اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد 22

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

عنوان	صفحہ
آیت ۱۹ تا ۲۳	۴۲۹
تفسیر	۴۳۰
چند نکات	
(۱) عربوں کے تین مشہور بت	۴۳۲
(۲) اسمہای بے مسمّٰی	۴۳۳
(۳) بت پرستی کا نفسیاتی اور فکری سرچشمہ	۴۳۴
(۴) پھر بھی "عزانیق" کا افسانہ	۴۳۴
آیت ۲۴ تا ۲۶	۴۳۶
شفاعت بھی اسی کے اذن سے ہوگی	۴۳۶
چند نکات	
(۱) آرزوؤں کے دامن کا پھیلاؤ	۴۳۸
(۲) شفاعت کے بارے میں گفتگو	۴۳۹
آیت ۲۷ تا ۳۰	۴۴۰
ظن و گمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے۔	۴۴۱
ایک نکتہ	
دنیا پرستوں کا سرمایہ	۴۴۴
آیت ۳۱، ۳۲	۴۴۵
خودستائی نہ کرو وہ تمھیں اچھی طرح پہنچانتا ہے۔	۴۴۶
چند نکات	
(۱) خدا کا علم بے پایاں ہے	۴۴۹

عنوان	صفحہ
(۲) کبائر الاثم کیا ہے؟	۴۴۹
(۳) خودستائی اور تزکیۂ نفس	۴۵۰
آیت ۳۳ تا ۴۱	۴۵۳
شانِ نزول	۴۵۴
ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے	۴۵۵
چند نکات	
(۱) تین اہم اسلامی اصول	۴۵۸
(۲) آیت کے مفاد سے سوء استفادہ	۴۵۹
(۳) چند سوالات کا جواب	۴۵۹
(۴) صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ	۴۶۰
(۵) گزشتہ کتب میں اعمال کے مقابلہ میں اصل مسئولیت	۴۶۱
آیت ۴۲ تا ۴۹	۴۶۲
تمام خطوط اسی تک پہنچتے ہیں	۴۶۳
چند نکات	
(۱) یہ سب سرو صدا اسی کی طرف سے ہے	۴۶۶
(۲) ستارہ شعریٰ کے عجائبات	۴۶۷
(۳) پیغمبرؐ کی ایک پُرمعنی حدیث	۴۶۸
آیت ۵۰ تا ۵۵	۴۷۰
کیا یہ سب درسِ عبرت کافی نہیں ہیں؟	۴۷۱
آیت ۵۶ تا ۶۲	۴۷۴
سب اس کے لیے سجدہ کرو	۴۷۵

تفسیر نمونہ جلد ۲۲

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
سورۂ فتح	۲۷
سورۂ فتح کے مطالب	۲۹
سورۂ فتح کی تلاوت کی فضیلت	۳۰
آیت ۱	۳۳
فتح المبین	۳۳
داستان صلح "حدیبیہ"	۳۴
صلح "حدیبیہ" کے سیاسی اجتماعی اور مذہبی نتائج	۳۶
آیت ۲، ۳	۴۰
فتح مبین کے عظیم نتائج	۴۰
چند نکات	
(۱) چند اہم سوالات کے جواب	۴۱
(۲) "ماتقدم" اور "ماتاخر" سے کیا مراد ہے؟	۴۴
آیت ۴	۴۵
مومنین کے دلوں پر نزول سکینہ	۴۵
یہ سکینہ کیا تھا؟	۴۶
چند نکات	
(۱) بے مثال آرام و سکون	۴۷
(۲) مراتب ایمان کا سلسلہ	۴۸
(۳) سکون کے دو اہم وسیلے	۴۹
آیت ۵ تا ۷	۵۰
فتح مبین کا ایک اور نتیجہ	۵۱
ایک نکتہ	
خدا کے بارے میں سوء ظن کون لوگ رکھتے ہیں؟	۵۵
آیت ۸ تا ۱۰	۵۸
پیغمبر کی حیثیت کا استحکام اور لوگوں کی اس کے بارے میں ذمہ داری	۵۹
آیت ۱۱ تا ۱۴	۶۵
پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی	۶۶
ایک نکتہ	
گناہ کی توجیہ کرنا ایک عام بیماری ہے۔	۷۰
آیت ۱۵ تا ۱۷	۷۳
پیچھے رہ جانے والے آمادہ طلب	۷۵
آیت ۱۸، ۱۹	۸۰
بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں سے خدا کی خوشنودی	۸۰
ایک نکتہ	

عنوان	صفحہ
"بیعت" اور اس کی خصوصیات	۸۳
بیعت کی ماہیت	۸۵
"بیعت" علیؑ کے ارشادات میں	۸۸
آیت ۲۰، ۲۱	۹۱
صلح حدیبیہ کی مزید برکات	۹۱
ایک نکتہ	
جنگِ خیبر کا ماجرا	۹۴
آیت ۲۲ تا ۲۵	۹۷
اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی	۹۸
آیت ۲۶	۱۰۴
تعصب اور حمیت جاہلیت، کفار کے لیے بزرگ ترین سدِ راہ	۱۰۴
ایک نکتہ	
حمیت جاہلیت کیا ہے؟	۱۰۷
آیت ۲۷	۱۱۱
پیغمبرؐ کا سچا خواب	۱۱۲
اس آیت میں کچھ قابلِ توجہ نکات	۱۱۳
عمدۃ القضاء	۱۱۵
آیت ۲۸، ۲۹	۱۱۷
دشمنوں کے مقابلہ میں سخت گیر اور دوستوں کے لیے مہربان	۱۱۸
چند نکات	
(۱) تنزیہ صحابہ کی داستان	۱۲۵
(۲) اسلامی باہمی محبت	۱۲۷
سورۂ حجرات	۱۳۱
سورۂ حجرات کے مطالب	۱۳۳

عنوان	صفحہ
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۱۳۴
آیت ۱ تا ۵	۱۳۷
شانِ نزول	۱۳۸
پیغمبرؐ کی بارہ گاہ کے آداب	۱۴۰
چند نکات	
(۱) ادب افضل ترین سرمایہ ہے	۱۴۵
(۲) پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا	۱۴۸
(۳) ہر چیز اور ہر جگہ انضباط اسلامی	۱۴۹
آیت ۶ تا ۸	۱۵۲
شانِ نزول	۱۵۳
فاسقوں کی خبروں پر اعتبار نہ کرو	۱۵۵
چند نکات	
(۱) خدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی	۱۶۰
(۲) رہبری اور اطاعت	۱۶۰
آیت ۹، ۱۰	۱۶۲
شانِ نزول	۱۶۳
مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں	۱۶۳
چند نکات	
(۱) باغیوں سے جنگ کرنے کی شرائط	۱۶۵
(۲) اخوت اسلامی کی اہمیت	۱۶۷
آیت ۱۱، ۱۲	۱۷۱
شانِ نزول	۱۷۲
استہزاء، بدگمانی غیبت، تجسس، اور برے القاب سے یاد کرنا ممنوع ہے	۱۷۳
چند نکات	
(۱) معاشرے میں کامل اور ہر پہلو سے امن و امان	۱۷۸

عنوان	صفحہ
(۲) تجسس نہ کرو	۱۸۰
(۳) غیبت بہت بڑا گناہ ہے	۱۸۱
(۴) غیبت کا مفہوم	۱۸۳
(۵) غیبت کا علاج اور اس سے توبہ	۱۸۴
(۶) استثنائی مواقع	۱۸۵
آیت ۱۳	۱۸۶
تفسیر	۱۸۶
تقویٰ بہترین انسانی صفت	۱۸۶
نکتہ	
(۱) سچی اور جھوٹی قدریں	۱۸۸
(۲) تقویٰ کی حقیقت	۱۹۲
آیت ۱۴، ۱۵	۱۹۶
"اسلام" اور "ایمان" کا فرق	۱۹۷
آیت ۱۶ تا ۱۸	۲۰۰
شانِ نزول	۲۰۰
مسلمان ہونے کا احسان مت جتلاؤ	۲۰۱
سورۂ "قٓ"	۲۰۵
سورۂ قٓ کے مطالب و مضامین	۲۰۷
آیت ۱ تا ۵	۲۰۹
ہٹ دھرم منکرین اپنے کام میں سرگرداں ہیں	۲۱۰
آیت ۶ تا ۱۱	۲۱۴
ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو	۲۱۵
آیت ۱۲ تا ۱۵	۲۱۹
صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن سے مقابلہ ہے؟	۲۲۰
آیت ۱۶ تا ۱۸	۲۲۳

عنوان	صفحہ
تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی وہ لکھتے ہیں۔	۲۲۳
ایک نکتہ	
دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے۔	۲۲۹
آیت ۱۹ تا ۲۲	۲۳۱
قیامت اور تیز بین آنکھیں	۲۳۱
چند نکات	
(۱) موت کی حقیقت	۲۳۷
(۲) سکراتِ موت	۲۳۹
(۳) موت حق ہے	۲۴۰
آیت ۲۳ تا ۳۰	۲۴۲
فرشتوں اور شیاطین میں سے انسان کے ہمنشین	۲۴۳
آیت ۳۱ تا ۳۷	۲۵۰
اے مجرمو! فرار کی کوئی راہ نہیں ہے!	۲۵۱
آیت ۳۸ تا ۴۰	۲۵۷
آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے	۲۵۷
نکتہ	
صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے	۲۶۱
آیت ۴۱ تا ۴۵	۲۶۳
قیامت کے صیحہ (چیخ) کے ساتھ ہی سب زندہ ہو جائیں گے	۲۶۴
سورۂ ذاریات	۲۶۹
سورۂ ذاریات کے مطالب	۲۷۱

عنوان	صفحہ
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	
آیت ۱ تا ۶	۲۷۳
طوفانوں اور بارش لانے والے بادلوں کی قسم	۲۷۴
آیت ۷ تا ۱۴	۲۷۷
قسم ہے آسمان کی اور اس کی زیبا شکنوں کی	۲۷۸
آیت ۱۵ تا ۱۹	۲۸۳
نیکو کار سحر خیزوں کا اجر	۲۸۳
چند نکات	
(۱) "خدا" اور "خلقِ خدا" کی طرف توجہ	۲۸۸
(۲) شب خیز کہ عاشقان بہ شب راز کنند!	۲۸۸
(۳) سائل و محروم کا حق	۲۹۰
آیت ۲۰ تا ۲۳	۲۹۱
خدا کی نشانیاں تمہارے وجود کے اندر ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ؟	۲۹۱
چند نکات	
(۱) اصمعی کی لرزا دینے والی داستان	۲۹۶
(۲) بہشت کہاں ہے ؟	۲۹۷
(۳) حق تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آمادگی ضروری ہے۔	۲۹۸
(۴) رزق حق ہے	۲۹۸
آیت ۲۴ تا ۳۰	۳۰۰
ابراہیمؑ کے مہمان	۳۰۱
ایک نکتہ	
پیغمبروں کی سخاوت	۳۰۵
قرآن مجید کے پارہ ۲۷ کا آغاز	۳۰۷
آیت ۳۱ تا ۳۷	۳۰۹
قوم لوطؑ کے بلادیدہ شہر ایک آیت اور عبرت ہیں۔	۳۱۰
ایک نکتہ	
قوم لوطؑ کے شہر کہاں تھے ؟	۳۱۴
آیت ۳۸ تا ۴۶	۳۱۵
گزشتہ لوگوں کی تاریخ میں یہ سب عبرت کے درس ہیں۔	۳۱۶
چند نکات	
(۱) عذابِ الٰہی کی مختلف صورتیں	۳۲۱
(۲) تولید کرنے والی اور بانجھ ہوائیں	۳۲۱
آیت ۴۷ تا ۵۱	۳۲۳
ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔	۳۲۴
آیت ۵۲ تا ۵۵	۳۳۰
نصیحت کر کیونکہ نصیحت و تذکر فائدہ مند ہے	۳۳۰
ایک نکتہ	
حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دلوں کی ضرورت ہے۔	۳۳۲
آیت ۵۶ تا ۵۸	۳۳۴
قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت کا مقصد	۳۳۴
چند نکات	
(۱) خدا غنی مطلق ہے	۳۳۷
(۲) وہ صاحب "قوت" اور "متین" ہے	۳۳۷

عنوان	صفحہ
(۳) جنوں کا ذکر پہلے کیوں ؟	۳۳۷
(۴) فلسفہ کی نظر سے خلقت کا فلسفہ	۳۳۸
(۵) انسان کی خلقت کے فلسفہ کے سلسلہ میں اسلامی روایات پر ایک نظر	۳۴۲
(۶) ایک سوال کا جواب	۳۴۳
آیت ۵۹ تا ۶۰	۳۴۵
یہ بھی عذابِ الٰہی میں حصہ دار ہیں	۳۴۵
سورۂ طور	۳۴۹
سورۂ طور کے مطالب	۳۵۱
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۳۵۱
آیت ۱ تا ۸	۳۵۳
بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم	۳۵۴
آیت ۹ تا ۱۶	۳۵۸
تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں	۳۵۹
چند نکات	
(۱) مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائیں گے ۔	۳۶۱
(۲) وہ لوگ جو باطل باتوں میں غوطہ زن ہیں ۔	۳۶۲
آیت ۱۷ تا ۲۱	۳۶۳
ہر شخص اپنے عمال کے بدلے میں گروی ہے	۳۶۴
آیت ۲۲ تا ۲۸	۳۷۰
ہم اس دن خوف زدہ تھے اور آج انتہائی امن میں ہیں ۔	۳۷۱

عنوان	صفحہ
چند قابلِ توجہ نکات	۳۷۴
آیت ۲۹ تا ۳۴	۳۷۶
شانِ نزول	۳۷۷
اگر سچ کہتے ہیں تو اس کے مانند کلام لے آئیں ۔	۳۷۷
آیت ۳۵ تا ۴۳	۳۸۳
سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کون سی ہے ؟!	۳۸۴
آیت ۴۵ تا ۴۹	۳۹۱
تو ہماری مکمل حفاظت میں ہے	۳۹۲
سورۂ النجم	۳۹۷
سورۂ النجم کے مطالب و مضامین	۳۹۹
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۴۰۰
آیت ۱ تا ۴	۴۰۳
تفسیر	۴۰۳
آیت ۵ تا ۱۲	۴۰۸
دوست کا پہلا دیدار	۴۰۹
آیت ۱۳ تا ۱۸	۴۱۶
دوسرا دیدار	۴۱۷
چند نکات	
(۱) معراج ایک مسلّمہ حقیقت ہے	۴۲۰
(۲) معراج کا مقصد	۴۲۱
(۳) معراج اور بہشت	۴۲۱
(۴) معراج اسلامی روایات میں	۴۲۱
(۵) معراج کی رات خدا کی پیغمبر سے باتوں کا ایک گوشہ	۴۲۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

ہم کیوں خدا کا شکر نہ کریں؟

خدا کا شکر ہے کہ چند افراد کی چودہ سال کی مسلسل کوششوں سے تفسیر نمونہ اپنی بائیسویں جلد تک پہنچ گئی ہے آہستہ آہستہ قرآن کا شوق رکھنے والے عاشقوں کے دلوں کو تسخیر کر رہی ہے۔

اب کام کے ختم ہونے میں کوئی زیادہ راستہ درپیش نہیں ہے۔ صرف "تین جلدیں" اور باقی رہ گئی ہیں، امید ہے کہ اس طولانی راستہ کے باقی ماندہ حصہ میں بھی خداوند تعالیٰ کا لطف یار و مددگار ہوگا اور اس کی توفیقات کے ساتھ یہ خدمت انجام پا جائے گی۔

ادھر اُردو زبان میں اس کا ترجمہ چار جلدوں تک[1] "پاکستان" و "ہند" میں زیباترین صورت میں نشر ہو چکا ہے، اور جلد اوّل کا "عربی" ترجمہ زیر طبع ہے، اور انگریزی زبان کے ترجمہ کے مقدمات بھی فراہم ہو رہے ہیں۔

لیکن ہم جتنا قرآن کے آخری حصہ سے نزدیک ترین ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی ہماری خوف سے ملی ہوئی مشتاقانہ عجلت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

"عجلت" تو ہفتوں اور دنوں کے فوت ہو جانے کی خاطر ہی نہیں بلکہ گھنٹوں اور منٹوں کے ضائع نہ ہونے کے لیے بھی ہے، اور "خوف" اس بنا پر ہے کہ شاید وہ مباحث جو پہلی جلدوں میں بیان ہوئے ہیں، ان کا مکمل طور پر حق ادا نہ ہوا ہو، اور ان جلدوں میں ان کی تلافی ہونی چاہیئے، یا وہ وعدے جو ہم نے بعض مسائل کی تشریح و تفصیل کے لیے کر رکھے ہیں، کہیں وہ بیان کرنے سے نہ رہ جائیں۔

---

[1] اب تو الحمد للہ ستر جلدیں تک طبع ہو چکی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اتنی مدت گزر جانے کے باوجود نہ صرف یہ کہ کوئی تھکاوٹ اور رکاوٹ تفسیر کے کام میں حائل نہیں ہوئی، بلکہ سعی اور کوششیں کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہیں، اس لیے ہمیں امید ہے کہ ہم جتنا آگے بڑھتے جائیں گے اتنا ہی مباحث میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے تمام گزشتہ تجربات سے مدد لی جائے گی۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان نکات کو، جو اس عظیم آسمانی کتاب، قرآن مجید پر، کئی سال غیر مرتب طور پر کام کرنے اور چودہ سال سے زیادہ مرتب طور پر کام کرنے سے، ہم پر روشن ہوئے ہیں، انھیں ہم قرآن کے سلسلہ میں تحقیق کرنے والوں کے حوالے کردیں، شاید یہ قرآن کو جاننے اور پہچاننے کے سلسلہ میں ایک مؤثر قدم ثابت ہو۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ:

(۱) انسان قرآن سے جتنا زیادہ نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی اس حقیقت کو بہتر طور پر محسوس کرلیتا ہے کہ قرآن ایک عظیم بیکراں سمندر ہے، جس کے بارے میں جتنی بھی گفتگو کی جائے کم ہے، غوطہ لگانے والے جب بھی اس میں غوطہ لگائیں گے، نئے نئے موتی اس میں سے نکال کر لائیں گے اور پھر بھی جو بیان کرنے سے رہ جائے گا وہ اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگا جو بیان کیا گیا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس تفسیر کے کام کی ابتدا میں کسی شہر کے ایک عالم نے یہ کہا تھا کہ تفسیر "مجمع البیان" کے بعد کسی تفسیر کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ (ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے آپ کو زحمت میں نہ ڈالیں)

اس پر میں نے یہ کہا تھا کہ میرا گمان یہ ہے کہ جب مرحوم "طبرسی" تفسیر "مجمع البیان" لکھنے میں مشغول ہوئے، تو انھیں بھی یہی کہا گیا تھا، کہ جب "شیخ طوسی" نے تفسیر "تبیان" لکھ دی ہے تو اس کے بعد تفسیر "مجمع البیان" لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن زمانہ کے گزرنے نے بتادیا کہ نہ صرف "مجمع البیان" کے لیے وسیع جگہ موجود تھی، بلکہ اگر مفکرین کی طرف سے قرآن کی دوسری سینکڑوں تفسیریں بھی لکھی جائیں پھر بھی کہا جائے گا کہ بہت سے مطالب ایسے ہیں جو بیان نہیں ہوئے۔

اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے، اور خدا کے کلام نے اس کے بے پایاں علم سے سرچشمہ حاصل کیا ہے، لہٰذا وہ بھی بے انتہا ہی ہونا چاہیئے۔

(۲) واقعاً انسان جتنا قرآن سے زیادہ آشنا ہوتا ہے، اتنا ہی بہتر طور سے وہ علی علیہ السلام کی اس گفتار کی گہرائی تک رسائی حاصل کرلیتا ہے جو نہج البلاغہ میں بیان ہوئی ہے، آپ نے فرمایا ہے: "اپنی بیماریوں کی دوا قرآن سے طلب کرو"۔ (فاستشفوہ من ادوائکم)

اگر آج دنیا بھر کے مسلمان مشکلات اور بہت سے رنج و آلام اور مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہیں، تو یہ سب کچھ اس صحیفہ آسمانی کو فراموش کرنے کی بنا پر ہے، کیونکہ اس کی آیات کے اندر ایسے دستور و احکام پوشیدہ ہیں، جن پر عمل کرنے سے موجودہ تمام بدبختیوں کو ختم کیا جاسکتا ہے، دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنایا جاسکتا ہے، فتنوں کو دبایا جاسکتا ہے، صفوں کو متحد کیا جاسکتا ہے، اسیری کی زنجیروں کو توڑا جاسکتا ہے، انکار کی سطح کو بلند کیا جاسکتا ہے، نیتوں کو خالص اور دنیا کے

بڑے سے بڑے مجرموں کے شر کو دفع کیا جا سکتا ہے اور بے سروسامانی کو ساز و سامان سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن "وما یعقلها الا العالمون"۔

سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن کو بالکل پڑھتے ہی نہیں ہیں، اور جو پڑھتے ہیں ان کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی تجوید اور طرز و آہنگ کو درست کریں۔

(۳) یہ جو ہم کہتے ہیں، کہ قرآن نور اور روشنی ہے (قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین) یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے ہم نے محسوس کر لیا ہے، اگر بعض حقیقت سے دور رہنے والوں کے لیے یہ بات نسیہ اور ادعا ہو تو ہو، ہمارے لیے تو یہ نقد ہے، حق کی قسم قرآن پر مسلسل کام کرنا اور اس کی نورانی آیات کا مطالعہ انسان کے دل و جان میں اس قسم کی حد سے زیادہ نورانیت اور ناقابل بیان لذت پیدا کرتا ہے، کہ ان آیات میں خدا کے جلووں کا اچھی طرح مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اور لوگ حق کے عشق کی شراب طہور سے سرمست ہو سکتے ہیں، خواہ بے خبروں نے ابھی تک کوئی بھی چیز حاصل نہ کی ہو،

اسی بنا پر ہم راہِ حق کے تمام راہ نوردوں اور معرفت اسلام کے جملہ طبقات پر خلوص اشتیاق رکھنے والوں کو دعوت و نصیحت کرتے ہیں، کہ وہ قرآن سے جتنا بھی ہو سکے نزدیک سے نزدیک تر ہوں گے، وہ خدا کا جمال و جلال اور اسلام و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت، اور عظیم اجتماعی مشکلات کا حل اس کے آئینہ میں دیکھ سکیں گے۔

(۴) یہ جو ہم کہتے ہیں کہ قرآن عظیم ترین ابدی و دائمی معجزہ ہے ایک ایسی بات ہے جو قرآن پر پہلی نظر پڑتے ہی ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی گہرائی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب انسان قرآن پر کام کرتا ہے، اس کی ریزہ کاریاں، ظرافتیں، دقتیں، مہربانیاں، تہدید و عذاب، بشارتیں، نذارتیں، نمونے، پیام، رہنمائیاں، ضرب المثلیں، تواریخ، تفسیریں، تجزیے، تحلیلیں، محکم دلائل، زیبا تصویریں، شیریں منطق، پرکشش بیان، خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے ناقابل توصیف نکات کو اس کی آیات کے اندر مشاہدہ کرے گا تو اس وقت تمام وجود کے ساتھ اعتراف کرے گا۔

"اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابها مثانی تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم و قلوبهم الی ذکر اللہ ذالک هدی اللہ یهدی به من یشاء"۔

"خدا نے بہترین کلام نازل کیا، ایسی کتاب جس کی آیات (لطف و زیبائی اور عمق و مطالب کے اعتبار سے) ایک دوسرے کی مثل ہیں، مکرر آیات ہیں، (لیکن ایسی تکرار جس سے شوق پیدا ہو) جس کی آیات کے سننے سے وہ لوگ لرزہ براندام ہو جاتے ہیں جو اپنے پروردگار کے سامنے خشوع کرنے والے ہیں، اس کے بعد ان کا ظاہر و باطن نرم اور خدا کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، یہ خدا کی ہدایت ہے، جسے چاہتا ہے اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔ (زمر۔ ۲۳)

ہم اس دن کی امید رکھتے ہیں، کہ قرآن تمام مسلمانوں کے متن زندگی میں نفوذ کرے، اور ان کے تمام اجتماعی میدانوں میں حضور پائے۔

آمین!

قم: حوزۂ علمیہ

ناصر مکارم شیرازی

جلد ۲۲

تفسیر نمونہ

سورۂ فتح، حجرات، ق

ذاریات، طور اور نجم

۱

سُورۂ فتح

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا
اور
اس کی ۲۹ آیات ہیں

تاریخ شروع
۱۷ رمضان ۱۴۰۵ھ
۱۷/۳/۱۳۶۴ھ ش

سورۂ فتح کے مطالب

یہ سورت جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے فتح و کامیابی کا پیغام لانے والی ہے، دشمنان اسلام پر کامیابی، قطعی اور نظر آنے والی کامیابی، (خواہ وہ کامیابی فتح مکہ کے ساتھ مربوط ہو یا صلح حدیبیہ کے ساتھ یا فتح خیبر سے، یا مطلق طور سے کامیابی)

اس سورہ کے مطالب کو معلوم کرنے کے لیے، ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ یہ سورہ حدیبیہ کے واقعہ کے بعد ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: پیغمبر اسلام نے ہجرت کے چھٹے سال مہاجرین و انصار اور باقی مسلمانوں کو ساتھ لے کر مراسم "عمرہ" کے عنوان سے مکہ کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کیا، اور اس سے پہلے وہ مسلمانوں کو بتا چکے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے اصحاب انصار کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہوا ہوں اور مناسک عمرہ ادا کرنے میں مشغول ہوں۔

مسلمانوں نے "ذی الحلیفہ" میں مدینہ کے قریب احرام باندھا، اور بہت زیادہ اونٹ قربانی کے لیے لے کر چلے۔

پیغمبرؐ کے چلنے کی کیفیت سے اس بات کی اچھی طرح نشاندہی ہو رہی تھی کہ اس عظیم عبادت کو انجام دینے کے علاوہ آپ کا اور کوئی مقصد نہیں ہے، یہاں تک کہ پیغمبرؐ سرزمین "حدیبیہ" میں وارد ہوئے، (حدیبیہ مکہ کے قریب ایک ایسی بستی تھی جو مکہ سے ۲۰ کلو میٹر کے فاصلہ پر تھی)

لیکن یہاں قریش کو پتہ چل گیا اور انھوں نے پیغمبرؐ کا راستہ روکا اور وہ ان کے مکہ میں وارد ہونے سے مانع ہوئے، اور حقیقت میں انھوں نے ان تمام سنتوں کو جو وہ ماہ حرام میں زائرین خانہ خدا کے امن و امان کے سلسلہ میں ادا کرتے تھے پاؤں تلے روند ڈالا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا، کہ حرمت والے مہینوں میں (منجملہ ماہ ذی قعدہ جس میں پیغمبر عمرہ کا ارادہ رکھتے تھے) خصوصاً حالت احرام میں کسی شخص سے مانع نہیں ہونا چاہیئے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی ان دنوں اور ان مراسم میں دیکھ لیتا تو ہرگز اس سے متعرض نہ ہوتا۔

یہاں ایک اہم واقعہ پیش آیا جو پیغمبرؐ اور مشرکین مکہ کے درمیان "صلح حدیبیہ" کے نام سے ایک صلح کی قرارداد کی صورت میں منتہی ہوا، جس کو ہم بعد میں بیان کریں گے، لیکن بہر صورت انہوں نے اس سال پیغمبر کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا، مجبوراً پیغمبر نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ اپنے اونٹوں کی اسی جگہ قربانی کریں اور اپنے سر منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، اور مدینہ کی طرف

لوٹ جائیں۔

یہاں غم واندوہ کے ایک طوفان نے مسلمانوں کو گھیر لیا، اور ضعیف الایمان لوگوں پر شک و تردد غالب آگیا۔

جس وقت پیغمبرؐ حدیبیہ سے مدینہ کی طرف آرہے تھے۔ تو آپ کی سواری بوجھل ہوگئی اور چلنے سے رُک گئی، اور اسی حالت میں آپ کا چہرۂ مبارک کسی بظاہر وجہ کے بغیر سرور و شادمانی میں ڈوب گیا، اور فرمایا:

لبس ابھی ابھی سورۂ فتح کی آیات محمد پر نازل ہوئی ہیں۔[1]

اور یہاں سے اس سورہ پر چھائی ہوئی ایک خاص فضا کامل طور پر نمایاں ہو جاتی ہے،

ایک اجمالی مطالعہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سورہ کے سات حصے ہیں۔

① یہ سورت، فتح کی بشارت سے شروع ہوتی ہے، اور اس کے اختتام کی آیات بھی اسی مسئلہ سے مربوط ہیں اور پیغمبرؐ کے مکہ میں وارد ہونے اور اس میں مناسک عمرہ انجام دینے کے خواب کے پورا ہونے کی تاکید ہے۔

② اس سورت کا دوسرا حصہ "صلح حدیبیہ"، "نزول سکینہ" اور مومنین کے دلوں کے لیے تسلی سے مربوط واقعات، اور بیعت رضوان کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

③ ایک اور حصہ میں پیغمبر کے مرتبہ، اور ان کے بلند و بالا مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔

④ ایک دوسرے حصہ میں منافقوں کی کارشکنیوں، اور میدان جہاد میں ان کے شرکت نہ کرنے کے بے ہودہ عذروں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

⑤ ایک اور حصہ میں منافقین کے کچھ نامناسب تقاضوں کا بیان ہے۔

⑥ اس کے بعد یہ سورہ ان لوگوں کا تعارف کراتا ہے جو میدان جہاد میں شرکت کرنے سے معذور ہیں،

⑦ آخری حصہ میں پیغمبر اسلامؐ کے دین کی راہ کے پیروکاروں کی خصوصیات اور مخصوص صفات کا بیان ہے۔

اس سورہ کی آیات، مجموعی طور پر حد سے زیادہ حساس، و مقدر ساز ہیں اور خاص طور سے ان گوناں گوں حوادث کے مقابلہ میں، جن میں اسلامی معاشرہ الجھا ہوا ہے، آج کے مسلمانوں کے لیے الہام آفرین ہیں۔

سورۂ فتح کی تلاوت کی فضیلت

منابع اسلامی میں اس سورہ کے بارے میں کچھ عجیب روایات نظر آتی ہیں،

ایک حدیث انس سے مروی ہے، وہ کہتا ہے،: جب ہم "حدیبیہ" سے واپس آرہے تھے، درحالیکہ مشرکین نے نہ تو ہمیں مکہ میں داخل ہونے دیا تھا اور نہ ہی عمرہ کرنے دیا تھا، تو ہم انتہائی غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے، کہ اچانک خدا نے آیہ

---

[1] تلخیص از تفسیر قمی، مجمع البیان اور فی ظلال۔

"انّا فتحنا لك فتحًا مبينًا" نازل فرمائی۔

پیغمبرؐ اکرم نے فرمایا۔ لقد انزلت علی آیۃ ھی احب الی من الدُّنیا کلّھا۔ "مجھ پر ایک آیت نازل ہوئی ہے، جو مجھے تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہے" (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک سورہ مجھ پر نازل ہوا ہے ...)[1]

"عبداللہ بن مسعود" کہتا ہے: "حدیبیہ سے واپسی کے موقع پر جب پیغمبرؐ پر "انّا فتحنا ....." نازل ہوئی تو آپؐ اس قدر خوش ہوئے کہ خدا ہی جانتا ہے۔[2]

ایک دوسری حدیث میں پیغمبرؐ سے منقول ہوا ہے۔

من قرأھا فکانما شھد مع محمد (ص)، فتح مکّہ، وفی روایۃ اخری فکانما کان مع من بایع محمدًا تحت الشجرۃ۔"

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے وہ اس شخص کے مانند ہے جو فتح مکّہ کے موقع پر پیغمبر کے ساتھ اور ان کے لشکر میں تھا، اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے، کہ وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے اس درخت کے نیچے جو حدیبیہ میں تھا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی"۔[3]

اور آخر میں ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے۔

حصنوا اموالکم ونساءکم وما ملکت ایمانکم من التلف بقرائۃ "انّا فتحنا لك" فانّہ اذا کان ممن یدمن قرائتھا نادی منادٍ یوم القیامۃ حتی یسمع الخلائق، انت من عبادی المخلصین، الحقوہ بالصالحین من عبادی، وادخلوہ جنات النعیم، واسقوہ من رحیق مختوم بمزاج الکافور!"

"اپنے مالوں، عورتوں، اور جو کچھ تمہاری ملک میں ہے، اُسے انّا فتحنا کی قرارت سے محفوظ کر لو، جو شخص مسلسل اس کی تلاوت کرے تو قیامت کے دن ایک منادی اس طرح ندا کرے گا کہ اُسے تمام مخلوق سُنے گی: یہ میرے مخلص بندوں میں سے ہے، اسے میرے صالح بندوں کے ساتھ ملا دو، اور بہشت کے نعمتوں بھرے باغات میں اسے داخل کر دو اور بہشتوں کے مخصوص مشروب سے اُسے سیراب کر دو"۔[4]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۰۸

[2] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۰۹

[3] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۰۸

[4] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۴۶ بحوالہ ثواب الاعمال۔

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ یہ سب فضیلت وافتخار، غور وفکر اور عمل سے خالی تلاوت سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تلاوت کا اصل مقصد اپنے عادات واخلاق واعمال کو ان آیات کے مفاد کے مطابق ڈھالنا ہے۔

سورۂ فتح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ہم نے تیرے لیے واضح کامیابی فراہم کردی ہے۔

تفسیر

فتح المبین

اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبرؐ کو ایک عظیم بشارت دی گئی ہے، ایسی بشارت جو بعض روایات کے مطابق پیغمبر کے نزدیک تمام دُنیا سے زیادہ محبوب تھی۔ فرماتا ہے: "ہم نے تجھے آشکار اور نمایاں فتح دی" (اِنا فتحنا لک فتحا مبینا)۔

ایسی نمایاں کامیابی، جس کے آثار اسلام کی پیش رفت، اور مسلمانوں کی زندگی میں، مختصر سے عرصہ میں ظاہر ہو گئے اور طویل مدت تک ظاہر ہوتے رہیں گے، ایسی فتح جو طول تاریخ اسلام میں کم مثال یا بے نظیر تھی۔

یہاں مفسرین کے درمیان ایک عظیم بحث ہوئی ہے کہ اس فتح سے مراد کونسی فتح ہے؟

اکثر مفسرین اس کو اس عظیم کامیابی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو "صلح حدیبیہ" سے مسلمانوں کو نصیب

ہوئی۔[1]

ایک جماعت نے اسے "فتح مکہ" کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے۔ اور بعض دوسروں نے اس سے "فتح خیبر" مراد لی ہے۔

اور بعض نے قدرت منطق، دلائل کی برتری اور آشکار معجزات کے طریقہ سے تمام دشمنوں پر اسلام کی کامیابی سمجھا ہے۔

آخر میں بعض اس کو پیغمبرؐ کے لیے اسرار علوم کے کھلنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے پاس بہت زیادہ قرائن موجود ہیں جو صلح حدیبیہ کے مسئلہ کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ان آیات کی تفسیر کے واضح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر چیز سے پہلے یہاں مختصراً حدیبیہ کی داستان پیش کریں، جو ان کی شان نزول ہے۔

داستان صلح حدیبیہ

چھٹی ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں پیغمبر اکرمؐ عمرہ کے قصد سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، اور تمام مسلمانوں کو اس سفر میں شرکت کا شوق دلایا، اگرچہ ایک گروہ کنارہ کش ہوگیا، مگر مہاجرین و انصار اور بادیہ نشین اعراب کی ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ جمعیت جو تقریباً ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل تھی، سب کے سب نے لباس احرام پہنا ہوا تھا، اور تلوار کے علاوہ، جو مسافروں کا اسلحہ شمار ہوتی تھی، کوئی جنگی ہتھیار اپنے ساتھ نہ لیا تھا۔

جب پیغمبر مکہ کے نزدیکی مقام "عسفان" پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش نے یہ پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے، یہاں تک کہ پیغمبرؐ "حدیبیہ" میں پہنچ گئے (حدیبیہ مکہ سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بستی ہے، جو ایک کنویں یا درخت کی مناسبت سے اس نام سے موسوم تھی) حضرتؐ نے فرمایا کہ تم سب اسی جگہ رک جاؤ، لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں تو کوئی پانی نہیں ہے، پیغمبرؐ نے معجزانہ طور پر اس کنویں سے جو وہاں تھا، اپنے اصحاب کے لیے پانی فراہم کیا۔

اسی مقام پر قریش اور پیغمبر کے درمیان سفراء آتے جاتے رہے تاکہ کسی طرح سے مشکل حل ہو جائے، آخر کار "عروہ ابن مسعود ثقفی" جو ایک ہوشیار آدمی تھا، قریش کی طرف سے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا، پیغمبرؐ نے فرمایا میں جنگ کے ارادہ سے نہیں آیا اور میرا مقصد صرف خانۂ خدا کی زیارت ہے، ضمناً عروہ نے اس ملاقات میں پیغمبرؐ کے وضو کرنے کا منظر بھی دیکھا، کہ صحابہ آپ کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے، جب وہ واپس لوٹا تو اس نے قریش سے کہا: میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں، میں نے کسی سربراہ مملکت کو اس کی قوم کے درمیان اتنا باعظمت نہیں دیکھا، جتنا محمدؐ کی عظمت کو ان کے اصحاب میں دیکھا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ محمد کو چھوڑ جائیں گے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، دیکھ لو تمہارا مقابلہ ایسے ایثار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ تمہارے لیے

---

[1] یہ تفسیر ابوالفتوح رازی نے، اور آلوسی نے روح المعانی میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، فی ظلال کے مؤلف نے اپنی تفسیر میں، اور فیض کاشانی نے صافی میں اختیار کی ہے، جبکہ تفسیر تبیان، کشاف، فخر رازی اور بعض دوسرے علماء نے دوسری تفسیر (فتح مکہ) کو ترجیح دی ہے، مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں دونوں قول دوسرے اقوال کے ساتھ شمار کیے ہیں، لیکن فتح مکہ کو پہلا قول ذکر کیا ہے، جس کی ترجیح ان کی نظر میں ہے۔

غور و فکر کا مقام ہے۔

اسی دوران پیغمبرؐ نے عمر سے فرمایا کہ وہ مکہ جائیں، اور اشراف قریش کو اس سفر کے مقصد سے آگاہ کریں، عمر نے کہا کہ قریش مجھ سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، لہٰذا مجھے ان سے خطرہ ہے، بہتر یہ ہے کہ عثمان کو اس کام کے لیے بھیجا جائے، عثمان مکہ کی طرف آئے، تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر پیغمبر نے شدتِ عمل کا ارادہ کیا اور ایک درخت کے نیچے جو وہاں پر موجود تھا، اپنے اصحاب سے بیعت لی، جو "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہوئی، اور ان کے ساتھ یہ عہد و پیمان کیا کہ آخری سانس تک ڈٹیں گے، لیکن تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ عثمان صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور اُن کے پیچھے پیچھے قریش نے "سہیل بن عمر" کو مصالحت کے لیے پیغمبر کی خدمت میں بھیجا، لیکن تاکید کی کہ اس سال کسی طرح بھی آپ کا مکہ میں ورود ممکن نہیں ہے۔

بہت زیادہ بحث و گفتگو کے بعد صلح کا عہد و پیمان ہوا، جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ سے باز رہیں اور اور آئندہ سال مکہ میں آئیں۔ اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ رہیں، اور مسافرت کے عام ہتھیار کے علاوہ اور کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہ لائیں، اور دوسرے متعدد مواد جن کا دارو مدار ان مسلمانوں کی جان و مال کی امنیت پر تھا، جو مدینہ سے مکہ میں وارد ہوں، اور اسی طرح مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال جنگ نہ کرنے اور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مذہبی فرائض کی انجام دہی بھی اس میں شامل کی گئی تھی۔

یہ پیمان حقیقت میں ہر جہت سے ایک عدم تعرض کا عہد و پیمان تھا، جس نے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مسلسل اور بار بار کی جنگوں کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

"صلح کے عہد و پیمان کا متن" اس طرح تھا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو حکم دیا کہ لکھو:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم": سہیل بن عمرو نے، جو مشرکین کا نمائندہ تھا، کہا: میں اس قسم کے جملہ سے آشنا نہیں ہوں، لہٰذا، بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھو!

پیغمبرؐ نے فرمایا: لکھو: "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"

اس کے بعد فرمایا: لکھو! یہ وہ چیز ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی" سہیل" نے کہا: ہم اگر آپ کو "رسول اللہ" سمجھتے تو آپ سے جنگ نہ کرتے، صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیے، پیغمبرؐ نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھو" یہ وہ چیز ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے سہل بن عمرو سے صلح کی، کہ دس سال تک دونوں طرف سے جنگ متروک رہے گی تاکہ لوگوں کو امن و امان کی صورت دوبارہ میسر آئے۔

علاوہ ازیں جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے اور مسلمان ہو جائے، اسے واپس کر دیں اور جو شخص ان افراد میں سے جو محمد کے پاس ہیں، قریش کی طرف پلٹ جائے تو اس کو واپس لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

تمام لوگ آزاد ہیں جو چاہے محمدؐ کے عہد و پیمان میں داخل ہو اور جو چاہے قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہو۔ طرفین اس بات کے پابند ہیں کہ ایک دوسرے سے خیانت نہ کریں اور ایک دوسرے کی جان و مال کو محترم شمار کریں۔

اس کے علاوہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں، لیکن آئندہ سال ہم تین دن کے لیے مکہ سے باہر چلے جائیں گے اور ان کے اصحاب آجائیں، لیکن تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں، (اور مراسم عمرہ کو انجام دے کر واپس چلے جائیں) اس شرط کے ساتھ کہ سوائے مسافر کے ہتھیار یعنی تلوار کے۔ وہ بھی غلاف میں۔ کوئی اور ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔

اس پیمان پر مسلمانوں اور مشرکین کے ایک گروہ نے گواہی دی اور اس عہد نامہ کے کاتب علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے[1]

مرحوم "علامہ مجلسی" نے بحار الانوار میں کچھ اور امور بھی نقل کیے ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ:

"اسلام مکہ میں آشکارا ہوگا اور کسی کو کسی مذہب کے انتخاب کرنے پر مجبور نہیں کریں گے، اور مسلمانوں کو اذیت و آزار نہیں پہنچائیں گے"[2]

اس موقع پر پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ قربانی کے وہ اونٹ جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے، اسی جگہ قربان کردیں اور اپنے سروں کو منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، لیکن یہ بات کچھ مسلمانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوئی، کیونکہ عمرہ کے مناسک کی انجام دہی کے بغیر ان کی نظر میں احرام سے باہر نکل آنا ممکن نہیں تھا، لیکن پیغمبرؐ نے ذاتی طور پر خود پیش قدمی کی اور قربانی کے اونٹوں کو نحر کیا اور احرام سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ یہ احرام و قربانی کے قانون میں ایک استثناء ہے جو خدا کی طرف سے قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا تو سر تسلیم خم کردیا، اور پیغمبرؐ کا حکم کامل طور سے مان لیا، اور وہیں سے مدینہ کی راہ لی، لیکن غم واندوہ کا ایک پہاڑ ان کے دلوں پر بوجھ ڈال رہا تھا، کیونکہ ظاہر میں یہ سارے کا سارا سفر ایک ناکامی اور شکست تھی، لیکن انھیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ صلح حدیبیہ کی داستان کے پیچھے مسلمانوں اور اسلام کے لیے کتنی کامیابیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی وقت سورۂ فتح نازل ہوئی اور پیغمبر گرامیؐ اسلام کو فتح عظیم کی بشارت ملی،[3]

صلح حدیبیہ کے سیاسی اجتماعی اور مذہبی نتائج

ہجرت کے چھٹے سال (صلح حدیبیہ کے وقت) مسلمانوں کی حالت میں اور دو سال بعد کی حالت میں فرق نمایاں تھا جب وہ دس ہزار کے مسلح لشکر کے ساتھ فتح مکہ کے لیے چلے تاکہ مشرکین کو پیمان شکنی کا دندان شکن جواب دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فوجوں کی معمولی سی جھڑپ کے بغیر ہی مکہ کو فتح کرلیا، اس وقت قریش اپنے اندر مقابلہ کرنے کی معمولی

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۸۱ (کچھ تلخیص کے ساتھ) [2] بحار الانوار جلد ۲۰ ص ۳۵۲۔

[3] سیرۃ ابن ہشام: ج ۳ ص ۳۲۱ - ۳۲۴، "تفسیر مجمع البیان"، "تفسیر فی ظلال" "کامل ابن اثیر جلد ۲ اور دوسرے مدارک بہت زیادہ تلخیص کے ساتھ۔

سی قدرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک اجمالی موازنہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ "صلح حدیبیہ" کا عکس العمل کس قدر وسیع تھا۔

خلاصہ کے طور پر مسلمانوں نے اس صلح سے چند امتیاز اور اہم کامیابیاں حاصل کیں، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① عملی طور پر مکہ کے فریب خوردہ لوگوں کو یہ بتا دیا کہ وہ جنگ و جدال کا ارادہ نہیں رکھتے، اور مکہ کے مقدس مظہر اور خانۂ خدا کے لیے بہت زیادہ احترام کے قائل ہیں، یہی بات ایک کثیر جماعت کے دلوں کے لیے اسلام کی طرف کشش کا سبب بن گئی۔

② قریش نے پہلی مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کو رسمی طور پر تسلیم کیا، یہی وہ چیز تھی جو جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت کو ثابت کرنے کی دلیل بنی۔

③ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان سکون و اطمینان کے ساتھ ہر جگہ آجا سکتے تھے اور ان کا جان و مال محفوظ ہوگیا تھا، اور عملی طور پر مشرکین کے ساتھ قریبی تعلق اور میل جول پیدا ہوا، ایسے تعلقات جس کے نتیجہ میں مشرکین کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ پہچان کے ساتھ ان کی توجہ اسلام کی طرف مائل ہوئی۔

④ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے سارے جزیرۃ العرب میں راستہ کھل گیا، اور پیغمبر کی صلح طلبی کی شہرت نے مختلف اقوام کو۔ جو پیغمبر کی ذات اور اسلام کے متعلق غلط نظریہ رکھتے تھے۔ تجدید نظر پر آمادہ کیا، اور تبلیغاتی نقطۂ نظر سے بہت سے وسیع امکانات و وسائل مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

⑤ صلح حدیبیہ نے خیبر کو فتح کرنے اور یہودیوں کے اس سرطانی غدہ کو نکال پھینکنے کے لیے، جو بالفعل اور بالقوہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک اہم خطرہ تھا راستہ ہموار کر دیا۔

⑥ اصولی طور پر پیغمبر کی ایک ہزار چار سو افراد کی فوج سے ٹکر لینے سے قریش کی دہشت۔ جن کے پاس کسی قسم کے اہم جنگی ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اور شرائط صلح کو قبول کر لینا، اسلام کے طرفداروں کے دلوں کی تقویت، اور مخالفین کی شکست کے لیے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو ستایا تھا خود ایک اہم عامل تھا۔

⑦ واقعہ حدیبیہ کے بعد پیغمبر نے بڑے بڑے ملکوں، ایران و روم و حبشہ کے سربراہوں، اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو متعدد خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور یہ چیز اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صلح حدیبیہ نے مسلمانوں میں کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، کہ نہ صرف جزیرہ عرب میں بلکہ اس زمانہ کی مجری دنیا میں ان کی راہ کو کھول دیا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ واقعاً صلح حدیبیہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتح اور کامیابی تھی، اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید نے فتح مبین کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قرائن ہمارے پاس ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

① "فتحنا" کا جملہ فعل ماضی کی صورت میں ہے، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ امر ان آیات کے نزول کے وقت پورا ہو چکا تھا، جبکہ اس وقت صلح حدیبیہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوئی تھی۔

(۲) ان آیات کے نزول کا زمانہ جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے، اور اس سورہ کی دوسری آیات، جو صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں مومنین کی مدح اور منافقین و مشرکین کی مذمت کر رہی ہیں، اس مطلب کے لیے ایک دوسری تائید ہے۔

اس سورہ کی آیت ۲۷ جو پیغمبرؐ کے رؤیائے صادقہ (سچے خواب) کی تاکید کر رہی ہے، وہ یہ کہتی ہے: "یقیناً تم عنقریب مسجد الحرام میں انتہائی امن و سکون کے ساتھ داخل ہو گے اور آخر مناسک عمرہ بجالاؤ گے" یہ اس بات کی ایک شاہد ہے کہ یہ سورہ اور اس کا مضمون حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے کا تھا۔

(۳) بہت سی روایات میں "صلح حدیبیہ" کا "فتح مبین" کے عنوان سے تعارف ہوا ہے، منجملہ ان کے یہ ہے:

تفسیر "جوامع الجوامع" میں آیا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ حدیبیہ سے واپس لوٹے (اور سورۂ فتح نازل ہوئی) تو ایک صحابی نے عرض کیا:

"ماھذا الفتح لقد صدونا عن البیت وصد ھدینا"

"یہ کیا فتح ہے کہ ہمیں خانۂ خدا کی زیارت سے بھی روک دیا ہے اور ہماری قربانی میں بھی رکاوٹ ڈال دی"؟!

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بئس الکلام ھذا، بل ھو اعظم الفتوح، قد رضی المشرکون ان یدفعوکم عن بلادھم بالراع، ویسئلوکم القضیۃ، ورغبوا الیکم فی الامان وقد رأوا منکم ما کرھوا"!:

"تو نے بہت بُری بات کہی ہے، بلکہ یہ تو ہماری عظیم ترین فتح ہے کہ مشرکین اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تمھیں خشونت آمیز طریقہ سے ٹکر لیے بغیر اپنی سرزمین سے دُور کریں، اور تمھارے سامنے صلح کی پیش کش کریں اور ان تمام تکالیف اور رنج و غم کے باوجود جو تمھاری طرف سے انھوں نے اٹھائے ہیں، ترکِ تعرض کے لیے تمھاری طرف مائل ہوئے ہیں"۔ [1]

اس کے بعد پیغمبرؐ نے وہ تکالیف جو انھوں نے بدر و احزاب میں جھیلی تھیں انھیں یاد دلائیں، تو مسلمانوں نے تصدیق کی یہ سب سے بڑی فتح تھی اور انھوں نے لاعلمی کی بنا پر یہ فیصلہ کیا تھا۔ [2]

"زھری" جو ایک مشہور تابعی ہے، کہتا ہے، کوئی بھی فتح "صلح حدیبیہ" سے زیادہ عظیم نہیں تھی، کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ ارتباط اور تعلق پیدا کیا، اور اسلام ان کے دلوں میں جاں گزیں ہوا، اور تین ہی سال کے عرصہ میں ایک عظیم گروہ اسلام لے آیا اور مسلمانوں میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ [3]

---

[1] جوامع الجوامع "(نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۴۰۔ حدیث ۹ کے مطابق)

[2] "تفسیر درّ المنثور" جلد ۶ صفحہ ۶۸۔

[3] " مذکورہ مدرک صفحہ ۱۰۹۔

ان احادیث میں، ان امتیازات کے ایک گوشہ کی طرف، جو صلح حدیبیہ کی برکت سے مسلمانوں کو نصیب ہوئے اشارہ ہوا ہے۔

صرف ایک ہی حدیث میں امام علی ابن موسی الرضاؑ سے آیا ہے کہ "انا فتحنا" "فتح مکہ" کے بعد نازل ہوئی۔ [1]

لیکن چونکہ "صلح حدیبیہ" دو سال بعد مکہ کی فتح کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید تھی لہذا اس حدیث کی توجیہ میں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔

یا دوسرے لفظوں میں صلح حدیبیہ مختصر سی مدت میں فتح خیبر کا سبب بنی (جو ہجرت کے ساتویں سال ہوئی) اور اس سے تھوڑا سا آگے فتح مکہ کا سبب بنی، اور دنیا کے تمام علاقوں میں لوگوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کے لحاظ سے اسلام کی کامیابی کا سبب ہوئی۔

گویا اس طرح سے چاروں تفاسیر کو جمع کیا جا سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان سب کا محور اصلی "صلح حدیبیہ" ہی کو قرار دیا جائے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۸۔

۲۔ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ

۳۔ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝

ترجمہ

۲۔ مقصد یہ تھا کہ خدا تیرے گذشتہ اور آئندہ کے وہ گناہ جن کی وہ تیری طرف نسبت دیتے تھے، بخش دے، اور تجھ پر اپنی نعمت کو تمام کردے، اور تجھے راہ راست کی طرف ہدایت کرے۔

۳۔ اور شکست ناپذیر کامیابی کو تیرے نصیب کرے۔

تفسیر

فتح مبین کے عظیم نتائج

ان دو آیات میں "فتح مبین" (صلح حدیبیہ) جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی تھی، کے پُر برکت نتائج کے ایک حصہ کی تشریح ہوئی ہے، فرماتا ہے: مقصد یہ تھا کہ خدا تیرے پہلے اور بعد کے گناہ بخش دے، اور اپنی نعمت کو تجھ پر تمام کردے اور تجھے راہ راست کی ہدایت کرے: "(لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر ویتم نعمته علیك ویهدیك صراطا مستقیما)۔

"اور تجھے شکست ناپذیر فتح تک پہنچائے"۔ "(وینصرك الله نصرا عزیزا)

اور اس طرح سے خدا نے اپنے پیغمبر کو فتح مبین کے سائے میں چار عظیم نعمتیں عطا فرمائیں، مغفرت، تکمیل نعمت، ہدایت و نصرت۔

چند نکات

① چند اہم سوالات کے جواب

یہاں بہت سے سوالات پیش ہوئے ہیں اور قدیم ترین زمانہ سے لے کر اب تک مفسرین ان سوالات کے جواب دے رہے ہیں۔

خصوصاً پہلی خدائی نعمت "یعنی گذشتہ اور آیندہ کے گناہوں کی مغفرت" کے بارے میں ذیل کے تین سوال پیش ہوئے ہیں۔

① جب کہ پیغمبر مقام عصمت کی بنا پر ہر گناہ سے پاک ہیں تو پھر اس جملہ سے کیا مراد ہے؟

② بالفرض اگر ہم اس اعتراض سے صرف نظر بھی کریں تو "فتح حدیبیہ" اور گناہوں کی آمرزش کے درمیان کون سا ربط ہے۔

③ اگر "ماتاخر" سے مراد آیندہ کے گناہ ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو گناہ ابھی واقع ہی نہیں ہوا اُسے معاف کیا جائے؟ کیا یہ آیندہ کے لیے ارتکاب گناہ کی اجازت نہیں ہے؟

مفسرین میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی صورت میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے، لیکن جامع ترین جواب اور ان آیات کی دقیق تفسیر کی تہ تک پہنچنے کے لیے ایک بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اور وہ اہم بات یہ ہے کہ ہم "فتح حدیبیہ" کا آمرزش گناہ، کے مسئلہ کے ساتھ ربط معلوم کریں، کیونکہ اُوپر کے تینوں سوالات کے اصل جواب کی چابی اسی میں چھپی ہوئی ہے۔

تاریخی واقعات اور حوادث پر غور و فکر کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ، جس وقت کوئی سچا مذہب یا مکتب خیال ظاہر ہوتا ہے، اور وہ قائم ہونے کی کوشش کرتا ہے، تو بے ہودہ رسم و رواج کے دفادار، جو اپنے وجود کو خطرے میں پاتے ہیں، ہر قسم کی تہمت اور ناروا نسبت اس کے سر تھوپتے ہیں، افواہیں پھیلاتے ہیں، جھوٹی باتیں کرتے ہیں اس کے مختلف نقص گنواتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اگر یہ مکتب اپنی پیش رفت کی راہ میں شکست سے دوچار ہو جائے، تو مخالفین کے ہاتھ میں ناروا نسبتوں کی ایک محکم دستاویز آجاتی ہے اور وہ چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ہم نے کہا نہیں تھا کہ اس طرح ہے، ہم کہتے نہیں تھے کہ یہ بات ہے؟ لیکن جب وہ کامیابی سے ہم کنار ہو جائے، اور اپنے پروگراموں کو کٹھن آزمائشوں سے گزرتے ہوئے پورا کر لے، تو تمام ناروا نسبتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تمام اس طرح کے فقرے "ہم نے نہیں کہا تھا؟" افسوس و ندامت میں بدل جاتے

ہیں، اور اس کی جگہ "ہم نہیں جانتے تھے، ہمیں معلوم نہیں تھا" جیسے فقرے آجاتے ہیں۔

خصوصاً پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ نادرست نسبتیں اور خیالی گناہ بہت زیادہ تھے، آپ کو جنگ طلب، آگ بھڑکانے والا، پہلے رسم و رواج کی پرواہ نہ کرنے والا، افہام و تفہیم کے ناقابل، اور اسی قسم کی دوسری باتوں کا مرتکب سمجھتے تھے۔

صلح حدیبیہ نے اچھی طرح سے نشاندہی کردی کہ آپ کا دین۔ دشمنوں کے خیال کے برخلاف۔ ایک ترقی کرنے والا اور خدائی دین ہے، اور آپ کے قرآن کی آیات انسانوں کے نفوس کی تربیت کی ضامن، اور ظلم و ستم اور جنگ و خونریزی کو ختم کرنے والی ہیں۔

وہ خانۂ خدا کا احترام کرتے ہیں، بلاوجہ کسی قوم و قبیلہ پر حملہ نہیں کرتے، دلیل کے ساتھ جچی تلی بات کرتے ہیں، اُن کے پیروکار اُن کے عاشق ہیں، وہ واقعاً تمام انسانوں کو ان کے محبوب اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اگر اس کے دشمن جنگ کو اس کے اوپر سوار ہی نہ کردیں، تو وہ صلح اور امن و سلامتی کے طالب ہیں۔

اس طرح سے صلح حدیبیہ نے، وہ تمام الزام جن کی ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد زیادہ تر تہمتیں جن کی اس ماجرے سے پہلے یہاں تک کہ وہ گناہ بھی جن کے آپ کی طرف آئندہ نسبت دینے کا امکان تھا، ان سب کو دھو دیا۔ اور چونکہ خدا نے پیغمبر کو یہ کامیابی نصیب فرمائی، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا نے ان سب کو دھو دیا۔

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ الزامات واقعی الزام نہیں تھے، بلکہ ایسے الزام تھے جو خیالی لوگوں کے افکار میں تھے، جنہیں انھوں نے باور کرلیا تھا، جیسا کہ سورۂ شعراء کی آیت ۱۴ میں موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰؑ نے بارگاہِ خدا میں عرض کیا۔

ولھم علیّ ذنب فاخاف ان یقتلون: "فرعونیوں کا میرے اوپر ایک گناہ ہے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے اس گناہ کے جرم میں قتل کردیں گے" حالانکہ آپ کا گناہ بنی اسرائیل کے ایک مظلوم آدمی کی مدد کرنے اور فرعونیوں میں سے ایک ستمگر کی سرکوبی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ نہ صرف گناہ نہیں تھا، بلکہ مظلوم کی حمایت تھی، لیکن فرعونیوں کی نظر میں وہ گناہ شمار ہوتا تھا۔

دوسرے لفظوں میں "ذنب" لغت میں کسی کام کے بُرے آثار اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج کے معنی میں ہے، ظہورِ اسلام نے آغاز میں مشرکین کی زندگی کو درہم برہم کرکے رکھ دیا، لیکن بعد کی کامیابیاں اس بات کا سبب بن گئیں کہ وہ نتائج فراموشی کے سپرد کردیے جائیں۔

اگر لوگ ہمارے پرانے اور فرسودہ گھر کو، جو اس وقت ہماری پناہ گاہ کا کام دیتا ہے اور ہم اس سے دل بستگی رکھتے ہیں، خراب کردیں، تو ممکن ہے کہ ہم اس کام کو ان کی خطا اور غلطی کہیں اور اُسے ان کا ایک گناہ سمجھیں، لیکن جب ایک محکم اور آراستہ عمارت اس کی جگہ بنادی جائے اور ہماری تمام پریشانیاں دُور کردی جائیں، تو پھر ہمارا فیصلہ کلی طور پر بدل جائے گا۔

مشرکین مکہ ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں غلط قسم کے خیالات و

تصورات رکھتے تھے، بعد والی کامیابیوں نے اُن سب پر خط بطلان کھینچ دیا۔

ہاں! اگر ہم ان گناہوں کی آمرزش کا فتح حدیبیہ کے ساتھ تعلق نظر میں رکھیں تو مطلب مکمل طور پر واضح ہو جائے گا۔ وہ رابطہ جو "لیغفرلک اللہ" کی "لام" سے معلوم ہوتا ہے اور آیت کے معنی کھولنے کے لیے کلید رمز ہے۔

لیکن جنہوں نے اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی وہ یہاں پیغمبرؐ کے مقام عصمت کو زیر سوال لے آتے ہیں۔ اور آپ کے لیے (نعوذ باللہ) گناہوں کے قائل ہوئے ہیں۔ جنھیں خدا نے فتح حدیبیہ کے سائے میں بخش دیا ہے یا پھر آیت کا ظاہر کے برخلاف معنی کیا ہے۔

ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد گناہ ہی ہیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن کے لوگ پیغمبر کے بارے میں مرتکب ہوئے تھے، مثلاً اذیت اور تکلیفیں جو صلح حدیبیہ کے بعد ختم ہو گئیں (اس صورت میں ذنب کی مفعول کی طرف اضافت ہوئی نہ کہ فاعل کی طرف)

اور یا اُسے ترک اولیٰ کے معنی میں لیا ہے۔

یا فرضی گناہوں کے معنی سے تفسیر کیا ہے کہ فرض کرو اگر تو آئندہ یا گذشتہ زمانے میں گناہ کا مرتکب ہوا ہوتا تو ہم اُسے بخش دیتے۔

لیکن واضح ہے کہ یہ تکلفات ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم انبیا کی عصمت کو مخدوش کر دیں تو ان کا فلسفۂ وجود ہی ختم ہو جائے گا، کیونکہ پیغمبرؐ کو ہر چیز میں نمونہ ہونا چاہیئے، ایک گناہگار شخص اس مثال کو کیسے پورا کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ خود ایک رہبر و رہنما کا محتاج ہوگا جو اُسے ہدایت کرے۔

اور بہت سی دوسری تفسیریں بھی ہیں، جو ظاہر کے خلاف ہیں، اور ان میں اہم اشکال یہ ہیں، کہ وہ آمرزش گناہ کا ارتباط صلح حدیبیہ کے مسئلہ سے منقطع کر دیتی ہیں،

بہترین تفسیر وہی ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ ہوا ہے، جو تینوں سوالات کا یکجا جواب دیتی ہے۔ اور آیت کے جملوں کے ارتباط کو مشخص کرتی ہے۔

یہ سب بحث تو ان چاروں نعمتوں میں سے پہلی نعمت کے بارے میں ہے، جو خدا نے "صلح حدیبیہ" کے سائے میں پیغمبرؐ کو دی تھیں۔

اب باقی رہ گیا پروردگار کی نعمت کی تکمیل، صاف اور مستقیم راستے کی طرف ہدایت، اور شکست ناپذیر خدائی نصرت، تو حدیبیہ کی کامیابی کے بعد یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو کسی پر مخفی رہی ہو، اسلام نے تیزی کے ساتھ وسعت پیدا کی، آمادہ دلوں کو تسخیر کیا، اس کی تعلیمات کی عظمت سب پر آشکار ہوئی، زہریلے پروپیگنڈوں کو ناکارہ کر دیا اور خدا کی نعمت کو کامل کر دیا، اور عظیم کامیابیوں کی طرف راہِ مستقیم کو اس طرح سے ہموار کیا، کہ فتح مکہ کے واقعہ میں لشکر اسلام نے بغیر کسی مزاحمت کے دشمن کا اہم ترین قلعہ فتح کر لیا۔

۲۔ "ماتقدم" اور "ماتاخر" سے کیا مراد ہے؟

زیر بحث آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ خدا فرماتا ہے، فتح مبین کے سایے میں تیرے پہلے گناہ بھی اور آیندہ کے گناہ بھی بخش دیئے ہیں، اس بارے میں کہ متقدم اور متاخر (پہلے اور آیندہ کے) سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے "ماتقدم" کو آدم وحوا کے عصیان اور ترکِ اولیٰ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور "ماتاخر" کو امت کے گناہوں کی طرف۔

بعض دوسروں نے "ماتقدم" کو نبوت سے قبل کے مسائل سے مربوط جانا ہے اور "ماتاخر" کو نبوت سے بعد کے ساتھ مربوط سمجھا ہے

بعض نے "ماتقدم" کو ان گناہوں سے جو صلح حدیبیہ سے پہلے ہوئے تھے، اور "ماتاخر" کو اُن سے جو صلح کے بعد ہوئے، مربوط سمجھا ہے۔

لیکن اس تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو ہم نے آیت کے اصل معنیٰ کے بارے میں خاص طور پر "صلح حدیبیہ" کے مسئلہ کے ربط میں۔ بیان کی ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام ناروا نسبتیں اور گناہ ہیں جو وہ اپنے گمان کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف گذشتہ زمانے میں منسوب کرتے رہے تھے یا آیندہ کرتے، اور اگر یہ عظیم کامیابی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو وہ ان تمام گناہوں کو قطعی ویقینی خیال کر لیتے، لیکن اس کامیابی کے حصول کے ساتھ گذشتہ ناروا نسبتیں بھی ختم ہوگئیں، اور وہ بھی جن کے بارے میں ممکن تھا کہ آیندہ نسبت دیتے۔

اس تفسیر کا ایک دوسرا شاہد وہ روایت ہے، جو امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے منقول ہوئی ہے کہ مامون نے جس وقت اس آیت کے متعلق سوال کیا تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

"مشرکین مکہ کے نزدیک کسی شخص کا گناہ رسول اللہ سے زیادہ سنگین نہیں تھا، کیونکہ وہ ۳۶۰ بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے جس وقت پیغمبرؐ نے انھیں توحید کی طرف دعوت دی تو ان پر بہت گراں گزرا، اور انھوں نے کہا، کیا اس نے ہمارے سب خداؤں کو ایک خدا میں تبدیل کر دیا ہے؟ یہ تو ایک عجیب بات ہے ..... ہم نے ہرگز اس قسم کی کوئی بات اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سُنی، یہ تو ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔

لیکن جس وقت خدا نے (صلح حدیبیہ کے بعد) اپنے پیغمبرؐ کے لیے مکہ فتح کر دیا، تو خدا نے فرمایا، اے محمد ہم نے تیرے لیے فتح مبین فراہم کی ہے تاکہ توحید کی طرف دعوت دینے کی بناء پر مشرکین عرب کے نزدیک جتنے گناہ تو نے پہلے کیے تھے یا آیندہ کرے گا ان سب کو بخش دیا، کیونکہ بعض مشرکین مکہ تو اس دن ایمان لا چکے تھے، اور بعض مکہ سے باہر نکل گئے تھے۔ اور ایمان نہیں لائے تھے، لیکن ان میں اب توحید کا انکار کرنے کی جرأت باقی نہیں رہی تھی، لہٰذا پیغمبرؐ کا گناہ ان کی نظر میں بھی کامیابی کی بنا پر بخشا گیا، جس وقت مامون نے یہ سُنا تو کہا بارک اللہ، اے ابوالحسن!

(نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۶)

۴۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝

ترجمہ

۴۔ وہی تو ہے جس نے مؤمنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ ہو، اور آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا ہی کے لیے ہیں اور خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

مؤمنین کے دلوں پر نزول سکینہ

گذشتہ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اتنی عظیم نعمتیں تھیں جو خدا نے فتح مبین (صلح حدیبیہ) کے سایے میں پیغمبرؐ کو عطا فرمائی تھیں، لیکن زیر بحث آیت میں اس عظیم نعمت کے بارے میں بحث کر رہا ہے جو اس نے تمام مؤمنین کو مرحمت فرمائی ہے، فرماتا ہے: وہی تو ہے، جس نے مومنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کرے۔"

(هو الذی انزل السکینة فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانهم)۔

اور سکون و اطمینان ان کے دلوں پر نازل کیوں نہ ہو۔" درآنحالیکہ آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا کے لیے ہیں۔ اور خدا دانا و حکیم ہے۔"

(وَ لِلّٰہ جنود السماوات والارض وکان اللہ علیمًا حکیمًا)۔

یہ سکینہ کیا تھا؟

ضروری ہے کہ ہم پھر "صلح حدیبیہ" کی داستان کی طرف لوٹیں اور اپنے آپ کو "صلح حدیبیہ" کی فضا میں اور اس فضا میں جو صلح کے بعد پیدا ہوئی، تصور کریں تاکہ آیت کے مفہوم کی گہرائی سے آشنا ہو سکیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا تھا۔ "ایک رؤیائے الٰہی و رحمانی"۔ کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور اس کے بعد خانۂ خدا کی زیارت کے عزم کے ساتھ چل پڑے زیادہ تر صحابہ یہی خیال کرتے تھے کہ اس خواب اور رؤیائے صالحہ کی تعبیر اسی سفر میں واقع ہوگی، حالانکہ مقدر میں ایک دوسری چیز تھی یہ بات تو ایک ہوئی۔

دوسری طرف مسلمانوں نے احرام باندھا ہوا تھا، اور وہ قربانی کے جانور اپنے ساتھ لائے تھے، لیکن ان کی توقع کے برخلاف خانۂ خدا کی زیارت کی سعادت تک نصیب نہ ہوئی، اور پیغمبرؐ نے حکم دے دیا کہ مقام حدیبیہ میں ہی قربانی کے اونٹوں کو نحر کر دیں۔ کیونکہ ان کے آداب و سنن کا بھی اور اسلامی احکام و دستور کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جب تک مناسک عمرہ کو انجام نہ دے لیں احرام سے باہر نہ نکلیں۔

تیسری طرف حدیبیہ کے صلح نامہ میں کچھ ایسے امور تھے جن کے مطالب کو قبول کرنا بہت ہی دشوار تھا، منجملہ ان کے یہ کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور مدینہ میں پناہ لے لے تو مسلمان اُسے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس لازم نہیں تھا۔

چوتھی طرف صلح نامہ کی تحریر کے موقع پر قریش اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ لفظ "رسول اللہ" محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ لکھا جائے، اور قریش کے نمائندے "سہیل" نے اصرار کر کے اسے حذف کرایا، یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے لکھنے کی بھی موافقت نہ کی، اور وہ یہی اصرار کرتا رہا کہ اس کے بجائے "بسمک اللّٰھم" لکھا جائے، جو اہل مکہ کی عادت اور طریقہ کے مطابق تھا، واضح رہے کہ ان امور میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک ناگوار امر تھا، چہ جائیکہ وہ سب کے سب مجموعی طور سے۔ اسی لیے ضعیف الایمان لوگوں کے دل ڈگمگا گئے، یہاں تک کہ جب سورۂ فتح نازل ہوئی تو بعض نے تعجب کے ساتھ پوچھا: کونسی فتح؟!

یہی وہ موقع ہے جب نصرت الٰہی کو مسلمانوں کے شامل حال ہونا چاہیئے تھا، اور سکون و اطمینان ان کے دلوں میں داخل ہوتا تھا، نہ یہ کہ کوئی فتور اور کمزوری ان میں پیدا ہوتی تھی، بلکہ "لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم" کے مصداق ان کی قدرتِ ایمانی میں اضافہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور پر دلائی آیت ایسے حالات میں نازل ہوئی۔

"سکینہ" اصل میں "سکون" کے مادہ سے دلی آرام و اطمینان کے معنی میں ہے، جو ہر قسم کے شک و تردد اور وحشت کو

انسان سے زائل کر دیتا ہے، اور اس کو طوفان حوادث میں ثابت قدم رکھتا ہے۔

ممکن ہے اس سکون میں اعتقادی پہلو ہو۔ اور وہ اعتقاد میں ڈگمگانے سے بچائے، یا اس میں عملی پہلو ہو اس طرح سے کہ وہ انسان کو ثبات قدم، مقاومت اور صبر و شکیبائی بخشے۔ البتہ گذشتہ مباحث کی مناسبت سے اور خود آیت کی تعبیریں یہاں زیادہ تر پہلے معنی کی طرف نظر جاتی ہے، جبکہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۴۸ داستان "طالوت" و "جالوت" میں زیادہ تر عملی پہلوؤں پر تکیہ کرتی ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے "سکینہ" کے لیے کچھ اور معنی بھی ذکر کیے ہیں۔ جن کی بازگشت آخر کار اسی تفسیر کی طرف ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں "سکینہ" کی "ایمان" کے ساتھ تفسیر ہوئی[1] اور بعض دوسری روایات میں نسیم جنت سے جو ایک خاص صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور مومنین کو سکون و آرام بخشتی ہے۔[2]

جو کچھ بیان ہوا ہے، یہ بھی ان کے لیے ایک تائید ہے، کیونکہ "سکینہ" ایمان کی پیداوار ہے اور نسیم بہشتی کی طرح آرام بخش ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے، کہ "سکینہ" کے بارے میں "انزال" (نازل کرنے) کی تعبیر ہوئی، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ تعبیر قرآن مجید میں بعض اوقات، ایجاد، و خلقت اور بخشش کے معنی میں آتی ہے اور چونکہ ایک عالی مقام سے ایک پست مقام کی طرف ہے اس لیے اس تعبیر کی خوبی واضح ہے۔

چند نکات

① بے مثال آرام و سکون

اگر ایمان کا ثمر اور نتیجہ اسی سکون و آرام کے مسئلہ کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، تو یہی کافی تھا کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کا استقبال کرے، جبکہ اس میں دوسرے ثمرات و برکات بھی موجود ہیں۔

مومنین اور بے ایمان لوگوں کی حالت کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے، کہ دوسرا گروہ ایک دائمی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں بسر کرتا ہے، جب کہ پہلا گروہ بے مثال اطمینان قلب سے بہرہ مند ہے، اور اس کے سائے میں ہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۱۴

[2] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۱۴

ہرگز خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، "ولا یخشون احدا الا اللہ"۔

(احزاب - ۳۹)

ان کے آہنی ارادے میں اس کی اور اُس کی ملامت و سرزنش ہرگز اثر انداز نہیں ہوتی، "ولا یخافون لومۃ لائم" (مائدہ - ۵۴)

جو کچھ ہاتھ سے چلا جائے اس پر ہرگز غمگین نہیں ہوتے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس سے زیادہ دل بستگی نہیں رکھتے، اور یہ دونوں اصول اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ گذشتہ اور آئندہ کے لحاظ سے ان کا روحی سکون متزلزل نہ ہو، "لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم"۔

(حدید - ۲۳)

اور بالآخر سخت اور شدید حوادث کے مقابلہ میں ہرگز بھی سست اور کمزور نہیں ہوتے، اور کسی غم کو اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیتے۔

گویا مومنین ہمیشہ اپنے دشمن سے برتر رہتے ہیں: "ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین"۔

(آلِ عمران - ۱۳۹)

مؤمن میدانِ حوادث میں خود کو تنہا نہیں سمجھتا، خدا کے لطف و حمایت کے ہاتھ کو ہمیشہ اپنے سر پر محسوس کرتا ہے اور فرشتوں کی مدد و نصرت کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے۔

جب کہ بے ایمان لوگوں پر چھائی ہوئی بے چینی اور اضطراب ان کی گفتار و رفتار سے۔ خصوصاً جب حوادث کے طوفان چل رہے ہوں۔ پورے طور پر محسوس ہوتا ہے۔

② مراتب ایمان کا سلسلہ

ایمان چاہے علم و آگاہی اور معرفت کے معنی میں ہو، اور چاہے حق کے سامنے تسلیم و قبولیت کی رُوح کے معنی میں، کئی درجے اور سلسلہ مراتب رکھتا ہے، کیونکہ علم کے کئی درجے ہوتے ہیں اور قبول کرنے اور سر تسلیم خم کرنے کے بھی مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ عشق کے لگاؤ اور ایمان سے توأم محبت میں بھی فرق ہوتا ہے۔

زیر بحث آیت جو یہ کہتی ہے کہ: "لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم" بھی اسی حقیقت پر ایک تاکید ہے، اسی بنا پر ایک مومن آدمی کو ایمان کے کسی ایک مرحلہ پر ہرگز رکنا نہیں چاہیئے، وہ ہمیشہ خودگری کرتے ہوئے علم اور عمل کے ذریعہ بالاتر درجات کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"ان الایمان عشر درجات بمنزلۃ السلم یصعد منہ مرقاۃ

بعد مرقاۃ"

" ایمان کے دس درجے ہیں مثل سیڑھی کے، جس کے ایک ایک درجہ پر اُس سے اُوپر جاتے ہیں"۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں آپؑ ہی سے منقول ہے:

خدا نے ایمان کو سات حصّوں پر تقسیم کیا ہے، نیکی، صدق، یقین، رضا، وفا، علم اور حلم۔ پھر اسے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا، جو شخص ان تمام ساتوں حصّوں کا حامل ہے، وہ کامل و معتمد مؤمن ہے۔ لوگوں میں سے بعض تو ایک حصّہ رکھتے ہیں، بعض دو اور بعض تین، یہاں تک کہ بعض سات تک پہنچ جاتے ہیں"۔

اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا:

جو وظیفہ اور ذمہ داری دو حصوں والے کی ہے۔ اسے ایک حصّہ والے کے کندھے پر نہ رکھو، اور جو بات تین حصّوں والے سے مربوط ہے اسے دو حصّوں والے کے دوش پر نہ ڈالو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا بار زیادہ ہو جائے اور وہ زحمت میں جا پڑیں"۔ [2]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز جو بعض سے نقل کی گئی ہے کہ ایمان میں کمی و زیادتی نہیں ہے، بہت ہی بے بنیاد سی بات ہے کیونکہ نہ تو وہ علمی واقعات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی اسلامی روایات کے ساتھ، لگا کھاتی ہے۔

③ سکون کے دو اہم وسیلے

زیر بحث آیت کے ذیل میں ہم نے دو جملے پڑھے ہیں، جن میں سے ہر ایک "سکینہ" اور مؤمنین کے آرام و اطمینان کے عوامل کو بیان کرتا ہے، پہلا تو " وللہ جنود السماوات والارض " (آسمانوں اور زمین کا لشکر خدا کے لیے ہے اور اس کے حکم کے ماتحت ہے) کا جملہ ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا " وکان اللہ علیما حکیما" (خدا علیم و حکیم ہے) کا جملہ ہے۔

پہلا جملہ انسان سے کہتا ہے کہ اگر تو خدا کے ساتھ ہو تو زمین و آسمان کی ساری قوتیں تیرے ساتھ ہیں، اور دوسرا جملہ اس سے یہ کہتا ہے کہ خدا تیرے احتیاجات، مشکلات اور مصیبتوں کو بھی جانتا ہے اور تیری جد و جہد تیری کوششوں اور اطاعت و بندگی سے بھی باخبر ہے اور ان دونوں اصولوں کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ انسان کو سکون قلب اور اطمینان خاطر حاصل نہ ہو۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶۹ ص ۱۶۵۔

[2] "کافی" جلد ۲ باب درجات الایمان۔ حدیث ۱۔

۵۔ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

۶۔ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۖ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

۷۔ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

ترجمہ

۵۔ (اس فتح مبین سے ایک اور) مقصد یہ تھا کہ صاحب ایمان مردوں اور صاحب ایمان عورتوں کو (بہشت کے) باغوں میں داخل کرے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور ان کے گناہوں کو بخش دے اور یہ خدا کے نزدیک بہت بڑی

کامیابی ہے۔

۶۔ اور (اس کے علاوہ) منافق مردوں اور منافق عورتوں، اور مشرک مردوں، اور مشرک عورتوں کو جو خدا کے بارے میں بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں عذاب کرے، اور وہ بُرے حادثات، (جن کے وہ مومنین پر نازل ہونے کے منتظر ہیں) صرف انہی پر نازل ہوں گے، خدا نے ان پر غضب کیا ہے اور انھیں اپنی رحمت سے دُور رکھا ہے، اور جہنم ان کے لیے آمادہ و تیار ہے، اور یہ کتنا بُرا انجام ہے۔

۷۔ آسمانوں اور زمین کے لشکر صرف خدا کے لیے ہیں، اور خدا شکست ناپذیر اور حکیم ہے۔

تفسیر

فتح مبین کا ایک اور نتیجہ

شیعہ اور اہلِ سنت مفسرین کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے، کہ جس وقت اس سُورہ کی ابتدائی آیات میں پیغمبرِ اسلام کو فتح مبین، اتمام نعمت، ہدایت اور نصرت کی بشارت دی گئی، تو بعض مسلمانوں نے جو حوادث "حدیبیہ" سے دل تنگ اور پریشان تھے، عرض کیا،

"هنیئاً لك یارسول الله! لقد بین الله لك ما ذا یفعل بك، فما ذا یفعل بنا؟

فنزلت: "لیدخل المؤمنین والمؤمنات ....."

"اے خدا کے رسول یہ تمام خدائی نعمتیں آپ کو مبارک، خدا نے جو کچھ آپ کو دیا

ہے یاد دے گا اُسے تو اس نے بیان کر دیا ہے، ہمیں وہ کیا دے گا؟ اس موقع پر پہلی زیر بحث آیت نازل ہوئی، اور مومنین کو بشارت دی کہ ان کے لیے بھی بڑا ثواب اور اجر عظیم ہے۔[1]

بہر حال یہ آیات اسی طرح صلح "حدیبیہ" سے مربوط لوگوں کے افکار میں مختلف عمل، اور اس کے وزنی نتائج کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، اور ہر گروہ کی سرنوشت کو اس عظیم آزمائش کی بھٹی میں مشخص کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے کہ "اس عظیم فتح کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو جنت میں داخل کرے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں" (لیدخل المؤمنین والمؤمنات جنات تجری من تحتها الانهار)۔

"وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، اور یہ عظیم نعمت ہرگز ان سے چھینی نہیں جائے گی" (خالدین فیها)۔

"اس کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ "ان کے بُرے اعمال پر پردہ ڈال دے"۔ اور انھیں معاف کر دے" (ویکفر عنهم سیاتهم)۔

"اور یہ خدا کے نزدیک ایک عظیم کامیابی ہے" (وکان ذالك عند الله فوزا عظیما)[2]

اس طرح سے خدا نے ان چار نعمتوں کے مقابلہ میں، جو فتح مبین میں اپنے پیغمبر کو دیں۔ دو عظیم نعمتیں مومنین پر بھی ارزانی فرمائیں، بہشت جاودانی اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ، اور عفو و درگزر ان کی لغزشوں سے، یہ اس روحانی اطمینان اور سکون کے علاوہ ہے جو انہیں اس دنیا میں عطا فرمایا ہے، اور ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ ایک فوز عظیم یعنی بہت بڑی کامیابی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس امتحان کی کٹھالی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔

لفظ "فوز" جس کا قرآن مجید میں عام طور پر "عظیم" کی صفت کے ساتھ ذکر ہوا ہے، اور بعض اوقات "مبین" اور "کبیر" کے ساتھ بھی آیا ہے، مفردات میں راغب کے قول کے مطابق کامیابی اور خیرات کا سلامتی کے ساتھ حصول ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہے کہ اس میں آخرت کی نجات بھی ہو، اگرچہ مادی دنیا کی نعمتوں کے کھو بیٹھنے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

ایک مشہور روایت کے مطابق جب امیر المومنین علی علیہ السلام کا فرق مبارک محراب عبادت میں

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۶ ص ۸۵ و تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۰ ص ۲۶ و تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ ص ۶۔

[2] اس بیان کے مطابق "لیدخل" اور اسی طرح "یعذب" کا جملہ جو بعد والی آیت میں آئے گا "لیغفر" کے جملہ پر عطف ہے۔ مفسرین کے ایک گروہ نے منجملہ شیخ طوسی نے "تبیان" میں اور "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں اور ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں اسی معنی کو انتخاب کیا ہے، جبکہ ایک دوسرے گروہ نے "لیزدادوا ایمانا" پر عطف سمجھا ہے، حالانکہ نہ وہ اور یہ والے شان نزول سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی کفار کی سزا اور مجازات کے ساتھ۔

خطا کار زمانہ " عبدالرحمٰن بن ملجم کی شمشیر سے شگافتہ ہوا تو آپ نے باآواز بلند فرمایا:

"فزت ورب الکعبۃ"

"کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوا"

(اور میرے سعادت نامہ پر میرے خون سے دستخط ہو گئے ہیں)

ہاں بعض اوقات پروردگار کے امتحانات ایسے سخت اور طاقت فرسا ہوتے ہیں جو کمزور ایمان والوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور ان کے دلوں کو الٹ دیتے ہیں۔ صرف پختے مومنین ہی جو سکینہ اور اطمینان کی نعمت سے بہرہ مند ہوتے ہیں مقابلہ میں ڈٹتے ہیں، اور وہ قیامت میں اس کے ثمرات و نتائج سے بھی بہرہ مند ہوں گے، اور واقعاً یہ ایک فوز عظیم ہے۔

لیکن اس گروہ کے مقابلہ میں بے ایمان منافقین و مشرکین کا ایک گروہ تھا جن کی سرنوشت کی بعد والی آیت میں اس طرح تصویر کشی ہوئی ہے، : "دوسرا مقصد یہ ہے کہ خدا منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے" (و یعذب المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات)۔

" وہی کہ جو خدا کے متعلق بُرا گمان کرتے تھے": (الظانین باللہ ظن السوء)۔

ہاں! پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی مدینہ سے روانگی کے وقت یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ گروہ ہرگز صحیح وسالم مدینہ پلٹ کر نہیں آئے گا، جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۱۲ میں بیان ہوا ہے۔

"بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمؤمنون الی اھلیھم ابدًا"۔

اور مشرکین بھی یہی گمان رکھتے تھے کہ محمد اس تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ، اور کافی اسلحہ نہ رکھنے کی وجہ سے صحیح وسالم مدینہ کی طرف نہیں لوٹیں گے، اور اسلام کا ستارہ بہت جلد غروب ہو جائے گا۔

اس کے بعد اس عذاب اور سزا کی وضاحت کرتے ہوئے چار عنوانوں کے تحت اس کی تشریح کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "حوادث اور بُرے اثرات و نتائج صرف اسی گروہ پر نازل ہوں گے": (علیھم دائرۃ السوء)۔[1]

"دائرۃ" لغت میں حوادث اور ان روئیدادوں کے معنی میں ہے جو انسان کو پیش آتی ہیں، چاہے وہ اچھی ہوں یا بُری، لیکن یہاں لفظ "سوء" کے ذکر کرنے کی وجہ سے نامطلوب حوادث ہی مراد ہیں۔

"دوسرے یہ کہ خدا نے ان پر غضب کیا ہے": (وغضب اللہ علیھم)۔

"اور انھیں خدا نے اپنی رحمت سے بھی دور کر دیا ہے": (ولعنھم)۔

---

[1] "سوء" بروزن "نوع" "صحاح اللغۃ" کے قول کے مطابق مصدری معنی رکھتا ہے، اور "سوء" بروزن "کور" اسم مصدر کے معنی میں ہے۔ لیکن بقول کشاف دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

اور آخر میں" ان کے لیے ابھی سے جہنم فراہم کر رکھی ہے۔ اور وہ کیا ہی بُرا انجام ہے۔" (واعدلھم جھنم وساءت مصیرًا)۔ [1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ میدان" حدیبیہ" میں زیادہ تر مسلمان مرد تھے، اور ان کے مقابل میں بھی منافق و مشرک مرد تھے، لیکن اوپر والی آیات میں قرآن نے اس فوزِ عظیم اور اس عذاب الیم میں عورتوں اور مردوں کو مشترک شمار کیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ با ایمان مرد جو میدان جنگ میں حاضر ہوتے ہیں، صاحب ایمان عورتوں کی پشتیبانی کے بغیر اور اسی طرح منافق مرد منافق عورتوں کی ہمکاری کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اصولی طور پر اسلام مردوں ہی کا دین نہیں ہے، کہ عورتوں کی شخصیت کو نظر انداز کر دے، لہٰذا ہر اس مقام پر جہاں عورتوں کے نام کا نہ ہونا کلام میں انحصاری مفہوم پیدا کرتا ہو وہاں عورتوں کا ذکر صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں ایک مرتبہ پھر خدا کی قدرت کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:" آسمانوں و زمین کے لشکر اور فوجیں خدا ہی کے لیے ہیں۔ اور خدا عزیز و حکیم ہے۔" (ولله جنود السموات والارض وكان الله عزيزًا حكيمًا)۔

یہ بات ایک مرتبہ اہلِ ایمان کے مقامات اور نعمتوں کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے، اور ایک مرتبہ یہاں منافقین اور مشرکین کے عذاب اور سزاؤں کے ذیل میں آئی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ خدا جس کے زیرِ فرمان آسمانوں اور زمین کے سارے لشکر ہیں وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے اور اس پر بھی اسے توانائی حاصل ہے۔ جس وقت اس کا دریائے رحمت موجزن ہوتا ہے تو جن میں لیاقت و شائستگی ہوتی ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کے شامل حال ہوتا ہے، اور جس وقت اس کے قہر و غضب کی آگ شعلہ زن ہو تو پھر کسی مجرم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ دفاع کر سکے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مومنین کے ذکر کے وقت خدا کی "علم و حکمت" کے ساتھ توصیف ہوئی ہے، جو مقامِ رحمت کے ساتھ مناسب ہے، لیکن منافق و مشرک لوگوں کے لیے خدا کی "قدرت و حکمت" کے ساتھ توصیف ہوئی ہے، جو مقامِ عذاب کے ساتھ مناسب ہے۔

"آسمانوں اور زمین کے لشکروں" سے کیا مراد ہے؟

یہ لفظ ایک وسیع معنی رکھتا ہے، جو خدا کے فرشتوں کے لشکروں کو بھی شامل ہے، اور "صاعقہ" "زلزلوں" "طوفانوں"، "سیلابوں"، "امواج" اور دوسری غیر مرئی طاقتوں کے لشکروں کو بھی، جن سے ہم آگاہی نہیں رکھتے، کیونکہ یہ سب اللہ کے لشکر ہیں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

---

[1] "مصیرًا" مختلف حالات کے معنی میں ہے، جس تک انسان یکے بعد دیگرے پہنچتا ہے۔

ایک نکتہ

خدا کے بارے میں سوءظن کون لوگ رکھتے ہیں؟

"سوءظن" کی کبھی تو اپنی طرف نسبت ہوتی ہے، اور کبھی دوسروں کی طرف اور کبھی خدا کی طرف" جیسا کہ "حسن ظن" بھی تین ہی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

اپنے متعلق جو سوءظن ہوتا ہے اگر وہ افراط کی حد تک نہ پہنچے تو وہ تکامل دار تقاء کی سیڑھی ہے اور وہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کی نسبت سخت گیر اور بال کی کھال نکالنے والا بن جائے، اور نیک اعمال سے پیدا ہونے والے عجب و غرور کو روک دے۔

اسی بناء پر علی علیہ السلام مشہور خطبہ "ہمام" میں پرہیزگاروں کی تعریف و توصیف میں فرماتے ہیں۔

"فهم لانفسهم متهمون، ومن اعمالهم مشفقون، اذا زكى احد منهم خاف مما يقال له، فيقول: انا اعلم بنفسي من غيري، وربي اعلم بي مني بنفسي، اللهم لا تؤاخذني بما يقولون، واجعلني افضل مما يظنون، واغفر لي ما لا يعلمون"

"وہ اپنے آپ کو متہم کرتے ہیں، اور اپنے اعمال سے ڈرتے ہیں، جس وقت ان میں سے کسی ایک کا تزکیہ و تعریف کی جائے، تو جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے، اس سے ڈرتا ہے اور کہتا ہے: میں اپنے بارے میں دوسروں کی نسبت زیادہ آگاہ ہوں اور میرا پروردگار میرے اعمال کو مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے، خداوندا! جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر میرا مؤاخذہ نہ کرنا اور مجھے اس چیز سے، جو وہ میرے بارے میں خیال کرتے ہیں، برتر قرار دے، اور میری جن باتوں کا انھیں علم نہیں ہے وہ مجھے بخش دے۔"

لیکن اگر یہ "سوءظن" لوگوں کے بارے میں ہو تو ممنوع ہے، مگر ایسے مواقع پر جبکہ فساد اور خرابی معاشرے پر غلبہ کرے، تو پھر خوش فہمی ٹھیک نہیں ہے، (انشاء اللہ اس کی تشریح و تفصیل سورۂ حجرات کی آیت ۱۲ کے ذیل میں آئے گی)

باقی رہا خدا کے بارے میں "سوءظن" یعنی اس کے وعدہ کے بارے میں، اس کی بے پایاں رحمت و کرم کے بارے میں، تو وہ بہت ہی برا اور تباہ کر دینے والا ہے، اور ایمان کی کمزوری کی نشانی، بلکہ بعض اوقات تو ایمان کے نہ ہونے کی علامت ہے۔

قرآن بے ایمان افراد یا ضعیف الایمان لوگوں کے سوءِ ظن کو خصوصاً اجتماعی سخت قسم کے حوادث اور آزمائش کے طوفانوں کے ظہور کے موقع پر۔ بار بار ذکر کرتا ہے، کہ مومنین ایسے مواقع پر کس طرح پورے حسن ظن کے ساتھ، اور پروردگار کے لطف پر اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم رہتے ہیں، لیکن ضعیف اور ناتواں افراد شکایت کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ فتح "حدیبیہ" کی داستان میں منافقین اور ان کے ہم خیال لوگوں نے بھی سوءِ ظن کیا اور کہا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے یار و انصار اس سفر میں جا تو رہے ہیں لیکن وہ اس سے واپس نہیں لوٹیں گے۔ گویا انہوں نے خدا کے وعدوں کو فراموش کر دیا، یا اُس کے بارے میں بدگمان تھے۔

اس کا ایک واضح نمونہ خصوصیت کے ساتھ جنگ احزاب میں۔ جبکہ مسلمان سخت دباؤ کی حالت میں تھے۔ ظاہر ہوا، خدا نے ایک گروہ کے بُرے گمانوں کی سخت مذمت کی،

"اذ جاءوکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالاً شدیدًا،

"وہ وقت یاد کرو جب (لشکرِ احزاب) اُوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی شہر میں داخل ہو گیا (اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا) اور اس وقت کو (یاد کرو) جب شدتِ وحشت سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اور جانیں لبوں تک آ گئی تھیں، اور تم خدا کے بارے میں بُرے بُرے گمان کر رہے تھے، اس موقع پر مومنین کی آزمائش ہو گئی اور وہ ہل کر رہ گئے"۔

(احزاب، آیت ۱۰-۱۱)

یہاں تک کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں ایسے گمانوں کو "ظن الجاھلیۃ" (زمانہ جاہلیت کے گمان) کہا ہے۔

بہر حال خدا سے اور اس کے رحمت و کرم اور لطف و عنایت کے وعدہ کے متعلق حسن ظن ایمان کی اہم نشانی، اور نجات و سعادت کے مؤثر وسائل میں سے ہے۔

یہاں تک کہ رسولؐ خدا سے ایک حدیث میں آیا ہے۔

"لیس من عبد یظن باللہ خیرًا الا کان عند ظنہ بہ"؛

"کوئی بندہ خدا کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتا مگر یہ کہ خدا اس کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہے"۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں امام علی ابن موسی الرضاؑ سے آیا ہے۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۰، صفحہ ۳۹۴۔

"احسن باللہ الظن، فان اللہ عزوجل یقول انا عند ظن عبدی المؤمن بی، ان خیر فخیر، و ان شر فشر:"

"خدا کے ساتھ اپنے ظن و گمان کو اچھا رکھو کیونکہ خداوند عزوجل فرماتا ہے، میں اپنے بندۂ مومن کے ظن و گمان کے پاس ہوتا ہوں، اگر وہ میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو تو میں اس سے اچھا سلوک کرتا ہوں اور اگر وہ بُرا گمان رکھتا ہو، تو بُرا سلوک ہوگا۔[1]

"آخر میں ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے۔"

"ان حسن الظن باللہ عزّ وجلّ ثمن الجنۃ:

"خدا کے ساتھ حسن ظن رکھنا جنت کی قیمت ہے۔"[2]

اس سے زیادہ سہل اور آسان قیمت اور کیا ہوگی؟ اور اس سے زیادہ قیمتی مال و متاع اور کونسا ہوگا؟"

---

[1]، [2] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۳۸۵۔

۸۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ
۹۔ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝
۱۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۸۔ ہم نے تجھے ایک گواہ، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کے عنوان سے بھیجا ہے۔
۹۔ تاکہ تم لوگ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور اس کا دفاع کرو اور اس کا احترام کرو، اور صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔
۱۰۔ جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں خدا ہی کی بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے، پس جو شخص بھی پیمان شکنی کرے گا، وہ اپنے ہی نقصان میں پیمان شکنی کرے گا اور جو شخص اس عہد کے لیے جو اس نے خدا سے باندھا ہے، وفا کرے گا تو وہ اسے بہت جلد ایک عظیم اجر عطا کرے گا۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی حیثیت کا استحکام اور لوگوں کی اس کے بارے میں ذمہ داریاں

ہم بیان کر چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ پر بعض نادانوں نے سخت تنقید کی، یہاں تک کہ پیغمبر کے بارے میں ان کے سامنے ایسی باتیں کی گئیں، جن سے آپ کی بے حرمتی ہوتی تھی، ان باتوں کا مجموعی طور پر تقاضا یہی تھا کہ پیغمبرؐ کی عظمت و مقام اور مرتبہ و حیثیت کے بارے میں دوبارہ تاکید کی جائے۔

لہٰذا اسی زیر بحث آیت میں پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے تجھے ایک گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔ (اِنّا ارسلناک شاھدًا ومبشرًا ونذیرًا)۔

یہ تین عظیم اوصاف اور تین عمدہ مقامات پیغمبر کے اہم ترین مراتب اور مقامات میں سے ہیں، "گواہ ہونا" "بشیر ہونا" اور "نذیر ہونا" گواہ تمام اُمت مسلمہ پر، بلکہ ایک معنی کے لحاظ سے تمام امتوں پر گواہ، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۴۱ میں آیا ہے، فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شھیدًا: "اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ان کے اعمال پر گواہ لائیں گے، اور تجھے ان سب گواہوں پر گواہ بنائیں گے"۔

اور سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۵ میں فرماتا ہے: وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون: "کہہ دے کہ تم عمل کرو، خدا اور اس کا رسول اور مومنین (ائمہ معصوم) تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں"۔

اصولی طور پر ہر انسان بہت سے گواہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے تو خداوند عالم ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ ہمارے تمام اعمال اور ہماری نیتوں تک کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے بعد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے اعمال کو لکھنے پر مامور ہیں، جیسا کہ سورۂ ق کی آیت ۲۱ میں اشارہ ہوا ہے: وجاءت کل نفس معھا سائق وشھید:

اس کے بعد انسانی جسم کے اعضاء و جوارح ہیں، یہاں تک کہ اس کے بدن کی جلد بھی گواہی دے گی:

"یوم تشهد علیهم السنتهم وایدیهم وارجلهم بما کانوا یعملون"

"اس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔"

(نور۔ ۲۴)

"وقالوا لجلودهم لم شهدتم علینا قالوا انطقنا الله الذی انطق کل شیء"

"وہ اپنے بدن کی جلد سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی، تو وہ کہیں گے، وہ خدا جس نے ہر موجود کو قوت گویائی عطا کی ہے، اُسی نے ہمیں بھی گویائی دی ہے، تاکہ ہم گواہی دیں۔" (حٰم سجدہ۔ ۲۱)

"زمین" بھی گواہوں میں سے ایک گواہ ہے جیسا کہ سورۂ زلزال میں آیا ہے:

"یومئذ تحدث اخبارها"

بعض روایات کے مطابق "زمانہ" بھی اس دن گواہوں کی صف میں ہوگا۔ ایک روایت میں علی علیہ السلام سے منقول ہے۔

"ما من یوم یمر علی بنی آدم إلا قال له ذلك الیوم انا یوم جدید وانا علیك شهید، فافعل فی خیرا، واعمل فی خیرا، اشهد لك به یوم القیامة، فانك لن تراني بعد هذا ابدا"[1]

"کوئی دن آدم کے بیٹے پر نہیں گزرتا مگر یہ کہ وہ اس سے کہتا ہے: میں نیا دن ہوں، میں تیرے بارے میں گواہی دوں گا، تو مجھ میں نیک کام کر اور عمل خیر بجالا، تاکہ میں قیامت کے دن تیرے فائدے میں گواہی دوں، کیونکہ تو اس کے بعد مجھے کبھی بھی نہیں دیکھے گا۔"[2]

بلاشک خدا کی تنہا گواہی ہی کافی ہے، لیکن گواہوں کا متعدد ہونا مزید اتمام حجت کا باعث بھی ہے اور انسانوں میں زیادہ قوی تربیتی اثر بھی رکھتا ہے۔

بہرحال قرآن مجید نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امور کو۔ جو کہ مسئلہ شہادت و بشارت و نذارت ہیں۔ تین عمدہ اوصاف کے عنوانوں کے ساتھ بیان کیا ہے، تاکہ یہ ان وظائف اور ذمہ داریوں کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہو، جو بعد والی آیت میں بیان ہوئی ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کے گذشتہ بیان کردہ اوصاف کے ایک مقصد اور نتیجہ کے عنوان سے پانچ

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۱۲

[2] "قیامت کی عدالت کے گواہوں" کے بارے میں ایک بحث ہم نے سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۲۰۔ ۲۱ کے ذیل میں بھی کی ہے۔

اہم احکام بیان ہوئے ہیں، جن سے دو حکم تو خدا کی اطاعت اور اس کی تسبیح و تنزیہ میں ہیں، اور تین احکام مقام پیغمبر کی تعظیم، اور ان کی اطاعت و دفاع کے بارے میں ہیں، فرماتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کا دفاع کرو، اور اس کی عزت و احترام و تکریم کرو اور صبح و شام خدا کی تسبیح و تقدیس کرو" (لتؤمنوا باللہ ورسولہ وتعزّروہ وتوقّروہ وتسبّحوہ بکرۃ واصیلاً)۔

"تعزّروہ" "تعزیر" کے مادہ سے دراصل "منع" کے معنی میں ہے، اس کے بعد دشمن کے مقابلہ میں ہر قسم کے دفاع اور نصرت و مدد کرنے کرنے پر اطلاق ہونے لگا، بعض سزاؤں کو بھی، جو گناہ سے روکتی ہیں، تعزیر کہا جاتا ہے۔

"توقّروہ" "توقیر" کے مادہ سے جس کی اصل "وقر" ہے سنگینی کے معنی میں ہے، اس بناء پر یہاں "توقیر" تعظیم و تکریم کے معنی میں ہے۔

اس تفسیر کے مطابق وہ ضمیریں جو "تعزّروہ" اور "توقّروہ" میں آئی ہیں وہ پیغمبرؐ کی ذات کی طرف لوٹتی ہیں۔ اور اس کا مقصد دشمن کے مقابلہ میں آپؐ کی حمایت اور دفاع کرنا اور آپؐ کی تعظیم و تکریم کرنا ہے، (اس تفسیر کو "شیخ طوسی" نے "تبیان" میں اور "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں اور بعض دوسرے علماء نے اختیار کیا ہے۔

لیکن مفسرین کی ایک جماعت[1] کا نظریہ یہ ہے، کہ آیت کی تمام ضمیریں خدا کی طرف لوٹتی ہیں، اور تعزیر و توقیر سے مراد یہاں خدا کے دین کی نصرت و مدد کرنا ہے اور اس کی اور اس کے دین کی تعظیم و تکریم کرنا ہے، اس تفسیر کے اختیار کرنے میں ان کی دلیل آیت میں موجود تمام ضمیروں کا ہم آہنگ ہونا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اوّلاً: "تعزیر" کا اصلی معنی دشمن کے مقابلہ میں دفاع کرنا اور اُسے روکنا ہے، جو خدا کے بارے میں مجازی صورت کے علاوہ صحیح نہیں ہے، اور اس سے زیادہ اہم آیت کا شان نزول ہے، جو حدیبیہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہے، جبکہ بعض لوگوں نے پیغمبر کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کے سلسلے میں بے حرمتی کی تھی، اور آیت پیغمبر کے سامنے مسلمانوں کو ان کے وظائف اور ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔

علاوہ ازیں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے ایک نتیجہ کے عنوان سے ہے، جو پیغمبر کی "شاھد" و "بشیر" و "نذیر" کے عنوان سے تعریف و توصیف کرتی ہے، اور یہ امر ان احکام کے لیے جو بعد والی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ زمین ہموار کرتی ہے گویا تمہید کے طور پر ہے۔

---

[1] "زمخشری" نے "کشاف" میں "آلوسی" نے "روح المعانی" میں "فیض کاشانی" نے "صافی" میں اور "علامہ طباطبائی" نے "المیزان" میں اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں "بیعت رضوان" کے مسئلہ کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے، جو اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۸ میں زیادہ تفصیل کے طور پر آیا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مشہور تاریخوں کے مطابق آپؐ اس خواب کے بعد جو آپؐ نے دیکھا تھا ۱۴۰۰ افراد کے ساتھ عمرہ انجام دینے کے ارادہ سے مدینہ سے نکلے، لیکن مکہ کے قریب مشرکین نے آپؐ کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کا مصمم ارادہ کر لیا، پیغمبرؐ اور آپ کے اصحاب سرزمین "حدیبیہ" میں ٹھہر گئے اور آپؐ کے اور قریش کے درمیان سفیروں کا آنا جانا ہوا یہاں تک کہ صلح حدیبیہ کی قرارداد انجام پائی۔

ان امور میں ایک مرتبہ عثمان مامور ہوئے کہ وہ اہل مکہ تک یہ پیغام پہنچائیں کہ آپ جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے اور آپ کا ارادہ صرف خانۂ خدا کی زیارت ہے، لیکن مشرکین نے وقتی طور پر عثمان کو روک لیا، اور اسی سبب سے مسلمانوں کے درمیان قتل عثمان کی خبر پھیل گئی، اور اگر اس طرح کی بات صحیح ہوتی تو یہ قریش کی طرف سے اعلان جنگ کی دلیل ہوتی، لہٰذا پیغمبرؐ نے فرمایا کہ جب تک ہم اس قوم سے نمٹ نہ لیں ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، اور اس اہم امر پر تاکید کے لیے لوگوں کو دعوت دی کہ آپ سے تجدید بیعت کریں، مسلمان وہاں پر موجود ایک درخت کے نیچے جمع ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، کہ ہرگز میدان سے نہیں بھاگیں گے، اور جس حد تک ان میں تاب و تواں ہے، دشمن کے قلع قمع کرنے میں کوششیں کریں گے۔

اس بات کی خبر مشرکین مکہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے ان کے دلوں میں ایک رعب اور وحشت پیدا کر دی اور اسی سبب سے وہ اس ناپسندیدہ صلح کے لیے تیار ہو گئے۔

اس بیعت کو اس بناء پر "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔

کیونکہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے:

"لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ"۔

"خدا مومنین سے۔ جب وہ اس درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے۔ راضی ہو گیا۔

بہر حال قرآن مجید زیر بحث آیت میں کہتا ہے:

"جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں حقیقت میں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں، اور خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے"۔

(ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم)۔

"بیعت" کسی شخص کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لیے عہد و پیمان باندھنے کے معنی میں ہے، اور یہ رسم چلی آ رہی تھی کہ جو شخص اطاعت کا عہد و پیمان باندھتا تھا تو وہ اپنا ہاتھ پیشوا اور رہبر کے ہاتھ میں دے دیتا تھا، اور وفاداری کے عہد و پیمان کا اس طریقہ سے اظہار کیا کرتا تھا۔

اور چونکہ "معاملہ اور بیع" کے وقت بھی ہاتھ میں ہاتھ دیتے تھے، اور معاملہ کی قرارداد باندھتے تھے، اس لیے

"بیعت" کا لفظ ان عہد و پیمان پر اطلاق ہونے لگا، خصوصاً یہ کہ وہ اپنے عہد و پیمان میں گویا اپنی جان کا اس شخص کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں۔

اور یہیں سے "ید اللہ فوق ایدھم" (خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اُوپر ہے) کا معنی واضح ہو جاتا ہے، تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی بیعت ایک بیعت الٰہی ہے، گویا خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر قرار پایا، نہ صرف پیغمبر سے بلکہ انھوں نے یہ خدا سے بیعت کی ہے اور اس قسم کے کنایے عربی زبان میں معمولات میں سے ہیں۔

اس بنا پر جن لوگوں نے اس جملہ کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ "خدا کی قدرت ان کی قدرت سے مافوق ہے" یا "خدا کی نصرت و مدد لوگوں کی نصرت و مدد سے برتر ہے" اور اسی قسم کی دوسری تفسیریں آیت کے شانِ نزول اور اس کے مفاد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، اگرچہ یہ مطلب بذاتِ خود ایک صحیح مطلب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "جو شخص نقضِ عہد اور پیمان شکنی کرے گا، درحقیقت وہ اپنے ہی نقصان میں پیمان شکنی کرے گا اور اپنے عہد و پیمان کو توڑے گا" (فمن نکث فانما ینکث علیٰ نفسہ)۔

اور جو شخص اس عہد و پیمان کے مقابلہ میں جو اس نے خدا کے ساتھ باندھا ہے، وفادار رہے گا اور بیعت کا حق ادا کرے گا تو خدا اُسے اجرِ عظیم دے گا (ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجرًا عظیمًا)۔[1]

"نکث" "نکث" (بروزن مکث) کے مادہ سے کھولنے اور اُلٹا بٹا دینے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد پیمان شکنی، اور نقضِ عہد کے لیے استعمال ہونے لگا۔[2]

اس آیت میں قرآن مجید تمام بیعت کرنے والوں کو خبردار کر رہا ہے، کہ اگر وہ اپنے عہد و پیمان پر برقرار رہیں تو ان کے لیے اجرِ عظیم ہوگا، لیکن اگر وہ اس کو توڑ دیں، تو اس کا نقصان خود انھیں کو ہوگا وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ خدا کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں، بلکہ معاشرے کی بقاء اور اپنی عظمت و قدرت و قوت یہاں تک کہ پیمان شکنی کی وجہ سے اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ اوپر والی آیت میں "علیہ" خلافِ معمول "ھا" کی پیش کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی توجیہ میں اس طرح بیان کیا ہے، کہ یہ وہی "ھ" ضمیر "ھا" ہے، جو اصل میں مضموم ہے اور "واو" کے حذف ہونے کے بعد کبھی مضموم آتی ہے۔ جیسے "لہ" اور "عنہ" اور کبھی اس بنا پر کہ اس کے پہلے "یا" ہے مکسور آتی ہے مثلاً "علیہ" لیکن چونکہ زیرِ بحث آیت میں اس کے بعد لفظ "اللہ" آیا ہے اس لیے مضموم پڑھی گئی ہے تاکہ "اللہ" میں جو لام ہے، اس کی تفخیم کے ساتھ زیادہ سازگار ہو۔

[2] "نکث" نون کی زبر کے ساتھ مصدری معنی رکھتا ہے اور "نکث" نون کی کسرہ کے ساتھ اسم مصدر کے معنی رکھتا ہے۔

"ان فی النار لمدینة یقال لها الحصینة، افلا تسئلونی مافیها؟ فقیل له: مافیها یا امیر المؤمنین؟ قال فیها ایدی الناکثین!"[1]

"جہنم میں "حصینہ" نامی ایک شہر ہے، کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ اس شہر میں کیا ہے؟ کسی نے عرض کیا: اے امیر المومنین اس شہر میں کیا ہے؟ فرمایا: پیمان شکنی کرنے والوں اور عہد توڑنے والوں کے ہاتھ ہیں۔"

اسی سے واضح ہے کہ عہد شکنی و نقض بیعت اسلام میں کس قدر قبیح ہے۔[1]

اسلام میں بیعت کا موضوع یہاں تک کہ قبل از اسلام اس کا وجود اس کی کیفیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام ایک طویل بحث چاہتے ہیں جو انشاء اللہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں آئے گی۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷، ص ۱۵۵۔

۱۱۔ سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○

۱۲۔ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۠ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ○

۱۳۔ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ○

۱۴۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

ترجمہ

۱۱۔ عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے (عذر تراشی کرتے ہوئے) کہیں گے کہ ہمارے اموال اور گھر والوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مشغول رکھا، (اور ہم سفر حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ نہ جا سکے) پس

آپ ہمارے لیے طلب مغفرت کیجئے، یہ اپنی زبان سے وہ بات کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے، کہہ دے: کون ایسا ہے جو خدا سے تمھیں بچا سکے اگر وہ تمھارے لیے نقصان کا ارادہ کرے، یا کون ہے جو اس نفع کو روک سکے جسے پہنچانے کا وہ ارادہ کرے، اور خدا ان تمام اعمال سے جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۱۲۔ بلکہ تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ غلط خیال تمھارے دلوں میں زینت پا گیا تھا اور تم نے بدگمانی سے کام لیا اور آخر کار تم ہلاک ہوئے۔

۱۳۔ اور وہ شخص جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا (اس کی سرنوشت دوزخ ہے) کیونکہ ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

۱۴۔ آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خدا ہی کے لیے ہے جسے وہ چاہتا ہے (اور شائستہ دیکھتا ہے) بخش دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عذاب کرتا ہے، اور خدا غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی

گذشتہ آیات کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبرؐ ایک ہزار چار سو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے عمرہ کے

ارادہ سے مکّہ کی طرف روانہ ہُوئے۔

پیغمبرؐ کی طرف سے بادیہ نشین قبائل میں اعلان ہوا کہ وہ بھی سب کے سب اس سفر میں آپؐ کے ساتھ چلیں لیکن ضعیف الایمان لوگوں کے ایک گروہ نے اس حکم سے روگردانی کی، اور ان کا تجزیہ یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان اس سفر سے صحیح وسالم بچ کر نکل آئیں، حالانکہ کفارِ قریش پہلے ہی ہیجان واشتعال میں تھے، اور انھوں نے اُحد واحزاب کی جنگیں مدینہ کے قریب مسلمانوں پر تھوپ دی تھیں، اب جبکہ یہ چھوٹا سا گروہ بغیر ہتھیاروں کے اپنے پاؤں سے چل کر مکّہ کی طرف جارہا ہے، گویا بھیڑوں کے چھتہ کے پاس خود پہنچ رہا ہے، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ آئیں گے؟!

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اور قابلِ ملاحظہ امتیازات کے ہمراہ جو انھوں نے صلح حدیبیہ کے عہد وپیمان سے حاصل کیے تھے، صحیح وسالم مدینہ کی طرف پلٹ آئے ہیں۔ اور کسی کے نخیر تک بھی نہیں پھوٹی، تو انھوں نے اپنی عظیم غلطی کا احساس کیا اور پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہُوئے تاکہ کسی طرح کی عذر خواہی کر کے اپنے فعل کی توجیہ کریں، اور پیغمبر سے استغفار کا تقاضا کریں۔

لیکن اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان کے اعمال سے پردہ اٹھا دیا اور انھیں رسوا کیا۔

اس طرح سے پہلی آیات میں منافقین اور مشرکین کی سرنوشت کا ذکر کرنے کے بعد، یہاں پیچھے رہ جانے والے ضعیف الایمان لوگوں کی کیفیت کا بیان ہو رہا ہے، تاکہ اس بحث کی کڑیاں مکمل ہو جائیں۔

فرماتا ہے: عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے عذر تراشی کرتے ہُوئے کہیں گے: ہمارے مال ومتاع اور بال بچوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مائل رکھا، اور ہم اس پُر برکت سفر میں آپ کی خدمت میں نہ رہ سکے اب ہمارے عذر کو قبول کرتے ہُوئے ہمارے لیے طلبِ بخشش کیجیے" (سیقول لک المخلفون من الاعراب شغلتنا اموالنا واھلونا فاستغفرلنا)۔

"وہ اپنی زبان سے ایسی چیز کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے" (یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم)

وہ تو اپنی توبہ تک میں بھی مخلص نہیں ہیں۔

لیکن ان سے کہہ دے: خدا کے مقابلہ میں۔ اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ وہ تمھارا دفاع کر سکے، اور اگر وہ تمھیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو کس میں طاقت ہے، کہ اُسے روک سکے: (قل فمن یملک لکم من اللہ شیئاً ان اراد بکم ضرّاً او اراد بکم نفعاً)

خدا کے لیے یہ بات کسی طرح بھی مشکل نہیں ہے، کہ تمھیں تمھارے امن وامان کے گھروں میں، بیوی بچوں اور مال ومتال کے پاس، انواع واقسام کی بلاؤں اور مصائب میں گرفتار کر دے۔ اور اس کے لیے یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دشمنوں کے مرکز میں اور مخالفین کے گڑھ میں تمھیں ہر قسم کے گزند سے محفوظ رکھے، یہ تمھاری قدرت خدا کے بارے میں

جہالت اور بے خبری ہے جو تمہاری نظر میں اس قسم کے افکار کو جگہ دیتی ہے۔

ہاں! "خدا ان تمام اعمال سے جنہیں تم انجام دیتے ہو باخبر اور آگاہ ہے" (بل کان اللہ بما تعملون خبیرًا)۔

بلکہ وہ تو تمہارے سینوں کے اندر کے اسرار اور تمہاری نیتوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ عذر اور بہانے واقعیت اور حقیقت نہیں رکھتے اور جو اصل حقیقت اور واقعیت ہے، وہ تمہارا شک و تردد، خوف و خطر اور ضعف ایمان ہے، اور یہ عذر تراشیاں خدا سے مخفی نہیں رہتیں، اور یہ ہرگز تمہاری سزا کو نہیں روکیں گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیات کے لب و لہجہ سے بھی اور تواریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات پیغمبرؐ کی مدینہ کی طرف بازگشت کے دوران نازل ہوئیں، یعنی اس سے پہلے کہ پیچھے رہ جانے والے آئیں اور عذر تراشی کریں، ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا گیا اور انہیں رسوا کر دیا۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے مکمل طور پر پردے ہٹا کر مزید کہتا ہے: "بلکہ تم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے": (بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمؤمنون الی اھلیھم ابدًا)

ہاں! اس تاریخی سفر میں تمہارے شریک نہ ہونے کا سبب، اموال اور بیوی بچوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کا اصلی عامل وہ سوء ظن تھا جو تم خدا کے بارے میں رکھتے تھے، اور اپنے غلط اندازوں کی وجہ سے یہ سوچتے تھے کہ یہ سفر پیغمبر اور مومنین کے ختم ہونے کا سفر ہے اور اس سے کنارہ کشی کرنی چاہیئے۔

ہاں! "یہ غلط خیال اور شیطانی وسوسے تمہارے دلوں میں زینت پا چکے تھے" (وزین ذالک فی قلوبکم)۔

"اور یہ تم نے برا گمان کیا" (وظننتم ظن السوء)۔

کیونکہ تم یہ سوچ رہے تھے کہ خدا نے پیغمبر کو اس سفر میں بھیج کر انہیں دشمن کے چنگل میں دے دیا ہے، اور ان کی حمایت نہیں کرے گا۔!

"اور انجام کار تم ہلاک ہو گئے"!! (وکنتم قومًا بورًا)۔

اس سے بدتر ہلاکت اور کیا ہو گی کہ تم اس تاریخی سفر میں شرکت، بیعت رضوان، اور دوسرے افتخارات و اعزازات سے محروم رہ گئے، اور اس کے پیچھے عظیم رسوائی تھی اور آئندہ کے لیے آخرت کا دردناک عذاب ہے، ہاں تمہارے دل مردہ تھے اس لیے تم اس قسم کی صورت احوال میں گرفتار ہوئے۔

چونکہ یہ ضعیف الایمان یا منافق ایسے ڈرپوک، آرام طلب اور طبعًا جنگ اور ہر قسم کے مقابلہ سے بھاگنے والے آدمی

ہیں لہٰذا وہ حوادث کے بارے میں جو بھی تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی واقعیت کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ ان کی نظروں میں بہت ہی کشش رکھتی ہے۔

اور اس طرح سے خوف اور عافیت طلبی، اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے فرار، برے گمانوں کو ان کی نظر میں حقیقت و واقعیت کے طور پر جگہ دیتے ہیں، وہ تمام چیزوں کے بارے میں بدبین ہیں یہاں تک کہ پیغمبر خدا اور خدا کے بارے میں بھی۔

نہج البلاغہ میں "مالک اشتر" کے نام حکم میں یہ آیا ہے،

"ان البخل والجبن والحرص غرائز شتی یجمعها سوء الظن بالله:

"بخل" بزدلی، اور حرص ایسی مختلف قسم کی مذموم صفات ہیں جو سب کی سب خدا کے بارے میں سوءظن میں جمع ہیں[1]

روداد حدیبیہ اور زیر بحث آیات اسی معنی کا ظہور عینی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ پروردگار کے بارے میں سوءظن، کس طرح سے بخل وحرص اور خوف جیسے برے صفات کو حاصل کر لیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

چونکہ اس قسم کی غلط صفات کا سرچشمہ بعض اوقات عدم ایمان ہوتا ہے لہٰذا بعد والی آیت میں کہتا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا اس کی تقدیر جہنم کی آگ ہے، کیونکہ ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے" (ومن لم یؤمن بالله ورسوله فانا اعتدنا للکافرین سعیرا)۔[2]

٭ ٭ ٭

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں کفار اور منافقین پر خدا کے عذاب دینے کی قدرت کے اثبات کے لیے فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خدا کے لیے ہے، جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے عذاب کرتا ہے اور خدا غفور ورحیم ہے" (ولله ملک السماوات والارض یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء وکان الله غفورا رحیما)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مغفرت اور بخشش کے مسئلہ کو عذاب کے مسئلہ پر مقدم رکھا ہے، اور آیت کے آخر میں پھر دوبارہ غفران اور رحمت الٰہی پر تاکید کی گئی ہے، کیونکہ ان تمام دھمکیوں اور ڈراوں کا مقصد تربیت ہے اور مسئلہ تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ گناہگاروں اور کافروں تک کے لیے بھی بازگشت کی راہ کھلی رہے، خاص طور پر جبکہ ان منفی اعتراضات اور تنقیدوں میں سے زیادہ کا سرچشمہ جہالت اور بے خبری ہے اور اس قسم کے افراد کے سامنے بخشش کی امید میں اضافہ کرنا

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۳۔

[2] آیت کے الفاظ کی روانی کا تقاضا یہ ہے کہ "انا اعتدنا لهم سعیرا" کہا جائے لیکن خاص طور پر ضمیر کو بدل کر اس کی بجائے اسم ظاہر یعنی "الکافرین" کہا گیا ہے تاکہ اس خرابی کو بیان کیا جائے جو مسئلہ کفر ہے۔

چاہیئے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔

ایک نکتہ

گناہ کی توجیہ کرنا ایک عام بیماری ہے

گناہ چاہے جتنا بھی سنگین ہو وہ توجیہ گناہ جتنی سنگینی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ گنہگار جو گناہ کا معترف ہو وہ، سزا و توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے، لیکن مصیبت اس وقت شروع ہوتی ہے جب گنہگار اس کی توجیہ کرنے لگ جاتا ہے جو نہ صرف انسان کے سامنے توبہ کے راستے کو بند کر دیتا ہے بلکہ اُسے ہر گناہ کرنے میں اور بھی زیادہ راسخ اور زیادہ جری بنا دیتا ہے۔

یہ توجیہیں بعض اوقات عزت و آبرو کی حفاظت اور لوگوں کے سامنے رسوائی سے بچنے کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے بھی بدتر اس وقت ہوتی ہیں جب وجدان کو دھوکہ دینے کے لیے کی جائیں۔

یہ توجیہیں کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کے مختلف نمونے بشر کی پوری تاریخ میں دیکھے جا سکتے ہیں، کہ تاریخ کے بڑے بڑے بدکار اپنے آپ کو یا دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے کس طرح سے مضحکہ خیز توجیہات پیش کیا کرتے تھے جس سے ہر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے جو تربیت اور انسان سازی کا ایک عظیم درس ہے اس بارے میں بہت سے مباحث پیش کیے ہیں جس کا ایک نمونہ تو ہم اوپر والی آیات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے دوسرے نمونے بھی غور و مطالعہ کے لیے پیش کر دیئے جائیں تو مناسب ہوگا۔

(۱) مشرکین عرب بعض اوقات اپنے شرک کی توجیہ کے لیے اپنے بڑوں کی رسم سے متوسل ہوتے تھے اور کہتے تھے: انا وجدنا اٰباءنا علی امۃ و انا علی اٰثارھم مقتدون: یعنی ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقے پر پایا! اور ہم نے ان کے آثار کو پایا! ہوا ہے اور ہم انھیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں۔

"انا وجدنا اٰباءنا علی امۃ و انا علی اٰثارھم مقتدون"

"ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم انھیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں۔

(زخرف - ۲۳)

اور بعض اوقات جبر کی ایک قسم کے ساتھ متوسل ہوتے ہوئے کہتے تھے:

"لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اٰباؤنا"

"اگر خدا چاہتا تو نہ تو ہم ہی شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد مشرک ہوتے"

(انعام: ۱۴۸)

(۲) اور کبھی کمزور ایمان والے مسلمان جنگ سے فرار کرنے کے لیے پیغمبر کی خدمت میں آتے تھے، اور اس عنوان سے میدان کو خالی چھوڑ جاتے تھے کہ ہمارے گھروں کے در و دیوار ٹھیک طرح کے نہیں ہیں لہٰذا ہمیں نقصان کا خطرہ ہے: "ویستأذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی بعورۃ ان یریدون الا فرارا" (احزاب - ۱۳) ان میں سے ایک گروہ پیغمبر سے اجازت طلب کرتا اور کہتا ہمارے گھر آسیب پذیر ہیں، حالانکہ وہ آسیب پذیر نہیں تھے، وہ تو صرف فرار کرنا چاہتے تھے۔

(۳) اور کبھی اس بہانہ سے۔ کہ اگر ہم رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جائیں تو ممکن ہے کہ خوبصورت رومی عورتیں ہمیں فریفتہ کرلیں اور ہم حرام میں مبتلا ہو جائیں، لہٰذا پیغمبر سے جنگ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت مانگتے: "ومنھم من یقول ائذن لی ولا تفتنی (توبہ - ۴۹)" ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو رہنے ہی دیں اور گناہ میں نہ ڈالیں"۔

(۴) اور کبھی اس عنوان سے کہ ہمارے اموال اور بیوی بچوں کے خیال نے ہمیں روکے رکھا۔ پیغمبر کے فرمان کی اطاعت سے فرار کرنے جیسے عظیم گناہ کی توجیہ کرتے (آیات زیر بحث)

(۵) شیطان نے بھی ایک غلط قیاس کے ذریعے اپنی صریح نافرمانی کی خدا کے سامنے توجیہ کی اور کہا: "تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اور آدم کو مٹی سے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک زیادہ شریف موجود ایک پست تر موجود کو سجدہ کرے"!: انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔ (اعراف - ۱۲)

(۶) زمانۂ جاہلیت میں بھی "دختر کشی" جیسے عظیم جرم کی توجیہ کے لیے یہ کیا کرتے تھے کہ ہم اس چیز سے ڈرتے ہیں کہ جنگوں میں ہماری بیٹیاں دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں گی، لہٰذا ہماری غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نئی پیدا ہونے والی لڑکیوں کو "زندہ" زمین میں دفن کر دیں، اور کبھی یہ کہتے کہ اگر ہماری اولاد زندہ رہ جائے تو ہم ان کی زندگی کی تأمین پر قادر نہیں ہیں! (اسراء - ۳۱)

یہاں تک کہ بعض آیات قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں کی توجیہ کے لیے قیامت میں بھی ان امور سے تمسک کریں گے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی قوم کے بزرگوں کی پیروی کی تھی اور وہی لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اور ہماری راہنمائی کا ذمہ لے لیا تھا۔

"ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا" (احزاب - ۶۷)

خلاصہ یہ ہے، کہ توجیہ کرنے کی بلا ایک ایسی مصیبت ہے، جو ہمہ گیر ہے، جس نے لوگوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو، خواہ وہ عام ہوں یا خواص، اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور اس کا عظیم خطرہ یہ ہے کہ یہ گنہگاروں کے سامنے اصلاح کی راہیں بند کر دیتی ہے اور بعض اوقات حقیقتوں اور واقعیتوں کو خود انسان کی نظر میں دگرگوں کر کے دکھاتا ہے کہ

بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے "خوف اور بزدلی" کی "احتیاط" سے اور "حرص" کی "مستقبل کی تامین" سے اور "تہور" کی "قاطعیت" سے اور "ضعف نفس" کی "حیا و شرم" سے اور "بدحالی" کی "زہد" سے اور "ارتکاب حرام" کی "کلاہ شرعی" سے اور "ذمہ داری کے زیر بار جانے سے فرار" کی "موضع کے ثابت نہ ہونے" سے اور اپنی "کمزوریوں اور کوتاہیوں" کی قضا و قدر سے توجیہ کرتے ہیں۔ اور کس قدر دردناک ہے یہ امر کہ انسان اپنے ہاتھ سے راہ نجات کو اپنے سامنے بند کر دے۔

اگرچہ یہ مفاہیم ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ لیکن اعتراض کی بات یہ ہے کہ وہ اس کو تحریف کر کے الٹا نتیجہ نکالتے ہیں، انسانی معاشروں، خانوادوں اور افراد کو اس رہ گزر سے کتنے عظیم نقصانات پہنچے ہیں؟!

خداوند عالم ہم سب کو اس عظیم اور گھروں کو تباہ کرنے والی بلا اور مصیبت سے محفوظ رکھے! (آمین)

۱۵۔ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

۱۶۔ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

۱۷۔ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ ○

ترجمہ

۱۵۔ جب تم آئندہ چل کر مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوگے تو

پیچھے رہ جانے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دیں (تاکہ اس جہاد میں شرکت کریں) وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں، کہہ دو: تمھیں ہرگز ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے، خدا نے پہلے ہی سے یہ کہہ دیا ہے، لیکن عنقریب وہ یہ کہیں گے: تم ہمارے بارے میں حسد کر رہے ہو، لیکن وہ اس بات کو سمجھتے ہی نہیں مگر تھوڑا۔

۱۶۔ اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والوں کو کہہ دے: تمھیں عنقریب ایک جنگجو قوم کی طرف جانے کی دعوت دی جائے گی تاکہ تم ان سے جنگ کرو یا وہ اسلام لے آئیں، اگر تم نے اطاعت کی تو خدا تمھیں اچھی جزا دے گا، اور اگر تم نے اسی طرح سے رُوگردانی کی جیسے کہ پہلے بھی روگردانی کر چکے ہو تو وہ تمھیں دردناک عذاب دے گا۔

۱۷۔ "نابینا" "لنگڑے" اور "بیمار" (اگر وہ میدانِ جہاد میں شرکت نہ کریں) کوئی گناہ نہیں ہے، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، خدا اُسے (بہشت) کے باغات میں داخل کرے گا، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو شخص روگردانی کرے گا تو اُسے دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔

تفسیر

پیچھے رہ جانے والے آمادۂ طلب!

اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیات فتح خیبر کے بارے میں ہیں، جو صلح حدیبیہ کے بعد اور ہجرت کے ساتویں سال کے شروع میں واقع ہوئی۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: روایات کے مطابق جس وقت پیغمبر "حدیبیہ" سے پلٹ رہے تھے تو حکمِ خدا سے آپ نے حدیبیہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو "فتح خیبر" کی بشارت دی، اور تصریح فرمائی کہ اس جنگ میں صرف وہی شرکت کریں گے، اور جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت بھی انھیں کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ تخلف کرنے والوں کو ان غنائم میں سے کچھ نہ ملے گا۔

لیکن جونہی ان ڈرپوک دُنیا پرستوں نے قرائن سے یہ سمجھ لیا کہ پیغمبر اس جنگ میں جو انھیں درپیش ہے یقینی طور پر کامیاب ہوں گے اور سپاہ اسلام کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آئے گا، تو وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میدان خیبر میں شرکت کی اجازت چاہی اور شاید اس عذر کو بھی ساتھ لیا کہ ہم گزشتہ غلطی کی تلافی کرنے، اپنی ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کرنے، گناہ سے توبہ کرنے اور اسلام و قرآن کی مخلصانہ خدمت کرنے کے لیے یہ چاہتے ہیں کہ ہم میدانِ جہاد میں آپ کے ساتھ شرکت کریں! وہ اس بات سے غافل تھے کہ قرآنی آیات پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں اور ان کے راز کو فاش کر چکی تھیں، جیسا کہ پہلی زیرِ بحث آیت میں بیان ہوا ہے۔

"جس وقت تم کچھ غنیمت حاصل کرنے کے لیے چلو گے تو اس وقت پیچھے رہ جانے والے کہیں گے: ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں اور اس جہاد میں شرکت کرنے کا شرف بخشیں! (سیقول المخلفون اذا انطلقتم الی مغانم لتأخذوھا ذرونا نتبعکم)۔

نہ صرف اسی موقع پر بلکہ دوسرے موقعوں پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ: یہ تن پرور، لالچی، کم تکلیف اٹھانے والے، ترلقموں کے پیچھے تو جاتے، لیکن سخت خطرناک اور دور دراز کے میدانوں سے گریز کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۴۲ میں بیان ہوا ہے، "جس وقت کوئی غنیمت نزدیک اور سفر سہل اور آسان ہو تو اس وقت تو یہ تیری پیروی کرتے ہیں، لیکن (اب جبکہ میدان تبوک کے لیے) راستہ دُور اور پُر مشقت ہے تو روگردانی کر رہے ہیں اور عنقریب وہ قسم کھا کر کہیں گے: کہ اگر ہم میں تاب تواں ہوتی تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلتے: "لو کان عرضاً قریباً وسفراً قاصداً لاتبعوک ولکن بعدت علیھم الشقۃ وسیحلفون باللہ لو استطعنا لخرجنا معکم"۔

بہر حال قرآن زیرِ بحث آیات میں اس منفعت جو اور فرصت طلب گروہ کے جواب میں کہتا ہے" وہ یہ

چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں" (یریدون ان یبدلوا کلام اللہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ان سے کہہ دے: "تم ہرگز ہمارے پیچھے نہ آنا" تمھیں اس میدان میں شرکت کرنے کا حق نہیں ہے: (قل لن تتبعونا)۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔" یہ تو وہ بات ہے جو خدا نے پہلے سے ہی کہہ دی ہے" اور ہمیں تمھارے مستقبل (کے بارے میں) باخبر کر دیا ہے، : (کذالکم قال اللہ من قبل)۔

خدا نے حکم دیا ہے کہ" غنائم خیبر" "اہل حدیبیہ" کے لیے مخصوص ہیں، اور اس چیز میں کوئی بھی ان کے ساتھ شرکت نہ کرے، لیکن یہ بے شرم اور پُرادعا پیچھے رہ جانے والے پھر بھی میدان سے نہیں ہٹتے اور تمھیں حسد کے ساتھ متہم کرتے ہیں، اور عنقریب وہ یہ کہیں گے: کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ تم ہم سے حسد کر رہے ہو"! (فسیقولون بل تحسدوننا)۔

اور اس طرح سے وہ ضمنی طور پر پیغمبر کی بھی تکذیب کرتے ہیں اور" جنگ خیبر" میں انھیں شرکت سے منع کرنے کی اصل حسد کو شمار کرتے ہیں۔

قرآن آخری جملہ میں کہتا ہے: "لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھتے مگر تھوڑا" (بل کانوا لا یفقھون الا قلیلا)۔

ہاں! ان کی تمام بدبختیوں کی اصل، جہالت، نادانی اور بے خبری ہے، جو ہمیشہ ان کے دامن گیر رہی ہے، خدا کے بارے میں جہالت، اور مقام پیغمبر کی عدم معرفت، اور انسانوں کی سرنوشت سے بے خبری اور دُنیا کی دولت و ثروت کے ناپائیدار ہونے کی طرف سے عدم توجہ۔

یہ درست ہے کہ وہ مالی مسائل اور شخصی منافع کے سلسلے میں باہوش، دقیق اور باریک بین تھے، لیکن اس سے بڑھ کر جہالت اور کیا ہوگی کہ انسان تھوڑی سی دولت کے لیے اپنی تمام چیزوں کو بدلے میں دے ڈالے؟!

آخر کار پیغمبرؐ نے۔ تواریخ کی نقل کے مطابق۔ غنائم خیبر صرف اہل حدیبیہ پر تقسیم کیے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی وجہ سے جنگِ خیبر میں شریک نہ ہو سکے ان کے لیے بھی ایک حصہ قرار دیا، البتہ ایسا آدمی صرف ایک ہی تھا، اور وہ "جابر بن عبداللہ" تھا۔[1]

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے "حدیبیہ" میں پیچھے رہ جانے والوں سے گفتگو ہیں، بعد والی آیت میں ایک پیش نہاد کرتا ہے اور ان کے سامنے بازگشت کی راہ کو اس طرح سے کھلی رکھتے ہوئے فرماتا ہے: "بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ دو: عنقریب تمھیں ایک جنگجو اور طاقتور قوم سے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۰۴۔

مقابلہ کے لیے نکلنے اور ان سے جنگ کرنے کی دعوت دی جائے گی یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں "(قل للمخلفین من الأعراب ستدعون الی قوم اولی بأس شدید تقاتلونهم او یسلمون)۔

"اگر تم اطاعت کرو گے تو خدا تمہیں نیک اجر دے گا، اور اگر تم نے روگردانی کی، جس طرح سے پہلے تم نے روگردانی کی تھی، تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا"؛ (فان تطیعوا یؤتکم الله اجرا حسنا وان تتولوا کما تولیتم من قبل یعذبکم عذابا الیما)۔

اگر تم واقعاً اپنے پہلے عمل سے پشیمان ہو گئے ہو اور راحت طلبی اور دُنیا پرستی سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے تو پھر اپنی صداقت کا امتحان ایک دوسرے سخت اور خوفناک میدان میں دو، ورنہ سخت میدانوں سے اجتناب کرنا، اور راحت و آرام اور صرف غنیمت کے لیے لڑائی کے میدانوں میں شرکت کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اور یہ چیز تمہارے نفاق، ضعفِ ایمان، بُزدلی، اور خوف پر ایک دلیل ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے ان آیات میں بار بار پیچھے رہ جانے والوں (مخلفین) کا تذکرہ کیا ہے اور اصطلاح کے مطابق "ضمیر" کے بجائے "اسم ظاہر" کو استعمال کرتا ہے۔

یہ تعبیر خصوصیت کے ساتھ صیغہ اسم مفعول کی صورت میں آئی ہے یعنی "پیچھے چھوڑے ہوئے" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت صاحب ایمان مسلمانوں نے اس گروہ کی سُستی اور بہانہ جوئیوں کا مشاہدہ کیا تو انھیں پیچھے چھوڑتے ہُوئے اور ان کی حالت و کیفیت کی پرواہ کیے بغیر میدانِ جہاد کی طرف چل پڑے۔

لیکن اس بارے میں کہ یہ جو جنگ جُو اور طاقت ور قوم جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہُوا ہے، کونسی جمعیت تھی؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

"تقاتلونهم او یسلمون" (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں)۔ کا جُملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اہل کتاب نہیں تھے، کیونکہ انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، بلکہ انھیں اس بات کا اختیار دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اسلام لے آئیں یا اہلِ ذمہ کی شرائط قبول کرتے ہُوئے مسلمانوں کے ساتھ صحیح طریقہ سے زندگی گزاریں اور جزیہ دیتے رہیں، صرف مشرکین اور بُت پرست ہی ہیں جن سے سوائے اسلام کے کوئی چیز قابلِ قبول نہیں۔ کیونکہ اسلام بُت پرستی کو ایک دین کے طور پر قبول نہیں کرتا، اور بُت پرستی ترک کرنے کے لیے مجبور کرنا جائز ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہُوئے کہ زمانہ پیغمبرؐ میں واقعہ "حدیبیہ" اور "فتح خیبر" کے بعد مشرکین کے ساتھ اہم جنگ سوائے "فتح مکہ" اور "جنگ حنین" کے اور کوئی نہیں تھی۔

لہٰذا اوپر والی آیت انھیں کی طرف اشارہ ہو سکتی ہے، خصوصاً جنگ حنین جس میں قبیلہ "ہوازن" اور "بنی سعد" کے سخت کوشش اور جنگ جُو قسم کے لوگ شریک تھے۔

لیکن بعض نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ "یہ غزوۂ موتہ" کی طرف اشارہ ہے جو رومیوں کے ساتھ انجام پائی تھی، تو یہ بات

بعید نظر آتی ہے کیونکہ وہ تو اہل کتاب تھے۔

اور یہ احتمال کہ اس سے پیغمبرؐ کے بعد کی جنگیں مراد ہیں، جن میں سے "اہل فارس" و "یمامہ" کی جنگیں ہیں، تو یہ بات بہت ہی زیادہ بعید ہے، کیونکہ آیات کا لب ولہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ زمانہ پیغمبرؐ کے ساتھ مربوط ہے، اور ہمارے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اسے زمانہ پیغمبرؐ سے بعد کی جنگوں پر منطبق کریں۔

ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کی فکر ونظر میں کچھ سیاسی اسباب تھے جن کی وجہ سے انھوں نے اس مسئلہ پر زور دیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبرؐ ان سے وعدہ نہیں کرتے کہ تمھاری آئندہ کی جنگوں میں تمھیں کچھ مال غنیمت ملے گا، کیونکہ جہاد کا مقصد غنیمت کا حصول نہیں ہے، بلکہ وہ صرف یہ بتانا ہی کافی سمجھتا ہے کہ خدا تمھیں اچھا اجر دے گا اور عام طور پر یہ تعبیر آخرت کے اجر کے بارے میں ہے۔

یہاں پر ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیہ ۸۳ میں ان نامحرموں کو کلی طور پر رد کرتے ہوئے کہتا ہے:

"فقل لن تخرجوا معی ابدًا ولن تقاتلوا معی عدوًّا انکم رضیتم بالقعود اول مرّة فاقعدوا مع الخالفین"؛ "تم ہرگز کسی جنگ میں بھی میرے ساتھ باہر نہیں نکلو گے اور تم میرے ساتھ رہ کر دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے مجاز نہیں ہو، کیونکہ تم پہلی مرتبہ بھی جنگ سے کنارہ کشی پر راضی ہو گئے تھے، اب بھی تم پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو۔

درحالیکہ زیر بحث آیت انھیں ایک اور سخت اور خطرناک میدان میں جنگ کی دعوت دے رہی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورۂ توبہ کی آیت تو جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ مربوط ہے، کہ پیغمبرؐ ان سے قطع امید کر چکے تھے اور زیر بحث آیت حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کہ ابھی تک ان کی طرف سے امید منقطع نہیں ہوئی تھی۔ اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے:

اور چونکہ پیچھے رہ جانے والوں کے درمیان ایسے افراد بھی تھے جو کسی عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے یا بیماری کی بنا پر واقعاً جہاد میں شرکت کی قدرت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا ان کا حق یہاں نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے، اس لیے آخری زیر بحث آیت میں ان کے معذور ہونے کو واضح کرتا ہے۔

خاص طور پر یہ بات جو بعض مفسرین نے نقل کی ہے کہ گذشتہ آیت کے نزول اور پیچھے رہ جانے والوں کو "عذاب الیم" کی دھمکی دینے کے بعد معذوروں اور بیماروں کی ایک جماعت پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ اس حالت میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اور ان کے لیے اس طرح حکم بیان کیا: "نابینا، لنگڑے اور بیمار پر کوئی گناہ نہیں ہے، اگر وہ میدان جہاد میں شرکت نہ کریں": (لیس علی الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج)۔

صرف جہاد ہی نہیں ہے کہ جو قدرت وتوانائی کے ساتھ مشروط ہے بلکہ تمام شرعی ذمہ داریاں عمومی شرائط کے ایک

سلسلہ کے ساتھ مشروط ہیں، جن میں سے ایک توانائی اور قدرت ہے اور آیاتِ قرآن میں بارہا اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۶ میں ایک کلیہ کی صورت میں اس طرح بیان ہوا ہے: لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا: "خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

یہ شرط منقول دلیلوں سے بھی ثابت ہے اور عقلی دلیلوں سے بھی۔

لیکن یہ گروہ اگرچہ میدانِ جہاد میں شرکت سے معاف رکھا گیا ہے، مگر انھیں بھی اپنے مقدور بھر قوائے اسلام کو طاقت پہنچانے اور اہداف الٰہی کو آگے بڑھانے کے لیے کوشش کرنی چاہیئے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۹۱ میں بیان ہوا ہے: لیس علی الضعفاء ولا علی المرضٰی ولا علی الذین لایجدون ما ینفقون حرج اذا نصحوا للہ ورسولہ: "کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر جو (جہاد کے لیے) کچھ خرچ کرنے کا بھی ذریعہ نہیں رکھتے، کوئی گناہ نہیں ہے، (کہ وہ میدان میں حاضر نہ ہوں) مگر شرط یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے خیر خواہی کریں۔"

یعنی اگر وہ ہاتھ سے کوئی کام انجام دینے پر قادر نہیں ہیں، تو حسبِ مقدور زبان سے تو گریز نہ کریں، اور یہ ایک عمدہ تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جو شخص تنِ توانائی رکھتا ہے اتنی فروگذاشت نہ کرے، دوسروں لفظوں میں اگر کوئی محاذ جنگ میں شرکت نہیں کرسکتا تو کم از کم محاذ کی پشت کو ہی مظبوط کرے۔

اور شاید زیرِ بحث آیت کا آخری جملہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو، جس میں فرماتا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو بہشت کے اُن باغات میں داخل کرے گا، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور جو شخص روگردانی کرے گا اُسے دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا" (ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنات تجری من تحتھا الانھار ومن یتول یعذبہ عذابا الیما)

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مواقع پر کسی حکم میں کوئی استثناء ہوتا ہے تو کچھ لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو معذوروں کی صف میں کھڑا کر لیتے ہیں، تو قرآن انھیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر واقعاً وہ معذور نہ ہوئے تو وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ معذور ہونے، نابینا، لنگڑے اور سخت بیماروں کا مسئلہ "جہاد" ہی کے لیے مخصوص ہے لیکن "دفاع" کے مسئلہ میں ہر شخص کو مقدور بھر کیانِ اسلام، وطنِ اسلامی اور جان کا دفاع کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں کوئی استثناء نہیں ہے۔

۱۸۔ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ

۱۹۔ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۸۔ خدا ان مومنین سے جنہوں نے اس درخت کے نیچے تیری بیعت کی راضی اور خوش ہوا، خدا اس کو جو (صداقت و ایمان سے) ان کے دلوں میں چھپا ہوا تھا جانتا تھا، لہٰذا اس نے ان کے دل پر سکون و اطمینان نازل کیا، اور اجر و پاداش کے عنوان سے ایک نزدیکی فتح انھیں نصیب فرمائی۔

۱۹۔ اور بہت سے غنائم جنہیں وہی حاصل کریں گے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں سے خدا کی خوشنودی

ہم بیان کر چکے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ میں "پیغمبرؐ" اور "قریش" کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا تھا، ان میں

سے پیغمبرؐ نے "عثمان بن عفان" کو (جو ابوسفیان کے عزیزوں میں سے تھا، اور یہ رابطہ ظاہراً اس کے انتخاب میں اثر رکھتا تھا) نمائندے کے طور پر مشرکین مکہ اور اشراف قریش کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ انھیں اس حقیقت سے آگاہ کرے کہ مسلمان جنگ کے ارادے سے نہیں آئے، بلکہ ان کا ہدف و مقصد خانہ خدا کی زیارت اور کعبہ کا احترام ہے، لیکن قریش نے وقتی طور پر عثمان کو روک لیا، اور اس کے بعد مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ عثمان مارا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا جب تک اس گروہ سے جنگ نہ کروں۔

اس کے بعد آپ اُس درخت کے نیچے تشریف لائے جو وہاں پر موجود تھا، اور لوگوں کے ساتھ تجدید بیعت کی اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے، اور کوئی شخص میدان جہاد سے فرار نہیں کرے گا[1]

اس بیعت کی شہرت مکہ میں پھیل گئی اور قریش سخت وحشت زدہ ہوگئے اور انھوں نے عثمان کو آزاد کر دیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ بیعت "بیعتِ رضوان" (خوشنودیِ خدا کی بیعت) کے عنوان سے مشہور ہوئی اور مشرکین کو لرزہ براندام کر دیا اور یہ تاریخ اسلام میں ایک نقطۂ عطف تھا۔

زیر بحث آیات اسی ماجرے کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا ان مومنین سے جنہوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی راضی اور خوشنود ہوا" (لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ)۔

اس بیعت کا مقصد توانائیوں کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنا، روحانی تقویت، جنگی آمادگی کی تجدید، انکار کی آزمائش اور وفادار دوستوں کی فداکاری کے وزن کو آزمانا تھا۔

اس بیعت نے مسلمانوں کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دی، چونکہ انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تھا۔ اور صمیم قلب کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

خدا نے ان فداکار اور ایثار پیشہ مومنین کو جنہوں نے اس حساس لمحہ میں پیغمبر سے بیعت کی تھی چار عظیم اجر عطا فرمائے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اس کی رضا و خوشنودی تھی، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۷۲ میں بیان ہوا ہے: ورضوان من اللہ اکبر: "اور خدا کی رضا اور خوشنودی بہشت کی سب نعمتوں سے برتر ہے"

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا اس عہد و پیمان کے بارے میں ان کی وفاداری پر آمادگی اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ایمان اور صداقت کو جانتا تھا، اس لیے ان پر سکون و آرام نازل کیا" (فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم)۔

ایسا سکون و اطمینان کہ: دشمنوں کے انبوہ کے درمیان، اپنے وطن اور شہر و دیار سے دُور دراز مقام پر، ان کے آمادہ و تیار بہتیاروں کے درمیان، کافی اسلحہ پاس نہ ہونے کے باوجود (چونکہ زیارت کے لیے آئے تھے نہ کہ جنگ

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

کے لیے) کسی قسم کا خوف اور گھبراہٹ محسوس نہ کی، اور مضبوط پہاڑ کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے رہے اور یہ ان کے لیے خدا کی دوسری نعمت تھی۔

اصولی طور پر الطاف خاص اور خدائی امدادیں ایسے اشخاص کے شامل حال ہوتی ہیں جو خلوصِ نیت اور باطنی صدق و صفا کے حامل ہوں۔

لہٰذا ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

" ان العبد المؤمن الفقیر لیقول یارب ارزقنی حتی افعل کذا و کذا من البر و وجوہ الخیر، فاذا علم اللہ عزوجل ذالک منہ یصدق نیتہ کتب اللہ لہ من الاجر مثل ما یکتب لہ لو عملہ، ان اللہ واسع کریم"۔

" فقیر بندۂ مومن جب کبھی یہ کہتا ہے: خداوندا مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ایسے ایسے اچھے اور نیک کام کروں، جب خدا اس کی صدق نیت کو جان لیتا ہے تو وہ اس کے لیے وہی اجر و صلہ لکھ دیتا ہے جو اُسے عمل کرنے کی صورت میں عطا کرتا، کیونکہ خدا وسیع رحمت والا کریم ہے۔" [1]

آیت کے آخر میں تیسری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اور انھیں اجر کے طور پر قریب کی فتح نصیب کی": (واثابھم فتحا قریبا)۔

ہاں! یہ فتح جو اکثر مفسرین کے قول کے مطابق فتح خیبر تھی (اگرچہ بعض نے اسے فتح مکہ شمار کیا ہے) ایثار پیشہ مومنین کے لیے خدا کی تیسری نعمت تھی۔

" قریبا" کی تعبیر اس چیز کی ایک تائید ہے کہ اس سے مراد" فتح خیبر" ہے، کیونکہ یہ فتح ہجرت کے ساتویں سال کی ابتدا میں، حدیبیہ کے واقعہ سے چند ماہ کے فاصلہ پر حاصل ہوئی۔

چوتھی نعمت جو بیعت رضوان کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوئی فراواں مادی غنائم تھے، جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"اور دوسرا اجر وہ بکثرت غنائم ہیں جو اُن کے ہاتھ آئیں گے" (ومغانم کثیرۃ یأخذونھا)۔

ان غنائم میں سے ایک وہی خیبر کے غنائم تھے جو مسلمانوں کو ایک مختصر سے عرصہ میں نصیب ہوئے، اور خیبر کے یہودیوں کی بے حساب ثروت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ غنائم حد سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

لیکن غنائم کو خیبر کے غنائم میں محدود کرنے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

لہٰذا باقی اسلامی جنگوں کے غنائم بھی جو فتح حدیبیہ کے بعد حاصل ہوئے اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اور چونکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس وعدہ الٰہی پر مکمل اطمینان رکھیں، آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے:" خدا

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۰، صفحہ ۱۹۹۔

شکست ناپذیر اور حکیم ہے" (وکان اللہ عزیزاً حکیماً)۔

اگر تمھیں یہ حکم دیا ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر صلح کرلو، تو وہ حکمت کی اساس پر تھا، وہ حکمت کہ وقت کے گزرنے نے اس کے اسرار سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور اگر وہ تمھیں فتح قریب اور غنائم کثیرہ کا وعدہ دیتا ہے تو وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنائے۔

اس طرح سے صاحب ایمان اور ایثار پیشہ مسلمانوں نے بیعت رضوان کے سایہ میں، اور ان حساس لمحات میں پیغمبر سے وفاداری کا اعلان کرکے دُنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرلی، جبکہ بے خبر اور ضعیف الایمان ڈرپوک منافق حسرت کی آگ میں جلتے رہے۔

ہم اس گفتگو کو امیر المومنین علی علیہ السلام کی گفتگو پر ختم کرتے ہیں۔ جبکہ آپ صدر اول کے مسلمانوں کی پامردی اور دشمن سے بے نظیر جہاد کے بارے میں بات کرتے ہیں، اور سست و کمزور عنصر مخاطبین کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فلما رای اللہ صدقنا انزل بعدونا الکبت، وانزل علینا النصر حتی استقر الاسلام ملقیاً جرانہ، ومتبوئاً اوطانہ، ولعمری لو کنا نأتی ما اتیتم، ما قام للدین عمود، ولا اخضر للایمان عود، وایم اللہ لتحتلبنہا دماً، لتتبعنہا ندماً"!

"جس وقت خدا نے ہمارے صدق و خلوص کو دیکھا تو ذلت و خواری کو دشمن پر اور کامیابی و نصرت کو ہم پر نازل فرمایا، یہاں تک کہ اسلام صفحۂ زمین پر پھیل گیا، اور وسیع علاقے اپنے لیے چن لیے، مجھے میری جان کی قسم ہے کہ اگر ہم مبارزہ میں تمھاری طرح ہوتے تو ہرگز دین کا ستون قائم نہ ہوتا، اور ایمان کے درخت کی شاخ سرسبز نہ ہوتی، اور خدا کی قسم تم دودھ کے بدلے خون دوہو گے اور پشیمان ہوں گے۔[1]

ایک نکتہ

بیعت اور اس کی خصوصیات

بیعت "بیع" کے مادہ سے اصل قرار داد معاملہ کے وقت ہاتھ میں دینے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اطاعت کے عہد و پیمان کے لیے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر اس کا اطلاق ہونے لگا، اور وہ اس طرح ہوتا تھا کہ جب کوئی کسی سے وفاداری کا اعلان کرنا چاہتا تھا اور اسے رسمی طور پر قبول کرنا اور اس کے فرمان کی اطاعت کرنا چاہتا تھا، تو اس

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۵۶۔

سے بیعت کیا کرتا تھا، اور شاید اس لفظ کا اطلاق اس معنی میں اس وجہ سے ہوتا تھا، کہ دونوں طرف سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایک عہد کرتا تھا جو دو معاملہ کرنے والوں کے عہد و پیمان کے مانند ہوتا تھا، بیعت کرنے والا بعض اوقات جان کی حد تک اور کبھی مال و اولاد کی حد تک اس کی اطاعت کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کرتا تھا، اور بیعت لینے والا بھی اس کی حمایت اور اس کے دفاع کو اپنے ذمہ لیتا تھا۔

ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمہ میں کہتا ہے: "کانوا اذا بایع الامیر جعل ایدیھم فی یدہ تاکیدًا فاشبہ ذالک فعل البایع والمشتری: جب لوگ کسی امیر سے بیعت کرتے تھے۔ تو تاکید کے لیے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے تھے، اور یہ کام بیچنے اور خریدنے والے کے کام کے مشابہ تھا"[1]

قرائن بتلاتے ہیں کہ بیعت مسلمانوں کی ایجادات میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام سے پہلے عربوں میں ایک رسم کے طور پر رائج تھی، اسی بنا پر آغاز اسلام میں جب قبیلہ "اوس" اور "خزرج" حج کے موقع پر مدینہ سے مکہ آئے تو انہوں نے عقبہ میں پیغمبر اسلام کی بیعت کی تھی، مسئلہ بیعت کے سلسلہ میں ان کا یہ عمل ایک جانے پہچانے کام پر عمل تھا، اس کے بعد پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر مسلمانوں سے تجدید بیعت کی، کہ ان میں سے ایک موقع یہی حدیبیہ میں "بیعت رضوان" کا تھا اور اس سے زیادہ وسیع وہ بیعت تھی جو فتح مکہ کے بعد انجام پائی، جس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ ممتحنہ کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

باقی رہی "بیعت" کی کیفیت تو وہ کلی طور پر اس طرح سے تھی کہ بیعت کرنے والا اپنا ہاتھ بیعت لینے والے کے ہاتھ پر رکھتا، اور زبان حال یا زبان مقال کے ساتھ اطاعت و وفاداری کا اعلان کرتا، اور بعض اوقات بیعت کے ضمن میں اس کے لیے شرائط و حدود کا قائل ہوتا تھا، مثلاً مال کی حد تک بیعت یا جان کی حد تک یا ہر چیز کی حد تک، یہاں تک کہ بیوی بچے تک قربان کر دینے کی حد تک،

اور بعض اوقات فرار نہ کرنے کی حد تک اور کبھی موت کی حد تک بیعت ہوتی تھی، (اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں معنی بیعت رضوان کے سلسلے میں تواریخ میں بیان ہوئے ہیں)

پیغمبر اسلام عورتوں کی بیعت کو بھی قبول کرتے تھے، لیکن وہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کے طریقہ سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ۔ جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے۔ آپ پانی کا ایک بڑا برتن لانے کا حکم فرماتے تھے اور اپنا ہاتھ برتن کی ایک طرف ڈبو دیتے تھے، اور بیعت کرنے والی عورتیں اپنے ہاتھ دوسری طرف ڈبو دیا کرتی تھیں۔

کبھی "بیعت" کے ضمن میں کسی کام کو انجام دینے یا کچھ کاموں کو ترک کرنے کی شرط کرتے تھے۔ جیسا کہ پیغمبرؐ نے فتح مکہ کے بعد عورتوں سے بیعت لیتے وقت شرط کی کہ "وہ شرک نہ کریں، اور بے عفتی سے آلودہ نہ ہوں، اور چوری نہ کریں اور اپنے بچوں کو قتل نہ کریں اور دیگر امور" (سورہ ممتحنہ آیہ ۱۲)

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۴۔

① بیعت کی ماہیّت

یہ ایک طرف سے بیعت کرنے والے کی جانب سے اور دوسری طرف بیعت لینے والے کی جانب سے، ایک قسم کی قرارداد اور معاہدہ ہے، اور اس کا مضمون و مطلب بیعت لینے والے کی اطاعت و پیروی اور دفاع و حمایت ہے اور ان شرائط کے مطابق جو اس میں بیان کیے جاتے ہیں، بیعت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔

آیاتِ قرآنی اور احادیث کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت، بیعت کرنے والے کی طرف سے ایک ضروری اور لازمی عہد ہوتا ہے، جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اور اس بنا پر یہ "اوفوا بالعقود" کے قانون کا کلی طور پر شمول ہے۔ (مائدہ-۱)

اس بنا پر بیعت کرنے والا فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، لیکن بیعت لینے والا اگر مصلحت دیکھے تو اپنی بیعت اُٹھا سکتا ہے اور اُسے فسخ کر سکتا ہے، اور اس صورت میں بیعت کرنے والا اپنے فرض اور عہد سے آزاد ہو جاتا ہے۔[1]

∴ ∴ ∴

② بعض لوگ بیعت کو "انتخابات" کے مشابہ یا اس کی ایک نوع سمجھتے ہیں، حالانکہ "انتخابات" کا مسئلہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ یعنی اس کی ماہیت منتخب ہونے والے کے لیے ایک قسم کی مسئولیت وظیفہ و ذمہ داری اور مرتبہ و مقام کا عطا کرنا ہے، یا دوسرے لفظوں میں کسی کام کے انجام دینے میں وکیل بنانا ہے، اگرچہ اس انتخاب میں انتخاب کرنے والوں کے لیے بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، (تمام وکالتوں کی طرح) جب کہ بیعت ایسی چیز نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں: انتخابات مقام کی عطائیگی ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ وکالت کے مشابہ ہے، جبکہ بیعت "اطاعت کا عہد" ہے۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں بعض باتوں میں ایک دوسرے سے مشابہت پیدا کر لیں، لیکن یہ شباہت ہرگز ان کے مفہوم و ماہیت کی وحدت کے معنی میں نہیں ہے، اسی لیے بیعت کے سلسلے میں بیعت کرنے والا فسخ کرنے کا حق اور اختیار نہیں رکھتا، جب کہ انتخابات میں بہت سے مواقع پر انتخاب کرنے والے فسخ کرنے کا حق رکھتے ہیں، کہ انتخاب ہونے والے شخص کو سب مل کر اس کے مقام سے معزول کر دیں۔ (غور کیجیے)

③ پیغمبرؐ اور ائمہ معصومینؑ کے لیے۔ جو خدا کی طرف سے منصوب ہوتے ہیں۔ کسی قسم کی بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور امام معصومؑ اور ان کی طرف سے نصب شدہ فرد کی اطاعت واجب ہے،

---

[1] واقعہ کربلا میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور خطبہ پڑھا اور اپنے اصحاب کی قدردانی کے اظہار کے ضمن میں اپنی بیعت ان سے اُٹھالی، تاکہ وہ جہاں ان کا دل چاہے چلے جائیں (لیکن وہ اسی طرح سے وفادار رہے) اور فرمایا: فانطلقوا فی حل لیس علیکم منی ذمام:

(کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۵۰)

خواہ کسی نے بیعت کی ہو یا کسی نے بیعت نہ کی ہو۔

دوسرے لفظوں میں نبوت و امامت کا مقام ہی وجوب اطاعت کو لازم و ضروری قرار دیتا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:
اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (نساء- ۵۹)

لیکن یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر پیغمبرؐ نے بارہا اپنے صحابہ سے اور تازہ مسلمانوں سے بیعت کیوں لی، جس کے دو نمونے صراحت کے ساتھ قرآن میں آئے ہیں، (بیعتِ رضوان تو اسی سورہ میں ہے اور اہل مکہ سے جو بیعت لی اس کی طرف سورۂ ممتحنہ میں اشارہ ہوا ہے)

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بلاشک و شبہ یہ بیعتیں وفاداری پر ایک قسم کی تاکید تھیں، جو خاص خاص موقعوں پر انجام پائی تھیں، خاص طور پر سخت قسم کے بحرانوں اور حوادث کے مقابلہ کے لیے ان سے استفادہ کیا گیا ہے، تاکہ اس کے سایہ میں لوگوں کے جسموں میں تازہ روح پھونکی جائے، جیسا کہ ہم گذشتہ بحثوں میں بیعتِ رضوان کے عجیب و غریب اثرات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

لیکن وہ بیعتیں جو خلفاء کے لیے لیتے تھے وہ ان کے مقام خلافت کو قبول کرنے کے طور پر ہوتی تھیں، اگرچہ ہمارے عقیدہ کے مطابق پیغمبرؐ کی خلافت کوئی ایسی چیز نہیں جو لوگوں کی بیعت کے طریقہ سے انجام پائے، بلکہ وہ صرف خدا کی طرف سے اور خود پیغمبر یا سابق امام کے ذریعہ منعقد ہوتی ہے۔

اور اسی بنا پر وہ بیعت جو مسلمانوں نے علیؑ یا امام حسنؑ یا امام حسینؑ کی، کی تھی وہ بھی وفاداری پر تاکید ہی پہلو رکھتی تھی، اور پیغمبرؐ کی بیعتوں کے ساتھ مشابہت رکھتی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

(۴) کیا موجودہ حالات میں بھی بیعت ایک اسلامی اصل کے طور پر قابل قبول ہے؟ دوسرے لفظوں میں، کیا آج بھی بیعت کو عام کیا جا سکتا ہے، مثلاً کوئی قوم کسی لائق اور حامل شرائطِ شرعی فرد کو انتخاب کرے (اور لشکر کے کمانڈر انچیف، رئیس قوم یا رئیس حکومت کے عنوان سے) اس کی بیعت کریں؟ تو کیا اس قسم کی بیعتیں احکام شرعی کی مشمول بیعت ہو سکتی ہے؟

کیونکہ اصطلاح کے مطابق بیعت کے بارے میں قرآن و سنت سے کوئی "عموم" اور "اطلاق" ہمارے پاس نہیں ہے، لہٰذا اس مسئلہ کو عمومیت دینا مشکل نظر آتا ہے۔ اگرچہ "اوفوا بالعقود" والی آیت کے عموم سے استدلال کرنا چنداں بعید نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود جو ابہام بیعت سے مربوط مسائل میں پایا جاتا ہے اس بات سے مانع ہے کہ ہم قطعی اور یقینی طور پر "اوفوا بالعقود" پر تکیہ کریں، خاص طور پر جبکہ ہماری فقہ میں بیعت کے لیے پیغمبرؐ اور امام معصومؑ کے علاوہ کوئی مقام نظر نہیں آتا۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ ولی فقیہ کی نیابت کا مقام ہماری نظر میں ایک ایسا مقام ہے جو ائمہ معصومینؑ کی طرف سے معین ہوا ہے، اور اس کے لیے کسی قسم کی بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ لوگوں کا ولی فقیہ کی اطاعت و پیروی کرنا اس کے اس مقام سے استفادہ کا امکان اور اصطلاح کے مطابق "بسط ید" دینا ہے۔

لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کا مقام لوگوں کے اتباع اور پیروی کا مرہون ہو، اور پھر لوگوں کے پیروی کرنے

کا مسئلہ بیعت کے مسئلہ سے کوئی ربط نہیں رکھتا، بلکہ ولایت فقیہ کے بارے میں حکم الٰہی پر عمل کرنا ہے، (غور کیجیے)

⑤ بہرحال "بیعت" مسائل اجرائی سے مربوط ہے، اور اس کا احکام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی کسی شخص کی بیعت کر لینا ہرگز اسے "تشریع" اور قانون وضع کرنے کا حق نہیں دیتا، بلکہ قوانین کو کتاب و سنت سے لینا چاہیئے، اور پھر انہیں جاری کرنا چاہیئے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

⑥ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور معصوم پیشوا کی بیعت خدا کے لیے ہونی چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں بیعت ایسے امور میں سے ہے جس میں قصد قربت ضروری ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے آیا ہے۔

"ثلاثة لا یکلمهم الله عزّ وجلّ یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم، رجل بایع اماما لا یبایعه الا للدنیا ان اعطاه ما یریده وفی له، والا کف، ورجل بایع رجلا بسلعته بعد العصر مخلف بالله عزّ وجلّ لقد اعطی بها کذا وکذا فصدقه واخذها ولم یعط فیها ما قال، ورجل علی فضل ماء بالفلاة یمنعه ابن السبیل"[1]

"تین شخص ایسے ہیں جن سے خدا بات نہیں کرے گا، اور نہ ہی انھیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک تو وہ شخص جو امام کی بیعت کرے اور اس سے اس کا مقصد دُنیا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، کہ اگر وہ اس کی مطلوبہ چیز اسے دے دے تو پھر تو وہ اپنی بیعت کو پورا کرے گا، ورنہ علیحدہ ہو جائے گا، اور ایک وہ شخص جو عصر کے وقت کے بعد جنس بیچتا ہے اور قسم کھا کر کہے کہ میں نے یہ جنس اتنی رقم دے کر خریدی ہے، اور مشتری سچ سمجھ کر اُسے خرید لیتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، تیسرا وہ شخص جس کے پاس بیابان میں فالتو پانی موجود ہے، لیکن وہ مسافر کو نہیں دیتا۔[1]

عصر کی تعبیر یا تو اس وقت کی شرافت کی وجہ سے ہے اور یا اس بناء پر ہے کہ بہت سے جنس بیچنے والے اس موقع پر اپنی جنس کو جس قیمت پر خریدتے ہیں اسی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔

⑦ بیعت توڑنا گناہان کبیرہ میں سے ہے ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے،

"ثلاثة موبقات: نکث الصفقة وترک السنة وفراق الجماعة"

---

[1] "خصال" باب الثلاثة حدیث ۷۰۔

"تین گناہ ایسے ہیں جو انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں، (اور خدا کے شدید عذاب میں اُسے پھینک دیتے ہیں) بیعت توڑنا، سُنت کو ترک کرنا، اور جماعت سے جدائی اور علیحدگی اختیار کرنا"[1]

ترکِ سنت ظاہراً ان قوانین کی طرف اشارہ ہے، جو پیغمبرؐ اسلام لائے ہیں، اور جماعت سے جدائی کا معنی اس سے اعراض کرنا اور پشت پھیرنا ہے نہ کہ صرف جماعت میں شریک نہ ہونا۔

⑧ "بیعت" علی علیہ السلام کے ارشادات میں

نہج البلاغہ کے خطبوں میں بارہا بیعت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی ہے۔ اور امامؑ نے بارہا اس بیعت کا جو لوگوں نے آپ سے کی تھی، ذکر کیا ہے۔

ان میں سے ایک موقع پر فرماتے ہیں: اے لوگو! تمہارا مجھ پر ایک حق ہے، اور میرا تم پر ایک حق ہے۔ اب رہا تمہارا حق مجھ پر تو وہ یہ ہے کہ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ رہوں اور تمہارے بیت المال کو تمہارے ہی لیے خرچ کروں، تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم جہالت سے نجات پاؤ اور تمہیں تادیب کروں تاکہ تمہیں آگاہی حاصل ہو۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"واما حقی علیکم فالوفاء بالبیعة، والنصیحة فی المشهد والمغیب، والاجابة حین ادعوکم، والطاعة حین آمرکم"

باقی رہا میرا حق تمہارے اوپر تو وہ یہ ہے کہ اپنی بیعت میں وفادار رہو، اور آشکار و پنہاں خیر خواہی کرو جس وقت تمہیں پکاروں تو لبیک کہو، اور جس وقت تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو۔[2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"لم تکن بیعتکم ایای فلتة"

تمہاری بیعت مجھ سے بغیر سوچے سمجھے اور اچانک انجام نہیں پائی (تاکہ معمولی سے معمولی شک و تردید بھی میری اطاعت کے بارے میں اختیار کرو)۔[3]

اور اس خطبہ میں جو جنگ "جمل" سے پہلے اور مدینہ سے بصرہ کی طرف جاتے وقت ارشاد فرمایا، لوگوں کو ان کی بیعت پر پائیداری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وبایعنی الناس غیر مستکرهین، ولا مجبرین، بل طائعین مخیرین"

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰ صفحہ ۱۸۵

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۳۴۔

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۶۔

" لوگوں نے بغیر کسی جبر و اکراہ کے اطاعت و اختیار کے ساتھ میری بیعت کی تھی " [1]

اور آخر میں معاویہ کے مقابلہ میں، جس نے امامؑ کی بیعت سے سرتابی کی تھی اور کسی نہ کسی طرح سے اس پر نکتہ چینی کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا:

" بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوهم علیه، فلم یکن للشاهد ان یختار، ولا للغائب ان یرد "

" انھیں لوگوں نے جنہوں نے ابوبکر و عمر و عثمان کی بیعت کی تھی، میری انھیں شرائط اور کیفیت میں بیعت کی ہے۔ اس بنا پر نہ تو کسی حاضر کو یہ اختیار ہے کہ بیعت کو فسخ کردے اور نہ ہی کسی غائب کو رد کرنے کی اجازت ہے " [2]

نہج البلاغہ کی بعض عبارتوں سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ " بیعت " ایک بار سے زیادہ نہیں ہوتی، اس میں تجدید نظر نہیں ہوسکتی، اور نہ ہی اس میں فسخ کا اختیار ہوتا ہے اور جو شخص اس سے سرتابی کرے وہ طعنہ زن اور عیب جو شمار ہوتا ہے، اور جو شخص اس کے قبول یا رد کرنے کے بارے میں غور و فکر کرے یا شک و تردد کرے وہ منافق ہے!

" انها بیعة واحدة، لا یثنی فیها النظر، ولا یستأنف فیها الخیار، الخارج منها طاعن، والمروی فیها مداهن " [3]

ان تعبیرات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ ان لوگوں کے سامنے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے آپؑ کی امامت منصوصہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور بہانہ جوئی کرتے تھے، بیعت کے مسئلہ کے ساتھ جو ان کے نزدیک مسلم تھا استدلال کرتے تھے، تاکہ امامؑ کی اطاعت سے روگردانی کی انھیں گنجائش نہ ہو، اور معاویہ اور اس کے مانند لوگوں کے گوش گذار فرماتے تھے کہ جس طرح وہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت کی مشروعیت کا قائل ہے۔ اسی طرح اسے امامؑ کی خلافت کا بھی قائل ہونا چاہیئے، اور ان کے لیے سر تسلیم خم کرنا چاہیئے (بلکہ آپ کی خلافت تو زیادہ مشروع ہے، چونکہ آپ کی بیعت زیادہ وسیع اور عام لوگوں کی رضا و رغبت سے انجام پائی تھی)

اس بنا پر بیعت کے ساتھ استدلال کرنا، امام کے خدا و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ منصوب ہونے کے مسئلہ اور بیعت کے تاکیدی ہونے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا۔

---

[1] نہج البلاغہ خط نمبر ۔

[2] نہج البلاغہ خط نمبر ۔

* توجہ رکھنا چاہیئے کہ گذشتہ خلفاء کی بیعت پر اس لیے تکیہ کیا گیا تھا، چونکہ معاویہ انھیں کی طرف سے منصوب ہوا تھا، اور ان کی حمایت کا دم بھرتا تھا، لہٰذا جو کچھ خطبہ شقشقیہ میں بیان ہوا ہے اس کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔

[3] نہج البلاغہ خط نمبر ۔

لہٰذا اسی نہج البلاغہ میں ایک موقع پر امامؑ حدیث ثقلین کے ساتھ جو امامت کے نصوص میں سے ہے۔ اشارہ فرماتے ہیں۔[1]

اور دوسری جگہ مسئلہ وصیت و وراثت کی طرف اشارہ کرتے ہیں[2] (غور کیجیے)

اور اپنی دوسری عبارتوں میں بیعت کے لیے وفاداری کے لازم و ضروری ہونے، اور اس کے دوام اور فسخ و تجدید نظر کے عدم امکان اور تکرار کی احتیاج کے نہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ یہ بھی ایسے مسائل ہیں جو بیعت کے سلسلہ میں قابل قبول ہیں۔

ضمنی طور پر ان سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر بیعت جبر و اکراہ کا پہلو رکھتی ہو یا لوگوں کو غفلت میں رکھنے کی صورت میں انجام پائے تو اسکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ وہی بیعت قابل قدر ہے جو ارادہ و فکر کی آزادی و اختیار اور مطالعہ کے بعد انجام پائے، (پھر بھی غور کیجیے)

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸۷۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۔

۲۰۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُونَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۙ

۲۱۔ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝

ترجمہ

۲۰۔ خدا نے بہت سے غنائم کا تمھیں وعدہ دیا ہے، جو تم حاصل کرو گے، لیکن ان میں سے یہ ایک تمھارے لیے زیادہ جلدی فراہم کردی ہے اور لوگوں، (دشمنوں) کے دست ظلم کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنین کے لیے ایک نشانی ہو اور تمھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے۔

۲۱۔ علاوہ ازیں دوسرے غنائم و فتوحات جن پر تمھیں قدرت نہیں ہے۔ لیکن خدا کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، تمھیں عطا کرے گا، اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

صلح حدیبیہ کی مزید برکات

یہ آیات اسی طرح سے "صلح حدیبیہ" سے مربوط مباحث اور اس کے بعد کے واقعات کو بیان کررہی ہیں، اور

ان برکات و فوائد کی۔ جو اس رہ گزر سے مسلمانوں کو نصیب ہوئے۔ تشریح کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے" خدا نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ کیا ہے، جنھیں تم حاصل کرو گے، لیکن یہ ایک بہت جلدی تمھارے لیے فراہم کر دی ہے" (وعدکم اللہ مغانم کثیرۃ تأخذونھا فعجل لکم ھذہ)۔

آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ یہاں غنائم کثیرہ سے مراد وہ تمام غنائم ہیں جو خدا نے مسلمانوں کو عطا کیے تھے، چاہے تھوڑی مدت میں اور چاہے طویل مدت میں، یہاں تک کہ مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ غنائم جو دامن قیامت تک مسلمانوں کے ہاتھ آتے رہیں گے وہ بھی اس عبارت میں داخل ہیں۔

اور یہ جو وہ کہتا ہے" ان میں سے یہ ایک بہت جلدی تمھارے لیے فراہم کی ہے، تو غالباً اسے "غنائم خیبر" کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ جو مختصر سے فاصلہ میں فتح حدیبیہ کے بعد فراہم ہوئی۔

لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ" ھذہ" فتح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے، جو عظیم ترین معنوی فتح تھی۔

اس کے بعد اس ماجرہ میں مسلمانوں کے لیے خدا کے الطاف میں سے ایک دوسرے لطف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: " اور لوگوں کے دست تعدی کو تم سے روک دیا" (وکف ایدی الناس عنکم)۔

یہ ایک بڑا لطف تھا کہ وہ افراد کی کمی اور کافی مقدار میں آلاتِ جنگ کے نہ ہونے کے باوجود، وہ بھی وطن سے دور دراز کے علاقہ میں اور دشمن کے عین گڑھ میں حملے سے بچے رہے، اور دشمن کے دل میں اس طرح کا رعب ڈالا کہ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کا حملہ کرنے سے رُکے رہے۔

مفسرین کی ایک جماعت اس جملہ کو خیبر کے ماجرے کی طرف اشارہ سمجھتی ہے کہ "بنی اسد" اور "بنی غطفان" کے قبائل نے یہ مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے پیچھے مدینہ پر حملہ کر دیں اور مسلمانوں کے اموال کو لوٹ کر لے جائیں اور ان کی خواتین کو قید کر لیں۔

یا ان دونوں قبیلوں کی ایک جماعت کے مصمم ارادہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ جن کا ارادہ یہ تھا کہ یہودیوں کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن خدا نے ان کے دلوں میں رعب اور وحشت ڈال دی اور وہ اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، چونکہ بعد کی چند آیات میں ہم اسی تعبیر کو مشاہدہ کرتے ہیں جو اہل مکہ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور ایک تفصیل و تشریح کے مانند ہے، اس مطلب کے لیے جو زیر بحث آیت میں آیا ہے۔

اور قرآن کی روش کے ساتھ جو اجمال و تفصیل کی روش ہے سازگار ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مشہور روایات کے مطابق ساری کی ساری سورۂ فتح ماجرائے حدیبیہ کے بعد اور پیغمبرؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں نازل ہوئی ہے۔

اس کے بعد اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے خدا کی نعمتوں میں سے دو دوسری عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، مقصد یہ تھا کہ یہ واقعات مومنین کے لیے (تیری دعوت کی حقانیت پر) نشانی بنیں، اور خدا تمھیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرے" (ولتکون اٰیۃ للمؤمنین ویھدیکم صراطًا مستقیمًا)۔

اگرچہ بعض مفسرین "لتکون" کی ضمیر کو "مغانم موعود" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے مسلمانوں کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھنے کی طرف، لیکن مناسب یہ ہے کہ یہ ضمیر "حدیبیہ" کے تمام حوادث اور اس کے بعد کے واقعات کی طرف لوٹے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت، اور پیغمبرؐ کی صداقت پر ایک دلیل، اور لوگوں کے لیے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کا ایک وسیلہ تھا، اور ان کا ایک حصہ تو پیشین گوئی اور خبر غیبی کا پہلو رکھتا تھا اور ان میں سے بعض عام قسم کے حالات و اسباب کے ساتھ سازگار نہ تھے اور مجموعی طور سے یہ سب پیغمبرؐ کے معجزات میں سے واضح معجزہ شمار ہوتے تھے۔

❊ ❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں مسلمانوں کو مزید بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے:

"خدا نے تمہیں اور دوسری فتوحات اور غنیمتوں کا وعدہ دیا، جن پر تمہیں نہ پہلے قدرت تھی نہ اب ہے، لیکن خدا کی قدرت ان سب پر احاطہ کیے ہوئے ہے، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔" (واخری لم تقدروا علیھا قد احاط اللہ بھا وکان اللہ علیٰ کل شیء قدیرًا)۔

اس بارے میں کہ یہ وعدہ کونسی غنیمت اور کونسی کامیابی کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض تو اسے "فتح مکہ" اور "حنین" کی غنیمتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور بعض ان فتوحات اور غنیمتوں کی طرف، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اُمت اسلامی کو نصیب ہوئیں۔ (مثل فتح ایران و روم و مصر)

یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام ہی کی طرف اشارہ ہو۔[1]

"لم تقدروا علیھا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان اس سے پہلے ہرگز اس قسم کے فتوحات و غنائم کا خیال تک نہ دیتے تھے، لیکن اسلام کی برکت اور خدائی امدادوں کی بنا پر ان میں یہ قدرت پیدا ہوگئی۔

بعض نے اس جملہ سے یہ مطلب نکالا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان پہلے سے ان فتوحات کے بارے میں بحث چلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ان کو انجام دینے کے لیے خود کو ناتواں اور کمزور سمجھتے تھے، خصوصاً وہ حدیث جو جنگِ احزاب کے واقعہ میں منقول ہے اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ اس دن جب کہ پیغمبرؐ نے مسلمانوں کو ایران و روم و یمن کی فتح کی بشارت دی تو منافقین نے اس کا مذاق اڑایا۔

"قد احاط اللہ بھا" (خدا نے ان کا احاطہ فرمایا) کا جملہ ان غنائم یا فتوحات پر، پروردگار کی قدرت کے احاطہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن بعض نے اسے اس کے احاطۂ عملی کی طرف اشارہ سمجھا ہے، لیکن پہلا معنی آیت کے دوسرے جملوں کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ البتہ دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

اور آخر میں آیت کا آخری جملہ یعنی "وکان اللہ علیٰ کل شیء قدیرًا" درحقیقت پہلے جملہ کے لیے علت

---

[1] "اخریٰ" "مغانم" کی صفت ہے جو محذوف ہے، اور تقدیر میں "مغانم اخریٰ" ہے، جو منصوب ہے "مغانم کثیرۃ" پر عطف کی بنا پر۔

کے بیان کے طور پر ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی ہر چیز پر قدرت کی بناء پر اس قسم کی فتوحات مسلمانوں کے لیے عجیب نہیں ہیں۔

بہر حال یہ آیت اخبار غیبی، اور قرآن مجید کی آئندہ کے بارے میں پیشین گوئیوں میں سے ہے، یہ کامیابیاں تھوڑی سی مدت میں وقوع پذیر ہوئیں، اور ان آیات کی عظمت کو واضح کیا،

ایک نکتہ

جنگِ خیبر کا ماجرا

جب پیغمبرؐ حدیبیہ سے واپس لوٹے تو تمام ماہ ذی الحجہ اور ہجرت کے ساتویں سال کے محرم کا کچھ حصہ مدینہ میں توقف کیا، اس کے بعد اپنے اصحاب میں سے اُن ایک ہزار چار سو افراد کو جنہوں نے حدیبیہ میں شرکت کی تھی ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، (جہاں اسلام کے برخلاف تحریکوں کا مرکز تھا، اور پیغمبرؐ کسی مناسب فرصت کے لیے گن گن کر دن گزار رہے تھے کہ اس مرکز فساد کو ختم کریں)

"غطفان" کے قبیلہ نے شروع میں تو خیبر کے یہودیوں کی حمایت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد میں ڈر گئے اور اس سے رُک گئے۔

پیغمبرؐ جس وقت "خیبر" کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپؐ نے اپنے صحابہ کو رُکنے کا حکم دیا، اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کیا اور یہ دُعا پڑھی۔

"اللھم رب السماوات وما اظللن، ورب الارضین وما اقللن ....
... نسألك خیر ھذہ القریۃ، وخیر اھلھا، ونعوذبك من شرّھا وشرّ اھلھا، وشرّ مافیھا"

"خداوندا! اے آسمانوں کے پروردگار اور جن پر انھوں نے سایہ ڈالا ہے، اور اے زمینوں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انھوں نے اُٹھا رکھا ہے، میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیر ہے اس کا طلب گار ہوں، اور تجھ سے اس کے شر اور اس میں رہنے والوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

اس کے بعد فرمایا: "بسم اللہ" آگے بڑھو! اور اس طرح سے رات کے وقت "خیبر" کے پاس جا پہنچے، اور صبح کے وقت جب اہلِ "خیبر" اس ماجرے سے باخبر ہوئے تو خود کو لشکرِ اسلام کے محاصرہ میں دیکھا، اس کے بعد پیغمبرؐ نے یکے بعد دیگرے ان قلعوں کو فتح کیا، یہاں تک کہ آخری قلعہ تک، جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور

تھا، اور مشہور یہودی کمانڈر "مرحب" اس میں رہتا تھا، پہنچ گئے۔

اُنھیں دنوں میں ایک سخت قسم کا دردِ سر، جو کبھی کبھی پیغمبرؐ کو عارض ہُوا کرتا تھا، آپؐ کو عارض ہوگیا، اس طرح سے کہ ایک دو دن آپ اپنے خیمہ سے باہر نہ آسکے تو اس موقع پر (مشہور اسلامی تواریخ کے مطابق) حضرت ابوبکر، نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر یہودیوں کے لشکر پر حملہ آور ہُوئے، لیکن کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس پلٹ آئے دوسری دفعہ "حضرت عمر" نے علم اُٹھایا، اور مسلمان پہلے دن کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے، لیکن بغیر کسی نتیجہ کے واپس پلٹ آئے۔

یہ خبر رسولؐ کے کانوں تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

• اما واللہ لاعطینھا غدًا رجلًا یحب اللہ ورسولہ، ویحبہ اللہ ورسولہ، یاخذھا عنوۃ:

"خدا کی قسم کل یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے، اور خدا اور پیغمبر اس کو دوست رکھتے ہیں، اور وہ اس قلعہ کو طاقت کے زور سے فتح کرے گا"۔

ہر طرف سے گردنیں اٹھنے لگیں کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟ کچھ لوگوں کا اندازہ تھا کہ پیغمبرؐ کی مراد علیؑ ہیں، لیکن علیؑ ابھی وہاں موجود نہیں تھے، کیونکہ شدید آشوب چشم انہیں لشکر میں حاضر ہونے سے مانع تھا، لیکن صبح کے وقت علیؑ اونٹ پر سوار ہوکر وارد ہُوئے، اور پیغمبرؐ کے خیمہ کے پاس اُترے درحالیکہ آپؑ کی آنکھیں شدت کے ساتھ درد کر رہی تھیں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: میرے نزدیک آؤ! آپ قریب گئے تو آپ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب علیؑ کی آنکھوں پر ملا اور اس معجزہ کی برکت سے آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہوگئیں اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم ان کے ہاتھ میں دیا۔

علی علیہ السلام لشکرِ اسلام کو ساتھ لے کر خیبر کے سب سے بڑے قلعہ کی طرف بڑھے تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے قلعہ کے اُوپر سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "میں علی بن ابی طالب" ہوں۔ اس یہودی نے پکار کر کہا۔

اے یہودیو! اب تمھاری شکست کا وقت آن پہنچا ہے! اس وقت اس قلعہ کا کمانڈر مرحب یہودی، علی علیہ السلام سے مقابلہ کے لیے نکلا، اور کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ہی کاری ضرب سے زمین پر گر پڑا۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان شدید جنگ شروع ہوگئی، علی علیہ السلام قلعہ کے دروازے کے قریب آئے، اور ایک قوی اور پُر قدرت حرکت کے ساتھ دروازے کو اکھاڑا اور ایک طرف پھینک دیا، اور اس طرح سے قلعہ کھل گیا اور مسلمان اس میں داخل ہوگئے اور اُسے فتح کرلیا۔

یہودیوں نے اطاعت قبول کر لی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ اس اطاعت کے عوض ان کی جان بخشی کی جائے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول کر لیا، منقول غنائم اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے اور وہاں کی زمینیں اور باغات آپؐ نے یہودیوں کو اس شرط کے ساتھ سپرد کر دیئے کہ اس کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔[1]

[1] کامل ابن اثیر (اہل سنت کے مشہور مورخ) جلد ۲ صفحہ ۲۱۶ - ۲۲۱ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

۲۲۔ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

۲۳۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○

۲۴۔ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ○

۲۵۔ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَــــُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

ترجمہ

۲۲۔ اگر کفّار (سرزمین حدیبیہ میں) تم سے جنگ کرتے تو بہت جلد بھاگ

کھڑے ہوتے، اور پھر کوئی اپنا ولی اور یار و یاور نہ پاتے۔

۲۳ - یہ سُنتِ الٰہی ہے جو پہلے بھی یہی تھی، اور تو کبھی بھی سنت الٰہی میں تغیر و تبدیلی نہ پائے گا۔

۲۴- وہ وہی تو ہے جس نے ان کا ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ اُن سے مکہ میں روک لیا، بعد اس کے کہ تمہیں ان پر فتح یاب کر دیا تھا، اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

۲۵- وہ ایسے لوگ ہیں جو کافر ہو گئے ہیں، اور تمہیں مسجد الحرام (کی زیارت) سے روکا ہے، اور تمہاری قربانیوں کے قُربان گاہ کی جگہ تک پہنچنے سے مانع ہُوئے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ صاحب ایمان مرد اور عورتیں تمہاری بے خبری میں تمہارے پاؤں تلے روندے جائیں گے، اور اس طرح سے ایک عار اور عیب لاشعوری طور پر تمہیں لگ جائے گا، (تو خدا ہرگز اس جنگ سے مانع نہ ہوتا) مقصد یہ تھا کہ خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے، اور اگر مؤمنین اور کفّار (مکّہ میں) ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہو جاتے، تو ہم کافروں پر دردناک عذاب کرتے۔

تفسیر

اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی

یہ آیات اسی طرح سے "حدیبیہ" کے عظیم ماجرے کے کچھ دوسرے پہلوؤں کو بیان کر رہی ہیں، اور اس

سلسلہ میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ خیال نہ کرو سرزمین "حدیبیہ" میں تمھارے اور مشرکین مکہ کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو مشرکین جنگ میں بازی لے جاتے، ایسا نہیں ہے، اکثر کفار تمھارے ساتھ وہاں جنگ کرتے تو بہت جلدی پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، اور پھر کوئی ولی و یاور نہ پاتے۔" (ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لا یجدون ولیًا ولا نصیرًا)۔

اور یہ بات صرف تم تک ہی منحصر نہیں ہے، " یہ تو ایک سُنت الٰہی ہے، جو پہلے بھی یہی تھی اور تم سنت الٰہی میں ہرگز تغیر و تبدیلی نہ پاؤ گے" (سنة الله التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلًا)۔

یہ خدا کا ایک دائمی قانون ہے کہ اگر مومنین جہاد کے معاملہ میں کمزوری اور سستی نہ دکھائیں اور پاکیزہ دل اور خالص نیت کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں، تو خدا انھیں کامیابی عطا کرتا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات اس امر میں امتحان کے طور پر یا دوسرے مقاصد کے ماتحت دیر یا جلدی ہو جائے، لیکن آخری کامیابی یقیناً انہیں کے لیے ہوگی۔

لیکن ایسے مواقع پر جیسا کہ میدان "احد" ہوا کہ ایک گروہ نے پیغمبرؐ خدا کے حکم سے سرتابی کی، اور ایک گروہ نے اپنی نیات کو عشق دُنیا سے آلودہ کیا، اور غنائم جمع کرنے میں لگ گئے، انجام کار انھیں ایک تلخ شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور بعد میں بھی معاملہ ایسا ہی ہے۔

وہ اہم نکتہ جو یہ آیات خاص طور پر بیان کر رہی ہیں یہ ہے کہ کہیں قریش بیٹھ کر یہ نہ کہنے لگیں، کہ افسوس ہم نے جنگ کیوں نہ کی اور اس چھوٹے سے گروہ کی سرکوبی کیوں نہ کی، افسوس کہ شکار ہمارے گھر میں آیا، اور اس سے ہم نے غفلت برتی، افسوس، افسوس۔

ہرگز ایسا نہیں ہے اگرچہ مسلمان ان کی نسبت تھوڑے تھے، اور وطن اور امن کی جگہ سے بھی دُور تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اگر جنگ چھڑ جاتی تو پھر بھی قوت ایمانی اور نصرت الٰہی کی برکت سے کامیابی انھیں ہی حاصل ہوتی، کیا جنگِ "بدر" اور "احزاب" میں ان کی تعداد بہت کم اور دشمن کا ساز و سامان اور لشکر زیادہ نہ تھا؟ ان دونوں مواقع پر دشمن کو کیسے شکست ہوگئی۔

بہر حال اس حقیقت کا بیان مومنین کے دل کی تقویت اور دشمن کے دل کی کمزوری اور منافقین کے "اگر" اور "مگر" کے ختم ہونے کا سبب بن گئی اور اس نے اس بات کی نشاندہی کر دی کہ ظاہری طور پر حالات کے برابر نہ ہونے کے باوجود اگر جنگ چھڑ جائے تو کامیابی مخلص مومنین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا نکتہ جو ان آیات میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ فرماتا ہے "وہی تو ہے جس نے کفار کے ہاتھ کو مکہ میں تم سے باز رکھا اور تمہارے ہاتھ کو اُن سے، یہ اس وقت ہوا جبکہ تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی، اور خدا وہ سب کچھ جو تم انجام دے رہے ہو دیکھ رہا ہے"۔ (وھو الذی کف ایدیھم عنکم وایدیکم عنھم ببطن مکۃ من بعد ان اظفرکم علیھم وکان اللہ بما تعملون بصیرًا)۔

واقعاً یہ ماجرا "فتح المبین" کا واضح مصداق تھا، وہی تعریف جو قرآن نے اس کے لیے انتخاب کی تھی، ایک محدود جمعیت، کافی جنگی ساز و سامان کے بغیر دشمن کی سرزمین میں داخل ہو جائے، ایسا دشمن جس نے کئی بار مدینہ پر لشکر کشی کی تھی اور انہیں درہم برہم کرنے کے لیے ایک عجیب کوشش میں لگا ہوا تھا، لیکن اب جبکہ اس نے ان کے شہر و دیار میں قدم رکھ دیا ہے، تو اس طرح سے مرعوب ہوا کہ صلح کی پیش نہاد کرتا ہے، اس سے بڑھ کر اور کامیابی کیا ہو گی کہ بغیر اس کے کہ کسی کی نکسیر پھوٹے، دشمن پر اس قسم کی برتری حاصل ہو جائے؟!

اس میں شک نہیں کہ "صلح حدیبیہ" کا ماجرا پورے جزیرہ عرب میں قریش کی شکست اور مسلمانوں کی فتح شمار ہوتا تھا، اور وہ اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ دشمن سے اس کا رعب و دبدبہ ختم کر دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے لیئے ایک "شان نزول" بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

مشرکین مکہ نے "حدیبیہ" کے واقعہ میں چالیس افراد کو مسلمانوں پر ضرب لگانے کے لیے مخفی طور پر حملہ کے لیے تیار کیا، لیکن ان کی یہ سازش مسلمانوں کی ہوشیاری سے نقش بر آب ہو گئی، اور مسلمان ان سب کو گرفتار کر کے پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے، اور پیغمبرؐ نے انہیں رہا کر دیا۔

بعض نے ان کی تعداد ۸۰ افراد لکھی ہے، جو تنعیم پہاڑ سے صبح کی نماز کے وقت تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں پر حملہ کریں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے سایئے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تاکہ قریش کے نمائندہ کے ساتھ صلح کے معاہدہ کو ترتیب دیں، اور علیؑ لکھنے میں مصروف تھے، تو جوانانِ مکہ میں سے ۳۰ افراد اسلحہ کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوئے، اور معجزانہ طور پر ان کی یہ سازش بے کار ہو گئی اور وہ سب کے سب گرفتار ہو گئے اور حضرتؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔[1]

اس شان نزول کے مطابق من بعد ان اظفرکم علیھم کا جملہ اس گروہ پر کامیابی کی طرف اشارہ ہے، جبکہ سابقہ تفسیر کے مطابق کل لشکرِ اسلام کی کل مشرکین پر کامیابی مراد ہے اور یہ آیت کے معانی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۲۳۔ اس شانِ نزول کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ "قرطبی" "ابوالفتوح رازی" "آلوسی" نے "روح المعانی" میں "شیخ طوسی" نے "تبیان" میں "مراغی" اور دوسروں نے بھی نقل کیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مکہ کے اندر نہ لڑنے پر تکیہ کرتا ہے، یہ تعبیر ممکن ہے دو نکتوں کی طرف اشارہ ہو:
پہلا یہ کہ: "مکہ" دشمن کی قدرت کا مرکز تھا، اور قائدے کے مطابق انھیں اس مناسب موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے تھا اور مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیئے تھا، اور اصطلاع کے مطابق وہ تو مسلمانوں کو آسمان میں ڈھونڈ رہے تھے، جبکہ انھوں نے انہیں اپنی ہی زمین میں پالیا تھا، تو انھیں آسانی کے ساتھ چھوڑنا نہیں چاہیئے تھا، لیکن خدا نے ان کی قدرت چھین لی۔
دوسرا یہ کہ مکہ خدا کا گھر تھا اور امن کا حرم تھا، اگر اس میں جنگ اور خون ریزی واقع ہو جاتی تو ایک طرف تو حرم کا احترام مخدوش ہو جاتا دوسری طرف مسلمانوں کے لیے عیب و عار کی بات تھی کہ انھوں نے اس مقدس سرزمین کے سنتی امن کو درہم برہم کر دیا، لہٰذا پیغمبر اور مسلمانوں پر خدا کی ایک عظیم نعمت یہ تھی کہ اس ماجرے کے دو سال بعد "مکہ" فتح ہو گیا، اور ہوا بھی کسی خون ریزی کے بغیر۔
آخری زیر بحث آیت میں صلح حدیبیہ کے مسئلہ اور اس کے فلسفہ سے مربوط ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:
وہ (تمھارے دشمن) ایسے لوگ ہیں جو کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے تمھیں مسجد حرام کی زیارت سے روک دیا ہے۔ اور تمھاری قربانیوں کی قربان گاہ کے مقام تک پہنچنے میں مانع ہوئے ہیں: (هم الذين كفروا وصدوكم عن المسجد الحرام والهدى معكوفا ان يبلغ محله)۔ [1]
ان کا ایک گناہ تو ان کا کفر تھا اور دوسرا گناہ یہ کہ تمھیں انھوں نے مراسم عمرہ اور طواف خانہ خدا سے روک دیا، اور تمھیں قربانی کے اونٹوں کو ان کے محل یعنی مکہ میں قربانی کی اجازت نہ دی (محل قربانی عمرہ کے لیے مکہ ہے اور حج کے لیے سرزمین منیٰ) حالانکہ خانۂ خدا کو تمام اہل ایمان کے لیے آزاد ہونا چاہیئے اور اس سے روکنا بہت ہی بڑا گناہ ہے، جیسا کہ قرآن ایک دوسری جگہ پر کہتا ہے: "ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيها اسمه": (اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو لوگوں کو خدا کی مساجد میں خدا کا نام لینے سے باز رکھے"؟! (بقرہ - ۱۱۴)
ان گناہوں کا تقاضا یہ تھا کہ خدا انہیں تمھارے ہاتھ سے سزا دیتا اور سخت عذاب کرتا۔
لیکن ایسا کیوں نہ کیا؟ آیت کے متن نے اس کی دلیل کو واضح کر دیا ہے فرماتا ہے: "اگر یہ وجہ نہ ہوتی کہ صاحب ایمان مرد اور عورتیں اسی دوران میں تمھاری لاعلمی اور بے خبری میں تمھارے رگڑے میں آکر ہلاک ہو جاتے، اور اس طریقہ سے بغیر اطلاع کے عیب و عار تمھارے دامن گیر ہو جاتا، تو خداوند عالم ہرگز اس جنگ سے مانع نہ ہوتا، اور تمھیں ان پر مسلط کر دیتا تاکہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں۔
(ولولا رجال مؤمنون ونساء مؤمنات لم تعلموهم ان تطئوهم

---

[1] "معکوفا" "عکوف" کے مادہ سے چلنے سے منع کرنے اور ایک محل میں رہنے کے معنی میں ہے۔

فتصیبکم منھم معرۃ بغیر علم ۔ [1]

یہ آیت مسلمان مردوں اور عورتوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے، جو اسلام تو لے آیا تھا، لیکن کئی ایک علل واسباب کی بنا پر وہ ہجرت کرنے پر قادر نہ ہوئے تھے، اور مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔

اگر مسلمان مکہ پر حملہ کرتے تو مسلمانوں کے اس کمزور گروہ کی جان مکہ میں خطرے میں پڑ جاتی اور مشرکین کی زبان کھل جاتی اور وہ یہ کہتے کہ لشکرِ اسلام نہ اپنے مخالفین پر رحم کرتا ہے اور نہ ہی اپنے پیروکاروں اور موافقت کرنے والوں پر، اور یہ ایک بہت بڑا عیب اور عار ہونا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس عیب سے مراد کفارہ اور قتل خطاء کی دیت کا واجب ولازم ہوتا ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

"معرۃ" "عر" (بروزن شر) کے مادہ سے اور "عر" (بروزن حر) اصل میں کھجلی اور خارش کی بیماری کے معنی میں ہے جو ایک قسم کا جلد کا شدید عارضہ ہے، جو انسان یا حیوانات کو عارض ہوتا ہے اس کے بعد اس کو وسعت دے دی گئی، اور ہر قسم کے زیان وضرر پر، جو انسان کو پہنچتا ہے، اس کا اطلاق ہوا ہے۔

اس کے بعد اس بات کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے، "مقصد یہ تھا کہ خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے": (لیدخل اللہ فی رحمتہ من یشاء)۔

ہاں! خدا چاہتا تھا کہ "مکہ" کے کمزور وناتواں مومنین کو اپنی رحمت کا مشمول کرے اور انھیں کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "صلح حدیبیہ" سے ایک مقصد یہ تھا کہ مشرکین کا ایک گروہ جو ہدایت کے قابل تھا ان کی ہدایت ہو جائے اور وہ رحمتِ خدا میں داخل ہو جائے۔

"من یشاء" (جسے چاہے) کی تعبیر ان لوگوں کے معنی میں ہے جو شائستگی اور لیاقت رکھتے ہیں، کیونکہ مشیت الٰہی کا سرچشمہ ہمیشہ اس کی حکمت ہوتی ہے اور حکیم بغیر دلیل کے ارادہ نہیں کرتا، اور بغیر حساب کے کوئی کام انجام نہیں دیتا۔

اور آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے "اگر مومنین کی صفیں مکہ میں کفار سے جدا ہو جاتیں، اور مکہ کے مومنین کے ختم ہو جانے کا خوف نہ ہوتا، تو ہم کفار کو دردناک عذاب کی سزا دیتے اور انھیں تمھارے ہاتھ سے سخت سزا دیتے" (لو تزیلوا لعذبنا الذین کفروا منھم عذابا الیما)۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا معجزانہ طور پر اس گروہ کو دوسروں سے جدا کر سکتا تھا، لیکن پروردگار کی سنت، استثنائی موقعوں کے سوا، کاموں کو عادی اسباب سے انجام دینا ہے۔

---

[1] "لولا" کا جواب اوپر والے جملہ میں محذوف ہے، اور تقدیر میں اس طرح تھا: لما کف ایدیکم عنھم۔ یا۔ لو طئتم رقاب المشرکین بنصرنا ایاکم، ہماری نصرت سے تم مشرکین کی گردنیں مروڑ دیتے۔

"تزیّلوا" "زوال" کے مادہ سے یہاں جُدا اور متفرق ہونے کے معنی میں ہے۔

متعدد روایات سے، جو شیعہ اور اہلِ سنت کے طرق سے اس آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ صاحب ایمان افراد تھے جو کفار کی صلب میں موجود تھے، خدا نے ان کی وجہ سے کفار کو عذاب نہیں کیا۔

منجملہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔

کسی نے امامؑ سے سوال کیا، کیا علیؑ دینِ خدا میں قوی اور با قدرت نہ تھے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں قوی تھے، اس نے عرض کیا: تو پھر ان (بے ایمان اور منافق) اقوام پر مسلط ہو جانے کے باوجود انھیں نابود کیوں نہ کیا؟ اس میں کون سی چیز مانع تھی؟

آپؑ نے فرمایا: قرآن مجید کی ایک آیت!

اس نے سوال کیا، کونسی آیت؟

آپؑ نے فرمایا یہ آیت جس میں خدا فرماتا ہے:

"لو تزیّلوا لعذبنا الذین کفروا منھم عذابًا الیمًا"

"اگر وہ جدا ہو جاتے تو ہم کافروں کو دردناک عذاب کرتے"

پھر آپؑ نے مزید فرمایا۔

"انہ کان اللہ عزوجل ودائع مؤمنون فی اصلاب قوم کافرین ومنافقین، ولم یکن علی(ع) لیقتل الاباء حتی تخرج الودائع! ..... وکذالک قائمنا اھل البیت لن یظھر ابدا حتی تظھر ودائع اللہ عزوجل!

"خدا کی کچھ ایمان والی امانتیں کفار اور منافقین کے صلبوں میں تھیں، اور علیؑ ان آباء کو قتل نہیں کرتے تھے جب تک کہ یہ امانتیں ظاہر نہ ہو لیں ..... اور اسی طرح ہم اہلِ بیت کے قائم ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ یہ امانتیں ظاہر نہ ہو جائیں۔"[1]

یعنی خدا جانتا ہے کہ ان کی اولاد میں سے ایک گروہ اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان قبول کرے گا اور انہیں کی وجہ سے ان کے باپ دادا کو جلدی کے عذاب سے معاف کیے ہوئے ہے۔

اس معنی کو "قرطبی" نے ایک دوسری عبارت کے ساتھ اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اوپر والی آیت مومنین مکہ کے کفار سے اختلاط کے معنی میں بھی ہو اور ان مومنین کے بارے میں بھی ہو جو ان کی صلب میں موجود تھے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۰، دیگر متعدد روایات بھی۔

۲۶- اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰی وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۟

ترجمہ

۲۶- اس وقت کو یاد کرو جب کافر اپنے دلوں میں جاہلیّت کا غصہ اور نخوت رکھتے تھے، اور اس کے مقابل میں) خدا نے اپنے رسُول اور مومنین پر قرار اور وقار نازل کیا، اور ان کے لیے تقوٰی کو لازم قرار دیا، کیونکہ وہ ہر شخص سے زیادہ شائستہ، لائق اور اس کے حق دار اور اہل تھے اور خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

تفسیر

تعصب اور حمیت جاہلیت، کفّار کے لیے بزرگ ترین سدّ راہ

ان آیات میں پھر "حدیبیہ کے ماجرے سے مربوط مسائل بیان کیے جارہے ہیں، اور اس عظیم ماجرے کے دوسرے مناظر کو مجسم کررہا ہے۔

پہلے کفار کو خدا و پیغمبرؐ پر ایمان لانے اور حق و عدالت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے روکنے والے ایک اہم ترین عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلیت کا غصہ اور نخوت رکھتے تھے" (اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ حمیۃ الجاھلیۃ)[1]

اور اس کی وجہ سے پیغمبرؐ اور مومنین کے خانۂ خدا میں داخل ہونے، اور عمرہ و قربانی کے مراسم کے انجام دینے سے مانع ہوئے، اور یہ کہا کہ اگر یہ لوگ جنہوں نے میدان جنگ میں ہمارے آباء و اجداد اور بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ ہماری سرزمین اور ہمارے گھروں میں وارد ہوں اور صحیح و سالم پلٹ جائیں تو عرب ہمارے بارے میں کیا کہیں گے اور ہماری کیا حیثیت اور اعتبار باقی رہ جائے گا؟

یہی کبر و غرور و تعصب اور خشم جاہلی، اس بات تک سے مانع ہوا کہ "حدیبیہ" کے صلح نامہ کی ترتیب و تنظیم کے وقت خدا کا نام "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی صورت میں لکھا جانا قبول کریں، حالانکہ ان کے آداب و سنن کہتے تھے کہ خانہ خدا کی زیارت سب کے لیے جائز ہے اور سرزمین مکہ حرم امن ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو اس سرزمین میں یا حج و عمرہ کے مراسم میں دیکھتا تھا تو اس سے مزاحم نہ ہوتا تھا۔

انھوں نے اس عمل کے ذریعہ خانہ خدا اور اس کے حرم امن کے احترام کو بھی توڑا، اور اپنے سنن و آداب کو بھی زیر پا روندا، اور اپنے اور حقیقت کے درمیان ایک ضخیم پردہ بھی کھینچ دیا، اور "جاہلیت کی حمیتوں کے مرگبار اثرات ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"حمیت" اصل میں "حمی" (بروزن حمد) کے مادہ سے، اس حرارت کے معنی میں ہے، جو آگ یا سورج یا انسانی بدن اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر "بخار" کی حالت کو "حمی" (بروزن کبری) کہا جاتا ہے، اور غیض و غضب کی حالت کو، اسی طرح نخوت اور "خشم آلود تعصب" کو بھی "حمیت" کہتے ہیں۔

یہ ایسی حالت ہے جو جہالت، کوتاہی فکر اور علمی انحطاط کے زیر اثر خصوصیت کے ساتھ جاہل قوموں میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان کی بہت سی جنگوں اور خون ریزیوں کا سبب بنتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اس کے مقابلہ میں "خدا نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنا اطمینان اور قرار نازل فرمایا" (فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المؤمنین)۔

اس آرام و سکون نے، جو خدا پر ایمان اور اعتقاد اور اس کے لطف سے پیدا ہوا تھا، انھیں ضبط اور نفس پر

---

[1] "جعل" کبھی ایک مفعول لیتا ہے، اور یہ اس موقع پر ہوتا ہے جہاں ایجاد کے معنی میں ہو، جیسا کہ زیر بحث آیت میں کہ اس کا فاعل "الذین کفروا" ہے، اور اس کا مفعول "الحمیۃ" ہے، اور یہاں ایجاد سے مراد اس حالت کی حفاظت، اور اس کی پابندی اور لازم بنانا ہے، اور کبھی دو مفعول لیتا ہے، اور وہ اس جگہ ہوتا ہے جہاں ہونے کے معنی میں ہو،

تسلط کی دعوت دی اور ان کے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا، یہاں تک کہ اپنے بزرگ مقاصد کی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔
اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے جملہ کو ہٹا کر جو کاموں کے شروع کرنے کے لیے اسلام کی نشانی تھا۔ اس کی جگہ "باسمک اللھم" جو عربوں کے ماضی دور کی یادگار تھی۔ حدیبیہ کے صلح نامہ کے آغاز میں لکھنے پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محترم نامہ کے ہمراہ "رسول اللہ" کا لقب حذف کرنے پر بھی تیار ہو گئے اور اس عشق اور دلی تعلق کے برخلاف۔ جو وہ خانہ خدا کی زیارت اور مراسم عمرہ سے رکھتے تھے۔ اسی "حدیبیہ" سے مدینہ کی طرف لوٹ جانے پر آمادہ ہو گئے اور اپنے قربانی کے اُونٹ حج و عمرہ کی سُنت کے برخلاف اسی جگہ قربان کرنے اور انجام مناسک کے بغیر ہی احرام سے باہر نکل آنے پر تیار ہو گئے۔

ہاں! وہ ضبطِ نفس کرنے، اور ان تمام ناخوشگوار اور خلافِ طبیعت امور کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی اختیار کرنے، پر آمادہ و تیار ہو گئے، حالانکہ اگر "حمیت جاہلیت" ان پر غالب آجاتی، تو ان میں سے ہر ایک چیز، اس سرزمین میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔

ہاں! جاہلیت کا تمدن، "حمیت" و "تعصب" اور جاہلانہ غیض و غضب" کی دعوت دیتا ہے، لیکن اسلام کا تہذیب "تمدن" "قرار" و "آرام" اور "ضبط نفس" کی طرف بلاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا نے ان کے لیے تقویٰ کو لازم و واجب قرار دے دیا، اور وہ ہر شخص سے زیادہ اس کے حقدار، لائق شائستہ اور اصل تھے"؛ والزمھم کلمۃ التقوٰی وکانوا احق بھا و اھلھا)۔

"کلمۃ" یہاں "روح" کے معنی میں ہے، یعنی خدا نے تقویٰ کی رُوح ان کے دلوں میں ڈال دی اور ان کے ہمراہ کر دی، جیسا کہ سُورۂ نساء کی آیہ ۱۷۱ میں عیسیٰؑ کے بارے میں آیا ہے،: انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ، مسیحؑ صرف خدا کے بھیجے ہُوئے (رسول) اس کا کلمہ اور اس کی طرف سے ایک روح ہے جسے مریم پر القاء فرمایا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "کلمہ تقویٰ" سے مراد وہ دستور و فرقان ہے، جو خدا نے اس سلسلہ میں مومنین کو دیا ہے۔ لیکن مناسب وہی "رُوح تقویٰ" ہے جو "تکوینی" پہلو رکھتا ہے اور ایمان و قرار اور احکام خداوندی سے تعلق قلبی کی پیداوار ہے۔

لہٰذا بعض روایات میں جو پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہیں "کلمۂ تقویٰ" کی "لا الٰہ الا اللہ" کے ساتھ [1] اور ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے "ایمان" کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ [2]

پیغمبر گرامیؐ کے ایک خطبہ میں یہ آیا ہے:

"نحن کلمۃ التقوٰی وسبیل الھدٰی"۔

---

[1] دُرِ المنثور جلد ۶ ص ۸۰۔

[2] "اصول کافی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۷۳۔

"ہم تقویٰ کا کلمہ اور ہدایت کی راہ ہیں۔" [1]

اسی معنی کے مشابہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

آپؑ نے فرمایا:

"نحن کلمة التقوٰی والعروة الوثقٰی"

"ہم کلمہ تقویٰ اور خدا کی مضبوط رسی ہیں۔" [2]

یہ بات واضح ہے کہ "نبوت" و "ولایت" پر ایمان لانا، اصل "توحید" اور معرفتِ خداوندی کی تکمیل کرتا ہے، کیونکہ وہ سب ہستیاں اللہ کی طرف دعوت دینے والی، اور توحید کی منادی کرنے والی ہیں۔

بہرحال مسلمان ان حساس لمحات میں، خشم و عصبانیت اور تعصب و نخوت میں گرفتار نہیں ہوئے، اور وہ درخشاں سرنوشت جو خدا نے ماجرائے حدیبیہ میں ان کے لیے رقم کی تھی، اُسے اُنھوں نے جہالت اور غصہ کی آگ سے نہیں جلایا۔

کیونکہ وہ کہتا ہے "مسلمان تقویٰ کے سب سے زیادہ سزاوار اور لائق تھے، اور اس کے اہل اور حق دار تھے۔"

یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ مٹھی بھر بے ہودہ، نادان اور بت پرست جمعیت سے "جاہلیت کی حمیت" کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہیں تھی، لیکن ان موحد مسلمانوں سے جو ایک عرصہ سے مکتب قرآن میں تربیت پا چکے تھے، اس قسم کی عادت اور جاہلانہ خلق کی امید نہ تھی۔ ان سے جس چیز کی توقع تھی وہ وہی وقار و تقویٰ اور صبر و قرار تھا جس کا انھوں نے "حدیبیہ" میں اظہار کیا۔ اگرچہ قریب تھا کہ بعض بے صبرے تند مزاج، جو شاید گزشتہ زمانہ کی رسوم و عادات کے عادی تھے۔ اس سد کو توڑ دیں اور کوئی جھگڑا کھڑا کر دیں، لیکن پیغمبرؐ کا اطمینان اور وقار پانی کی طرح اُس آگ پر پڑا، اور اُسے خاموش کر دیا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ "اور خدا ہر چیز سے آگاہ اور اس کا عالم تھا اور ہے": (وکان اللہ بکل شیء علیمًا)۔

وہ کفار کی بُری نیتوں کو بھی جانتا ہے، اور سچے مومنین کے دلوں کی پاکیزگی کو بھی، یہاں پر تو وہ اطمینان و تقویٰ کو نازل کرتا ہے اور وہاں جاہلیت کی حمیت کو مسلط کر دیتا ہے کیونکہ خدا ہر قوم و ملت کو ان کی لیاقت و قابلیت کے مطابق ہی اپنے لطف و رحمت کا مشمول قرار دیتا ہے یا اپنے خشم و غضب کا۔

---

[1] خصال صدوق نور الثقلین جلد ۵ ص۔

[2] خصال صدوق نور الثقلین جلد ۵ ص۔

ایک نکتہ

حمیت جاہلیت کیا ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "حمیت" اصل میں "حمی" کے مادہ سے حرارت کے معنی میں ہے، اور اس کے بعد غضب کے معنی میں اور پھر نخوت و غضب کی آمیزش رکھنے والے تعصب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہ لفظ کبھی تو اسی مذموم معنی میں (جاہلیت کی قید کے ساتھ یا اس کے بغیر) اور بعض اوقات ممدوح اور پسندیدہ معنی میں استعمال ہوتا ہے اور منطقی غیرت اور ثبت اور اصلاحی امور میں ڈٹ جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

امیر المومنین علیؑ اپنے سست عنصر اور سرکش ساتھیوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"منیت بمن لایطیع اذا امرت ولایجیب اذا دعوت ..... امادین یجمعکم ولاحمیة تحمشکم؛

"میں ایسے لوگوں میں پھنس گیا ہوں، جنھیں اگر حکم دیتا ہوں تو وہ اطاعت نہیں کرتے، اور اگر دعوت دیتا ہوں تو قبول نہیں کرتے ..... کیا تم دین نہیں رکھتے ہو، جو تمھیں اکٹھا رکھے؟ یا ایسی غیرت جو تمھیں غصہ میں لے آئے (اور تمھیں اپنی ذمہ داری پورا کرنے پر آمادہ کردے)[1]

لیکن یہ عام طور پر اسی مذموم معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے خطبہ "قاصعہ" میں بارہا اسی معنی میں استعمال کیا ہے اور ابلیس کی مذمت میں جو مستکبرین کا پیشوا تھا۔

فرماتے ہیں۔

"صدقه به ابناء الحمیة واخوان العصبیة وفرسان الکبر و الجاهلیة؛

"اس کی نخوت و حمیت کے بیٹوں اور عصبیت کے بھائیوں اور کبر و جہالت کے مرکب کے سواروں نے تصدیق کی ہے۔"[2]

اسی خطبہ میں ایک دوسری جگہ، جہاں آپ لوگوں کو جاہلیت کے تعصبات سے ڈرا رہے ہیں، فرماتے ہیں:

"فاطفئوا ماکمن فی قلوبکم من نیران العصبیة و احقاد

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۳۹۔

[2] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۹۲ (خطبۂ قاصعہ)

الجاهلية، فانما تلك العصبية تكون في المسلم من خطرات الشيطان ونخواته ونزعاته ونفثاته!؟

" تعصب کے وہ شرارے اور جاہلیت کے وہ کینے جو تمہارے دلوں میں ہیں انھیں بجھا دو، کیونکہ یہ نخوت وحمیت اور ناروا تعصب مسلمانوں میں شیطان کی نخوت اور وسوسوں میں سے ہے۔" [1]

بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ کسی فرد یا جماعت میں اس قسم کی حالت کا ہونا اُس معاشرے کی پسماندگی اور گراوٹ کا باعث ہے۔ یہ انسان کی عقل وفکر پر سنگین پردے ڈال دیتا ہے اور اُسے صحیح ادراک اور کامل سوجھ بوجھ سے باز رکھتا ہے اور بعض اوقات اس کے تمام مصالح کو باد فنا کے سپرد کر دیتا ہے۔

اصولی طور پر ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف غلط رسومات اور طریقوں کا منتقل ہونا اسی طرفداری جاہلیت کے منحوس سائے میں صورت پذیر ہوتا ہے، اور انبیاء اور خدائی رہبروں اور پیشواؤں کے مقابلہ میں منحرف اقوام کی مخالفت بھی عام طور پر اسی راستہ سے ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے بیان ہوا ہے کہ جب آپؑ سے کسی نے "عصبیت" کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

" العصبية التي يأثم عليها صاحبها ان يرى الرجل شرار قومه خيرا من خيار قوم آخرين وليس من العصبية ان يحب الرجل قومه ولكن من العصبية ان يعين قومه على الظلم؟

" وہ تعصب جو گناہ کا موجب ہے یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اپنی قوم کے بُرے افراد کو دوسری قوم کے نیک اور اچھے افراد سے برتر سمجھے، لیکن اپنی قوم سے محبت کرنا اور انھیں دوست رکھنا تعصب نہیں ہے۔ تعصب یہ ہے کہ ظلم وستم میں ان کی مدد کرے۔" [2]

اس بُری عادت سے لڑنے، اور اس عظیم مہلکہ سے نجات حاصل کرنے کا بہترین راستہ، ہر قوم اور ہر معاشرے کی فکر و ایمان، اور تہذیب وتمدن کی سطح کو اُونچا کرنے کے لیے کوشش کرنا ہے۔

درحقیقت قرآن مجید نے اس درد کی دوا اسی زیر بحث آیت میں بیان کی ہے، جہاں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۷۳، حدیث ۷۰۔

وہ اس کے نقطۂ مقابل میں مؤمنین کے بارے میں بحث کرتا ہے، کہ وہ اطمینان و وقار اور رُوح تقویٰ کے حامل ہیں اور اس بنا پر جہاں ایمان، اطمینان اور تقویٰ ہے، وہاں حمیت جاہلیت نہیں ہے، اور جہاں حمیت جاہلیت ہے، وہاں ایمان، اطمینان اور تقویٰ نہیں ہے۔

۲۷۔ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ○

ترجمہ

۲۷۔ خدا نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا، انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر، انتہائی امن وامان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے ہوں گے یا اپنے ناخنوں کو کٹواتے ہوئے ہوں گے مسجد الحرام میں داخل ہوں گے، اور کسی شخص سے تمھیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی، لیکن خدا کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے (اور اس تاخیر میں ایک حکمت تھی) اور اس سے پہلے اس نے (تمھارے لیے) ایک قریب کی فتح قرار دی۔

تفسیر

پیغمبرؐ کا سچا خواب

یہ آیت بھی داستان "حدیبیہ" کے ایک اور گوشہ کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ قصہ یہ تھا:

پیغمبرؐ نے مدینہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے لیے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور اس خواب کو صحابہ کے سامنے بیان کر دیا، وہ سب کے سب شاد و خوش حال ہوئے، لیکن چونکہ ایک جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال پوری ہوگی، تو جس وقت قریش نے مکہ میں ان کے داخل ہونے کا راستہ حدیبیہ میں ان کے آگے بند کر دیا تو وہ شک و تردید میں مبتلا ہو گئے، کہ کیا پیغمبر کا خواب غلط بھی ہو سکتا ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوں گے؟ پس اس وعدہ کا کیا ہوا؟ اور وہ رحمانی خواب کہاں چلا گیا؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں فرمایا، کیا میں نے تمھیں یہ کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال پورا ہوگا؟

اوپر والی آیت اسی بارے میں مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں نازل ہوئی، اور تاکید کی کہ یہ خواب سچا تھا، اور ایسا مسئلہ حتمی و قطعی اور انجام پا جانے والا ہے۔

فرماتا ہے: "خدا نے اپنے پیغمبر کو خواب میں جو کچھ دکھلایا تھا وہ سچ اور حق تھا": (لقد صدق اللہ رسولہ الرءیا بالحق)۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر، انتہائی امن و امان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوں گے۔ یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوں گے مسجد الحرام میں داخل ہوں گے۔ اور کسی شخص سے تمھیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی" (لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رءوسکم و مقصرین لا تخافون)۔

لیکن خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے تم نہیں جانتے": (فعلم ما لم تعلموا)۔

---

[1] "صدق" فعل ماضی ہے۔ جس کے بعض اوقات دو مفعول ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر والی آیت میں "رسولہ" مفعول اول ہے، اور "رءیا" مفعول دوم ہے، لیکن عام طور پر مفعول دوم "فی" کے واسطے ہوتا ہے مثلاً "صدقتہ فی حدیثہ" میں نے اس کی گفتگو میں تصدیق کی۔

اس تاخیر میں ایک حکمت تھی" اس سے پہلے ایک قریب کی فتح قرار دے دی" (فجعل من دون ذالك فتحًا قريبًا)۔

اس آیت میں کچھ قابل توجہ نکات

(۱) اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "لتدخلنّ" میں "لام" "قسم کا لام ہے۔" اور اس کے آخر "نون" تاکید کے لیے، یہ آئندہ کے بارے میں ایک قطعی و یقینی وعدہ ہے اور انتہائی امن و امان کے ساتھ مراسم عمرہ کے انجام دینے کے بارے میں ایک صریح معجزانہ پیشین گوئی ہے، اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ٹھیک آئندہ سال اسی ماہ ذی القعدہ میں یہ پیشین گوئی پوری ہوگئی، اور مسلمانوں نے عمرہ کے مراسم اسی صورت میں انجام دیئے۔

(۲) "ان شاء اللہ" کا جملہ یہاں ممکن ہے بندوں کے لیے ایک قسم کی تعلیم ہو، کہ وہ آئندہ کے بارے میں کچھ کہتے وقت خدا کی مشیت و ارادہ پر تکیہ کرنے کو فراموش نہ کریں اور اپنے آپ کو اپنے کاموں میں مستقل اور اس کے لطف سے بے نیاز نہ سمجھیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہو، جو خدا نے اس موفقیت (مستقبل قریب میں خانہ خدا کی زیارت کی توفیق) کے لیے قرار دیئے ہیں، اور وہ توحید و اطمینان اور وقار و تقویٰ پر باقی رہنے کا طریقہ طریقہ ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہو، جن کی عمر کی مدت اس دوران میں ختم ہو جائے گی، اور وہ اس زیارت کے انجام دینے پر موفق نہیں ہوں گے اور ان معانی کے درمیان جمع کرنا پورے طور پر ممکن ہے۔

(۳) بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "فتحًا قريبًا" کی تعبیر اسی "صلح حدیبیہ" کی طرف ہی اشارہ ہے، جس کو قرآن نے "فتح مبین" کہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہی فتح بعد والے سال میں مسجد الحرام میں داخل ہونے کی تمہید بنی۔

جبکہ ایک دوسرا گروہ اسے "فتح خیبر" کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔ البتہ "قریبًا" کا لفظ "فتح خیبر" کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ وہ اس خواب کے پورا ہونے میں بہت کم فاصلہ رکھتا تھا۔

اس کے علاوہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں جس میں "بیعت رضوان" کا بیان ہے، یہ آیا ہے: "فانزل السكينة عليهم واثابهم فتحًا قريبًا"

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور اکثر مفسرین کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اس سے مراد "فتح خیبر" ہے، آیت

میں موجود قرائن بھی یہی بات حکایت کرتے ہیں، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیرِ بحث آیت اس کے ہم آہنگ ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ [1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ [2]

(۴) "محلقین رؤوسکم و مقصرین" (درآں حالیکہ سروں کو منڈوائے ہوئے اور ناخن کٹوائے ہوئے ہوگے) کا جملہ مراسم عمرہ کے آداب میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے، جسے "تقصیر" کہتے ہیں اور اس کے ذریعہ محرم، احرام سے باہر نکل آتا ہے اور بعض اس آیت کو مسئلہ تقصیر اور احرام سے باہر نکلنے میں "تخییر" کی دلیل سمجھتے ہیں، کیونکہ محرم سر بھی منڈوا سکتا ہے یا اپنے ناخن کٹوا سکتا ہے، ان دونوں کے درمیان جمع قطعاً اور یقیناً واجب نہیں ہے۔

(۵) "فعلم مالم تعلموا" (خدا ان باتوں کو جانتا تھا، جو تمہیں معلوم نہیں تھیں) کا جملہ ان اہم اسرار کی طرف اشارہ ہے جو "صلح حدیبیہ" میں چھپے ہوئے تھے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ آشکار ہوئے، اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی، اور مسلمانوں پر جنگ کے طالب ہونے اور اسی طرح کی دوسری تہمتیں ختم ہوگئیں اور مسلمان فارغ البالی کے ساتھ "خیبر" کو فتح کرنے اپنے مبلغین "جزیرۃ العرب" کے اطراف میں بھیجنے، اور پیغمبرؐ اپنے تاریخی خطوط اس زمانہ کی دنیا کے بڑے بڑے صاحبان اقتدار کو ارسال کرنے پر قادر ہوگئے۔ یہ ایسے مطالب تھے جن سے عام لوگ آگاہی نہیں رکھتے تھے اور صرف خدا ہی اس سے آگاہ تھا۔

(۶) ہمارا اس آیت میں مسئلہ "رؤیا" سے سامنا ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ کا وہی رویائے صادقہ جو وحی کی ایک شاخ ہے، اسی کے مشابہ جو ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کے بارے میں آیا ہے۔ (صافات آیہ ۱۰۲) (رؤیا اور خواب دیکھنے کے بارے میں مزید تشریح جلد نہم میں یوسفؑ کی داستان میں صفحہ ۲۸۵ پر مطالعہ فرمائیں)

(۷) زیر بحث آیت قرآن کے غیبی اخبار میں سے ایک، اور اس کتاب کے آسمانی ہونے کے شواہد میں سے ہے، اور پیغمبر گرامی اسلامؐ کے معجزات میں سے بھی ہے۔ جو اس قاطعیت اور تاکید کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہونے اور مستقبل قریب میں مراسم عمرہ بجالانے کی خبر دیتی ہے اور اس سے پہلے فتح قریب اور نزدیکی کامیابی کی خبر بھی دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ دونوں پیشین گوئیاں پوری ہوگئیں، فتح خیبر کی داستان آپ پہلے سن چکے ہیں، اب "عمرۃ القضاء" کی داستان بھی سن لیں۔

---

[1] "من دون ذالک" کی تعبیر یا تو "قبل ذالک" کے معنی میں ہے۔ یعنی بعد والے سال میں عمرہ سے پہلے خدا مؤمنین کو ایک فتح قریب نصیب کرے گا۔ یا "غیر ذالک" کے معنی میں ہے۔ یعنی خانہ خدا کی زیارت کی توفیق کے علاوہ ان کے لیے ایک فتح قریب بھی قرار دے گا۔

[2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۷۰۔

عمرۃ القضاء

"عمرۃ القضاء" وہی عمرہ ہے جو پیغمبرؐ نے حدیبیہ سے ایک سال بعد یعنی ہجرت کے ساتویں سال کے ماہ ذی القعدہ میں (اس سے ٹھیک ایک سال بعد جب مشرکین نے آپ کو مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا) اپنے اصحاب کے ساتھ انجام دیا، اور اس کا یہ نام اس وجہ سے ہے، چونکہ یہ حقیقت میں گذشتہ سال کی قضا شمار ہوتا تھا۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: قرار داد حدیبیہ کی شقوں میں سے ایک شق کے مطابق پروگرام یہ تھا کہ مسلمان آئندہ سال مراسم عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت آزادانہ طور پر انجام دیں لیکن تین دن سے زیادہ مکہ میں توقف نہ کریں اور اس مدت میں قریش کے سردار اور مشرکین کے جانے پہچانے افراد شہر سے باہر چلے جائیں گے (تاکہ ایک تو احتمالی ٹکراؤ سے بچ جائیں۔ اور کینہ پروری اور تعصب کی وجہ سے جو لوگ مسلمانوں کی عبادت توحیدی کے منظر کو دیکھنے کا یارا اور قدرت نہیں رکھتے، وہ بھی اُسے نہ دیکھیں)

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ لے کر چل پڑے اور "ظہران" کے قریب پہنچ گئے اس موقع پر پیغمبر نے اپنے ایک صحابی کو جس کا نام "محمد بن مسلمہ" تھا، عمدہ سواری کے گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ اپنے آگے بھیج دیا، جب مشرکین نے اس پروگرام کو دیکھا تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور انھوں نے یہ گمان کرلیا کہ حضرت ان سے جنگ کرنا اور اپنی دس سالہ صلح کی قرار داد کو توڑنا چاہتے ہیں، لوگوں نے یہ خبر اہل مکہ تک پہنچا دی لیکن جب پیغمبرؐ مکہ کے قریب پہنچے تو آپؐ نے حکم دیا کہ تمام تیر اور نیزے اور دوسرے سارے ہتھیار اس سرزمین میں جس کا نام "یاجج" ہے، منتقل کردیں، اور آپ خود اور آپ کے صحابہ صرف نیام میں رکھی ہوئی تلواروں کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے ہیں۔

اہل مکہ نے جب یہ عمل دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ وعدہ پورا ہوگیا، (گویا پیغمبر کا یہ اقدام مشرکین کے لیے ایک تنبیہ تھا، کہ اگر وہ نقض عہد کرنا چاہیں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کریں، تو وہ ان کے مقابلہ کی قدرت رکھتے ہیں)

رُؤسائے مکہ، مکہ سے باہر چلے گئے، تاکہ ان مناظر کو جو ان کے لیے دل خراش تھے نہ دیکھیں، لیکن باقی اہل مکہ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی راستوں میں، چھتوں کے اُوپر، اور خانہ خدا کے اطراف میں جمع ہو گئے تھے، تاکہ مسلمانوں اور ان کے مراسم عمرہ کو دیکھیں۔

پیغمبرؐ ایک خاص رعب اور دبدبے کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے اور قربانی کے بہت سے اونٹ آپؐ کے ساتھ تھے، اور آپؐ نے انتہائی محبت اور ادب کے ساتھ مکہ والوں سے سلوک کیا، اور یہ حکم دیا کہ مسلمان طواف کرتے وقت تیزی کے ساتھ چلیں، اور احرام کو ذرا سا جسم سے ہٹالیں تاکہ ان کے قوی اور طاقتور اور موٹے تازے شانے آشکار

ہوں، اور یہ منظر مکہ کے لوگوں کی رُوح اور فکر میں، مسلمانوں کی قدرت و قوت و طاقت کی زندہ دلیل کے طور پر اثر انداز ہو۔

مجموعی طور سے "عمرۃ القضاء" عبادت بھی تھا اور قدرت کی نمائش بھی، یہ کہنا چاہیئے کہ "فتح مکہ" جو بعد والے سال میں حاصل ہوئی، اس کا بیج انہیں دنوں میں بو دیا گیا، اور اسلام کے مقابلہ میں اہل مکہ کے سرِ تسلیم خم کرنے کے سلسلے میں مکمل طور پر زمین ہموار کر دی۔

یہ وضع و کیفیت قریش کے سرداروں کے لیے اس قدر ناگوار تھی کہ تین دن گزرنے کے بعد کسی کو پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا کہ قرارداد کے مطابق جتنا جلدی ہو مکہ کو چھوڑ دیجیئے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے، کہ پیغمبرؐ نے مکہ کی عورتوں میں سے ایک بیوہ عورت کو، جو قریش کے بعض سرداروں کی رشتہ دار تھی، اپنی زوجیت میں لے لیا، تاکہ عربوں کی رسم کے مطابق، اپنے تعلق اور رشتے کو اُن سے مستحکم کر کے ان کی عداوت اور مخالفت میں کمی کریں۔

جس وقت پیغمبرؐ نے مکہ سے باہر نکل جانے کی تجویز سُنی تو آپؐ نے فرمایا: میں اس ازدواج کے مراسم کے لیے کھانا کھلانا چاہتا ہوں اور تمہاری بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں، یہ ایسا کام تھا کہ اگر یہ انجام پا جاتا، تو ان کے دلوں میں پیغمبرؐ کے ضمن میں ایک مؤثر نقش چھوڑتا، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور یہ دعوت رسمی طور پر رد کر دی گئی [1]

---

[1] "مجمع البیان طبرسی"، جلد ۹ صفحہ ۱۲۷
"فی ظلال القرآن"، جلد ۷، صفحہ ۵۱۱
اور "تاریخ طبری"، جلد ۲ صفحہ ۳۱۰
(اختصار اور خلاصے کے ساتھ)

۲۸۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝

۲۹۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝

ترجمہ

۲۸۔ وہ وہی ہے جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُسے تمام دینوں پر غلبہ اور کامیابی دے۔ اور اس بات کے لیے خدا کی گواہی کافی ہے۔

۲۹۔ محمدؐ خدا کے رسُول ہیں، اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں تو انھیں ہمیشہ رکوع اور سجدے میں دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ خدا

کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں، ان کی نشانی ان کے چہرے پہ سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے، یہ تعریف و توصیف تو ان کی تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی توصیف یہ ہے کہ وہ ایسی زراعت کے مانند ہیں۔ جس نے اپنی کونپلیں نکالی ہیں۔ پھر وہ قوت حاصل کر کے مضبوط اور محکم ہو گئی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی، اور اس قدر نشوونما کی کہ زراعت کرنے والوں کو حیران کر دیا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ کافروں کو غصہ دلائے، خدا نے ان میں سے ایسے لوگوں سے جو ایمان اور عمل صالح بجا لائے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

تفسیر

دشمنوں کے مقابلہ میں سخت گیر اور دوستوں کے لیے مہربان

ان دو آیات میں جو سورہ فتح کی آخری آیات ہیں۔ "فتح المبین" یعنی صلح حدیبیہ" سے مربوط دو دوسرے اہم مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے، جن میں سے ایک تو اسلام کے عالمگیر ہونے کے ساتھ مربوط ہے اور دوسرے میں پیغمبر اسلام کے اصحاب کے اوصاف اور ان کی خصوصیات، اور ان کے بارے میں خدائی وعدہ کو بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے "وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اُسے تمام دینوں پر غالب کر دے اور اس بات کے لیے خدا کی گواہی کافی ہے"۔ (هو الذی ارسل رسوله بالهدٰی ودین الحق لیظهره علی الدین کله وکفٰی بالله شهیدًا)۔

یہ خداوند قادر متعال کی جانب سے صریح اور دو ٹوک وعدہ ہے۔ اسلام کے تمام دینوں پر غالب ہونے کے بارے میں یعنی اگر خدا نے پیغمبر کے خواب کے ذریعہ تمھیں کامیابی اور فتح کی خبر دی ہے کہ تم انتہائی امن اور امان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے اور مراسم عمرہ بجا لاؤ گے، اور کسی میں تم سے مزاحمت کرنے کی جرأت نہ ہو گی علاوہ ازیں اگر خدا تمھیں "فتح قریب" (خیبر کی کامیابی) کی خبر دے رہا ہے تو اس پر تعجب نہ کرو، یہ تو ابتدا ہے

انجام کار اسلام عالمگیر ہو جائے گا اور تمام ادیان پر کامیاب و کامران ہوگا۔

ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ رسول خدا کی دعوت کا مطلب ہدایت ہے: (ارسل رسولہ بالھدیٰ) اور اس کا دین حق ہے: (ودین الحق) اور ہر غیر جانب دار ناظر اس کی حقانیت کو، اس قرآن کی آیات میں اور اسلام کے انفرادی و اجتماعی اور قضائی و سیاسی احکام اور اسی طرح اس کی اخلاقی و انسانی تعلیمات میں دیکھ سکتا ہے، اور ان دقیق و صریح پیشین گوئیوں سے جو مستقبل کے بارے میں ہیں، اور بالکل ٹھیک واقع ہوئی ہیں۔ اس پیغمبر کے خدا سے ارتباط کو قطعی طور پر جان سکتا ہے۔

ہاں اسلام کی قوی منطق اور اس کے بار آور مطالب کا تقاضا یہی ہے کہ آخر کار وہ تمام شرک آلود مذاہب کا صفایا کر دے گا اور تحریف شدہ آسمانی دینوں کو اپنے سامنے جھکا دے گا۔ اور اپنی عمیق کشش کے ساتھ دلوں کو اس خالص دین کی طرف کھینچ لے گا۔

اس بارے میں کہ اس کامیابی سے "منطقی کامیابی" مراد ہے یا "فوجی و لشکری کامیابی" مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کامیابی صرف منطقی و استدلالی "کامیابی" ہے اور یہ امر حاصل ہو چکا ہے۔ کیونکہ اسلام منطق اور استدلال کی قدرت کے لحاظ سے تمام موجودہ ادیان پر برتری رکھتا ہے۔

جبکہ "ایک دوسری جماعت" کامیابی کو "ظاہری غلبہ" اور غلبۂ اقتدار کے معنی میں سمجھتی ہے، اور اس لفظ "یظھرہ" کا موقع استعمال بھی خارجی غلبہ کی دلیل ہے، اور اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے، کہ ان بہت سے وسیع علاقوں کے علاوہ جو دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں اسلام کی قلمرو میں داخل ہیں، اور اس وقت بھی ۴۰ سے زیادہ اسلامی ممالک میں مجموعی طور پر تقریباً ایک ارب افراد پرچم اسلام کے زیر سایہ سانس لے رہے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ساری دنیا رسمی طور پر بھی اس پرچم کے نیچے آ جائے گی، اور یہ امر قیام مہدی (ارواحنالہ الفدا) کے ذریعہ تکمیل کو پہنچے گا۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

"لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام"[1]

"پورے روئے زمین پر کوئی پتھر اور مٹی کا گھر یا اون اور بالوں کا خیمہ باقی نہ رہے گا۔ مگر یہ کہ خدا اسلام کو اس میں داخل کر دے گا۔"

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۷ ص ۲۵۔ "قرطبی" نے بھی اس روایت کو پیغمبر اسلام سے سورۂ نور کی آیہ ۵۵ کے ذیل میں نقل کیا ہے (جلد ۷، صفحہ ۴۶۹۲)

اس سلسلہ میں ہم سورۂ توبہ کی آیہ ۳۳ میں جو اس آیت کے مشابہ ہے ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض نے "الھدیٰ" کی تعبیر کو "عقائد" اسلامی کے استحکام کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جبکہ "دینِ الحق" کو "فروع دین" سے متعلق جانا ہے، لیکن اس تقسیم بندی پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے ویسے ظاہر یہ ہے کہ ہدایت وحقانیت اصول میں بھی ہے اور فروع میں بھی۔

اس بارے میں کہ "لیظھرہ" کی ضمیر کا مرجع "اسلام" ہے یا "پیغمبرؐ" مفسرین نے دو احتمال دیئے ہیں۔ لیکن قرائن اچھی طرح گواہی دے رہے ہیں کہ اس سے مراد وہی دینِ حق ہے، کیونکہ جملہ بندی کے لحاظ سے بھی ضمیر کے ساتھ زیادہ نزدیک ہے اور دین کی دین پر کامیابی کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے نہ کہ شخص کی دین پر۔

آیت کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ "کفیٰ باللہ شھیداً" کا جملہ اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے کہ اس پیشین گوئی کے لیے کسی شاہد اور گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا شاہد اور گواہ اللہ ہے اور رسولِ خدا کی رسالت بھی کسی دوسرے گواہ کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ اس کا گواہ بھی اللہ ہی ہے اور "سہیل بن عمرو" اور اس کے مانند دوسرے لوگ اس بات پر تیار نہ ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" لکھا جائے تو وہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اور اس میں ہمارے لیے کوئی زحمت نہیں"!

★ ★ ★ ★

آخری آیت میں قرآن پیغمبرؐ کے مخصوص اصحاب وانصار کی اور ان افراد کی جو آپؐ کے طریقہ پر تھے، تورات وانجیل کی زبان سے ایک بہت ہی واضح تصویر پیش کرتا ہے اور اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے "حدیبیہ" اور دوسرے مراحل میں پامردی دکھائی ہے، ایک فخر اور مباہات کی بات بھی ہے، اور تمام قرون اعصار میں تمام مسلمانوں کے لئے ایک سبق آموز درس بھی ہے۔

ابتدا میں فرماتا ہے: محمد خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے": (محمد رسول اللہ)۔

چاہے سہیل بن عمرو جیسی چمگادڑیں اسے پسند کریں یا نہ کریں؛ اور خود کو اس آفتاب عالمتاب سے پنہاں کرلیں یا نہ کریں؛ خدا نے اس کی رسالت کی گواہی دی ہے اور تمام صاحبان علم وآگاہی بھی اس بات کے گواہ ہیں۔

اس کے بعد آپؐ کے اصحاب وانصار کی تعریف وتوصیف کا آغاز کرتے ہوئے ان کے ظاہر وباطن اوصاف اور عواطف وافکار واعمال کو پانچ صفات کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔ "وہ لوگ جو اُس کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور محکم ہیں": (والذین معہ اشداء علی الکفار)۔

اور دوسری صفت یہ بیان کرتا ہے: "لیکن آپس میں رحم دل اور مہربان ہیں": (رحماء بینھم)۔

ہاں وہ اپنے بھائیوں، دوستوں اور ہم مذہب افراد کے لیے تو عطوفت ومحبت کا مرکز اور خزانہ ہیں اور دشمنوں

---

[1] تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد ص ۲۷۶۔

کے مقابلہ میں سخت اور جلانے والی آگ اور مضبوط فولادی دیوار ہیں۔

درحقیقت ان کے عواطف و رجحانات کا خلاصہ یہ "مہر" اور "قہر" ہی ہیں۔ لیکن ان دونوں کا ان کے وجود میں جمع ہونا کوئی تضاد نہیں رکھتا، اور دشمن کے مقابلہ میں ان کا قہر، اور دوستوں کے لیے ان کا مہر و محبت اس بات کا سبب نہیں بنتا کہ وہ راہِ حق و عدالت سے قدم باہر رکھیں تیری صفت میں جو ان کے اعمال کے بارے میں ہے مزید کہتا ہے۔ تو انھیں ہمیشہ رکوع و سجود کی حالت میں دیکھے گا اور وہ ہر وقت عبادت خدا میں مشغول رہتے ہیں۔ (تراھم رکعًا سجدًا)

یہ تعبیر خدا کی عبادت و بندگی کو جو اس کے دو اصلی ارکان "رکوع" و "سجود" کے ساتھ بیان ہوئی ہے، ان کی دائمی اور ہمیشہ کی حالت کے طور پر ذکر کرتی ہے، ایسی عبادت، جو حق تعالیٰ کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے، اور کبر و غرور اور خود خواہی کی ان کے وجود سے نفی کی رمز ہے۔

چوتھی توصیف و تعریف میں جو ان کی پاک اور خالص نیت سے بحث کرتی ہے، فرماتا ہے: "وہ ہمیشہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں"۔ (یبتغون فضلًا من اللہ و رضوانًا)۔

نہ تو وہ دکھاوے اور ریاکاری کے لیے قدم اُٹھاتے ہیں، اور نہ ہی مخلوق خدا سے اجر و پاداش کی توقع رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی نظر صرف اس کی رضا و فضل پر لگی ہوئی ہے، اور تمام زندگی میں ان کے عمل کا محرک صرف یہی امر ہے۔ اور بس۔

یہاں تک کہ "فضل" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی کوتاہی کے معترف ہیں، اور اپنے اعمال کو کمتر سمجھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں خدا کا اجر و پاداش طلب کریں، بلکہ وہ پوری سعی و کوشش کے باوجود پھر بھی یہ کہتے ہیں، خداوندا! اگر تیرا فضل و کرم ہماری مدد و نصرت نہ کرے تو وائے ہے ہم پر۔

پانچویں اور آخری توصیف میں ان کے آراستہ اور نورانی پیکرِ ظاہر کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ان کی نشانی ان کے چہرے میں سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے"[1]: (سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود)

"سیما" اصل میں علامت و ہیئت کے معنی میں ہے۔ چاہے یہ علامت چہرے میں ہو یا بدن کی کسی دوسری جگہ، اگرچہ فارسی کے روزمرہ کے استعمال میں چہرے کی نشانیوں اور چہرہ کی ظاہری وضع و کیفیت کے لیے بولا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ان کا "قیافہ" اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خدا، حق، قانون اور عدالت کے سامنے ایک خاضع انسان ہیں، نہ صرف ان کے چہرے میں ہی بلکہ ان کے سارے وجود اور زندگی میں یہ علامت منعکس ہوتی ہے۔

---

[1] "سیماھم" مبتدا اور "فی وجوھھم" اس کی خبر ہے اور "من اثر السجود" یا "سیما" کا بیان ہے یا "سیما" کے لیے حال ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ "من" کو "نشوء" جانیں اور جملہ کا معنی اس طرح ہوگا "ان کی علامت ان کے چہرے میں ہے اور یہ علامت سجود کے اثر سے ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے پیشانی پر سجدہ کے ظاہری اثر یا سجدہ گاہ کی جگہ پر مٹی کے اثر سے تفسیر کی ہے۔ لیکن ظاہراً آیت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان مردانِ خدا کے چہرہ کی مکمل طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت قیامت میں ان کے سجدہ گاہ کی طرف اشارہ ہے، جو چودھویں کے چاند کی طرح چمکے گی۔

البتہ ممکن ہے کہ قیامت میں ان کی پیشانی اسی طرح ہو۔ لیکن یہاں آیت دنیاوی زندگی میں ان کی ظاہری وضع و کیفیت کی خبر دے رہی ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بھی آیا ہے کہ آپؑ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا:

هوالسهر فی الصلوٰة: "اس سے مراد رات کو نماز پڑھنے کے لیے بیدار رہنا ہے" جس کے آثار دن کے وقت ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔[1]

البتہ ان معانی کو جمع کرنا پورے طور پر ممکن ہے۔

بہرحال قرآن ان تمام اوصاف کو بیان کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ ان (اصحاب محمدؐ) کی توصیف توارت میں ہے": (ذالك مثلهم فی التوراة)۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کا بیان پہلے سے آچکا ہے، اور ایسی توصیف و تعریف ہے جو ایک عظیم آسمانی کتاب میں ہے، جو ایک ہزار سال سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ "والذین معه" (اور وہ جو اس کے ساتھ ہیں) کی تعبیر ایسے افراد کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، جو ہر چیز میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے، فکر و نظر میں، عقیدہ و اخلاق میں اور عمل میں، نہ کہ صرف وہ لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہم عصر اور ہم زمان تھے، چاہے ان کا طریقہ اور راستہ آپؐ سے جدا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ان کی ایک اور آسمانی عظیم کتاب یعنی "انجیل" میں، توصیف کو پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ان کی توصیف انجیل میں اس زراعت کی طرح ہے، جس نے اپنی کونپلوں کو باہر نکالا ہو، پھر انہیں تقویت دی ہو" یہاں تک کہ وہ مضبوط اور مستحکم ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہے، اور اس قدر نشو و نما کی ہے اور پُر برکت ہوئی ہے۔ کہ زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتی ہے۔" (ومثلهم فی الانجیل کزرع اخرج شطأه فآزره فاستغلظ فاستوی علیٰ سوقه یعجب الزراع)۔[2]

---

[1] "من لا یحضره الفقیه" روضۃ الواعظین، مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۸۰۔

[2] اس بارے میں کہ "ومثلهم فی الانجیل" ایک مستقل جملہ ہے اور اصحاب پیغمبرؐ کی ایک الگ توصیف و تعریف کرتا ہے جو اس تعریف کے علاوہ ہے جو تورات میں آئی ہے یا یہ "ذالك مثلهم فی التوراة" کے جملہ پر عطف ہے اس طرح سے کہ دونوں اوصاف کی دونوں آسمانی کتابوں سے خبر دیتا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ لیکن آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں اوصاف الگ الگ جدا گانہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

"شطأ" "ٹہنی اور چوزے" کے معنی میں ہے۔ ایسی ٹہنیاں جو تنے کے نیچے اور جڑوں کے قریب سے باہر نکلتی ہیں۔

"آزر" "موازرۃ" کے مادہ سے معاونت کے معنی میں ہے۔

"استغلظ" "غلظت" کے مادہ سے سخت اور مستحکم ہونے کے معنی میں ہے۔

"استوٰی علی سوقہ" کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر مستحکم ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، (اس بات پر توجہ رکھیے کہ "سوق" "ساق" کی جمع ہے)

"یعجب الزرّاع" کی تعبیر، یعنی وہ اتنی تیزی کے ساتھ اُگی اور اتنی زیادہ ٹہنیاں اور شاخیں نکلیں اور اس کی پیداوار اس حد کو پہنچی کہ خود کسانوں تک کو، جو ہمیشہ ان مسائل سے سروکار رکھتے ہیں، بہت زیادہ حیرت اور تعجب ہو رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ دوسری توصیف میں بھی، جو انجیل میں آئی ہے، مومنین اور محمد کے صحابہ کے پانچ عمدہ اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ (کونپل نکالنا، پرورش کے لیے مدد کرنا، محکم ہونا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا، حیرت انگیز دکھائی دینے والی نشوونما)

حقیقت میں تورات میں جو اوصاف ان کے لیے بیان ہوئے ہیں وہ ایسے اوصاف ہیں، جو حالات، مقاصد، اعمال اور ظاہری صورت کے لحاظ سے ان کے وجود کے پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہ اوصاف جو انجیل میں بیان ہوئے ہیں وہ ان کے مختلف پہلوؤں میں ترقی اور نشوونما کو بیان کرتے ہیں (غور کیجیے)

ہاں! وہ ایسے بلند صفات ہیں جو ایک آن کے لیے بھی "حرکت" و عمل سے نہیں رُکتے، وہ ہمیشہ کونپلیں نکالتے رہتے ہیں، وہ کونپلیں پرورش پاتی ہیں۔ اور بار آور ہوتی ہیں۔

وہ اپنے قول و عمل کے ذریعہ اسلام کو دُنیا میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اور روز بروز نئے دوستوں کا اسلامی معاشرے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

ہاں! وہ کبھی بھی بے کار ہو کر نہیں بیٹھتے، اور ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتے رہتے ہیں، عابد ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد ہیں، اور جہاد کے ساتھ ساتھ عبادت کرتے ہیں، ان کا ظاہر آراستہ ہے اور باطن پیراستہ ہے، ان کے عواطف قوی اور نیتیں پاکیزہ ہیں۔ حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں خدا کے غضب کے مظہر ہیں، اور حق کے دوستوں کے ساتھ اس کے لطف و رحمت کو نمایاں کرتے ہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: یہ عالی اوصاف، یہ تیزی کے ساتھ بڑھنے والی نشوونما، اور یہ پربرکت حرکت و ترقی جتنی دوستوں میں شوق اور نشاط پیدا کرتی ہے، اتنا ہی کفار کے لیے غیض و غضب کا سبب بنتی ہے: "یہاں بنا پر ہے تاکہ کافروں کو غصہ دلائے": لیغیظ بھم الکفار[1]

(باقی حاشیہ صفحہ کا) طور پر ان دو آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے موجود تھے۔ اسی لیے لفظ "مثل" کا تکرار ہوا ہے، درحالیکہ اگر یہ ایک دوسرے پر عطف ہوتے تو فصاحت کا تقاضا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "ذالک مثلھم فی التوراۃ والانجیل"۔

[1] "لیغیظ" کے جملہ میں "لام" ہے۔ بہت سے مفسرین اسے علت کا لام" سمجھتے ہیں، اس بنا پر اس جملہ کا مفہوم (بقیہ حاشیہ صفحہ پر)

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا نے ان میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور ساتھ ہی عمل صالح انجام دیئے ہیں، بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے" :(وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصالحات منهم مغفرة واجرًا عظيمًا)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ اوصاف جو آیت کی ابتدا میں بیان کئے گئے ہیں، ان میں ایمان اور عمل صالح جمع تھا، اس بنا پر ان دو اوصاف کی تکرار ان کے دوام اور ہمیشہ برقرار رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی خدا نے یہ وعدہ صرف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے اس گروہ سے کیا ہے جو آپؐ کے راستہ اور طریقہ پر باقی رہیں گے، اور ایمان و عمل صالح کو دوام بخشیں گے، ورنہ وہ لوگ جو ایک دن تو اس کے دوستوں اور اصحابؓ انصار کے زمرہ میں شامل تھے۔ اور دوسرے دن آنحضرت سے جدا ہو گئے، اور ان کے برخلاف راستے پر چل پڑے، وہ اس قسم کے وعدہ میں ہرگز شامل نہیں ہیں۔

"منهم" کی تعبیر۔ (اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ "من" ایسے مواقع پر "تبعیض" کے لیے ہوتا ہے اور آیت کا ظاہر بھی یہی معنی دیتا ہے)۔ اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے صحابہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے: ایک گروہ ایمان اور عمل صالح کو جاری رکھے گا، اور حق تعالیٰ کی رحمت واسعہ اور اجرِ عظیم میں شامل ہوگا، لیکن ایک گروہ اس سے الگ ہو کر اس عظیم فیض و برکت سے محروم ہو جائے گا۔

معلوم نہیں مفسرین کا ایک گروہ اس بات پر کیوں اصرار کرتا ہے۔ کہ اوپر والی آیت میں "منهم" کا "من" حتماً بیانیہ ہے۔ حالانکہ بالفرض اگر ہم خلاف ظاہر کے مرتکب بھی ہوں اور "من" کو "بیان" کے لیے ہی لے لیں، تو ان قرائن عقلی کو جو یہاں موجود ہیں، انہیں کیسے ایک طرف کریں گے، کیونکہ کوئی شخص بھی اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ پیغمبرؐ کے تمام صحابہ معصوم تھے تو اس صورت میں راہِ ایمان اور عمل صالح پر باقی نہ رہنے کا احتمال ان میں سے ہر ایک کے بارے میں جائے گا۔ تو ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ بغیر کسی قید و شرط کے اُن سب کو دے دے، عام اس سے کہ وہ ایمان و صلاح کی راہ طے کریں یا آدھی راہ سے پلٹ جائیں اور منحرف ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ: "والذين معه" (وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں) کے جملہ کا مفہوم آپؐ کے پاس بیٹھنا اور آپؐ سے جسمانی مصاحبت نہیں ہے، کیونکہ ایسی مصاحبت تو منافقین بھی رکھتے تھے، بلکہ "معه" سے مراد قطعی طور پر اصول ایمان اور تقویٰ کے لحاظ سے ہمراہ ہونا ہے۔

اس بنا پر ہم اوپر والی آیت سے پیغمبرؐ کے تمام ہم نشینوں اور معاصرین کے لیے ہرگز ایک حکم کلی کا استفادہ نہیں کر سکتے۔

(بقیہ حاشیہ صہ گا) یہ ہوگا: پیش رفت کی یہ قوت و قدرت خدا نے اصحاب محمدؐ کو نصیب کی ہے تاکہ کفار کو غصہ میں لے آئے۔"

چند نکات

۱۔ **تنزیہ صحابہ کی داستان** : اہلِ سُنّت کے علماء اور دانشمندوں میں مشہور یہ ہے کہ صحابۂ رسولؐ اُمت کے تمام دوسرے افراد سے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ وہ سب کے سب پاک پاکیزہ ہیں، اور وہ آلودگیوں سے دُور ہیں، اور ہمیں ان میں سے کسی پر تنقید و اعتراض کا حق نہیں ہے، اور انھیں بُرا بھلا کہنا مطلقاً ممنوع ہے، یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق موجب کفر ہے، اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے قرآن مجید کی کچھ آیات سے استناد کیا ہے، منجملہ ان کے ایک زیرِ بحث آیت ہے جو یہ کہتی ہے کہ: خدا نے اُن میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے" اور اسی طرح سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰۰ جو مہاجرین و انصار کا ذکر کرنے کے بعد کہتی ہے:

"رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ"

"خدا ان سے خوش ہو گیا اور وہ خدا سے خوش ہو گئے"۔

لیکن اگر ہم اپنے آپ کو پہلے سے کئے ہُوئے فیصلوں سے خالی کر لیں تو ایسے واضح قرائن ہمارے سامنے موجود ہیں جو اس مشہور عقیدہ اور نظریہ کو متزلزل کر دیتے ہیں۔

① سورۂ توبہ میں "رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ" کا جُملہ صرف مہاجرین و انصار کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں مہاجرین و انصار کے ساتھ "الذین اتبعوھم باحسان" کا جُملہ بھی موجود ہے، جس کا مفہوم تمام ان افراد کو شامل ہے، جو دامن قیامت تک نیکی میں ان کی پیروی کریں گے۔

جس طرح سے "تابعین" اگر ایک دن خطِ ایمان و احسان میں ہوں اور دوسرے دن کفر و اساء ت (بدی کرنے) کے خط میں قرار پاتے ہیں تو وہ رضایت الٰہی کے چتر کے نیچے سے نکل جائیں گے، بعینہٖ یہی مطلب "صحابہ" کے بارے میں بھی ہوگا، کیونکہ انھیں بھی سُورۂ فتح کی آخری آیت میں ایمان و عمل صالح کے ساتھ مقید کیا ہے کہ اگر کسی دن یہ صفت اُن سے سلب ہو جائے تو وہ رضایت الٰہی کے دائرہ سے باہر نکل جائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں "احسان" کی تعبیر "تابعین" کے لیے بھی ہے، اور "متبوعین" کے بارے میں بھی، اس بنا پر ان دونوں میں سے جو کوئی بھی "خطِ احسان" کو چھوڑ دے گا وہ رضایت خدا میں شامل نہیں رہے گا۔

② روایاتِ اسلامی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ آنحضرتؐ کی مصاحبت کا اعزاز و امتیاز رکھتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو بعد کے زمانوں میں آئیں گے، اور ایمان راسخ اور عمل صالح سے متصف ہوں گے وہ ایک لحاظ سے صحابہ سے افضل ہیں۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے بیان ہوا ہے، کہ صحابہ نے آپؐ سے عرض کیا:

"نحن اخوانک یارسول اللہ؟! قال: لا انتم اصحابی، و اخوانی الذین یأتون بعدی، آمنوا بی ولم یرونی، وقال: للعامل منھم اجر خمسین منکم، قالوا بل منھم یارسول اللہ؟ قال: بل منکم! ردّوھا ثلاثا، ثم قال: لانکم تجدون علی الخیر اعوانا!:

"یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی ہیں؟ فرمایا نہیں! تم تو میرے اصحاب ہو، لیکن میرے بھائی تو وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے، اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا!

اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا: ان میں سے وہ افراد جو عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ تم میں سے پچاس افراد کا اجر رکھتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ اپنے میں سے پچاس افراد کا (اجر رکھیں گے) فرمایا نہیں: تم میں سے پچاس افراد کا، اور انھوں نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا، (اور پیغمبر نے تینوں مرتبہ یہی کہا) اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، یہ اس بنا پر ہے کہ تمھارے پاس ایسے شرائط و حالات موجود ہیں جو تمھاری اچھے کاموں میں مدد کرتے ہیں"۔ [1]

صحیح مسلم میں بھی رسول خدا سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا:

"وددت انا قد رأینا اخواننا"

"میں دوست رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے"۔

"قالوا: اولسنا اخوانک یارسول اللہ؟!،

انھوں نے کہا، یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟!

آپؐ نے فرمایا:

"انتم اصحابی واخواننا الذین لم یأتوا بعد:

"تم تو میرے اصحاب ہو لیکن ہمارے بھائی ابھی تک نہیں آئے"۔ [2]

عقل و منطق بھی یہی کہتی ہے، کہ دوسرے لوگ جو شب و روز پیغمبرؐ کی دائمی تعلیمات کے سایہ میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ پیغمبرؐ کے صحابہ کے مانند یا ان سے زیادہ ایمان و عمل صالح رکھتے تھے۔ وہ ان سے برتر و افضل ہیں۔

(۳) یہ بات تاریخی طور پر بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ بعض صحابہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کے بعد یا خود پیغمبر کے زمانہ میں ہی غلط راستہ اختیار کر لیا تھا۔

---

[1] "تفسیر روح البیان"، جلد ۹، صفحہ ۶۱

[2] "صحیح مسلم" جلد اوّل کتاب الطہارۃ حدیث ۳۹۔

ہم ان لوگوں کو جنہوں نے جنگِ جمل کی آگ بھڑکائی، اور اتنے سارے مسلمانوں کو قتل کرایا، اور پیغمبرؐ کے برحق خلیفہ کے سامنے تلوار کھینچی، گناہ سے کیسے بری قرار دے سکتے ہیں؟

یا وہ لوگ جو "صفین" و "نہروان" میں اکٹھے ہونے اور پیغمبرؐ کے وصی و جانشین اور مسلمانوں کے منتخب خلیفہ کے مقابلہ جنگ کھڑی کردی، اور بے حساب خون بہائے، انھیں رضائے خدا کا مشمول جان لیں، اور یہ کہنے لگیں کہ گناہ وعصیان کا گرد وغبار بھی ان کے دامن پر نہیں بیٹھا۔

اور اس سے بھی عجیب تر ان لوگوں کا عذر ہے جو ان تمام مخالفتوں کو اس عنوان سے کہ وہ "مجتہد" تھے اور "مجتہد" معذور ہے توجیہ کرتے ہیں۔

اگر اس قسم کے عظیم گناہوں کی "اجتہاد" کے ذریعہ توجیہ کی جاسکتی ہو تو پھر کسی قاتل کو ملامت نہیں کی جاسکتی، یا حدودِ الٰہی کا اس میں اجرا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے اجتہاد کیا ہو۔

دوسرے لفظوں میں میدان جمل یا صفین یا نہروان میں دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ہیں، اور یقینی طور پر وہ دونوں کے دونوں حق پر نہیں تھے، کیونکہ ضدین کا جمع ہونا محال ہے۔ اس حالت میں دونوں کو رضائے خدا کا مشمول کیسے سمجھا جاسکتا ہے، جبکہ یہ مسئلہ کوئی مشکل اور ایسے پیچیدہ مسائل میں سے نہیں تھا، جس کی تشخیص ممکن نہ ہو؟ کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ علیؑ یا تو پیغمبرؐ کی نص کے مطابق اور یا مسلمانوں کے انتخاب کے ذریعہ برحق خلیفہ تھے، اس کے باوجود ان کے خلاف تلوار کھینچی، اس کام کی اجتہاد کے طریقہ سے کیسے توجیہ کی جاسکتی ہے؟!

"اصحابِ ردہ" کی شورش کو جو ابوبکر کے زمانہ میں ہوئی اس کی طریقِ اجتہاد سے توجیہ کیوں نہیں کرتے، اور انہیں رسمی و قانونی طور پر مرتد کیوں شمار کرتے ہیں، لیکن "جمل" "صفین" "نہروان" کے شورش کرنے والوں کو ہر قسم کے گناہ سے مبرا سمجھتے ہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنزیہ اصحاب کا مسئلہ مطلق طور پر ایک سیاسی مسئلہ تھا، ایک گروہ نے پیغمبرؐ کے بعد اپنی حیثیت کی حفاظت کے لیے اس پر تکیہ کیا تاکہ اپنے آپ کو ہر قسم کی تنقید و اعتراض سے بچالے اور محفوظ کرلے۔ اور یہ ایک ایسا مطلب ہے جو نہ تو عقل کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی مسلمہ اسلامی تاریخوں کے ساتھ، اور یہ ایک ایسا شعر ہے جو ہمیں اپنے قافیہ میں گرفتار کرلے گا۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم صحابۂ رسولِ خدا اور ان لوگوں کا جو ہمیشہ آپؐ کے طریقہ اور راستہ پر چلتے رہے، احترام کرنے کے باوجود ان کے بارے میں معیارِ حیات، ان کی زندگی میں آغاز سے لے کر انجام تک ان کے عقائد و اعمال کو اُسی معیار سے سمجھیں جو معیار کہ ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے، یعنی وہی معیار کہ جس کے ساتھ پیغمبرؐ اپنے صحابہ کو پرکھتے تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭

۲۔ **اسلامی باہمی محبت**: اسلامی روایات میں جو آخری آیہ کی تفسیر میں منقول ہوئی ہیں، "رحماء بینھم" کی اصل پر بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے، منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بیان ہوا ہے:

"المسلم اخو المسلم، لا یظلمه، ولا یخذله، ولا یخوفه، ویحق علی المسلم الاجتهاد فی التواصل، والتعاون علی التعاطف، والمواساة لاهل الحاجة، وتعاطف بعضهم علی بعض، حتی تکونوا کما امرکم الله عز وجل: رحماء بینکم متراحمین، مغتمین لما غاب عنکم من امرهم، علی ما مضی علیه معشر الانصار علی عهد رسول الله (ص):

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا، اُسے تنہا نہیں چھوڑتا، اُسے ڈراتا دھمکاتا نہیں، اور ضروری ہے کہ مسلمان حاجت مندوں سے ربط، تعلق، تعاون، محبت اور اُنسیت میں کوشش کرے، اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربان ہو۔ تاکہ ارشادِ خداوندی "رحماء بینھم" کے مطابق ایک دوسرے سے محبت اور پیار کا سلوک رواج پائے، یہاں تک کہ ان کے پیچھے پیچھے ان کے امور کے بارے میں دل سوزی سے کام لیں۔ جیسا کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں انصار تھے۔ [1]

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس آیت کی مؤثر رہنمائی اور اُن خصوصیات سے، جو سچے مومنین اور رسول اللہ کے صحابہ کی مثال بنتی ہیں، دوری اختیار کرلی ہے۔ اور بعض اوقات تو اس طرح سے ایک دوسرے کے جان لیوا بن جاتے ہیں اور ایسی کینہ پروری اور خونریزی کرتے ہیں، کہ دشمنانِ اسلام کے لیے بھی کبھی ایسی نہ کی ہوگی۔

بعض اوقات کفار کے ساتھ دوستی کا ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ ایک ہی اصل و نسب کے بھائی ہیں۔

نہ اس رکوع و سجود کا کوئی پتہ ہے، نہ وہ پاکیزہ نیتیں اور "ابتغاء فضل اللہ" (اللہ کے فضل کا طالب ہونا)، اور نہ ہی چہروں پر سجدوں کے وہ آثار نمایاں ہیں، نہ وہ نشوونما، نہ کونپلیں نکالنا، نہ قوی ہونا اور نہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم جتنا ان قرآنی اصولوں سے دُور ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ درد و رنج اور ذلت و لکنت میں گرفتار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی توجہ نہیں کرتے کہ ہمیں یہ ضرب کہاں سے پڑی ہے؟ پھر وہی "جاہلیت کی طرفداریاں غور و فکر کرنے تجدید نظر اور قرآن کی طرف لوٹنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، خدایا ہمیں اس گہری اور خطرناک نیند سے بیدار کردے۔

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم پیغمبرؐ کے سچے اصحاب و انصار کی اخلاقی خصوصیات کو، جو ان آیات میں آئی ہیں۔ اپنے اندر زندہ کریں۔

---

[1] "اصول کافی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ صفحہ حدیث ۹۱۔

بارالٰہا! ہمیں دشمنوں کے مقابلہ میں شدت، دوستوں کے ساتھ محبت، تیرے فرمان کے لیے تسلیم و رضا، تیری خاص عنایات کی طرف توجہ، اور اسلامی معاشرے کو بار دار کرنے کے لیے سعی و کوشش اور اس کو ترقی دینے اور پھیلانے کی توفیق عنایت فرما۔

پروردگارا! ہم تجھ سے فتح مبیں کے طلب گار ہیں، جس کے سائے میں ہمارا اسلامی معاشرہ حرکت میں آجائے، اور اس عصر اور زمانہ میں جس میں ہر دوسرے وقت سے زیادہ معنویت و روحانیت کی احتیاج و ضرورت ہے، ہم اس دین کی حیات بخش تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ہر روز نئے دلوں کو اسلام کی تسخیر و اطاعت میں داخل کریں اور دلوں کے ممالک میں سے ایک نیا ملک فتح کرلیں، (آمین یارب العالمین)

سورۂ فتح کا اختتام
۶ شوال ۱۴۰۵ھ
۱۳۶۴/۴/۴

سُورۂ حجرات

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا
اور اس کی ۱۸ آیات ہیں

تاریخ شروع
۶ شوال ۱۴۰۵ھ
۱۳۶۴/۴/۴

سُورۂ حجرات
کے
مطالب

اس سُورہ میں، جس میں اٹھارہ سے زیادہ آیات نہیں ہیں، پیغمبرؐ سے مربوط اور اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے سے تعلق کے بارے میں بہت اہم مسائل بیان ہُوئے ہیں، اور چونکہ اس میں بہت سے اہم اخلاقی مسائل کو عنوان بنایا گیا ہے لہٰذا اس سُورہ کو "سُورۂ اخلاق و آداب" بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس سُورہ کے مختلف حصّوں کا مجموعی طور سے کچھ اس طرح خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصّہ

آغاز سُورہ کی آیات ہیں، جو اسلام کے عظیم ترین پیشوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے آداب اور ان اصولوں کو بیان کرتی ہیں جن کا مسلمانوں کو آپ کے حضور میں کاربند ہونا چاہیئے:

دوسرا حصّہ

اس سُورہ کا "اجتماعی اور معاشرتی اخلاق" کے اہم اصول کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے، جن کی پابندی سے اسلامی معاشرہ میں محبت و صفا و امنیت و اتحاد کی حفاظت ہوتی ہے اور ان کے برخلاف ان کو فراموش کر دینا بدبینی، نفاق پراگندگی اور بدامنی کا سبب بنتا ہے۔

تیسرا حصّہ

ایسے احکام ہیں، جو اختلافات اور آپس میں لڑ پڑنے کے خلاف مبارزہ کرنے کی کیفیت سے مربوط ہیں، جو بعض اوقات مسلمانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

چوتھا حصّہ

انسان کی بارگاہِ خدا میں قدر و قیمت اور مسئلہ تقویٰ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

پانچواں حصہ

اس مسئلہ کی تاکید کرتا ہے کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اعتقاد قلبی کے علاوہ اس کے آثار انسانی اعمال اور اموال اور نفسوں کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی آشکار ہونے چاہئیں۔

چھٹا حصہ

اس چیز سے بحث کرتا ہے کہ اسلام و ایمان، خدا کا مومنین کے لیے ایک عظیم ہدیہ ہے، لہٰذا بجائے اس کے کہ اس کو قبول کرکے احسان جتلائیں، انھیں تو حد سے زیادہ ممنون و مشکور ہونا چاہیئے کہ وہ اس ہدیہ کے مشمول ہوئے۔

اور آخر میں:

ساتواں حصہ

جو اس سورہ کا آخری حصہ ہے، تمام عالم ہستی کے پوشیدہ اسرار، اور انسانوں کے اعمال سے خدا کے علم و آگاہی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جو حقیقت میں ان تمام حصوں کے اجزاء کے ضامن کے طور پر آیا ہے، جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔

اس سورہ کا نام سورۂ "حجرات" اس سورہ کی چوتھی آیت کی مناسبت سے ہے، جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کی تفسیر عنقریب بیان ہوگی۔

❊ ❊ ❊

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں بس یہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے:

"من قرأ سورة الحجرات اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من اطاع اللہ ومن عصاہ"

"جو شخص سورۂ حجرات کو پڑھے گا اُسے ان تمام افراد کی تعداد کے برابر، جنہوں نے خدا کی اطاعت کی ہے، یا نافرمانی کی ہے، دس نیکیاں دی جائیں گی۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے۔

"من قرأ سورة الحجرات فی کل لیلة، او فی کل یوم، کان من زوار محمد (ص)"

"جو شخص سورۂ حجرات کو ہر رات یا ہر روز پڑھے گا وہ زائرین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہوگا۔"

یہ بات واضح ہے کہ یہ تمام حسنات اطاعت کرنے والوں اور معصیت کرنے والوں میں اس صورت میں نمودپذیر ہوں گے۔ جب انسان ان دونوں میں سے ہر ایک کے اعمال کو، جو اس سورہ میں منعکس ہوئے ہیں، دقت کے ساتھ نظر میں رکھے، ان میں غور و فکر کرے اور اپنے راہ عمل کو اول پر منطبق اور دوسرے سے جدا کرے۔

علاوہ ازیں پیغمبر گرامیؐ کی زیارت سے مشرف ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ جو آداب اس سورہ میں آنحضرتؐ کی شخصیت کے بارے میں آئے ہیں ان پر عمل کرے، کیونکہ تلاوت تو ہر مقام پر عمل کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔

سورۂ حجرات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

۱- يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ○

۲- يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ○

۳- اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ○

۴- اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ○

۵- وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○

ترجمہ

خدا کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسول سے کسی چیز میں آگے نہ بڑھا کرو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، بیشک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۔ اے ایمان لانے والو! تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو، اور اس کے سامنے اونچے اونچے نہ بولا کرو۔ (اور چیخ و پکار نہ کرو) جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے (زور زور سے) باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

۳۔ وہ لوگ جو رسول خدا کے سامنے اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے خالص کر لیا ہے، ان کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔

۴۔ لیکن وہ لوگ جو تمہیں حجروں کے پیچھے سے بلند آواز کے ساتھ پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔

۵۔ اگر وہ لوگ اتنا صبر کرتے کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آ جاتے تو ان کے لیے بہتر تھا، اور خدا غفور و رحیم ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے پہلی آیت کے لیے تو بہت سی الگ شانِ نزول بیان کی ہیں اور بعد والی آیات کے لیے دوسری شان نزول۔

ان میں سے پہلی آیت کے لیے جو شان نزول بیان کی ہیں۔ یہ ہے کہ پیغمبرؐ "خیبر" کی طرف روانہ ہوتے وقت کسی کو "مدینہ" میں اپنی جگہ متعین کرنا چاہتے تھے، لیکن عمر نے کسی دوسرے آدمی کو متعین کرنے کی تجویز پیش کی اس پر اُوپر

والی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم دیا کہ تم خدا اور پیغمبر سے آگے نہ بڑھا کرو۔ [1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ: مسلمانوں کی ایک جماعت کے لوگ کبھی کبھی یہ کیا کرتے تھے کہ اگر اس قسم کا معنیٰ ہمارے بارے میں نازل ہوتا تو بہتر تھا، اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور کہا کہ تم خدا اور اس کے پیغمبرؐ سے آگے نہ بڑھا کرو۔ [2]

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے: یہ آیت بعض مسلمانوں کے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ جنہوں نے اپنی عبادات کے مراسم میں سے بعض کو وقت سے پہلے انجام دے دیا تھا تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور انھیں اس قسم کے کاموں سے منع کیا۔ [3]

باقی رہی دوسری آیت تو اس کے بارے میں یہ کہا ہے کہ قبیلہ بنی تمیم کا ایک گروہ اور ان کے اشراف مدینہ میں وارد ہوئے اور جب مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو بلند آواز کے ساتھ، ان حجروں کے پیچھے سے، جو پیغمبرؐ کی رہائش گاہ تھے، پکار پکار کر کہا: یا محمد اخرج الینا: "اے محمد! باہر آ"!

اس چیخ پکار، اور غیر مودبانہ تعبیروں سے پیغمبر کو دکھ ہوا، جس وقت آپ باہر آئے تو انھوں نے کہا: ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ اپنا فخر تجھ پر ظاہر کریں، اجازت دے تاکہ، ہمارا "شاعر" اور "خطیب" "بنی تمیم کے افتخارات بیان کرے پیغمبرؐ نے اجازت دی۔

پہلے ان کا خطیب کھڑا ہوا، اور قبیلہ بنی تمیم کے خیالی فضائل کی بہت سی باتیں بیان کیں۔

پیغمبرؐ نے ثابت بن قیس سے فرمایا [4] تم ان کا جواب دو، وہ کھڑے ہو گئے اور ان کے جواب میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ پیش کیا، جس نے ان کے خطبہ کے اثر کو ختم کر دیا۔

اس کے بعد ان کا "شاعر" کھڑا ہوا، اور اس نے اس قبیلہ کی مدح میں کچھ اشعار کہے، جن کا مشہور مسلمان شاعر "حسان بن ثابت" نے کافی و شافی جواب دیا۔

اس وقت اس قبیلہ کے اشراف میں سے ایک نے جس کا نام "اقرع" تھا، کہا: اس شخص کا خطیب ہمارے خطیب سے زیادہ توانا ہے اور اس کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ لائق ہے۔ اور ان کی آواز کی طرز بھی ہم سے برتر و بہتر ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹، صفحہ ۶۱۲۱۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

[3] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

[4] ثابت ابن قیس جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و انصار کا مشترکہ خطیب تھا، جیسا کہ حسان حضرتؐ کا خطیب تھا۔
(اسد الغابہ جلد ۱، ص ۲۲۹)

اس موقع پر پیغمبرؐ نے ان کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے حکم دیا تو اچھے اچھے ہدیے انھیں دیئے گئے، ان تمام باتوں کا ان پر بہت اثر ہوا، اور انھوں نے پیغمبرؐ کی نبوت کا اعتراف کرلیا۔

زیر بحث آیات پیغمبرؐ کے گھر کے پیچھے انھیں کی چیخ پکار کے بارے میں ہیں۔

ایک دوسری شانِ نزول بھی بیان کی گئی ہے جو پہلی آیت سے بھی مربوط ہے، اور بعد والی آیات سے بھی، اور وہ یہ ہے کہ:

ہجرت کے نویں سال جو "عام الوفود" تھا یعنی وہ سال جس میں قبائل کے قسم قسم کے وفود اسلام قبول کرنے یا عہد و پیمان کرنے کے لیے پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے)۔ چنانچہ جس وقت "بنی تمیم" کے قبیلہ کے نمائندے پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے تو ابوبکر نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تجویز پیش کی کہ "قعقاع" کو (جو ان کے اشراف میں سے ایک تھا) آپ کا امیر بنادیا جائے اور عمر نے یہ تجویز پیش کی کہ "اقرع بن حابس" کو اسی قبیلہ کا ایک دوسرا آدمی، امیر بنایا جائے۔

اس موقع پر ابوبکر نے عمر سے کہا، کیا تم میری مخالفت کرنا چاہتے ہو؟ عمر نے کہا، میرا ہرگز مخالفت کا ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت دونوں نے پیغمبرؐ کے سامنے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کردیا جس پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں، یعنی نہ تو کاموں میں پیغمبرؐ سے آگے بڑھو اور نہ ہی پیغمبر کے گھر کے سامنے چیخ پکار کرو۔[1]

تفسیر
پیغمبرؐ کی بارگاہ کے آداب

جیسا کہ ہم نے سورہ کے مضامین و مطالب کے بیان میں اشارہ کیا ہے اس سورہ میں اہم اخلاقی مباحث اور انضباطی احکام کا ایک سلسلہ نازل ہوا ہے جس نے اس کو "سورۂ اخلاق" کہلانے کے لائق بنادیا ہے، اور زیر بحث آیات میں جو اس سورہ کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں، ان ہی احکام کے دو حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

پہلا خدا و رسول پر کسی چیز میں سبقت نہ کرنا۔

---

[1] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱ و "تفسیر فی ظلال القرآن" جلد ۷ صفحہ ۵۲۴۳، و سیرۃ ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۲۰۶ سے آگے (کچھ فرق کے ساتھ) یہ داستان نقل ہوئی ہے (یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی آئی ہے۔ صحیح بخاری جزء ۶ صفحہ ۱۶۲، سورۂ حجرات کی تفسیر میں۔

دوسرا پیغمبر کی بارگاہ میں شور و غوغا اور چیخ و پکار نہ کرنا۔

اس کے بعد فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! کسی چیز کو خدا و رسول سے مقدم نہ کرو، اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے": (یاایھا الذین امنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم)۔

خدا اور پیغمبر کے سامنے کسی چیز کو مقدم نہ کرنے سے مراد، کاموں میں اُن سے سبقت نہ کرنا ہے، اور خدا و رسولؐ کے حکم کے مقابلہ میں عجلت اور تیزی اختیار نہ کرنا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے آیت کے مفہوم کو محدود کرنا چاہا ہے کہ اس کو وقت سے پہلے عبادات کو انجام دینے، یا پیغمبرؐ کے گفتگو کرنے سے پہلے بات کرنے، اور اسی قسم کی دوسری چیزوں میں منحصر سمجھیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ آیت ایک وسیع اور کشادہ مفہوم رکھتی ہے اور ہر قسم کے پروگرام میں ہر قسم کی سبقت کرنا شامل ہے۔ [1]

"پیروکاروں" کی "پیشواؤں اور رہبروں" کے سامنے نظم و ضبط کی ذمہ داری، خصوصاً ایک عظیم رہبر الٰہی کے ضمن میں اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کسی کام میں اور کسی بات اور پروگرام میں ان پر سبقت اور پیش قدمی، اور عجلت اور تیزی نہ کریں۔

البتہ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر وہ کوئی تجویز سامنے لاتے ہوں یا مشورہ دینا چاہتے ہوں تو وہ بھی رہبر الٰہی کے سامنے پیش نہ کریں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے آگے چل پڑنا، مصمم ارادہ کر لینا۔ اور کسی کام کو ان کی تصویب سے پہلے انجام دینا۔

یہاں تک کہ مسائل کے بارے میں بھی ضرورت سے زیادہ سوال و گفتگو نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ یہ بات رہبر پر چھوڑ دینی چاہیئے کہ وہ اپنے موقع و محل پر سائل کو پیش کرے۔ خصوصاً ہر معصوم کی صورت میں جو کسی چیز سے غفلت نہیں کرتا، اور اگر کوئی اور شخص اس سے سوال کر رہا ہو تو دوسروں کو پیش قدمی اور سبقت کرتے ہوئے جلدی کر کے سوال کا جواب بھی نہیں دینا چاہیئے۔ حقیقت میں یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

"اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کرو اور اس کے سامنے اونچی آواز کے ساتھ بات نہ کرو، اور داد و فریاد اور چیخ پکار نہ کرو، جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو، کہ

---

[1] "لاتقدموا" فعل متعدی کی صورت میں ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "لا تقدموا امرا بین یدی اللہ ورسولہ" کسی کام میں اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ فعل یہاں فعل لازم کے معنی میں آیا ہے اور اس کا مفہوم لاتقدموا بین یدی اللہ ..... ہے اللہ کے سامنے ایک دوسرے پر تقدم نہ کرو۔ اگرچہ یہ دونوں تفاسیر اصول ادبی کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن معنی اور نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہیں۔ بہر حال مراد یہ ہے کہ کسی چیز میں خدا اور پیغمبرؐ پر سبقت نہ کرو۔

تمہارے اعمال ختم اور نابود ہو جائیں درآنحالیکہ تمہیں خبر بھی نہ ہو" (یا ایھا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون)۔

پہلا جملہ (لا ترفعوا اصواتکم .....) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی آواز کو پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو، کیونکہ یہ ان کے حضور میں ایک قسم کی بے ادبی ہے، پیغمبرؐ کا تو مقام ہی بلند ہے، یہ کام تو ماں باپ، اور استاد و معلم کے سامنے بھی ادب و احترام کے خلاف ہے۔

باقی رہا جملہ (لا تجھروا لہ بالقول ....) ممکن ہے یہ اُسی پہلے جملہ کے معنی کی ایک تاکید ہو، یا کسی نئے مطلب کی طرف اشارہ ہو، اور وہ پیغمبرؐ کو "یا محمد" کے جملہ کے ساتھ خطاب نہ کرنے اور اس کی بجائے "یا رسول اللہ" کہنا ہو۔

البتہ مفسرین کی ایک جماعت نے ان دونوں جملوں کے درمیان فرق کے بارے میں اس طرح کہا ہے، پہلا جملہ تو اس وقت کے بارے میں ہے جب لوگ پیغمبرؐ سے بات کر رہے ہوں، تو ان کی آواز پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہیں ہونی چاہیئے اور دوسرے جملہ کا تعلق اس موقع سے ہے جب پیغمبرؐ خاموش ہوں اور لوگ آپ کی بارگاہ میں باتیں کر رہے ہوں، تو اس حالت میں بھی انکی آواز زیادہ بلند نہیں ہونی چاہیئے۔

اس معنی اور سابقہ معنی کو جمع کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، اور آیت کے شانِ نزول کے ساتھ بھی سازگار ہے۔ بہرحال آیت کا ظاہر زیادہ تر یہی ہے، کہ وہ دو مختلف مطالب کو بیان کر رہی ہے۔

یہ بات ظاہر اور واضح ہے کہ اگر اس قسم کے اعمال مقامِ شانِ نبوت کی توہین کے ارادہ سے ہوں تو موجب کفر ہیں، اور اس کے بغیر ہوں تو ایذاء و گناہ ہیں۔

پہلی صورت میں تو اعمال کے حبط اور نابودی کی علت واضح ہے، کیونکہ کفر علت حبط (نیک عمل کے ثواب کے ختم ہونے) کا باعث ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ اس قسم کا بُرا عمل بہت سے اعمال کے ثواب کی نابودی کا سبب بن جائے، اور ہم پہلے بھی "حبط" کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض اعمال کے ثواب کا بعض گناہوں کی وجہ سے نابود ہو جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ جیسا کہ اعمال صالح کی وجہ سے بعض گناہوں کے اثر کا نابود ہو جانا بھی قطعی و یقینی ہے، اور قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس معنی پر بہت سے دلائل موجود ہیں، اگرچہ یہ معنی ایک قانون کلی کی صورت میں "تمام حسنات" و "سیئات" میں ثابت نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعض اہم "حسنات" اور "سیئات" کے بارے میں بہت سی منقول دلیلیں موجود ہیں، اور عقلی طور پر بھی اس کے برخلاف کوئی دلیل نہیں ہے۔[1]

---

[1] مسئلہ "حبط" کے بارے میں مزید تشریح جلد ۱ ص ۲۶۶ (سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں) مطالعہ فرمائیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی، تو "ثابت بن قیس" نے (جو پیغمبرؐ کے خطیب تھے اور بلند آواز تھے) کہا: وہ میں تھا جو اپنی آواز کو پیغمبرؐ کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا، اور آپؐ کے سامنے اونچی آواز سے خطاب کیا کرتا تھا، پس میرے اعمال نابود ہو گئے ہیں، اور میں اہل دوزخ میں سے ہوں۔

یہ مطلب پیغمبرؐ کے کانوں تک پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہیں ہے، وہ اہل بہشت میں سے ہے"۔ (کیونکہ وہ یہ کام مومنین کے لیے خطاب کرتے وقت یا مخالفین کے مقابلہ میں ایک اسلامی وظیفہ و ذمہ داری ادا کرنے کے لیے انجام دیا کرتا تھا) [1]

جیسا کہ عباس بن عبد المطلب نے بھی جنگِ "حنین" میں پیغمبرؐ کے حکم سے بلند آواز میں بھاگنے والوں کو واپس لوٹنے کی دعوت دی تھی۔

❁ ❁ ❁

بعد والی آیت میں، اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے، ان لوگوں کے اجر و ثواب کو، جو خدا کے اس دستور پر عمل کرتے ہیں، اور پیغمبرؐ کے سامنے انضباط و ادب کی رعایت کرتے ہیں، اس طرح بیان کرتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی آواز پیغمبرؐ کے سامنے دھیمی رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہیں، جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے خالص اور کشادہ کر دیا ہے اور ان کے لیے مغفرت اور عظیم اجر ہے": (ان الذین یغضون اصواتھم عند رسول اللہ اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوٰی لھم مغفرۃ واجر عظیم) [2]

"یغضون" "غض" (بروزن حظ) کے مادہ سے نگاہ یا صدا کو کم کرنے اور کوتاہ کرنے کے معنی میں ہے، اور اس کے مقابلہ میں نگاہ کو خیرہ کرنا اور آواز کو بلند کرنا ہے۔

"امتحن" "امتحان" کے مادہ سے، اصل میں سونے کو پگھلانے اور غیر خالص کو الگ کرنے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات چمڑے کو پھیلانے کے معنی میں بھی آیا ہے، لیکن بعد میں آزمائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے ایسی آزمائش جس کا نتیجہ دل کا خلوص اور تقویٰ قبول کرنے کے لیے اس میں وسعت کا پیدا ہونا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں "نبی" کی تعبیر ہوئی ہے اور یہاں "رسول اللہ" کی تعبیر ہے، اور یہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۰۔ یہ حدیث مختصر سے فرق کے ساتھ بہت سے مفسرین و محدثین کے کلمات میں۔ منجملہ ان کے نور الثقلین، صحیح بخاری، تفسیر فی ظلال القرآن اور مراغی میں۔ آئی ہے۔

[2] "للتقوٰی" میں "لام" درحقیقت "لام غایت" ہے نہ کہ "لام علت" یعنی ان کے دلوں کو تقویٰ کو قبول کرنے کے لیے خالص اور آمادہ کرتا ہے، کیونکہ اگر دل خالص نہ ہو اور آلودگیوں سے پاک نہ ہو تو پھر حقیقی تقویٰ اس میں جاگزیں نہیں ہو سکتا۔

دونوں باتیں گویا اس نکتہ کی طرف اشارہ ہیں کہ پیغمبرؐ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا، وہ خدا کا بھیجا ہوا اور اس کا پیام لانے والا ہے لہٰذا اس کے سامنے سوء ادب خدا کے بارے میں سوء ادب ہے اور اس کے لیے ادب کی رعایت کرنا خدا کیلئے ادب کی رعایت کرنا ہے۔

ضمنی طور پر "مغفرۃ" کی تعبیر نکرہ کی صورت میں تعظیم و اہمیت کے لیے ہے، یعنی خدا انھیں کامل و عظیم مغفرت نصیب کرے گا۔ اور گناہ سے پاک ہونے کے بعد انھیں اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ کیونکہ پہلے تو گناہ سے پاک ہونا پڑتا ہے اس کے بعد خدا کا عظیم اجر حاصل ہوتا ہے۔

بعد والی آیت مزید تاکید کے لیے، ایسے لوگوں کی نادانی اور بے عقلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو اس حکم الٰہی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: "جو لوگ تجھے حجروں کے پیچھے سے بلند آواز کے ساتھ پکارتے ہیں ان میں سے اکثر عقل و خرد سے کورے ہیں" (ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون)۔

یہ کونسی عقل و خرد ہے کہ انسان خدا کے عظیم ترین سفیر کے سامنے ادب و آداب کی رعایت نہ کرے، اور "بنی تمیم" کے بدوؤں کی طرح، بلند اور غیر مؤدبانہ آواز پیغمبرؐ کے گھر کے پیچھے نکالے اور پکار پکار کر کہے: یا محمد! یا محمد! اخرج الینا، اور پروردگار کی اس مہر و عطوفت کے مرکز کو اس طرح سے ایذا اور آزار پہنچائے۔

اصولی طور پر انسان کی عقل و خرد جتنی بلند ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کے ادب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، کیونکہ وہ "قدروں" اور "اقتدار کی ضد" کو بہتر طور پر سمجھنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بے ادبی ہمیشہ بے عقلی کی نشانی ہوتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں بے ادبی حیوان کا کام ہے اور ادب انسان کا۔

"اکثرھم لا یعقلون" (ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں) کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ "اکثر" بعض اوقات لغت عرب میں "کل اور سب" کے معنی میں بولا جاتا ہے، لیکن احتیاط اور ادب کی رعایت کی بنا پر اس تعبیر کو استعمال کرتے ہیں، تاکہ اگر ایک شخص بھی مستثنیٰ ہوا ہو تو اس کا حق بھی ضائع نہ ہو، گویا خدا اس تعبیر کے ساتھ فرماتا ہے: میں جو تمھارا پروردگار ہوں، اور ہر چیز پر احاطہ علمی رکھتا ہوں، میں بات کرتے وقت آداب کی رعایت کرتا ہوں تو پھر تم کیوں رعایت نہیں کرتے؟

یا یہ کہ واقعاً ان کے درمیان کچھ عقلمند آدمی بھی تھے جو عدم توجہ یا ہمیشہ کی عادت کی بنا پر صدا بلند کرتے تھے، قرآن اس طریقہ سے انہیں تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی عقل و خرد کو کام میں لائیں اور ادب کو فراموش نہ کریں۔

"حجرات" "حجرۃ" کی جمع ہے یہاں ان متعدد کمروں کی طرف اشارہ ہے جو مسجد نبوی کے پہلو میں آپؐ کی ازواج کے لیے تیار کئے گئے تھے، اور اصل میں "حجر" (بر وزن اجر) کے مادہ سے منع کے معنی میں ہے۔ کیونکہ حجرہ دوسرے لوگوں کے لیے انسان کی زندگی کے حریم میں داخل ہونے سے مانع ہے، اور یہاں "وراء" کی تعبیر باہر کے معنی میں ہے چاہے جس طرف سے ہو، کیونکہ پیغمبر کے حجروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، اور نادان و جلد باز

لوگ بعض اوقات حجرہ کے دروازے کے سامنے آتے، اور "یا محمد" کہہ کر پکارتے، قرآن انھیں اس کام سے منع کر رہا ہے۔

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں اس معنی کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے:

"اگر وہ صبر سے کام لیتے اور اتنا صبر کرتے کہ تم خود نکل کر اُن کے پاس آجاتے تو ان کے لیے بہتر تھا" (ولو انھم صبروا حتّٰی تخرج الیھم لکان خیرًا لھم)۔

یہ ٹھیک ہے، کہ عجلت اور جلد بازی سے بعض اوقات انسان اپنے مقصد تک جلد تر پہنچ جاتا ہے، لیکن ایسے مقام پر صبر و شکیبائی ہی مایہ رحمت و آمرزش اور اجر عظیم ہے، اور یقیناً یہ اس پر برتری رکھتا ہے۔

اور چونکہ کچھ افراد لاشعوری طور پر پہلے اس قسم کے کام کے مرتکب ہو چکے تھے اور وہ اس خدائی حکم کے نزول کے ساتھ طبعاً و فطرۃً دہشت میں پڑ جاتے۔ لہٰذا قرآن انھیں یہ خوش خبری دیتا ہے۔ کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو وہ بھی خدا کی رحمت میں شامل ہو جائیں گے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے، "اور خدا غفور و رحیم ہے" (واللہ غفور رحیم)۔

چند نکات

۱۔ ادب افضل ترین سرمایہ ہے

اسلام میں ہر شخص اور ہر گروہ سے ملاقات میں احترام و ادب سے پیش آنے کی، اور رعایت آداب کے مسئلہ کی بہت زیادہ اہمیت بیان ہوئی ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الادب حلل مجددۃ: "ادب کی رعایت زینت کے نئے فاخرہ لباس کی طرح ہے"۔[1]

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"الادب یغنی عن الحسب": "ادب انسان کو اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں پر فخر کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے"۔[2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۵۔

[2] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۶۸۔

"خمس من لم تکن فیہ لم یکن فیہ کثیر مستمتع
قیل وماھن یاابن رسول اللہ؟
قال: الدین والعقل والحیاء وحسن الخلق وحسن الادب :

"پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں نہ ہوں تو وہ قابل ملاحظہ صفات و امتیازات کا حامل نہ ہوگا۔
عرض کیا گیا: اے فرزند رسول اللہ وہ کیا ہیں؟
فرمایا: دین و عقل و حیاء و حسن خلق و حسن ادب: [1]

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں اسی امام سے منقول ہے۔ کہ آپؑ نے فرمایا:

"لا یطمعن ذو الکبر فی الثناء الحسن ولا الخب فی کثرۃ الصدیق ولا السی الادب فی الشرف :

"تکبر کرنے والوں کو لوگوں سے ذکر خیر کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیئے، اور نہ ہی دھوکہ باز اور مکار لوگوں کو دوستوں کی کثرت کی امید رکھنی چاہیئے، اور نہ ہی بے ادب لوگوں کو عزت و آبرو اور شرف و بزرگی کی توقع کرنی چاہیئے۔ [2]

اسی بنا پر جب ہم اسلام کے عظیم رہنماؤں کی زندگی میں غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ادب سے متعلق دقیق ترین نکات کی اپنے سے چھوٹے افراد تک کے لیے بھی رعایت کرتے تھے۔

اصولی طور پر دین آداب کا ایک مجموعہ ہے، خدا کے لیے ادب پیغمبرؐ کے سامنے ادب، ائمہ معصومینؑ کے سامنے ادب۔ استاد و معلم، ماں باپ اور عالم و دانش مند کے سامنے ادب۔

یہاں تک کہ قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے اس مقام عظمت کے باوجود، جب اپنے بندوں سے بات کرتا ہے تو آداب کی پورے طور پر رعایت کرتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو پھر خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لوگوں کی ذمہ داری واضح اور روشن ہے،

ایک حدیث میں منقول ہے:

"جس وقت سورۂ مؤمنون کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اور انھیں آداب اسلامی کے دستور میں رکھا، جن میں سے ایک نماز میں خشوع کا مسئلہ تھا، تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پہلے

---

[1] "بحار الانوار"، جلد ۷۵، ص ۶۷۔
[2] "بحار الانوار" جلد ۷۵، ص ۶۷۔

نماز کے وقت آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے، پھر کبھی سر نہیں اُٹھایا اور پھر آپؐ ہمیشہ زمین ہی کی طرف نظر رکھتے تھے"۔ [1]

پیغمبرِ خدا کے بارے میں بھی یہ موضوع اس حد تک اہم ہے کہ قرآن اوپر والی آیات میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ پیغمبرؐ کی آواز سے آواز بلند کرنا، اور ان کے سامنے شور و غل مچانا حبط اعمال کا موجب اور ثواب کے ختم ہونے کا سبب ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ پیغمبرؐ کے سامنے صرف اس نکتہ کی رعایت ہی کافی نہیں ہے، بلکہ دوسرے ایسے امور بھی جو سوء ادب کے لحاظ سے آواز بلند کرنے اور شور و غل مچانے کے مانند ہیں وہ بھی آپ کی بارگاہ میں ممنوع ہیں، اور فقہی اصطلاح میں یہاں "القاء خصوصیت" اور "تنقیح مناط" کرنی چاہیئے۔ اور اس کے اشباہ و نظائر یعنی ملتی جلتی باتوں کو بھی اس سے ملحق کرنا چاہیئے۔

سورۂ نور کی آیہ ۶۳ میں بھی یہ بیان ہوا ہے: لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا، مفسرین کی ایک جماعت نے اس کی یوں تفسیر کی ہے "جس وقت تم پیغمبر کو پکارتے ہو تو ایسے ادب و احترام کے ساتھ اُسے پکارا کرو جو اس کے لائق ہے، نہ کہ اس طرح سے جیسے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو"۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اوپر آیات میں پیغمبرؐ کے سامنے ادب کی رعایت کو دل کی پاکیزگی، تقویٰ کو قبول کرنے کی آمادگی کی نشانی، اور بخشش و آمرزش اور اجرِ عظیم کا سبب شمار کرتا ہے، جبکہ بے ادب لوگوں کو بے عقل چوپایوں کے مانند بتاتا ہے۔

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیات کو وسعت دیتے ہوئے یہ تک کہا ہے کہ یہ بات پچھلے مراحل و امراتب مثلاً علماء، دانش مندوں اور فکری و اخلاقی رہبروں پر بھی عائد ہوتی ہے اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اُن کے سامنے بھی آداب کی رعایت کریں۔

البتہ ائمہ معصومینؑ کے سامنے تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ واضح ہے، یہاں تک کہ ان روایات میں جو اہل بیتؑ کے طریقے سے ہم تک پہنچی ہیں یہ بیان ہوا ہے کہ: جب ایک صحابی جنابت کی حالت میں آپؑ کی خدمت میں آیا تو امامؑ نے بغیر تمہید کے فرمایا:

"اما تعلم انه لا ینبغی للجنب ان یدخل بیوت الانبیاء؟!

"کیا تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ کسی جنابت والے کے لیے انبیاء کے گھر میں داخل ہونا مناسب نہیں ہے"؟ [2]

اور دوسری روایت میں "ان بیوت الانبیاء و اولاد الانبیاء لا یدخلها الجنب" کی تعبیر ہوئی ہے "جو انبیاء کے گھروں کے لیے بھی ہے اور اولاد انبیاء کے گھروں کے لیے بھی"

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" "تفسیر فخر رازی" سورۂ مومنون کی آیہ ۲ کے ذیل میں۔

[2] بحار الانوار جلد ۲۰ ص ۵۵۳۔

مختصر آیہ ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کے سامنے ادب کی رعایت کا مسئلہ اسلامی احکام کے ایک اہم حصہ پر مشتمل ہے، اگر ہم ان سب پر بحث کرنا چاہیں تو تفسیر آیات کی حد سے باہر ہو جائیں گے، ہم یہاں اس بحث کو امام سجاد علی بن الحسینؑ کی ایک حدیث کے ساتھ، جو رسالہ حقوق میں اُستاد کے سامنے ادب کی رعایت کے بارے میں ہے، ختم کرتے ہیں آپؑ نے فرمایا:

"اس شخص کا حق جو تجھے تعلیم دیتا ہے اور تربیت کرتا ہے یہ ہے کہ تو اس کا احترام کرے، اس کی مجلس کو محترم شمار کرے اس کی باتیں کامل طور سے کان دھر کے سُنے، اس کے رُو برو مؤدب ہو کر بیٹھے، اپنی آواز کو اس کی آواز سے بلند نہ کرے اور جب کوئی اس سے سوال کرے تو جواب دینے میں جلدی نہ کرے، اس کے حضور میں کسی سے باتیں نہ کرے اور اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے، اگر اس کے پیٹھ پیچھے کوئی اسے بُرا بھلا کہے تو اس کا دفاع کرے، اس کے عیوب کو چھپائے اور اس کے فضائل کو آشکار کرے، اس کے دشمنوں کے پاس نہ بیٹھے اور اس کے دوستوں کو دشمن نہ رکھے جس وقت تو ایسا کرے گا تو خدا کے فرشتے گواہی دیں گے کہ تو اس کے پاس گیا ہے اور خدا کے لیے تو نے اُس سے علم حاصل کیا ہے نہ کہ مخلوقِ خدا کے لیے۔ [1]

۲۔ پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا

علماء اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث آیات جس طرح پیغمبرؐ کی زندگی میں ان کے پاس آواز بلند کرنے سے منع کرتی ہیں اسی طرح ان کی وفات کے بعد کے زمانہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ [2]

اگر ان کی مراد آیت کی عبارتوں کا شمول ہے تو ظاہر آیت رسول اللہ کے زمانہ حیات کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ اپنی آواز کو آپؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب پیغمبرؐ حیاتِ جسمانی رکھتے ہوں اور یہ بات کر رہے ہوں۔

اور اگر اس سے مراد مناط و فلسفۂ حکم ہو، جو اس قسم کے موقع پر ظاہر و واضح ہے، اور اہل عرف انکا خصوصیت کرتے ہوں، تو پھر تعمیم مذکور بعید نظر نہیں آتی کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ یہاں ہدف و مقصد پیغمبرؐ کی ساحت قدس میں ادب و احترام کی رعایت ہے۔ اس بنا پر جب پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا ایک قسم کی بے احترامی اور ہتک حرمت ہو تو بلا شک و شبہ یہ بات جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اذان نماز کی صورت میں ہو، یا تلاوت قرآن یا خطبہ اور اس کے مانند دوسرے بیانات ہوں تو اس قسم کے مواقع پر نہ تو پیغمبرؐ کی زندگی میں یہ بات ممنوع ہے اور نہ ہی وفات

---

[1] "محجۃ البیضاء" جلد ۴ ص ۵۰ (باب آداب الصحبۃ المعاشرہ)

[2] "روح المعانی" جلد ۲۶ ص ۱۰۵

کے بعد۔

اصول کافی میں ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اُس واقعہ کے بارے میں منقول ہے، جو وفات امام حسن مجتبیٰؑ کے موقع پر اس ممانعت کے سلسلہ میں، جو حضرت کے جوار پیغمبرؐ میں دفن ہونے کے بارے میں "عائشہ" نے کی تھی، اور اس پر ایک چیخ پکار بلند ہوئی تو امام حسینؑ نے "یا ایھا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ..... کی آیت سے استدلال کیا اور رسولؐ خدا سے یہ جملہ نقل فرمایا: ان اللہ حرم من المؤمنین امواتاً ما حرم منھم احیاء: "خدا نے مومنین کے لیے جو کچھ حال حیات میں حرام کیا ہے وہ ان کی موت کے بعد بھی حرام کیا ہے،[1]

یہ حدیث آیت کے مفہوم کی عمومیت کی ایک اور گواہ ہے۔

۳- ہر چیز میں اور ہر جگہ انضباط اسلامی

مسئلہ مدیریت و فرماندہی نظم وضبط کی رعایت کے بغیر کبھی بھی درست نہیں۔ اگر وہ لوگ جو کسی مدیر و رہبر کے ماتحت ہوں خود سرانہ عمل کریں تو تمام کاموں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چاہے رہبر کتنا ہی لائق و شائستہ کیوں نہ ہو۔

بہت سی شکستیں اور ناکامیاں اور جو بہت سے گروہوں، جمعیتوں یا لشکروں کو دامن گیر ہوئی ہیں وہ سب اسی راہ گزر سے ہوئی ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس دستور سے تخلف کا تلخ مزہ پیغمبرؐ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بارہا چکھا ہے جن میں سے سب سے زیادہ واضح جنگ "احد" کی شکست ہے جو ایک تھوڑے سے جنگجو گروہ کی بے قاعدگی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

قرآن مجید نے "اس حد سے زیادہ اہم مسئلہ کو، اوپر والی آیات میں مختصر سی عبارتوں میں جامع اور پرکشش صورت میں پیش کیا ہے اور کہتا ہے: یا ایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، آیت کے مفہوم کی وسعت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہر قسم کے "تقدم" و "تاخر" اور خود سرانہ گفتار و رفتار کو رہبری کے دستور سے خارج ہونا شامل ہے۔

ان حالات میں، پیغمبرؐ کی زندگی کی تاریخ میں زیادہ مواقع ایسے نظر آتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے آپؐ کے فرمان پر سبقت کی، یا پیچھے رہ گئے اور آپ کی اطاعت سے روگردانی کی، تو شدید ملامت و سرزنش کا محل قرار پائے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ:

① جس وقت پیغمبرؐ فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے (تو اس وقت ہجرت کے آٹھویں سال کا) ماہ مبارک رمضان تھا

---

[1] اصول کافی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۸۰۔

اور بہت زیادہ جمعیت آپ کے ہمراہ تھی، ایک گروہ سوار اور ایک پیادہ تھا جس وقت آپ "کراع الغمیم" کی منزل پر پہنچے تو آپ کے حکم سے پانی کا برتن لایا گیا، اور حضرت نے اپنا روزہ افطار کیا آپ کے ہمراہیوں نے بھی افطار کیا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک گروہ نے آپ سے سبقت کی اور افطار کرنے پر تیار نہ ہوا اور اپنے روزے پر قائم رہے، تو پیغمبرؐ نے انھیں "عصاۃ" (یعنی گناہگاروں کا گروہ) نام دیا۔[1]

(۲) دوسرا نمونہ "حجۃ الوداع" کی داستان میں ہجرت کے دسویں سال میں واقع ہوا۔ پیغمبرؐ نے منادی کو یہ ندا کرنے کا حکم دیا کہ جو شخص قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لایا وہ پہلے "عمرہ" بجالائے اور احرام سے خارج ہو جائے، اس کے بعد مراسم حج بجالائے، لیکن جو لوگ قربانی کا جانور ساتھ لائے ہیں (اور ان کا حج، حج افراد ہے) وہ اپنے احرام پر برقرار رہیں، اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا، اگر میں قربانی کے اونٹ ہمراہ نہ لایا ہوتا، تو میں عمرہ کی تکمیل کرتا اور احرام سے خارج ہو جاتا، لیکن ایک گروہ نے اس حکم کو انجام دینے سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبرؐ تو اپنے احرام پر باقی رہے اور ہم احرام سے خارج ہو جائیں؟ کیا یہ بُری بات نہیں ہے کہ ہم مراسم حج کی طرف عمرہ بجالانے کے بعد جائیں جبکہ غسل (جنابت) کے پانی کے قطرات ہم سے گر رہے ہوں۔

پیغمبرؐ اس تخلف اور بے انضباطی سے سخت رنجیدہ ہوئے اور سختی کے ساتھ سرزنش کی۔[2]

(۳) پیغمبرؐ کی وفات کے قریب لشکر "اسامہ" سے تخلف کی داستان مشہور ہے کہ آنحضرت نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "اسامہ بن زید" کی کمان میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور مہاجرین و انصار کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ اس لشکر کے ساتھ جائیں۔

شاید آپ کا منشا یہ تھا کہ آپؐ کی رحلت کے وقت وہ مسائل جو امر خلافت میں واقع ہوئے وہ نہ ہوں، یہاں تک کہ آپؐ نے لشکر اسامہ سے تخلف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود ایک گروہ نے جانے سے روگردانی کی اور بہانہ یہ کیا کہ ہم پیغمبرؐ کو ایسے حالات میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔[3]

(۴) پیغمبر گرامی اسلام کی زندگی کے آخری لمحات میں "قلم و دوات" کی داستان بھی مشہور اور ہلا دینے والی ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم صحیح مسلم کی اصل عبارت کو یہاں نقل کر دیں۔

"لما حضر رسول اللہ وفی البیت رجال فیھم عمر بن الخطاب

---

[1] اس حدیث کو بہت سے مؤرخین اور محدثین نے نقل کیا ہے۔ منجملہ وسائل کی جلد ۷، ص ۱۲۵ (ابواب من یصح منہ الصوم) (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[2] "بحار الانوار" جلد ۲۱ ص ۳۸۶ تلخیص کے ساتھ

[3] اس ماجرے کو بہت سی کتب تواریخ اسلامی میں لکھا گیا ہے اور یہ تاریخ اسلام کے اہم حوادث میں سے ہے (مزید اطلاع کے لیے المراجعات کے مراجعہ ۹۰ کی طرف رجوع کریں۔

فقال النبی (ص) ھلم اکتب لکم کتابا لا تضلون بعدہ، فقال عمر ان رسول اللہ (ص) قد غلب علیہ الوجع! وعندکم القرآن، حسبنا کتاب اللہ، فاختلف اھل البیت، فاختصموا، فمنھم من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللہ (ص) کتابا لن تضلوا بعدہ، ومنھم من یقول ما قال عمر، فلما اکثروا اللغو والاختلاف عند رسول اللہ (ص)، قال رسول اللہ قوموا!"

"جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس وقت ایک گروہ آپ کے پاس گھر میں موجود تھا جن میں عمر بن الخطاب بھی تھا، پیغمبرؐ نے فرمایا کہ کاغذ لے آؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھ جاؤں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے، عمر نے کہا، بیماری نے پیغمبر پر غلبہ کیا ہے۔ (العیاذ باللہ ناموزوں باتیں کر رہے ہیں) قرآن تمہارے پاس ہے اور یہی خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔ تو اس وقت گھر میں موجود لوگوں میں اختلاف پڑ گیا۔ بعض نے کہا کہ لے آؤ تاکہ پیغمبرؐ اپنی تحریر لکھ دیں تاکہ تم ہرگز گمراہ نہ ہو، جبکہ بعض دوسرے عمر کی بات کا تکرار کر رہے تھے، جس وقت ناموزوں باتیں اور اختلاف بڑھ گئے، تو پیغمبرؐ نے فرمایا: اُٹھ جاؤ، اور مجھ سے دُور ہو جاؤ۔"[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعینہٖ یہی حدیث مختصر سے تفاوت اور فرق کے ساتھ بخاری نے بھی اپنی "صحیح" میں نقل کی ہے۔[2]

یہ ماجرا تاریخ اسلام کے اہم حوادث میں سے ہے، جس کے لیے بہت زیادہ تجزیہ اور تحلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں اس کی تشریح کا موقع نہیں ہے، لیکن بہرحال یہ واقعہ پیغمبرؐ کے حکم سے خلاف ورزی کے واضح ترین مواقع اور زیر بحث آیت یا ایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ، کی مخالفت کے روشن ترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔

اہم مسئلہ یہ ہے، کہ اس اسلامی اور الٰہی نظم وضبط کی رعایت کے لیے رہبر پر محکم ایمان رکھنے، اور اس کی زندگی کے تمام حالات میں اس کی رہبری کو قبول کرنے اور رہبر کی اطاعت کرتے ہوئے کامل طور پر تسلیم خم کرنے کی ضرورت ہے۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۳، کتاب الوصیہ حدیث ۲۰ (ص ۱۲۵۹)

[2] صحیح بخاری جلد ۶ باب مرض النبی ووفاتہ ص ۱۱۔

۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ○

۷۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ○

۸۔ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

۶۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی کی وجہ سے کسی گروہ کو نقصان پہنچا دو، اور پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

۷۔ اور تم یہ جان لو کہ خدا کا رسول تمہارے درمیان میں ہے اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری اطاعت کرے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، لیکن خدا نے تمہارے لیے ایمان محبوب قرار دے دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت بخشی ہے، اور (اس کے برعکس) کفر و فسق و گناہ کو تمہارے لیے قابل نفرت قرار دے دیا ہے، (جن لوگوں میں یہ

صفات ہوں) وہی تو ہدایت یافتہ ہیں۔

۸۔ خدا نے اپنی طرف سے تمہیں فضل اور نعمت عطا کی ہے، اور خدا علیم و حکیم ہے۔

شانِ نزول

پہلی زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں دو شانِ نزول بیان کی گئی ہیں۔ بعض نے تو جیسے طبرسی نے مجمع البیان میں دونوں کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے۔ جیسے "قرطبی" و "نور الثقلین" و "فی ظلال القرآن" صرف ایک ہی پر اکتفا کیا ہے۔

پہلی شانِ نزول جسے اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ: آیہ یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم ..... "ولید بن عقبہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جسے پیغمبرؐ نے قبیلہ "بنی المصطلق" کی زکات جمع کرنے کے لیے بھیجا تھا، جس وقت اہل قبیلہ کو پتہ چلا کہ رسول اللہؐ کا نمائندہ آرہا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کے استقبال کے لیے دوڑے، لیکن چونکہ ان کے اور ولید کے درمیان زمانہ جاہلیت میں سخت دشمنی تھی، تو اس نے خیال کیا کہ وہ اُسے قتل کرنے کے ارادہ سے آرہے ہیں۔

وہ (اپنے اس گمان کی تحقیق کیے بغیر ہی) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پلٹ آیا اور عرض کیا، کہ انھوں نے زکات ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے (اور ہم جانتے ہیں کہ زکات ادا کرنے سے انکار حکومتِ اسلامی کے خلاف ایک طرح کی بغاوت سمجھی جاتی تھی، تو اس بناء پر وہ اس بات کا مدعی تھا کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر سخت غصہ آیا اور اُن سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اُوپر والی آیت نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ جس وقت کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو۔ [1]

بعض نے اس پر مزید کہا ہے کہ "ولید" کی طرف سے "قبیلہ بنی المصطلق" کے ارتداد کی خبر دینے کے بعد پیغمبرؐ نے "خالد بن ولید بن مغیرہ" کو قبیلہ "بنی المصطلق" کی طرف بھیجا اور یہ حکم دیا کہ جلد بازی میں کوئی کام نہ کر بیٹھنا "خالد" راتوں رات قبیلہ کے قریب پہنچ گیا، اور اطلاع دینے والے مامورین کو تحقیق کے لیے بھیجا، انھوں نے آکر خبر دی کہ بنی المصطلق مکمل طور پر اسلام کے وفادار ہیں، اور ان کی اذان و نماز کی صدا انھوں نے اپنے کانوں سے سنی ہے، صبح کے وقت "خالد" خود ان کی طرف گیا اور خبر دینے والوں کی گفتار کی صداقت ملاحظہ کی وہ پیغمبرؐ کی خدمت

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹ ص ۱۳۲

میں پلٹ آیا اور ماجرا بیان کیا تو اس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی پیغمبرؐ نے فرمایا: التأنی من اللہ والعجلۃ من الشیطان: "تاخیر و تحقیق کرنا خدا کی طرف سے ہے اور جلد بازی سے کام لینا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ [1]

دوسری شان نزول جسے صرف بعض مفسرین نے نقل کیا ہے، یہ ہے کہ یہ آیت "ماریہ" زوجہ پیغمبرؐ (والدہ ابراہیمؑ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ کچھ لوگوں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ اس کا ایک چچازاد بھائی ہے جو کبھی کبھی اس کے پاس آتا ہے (اور ان دونوں میں غیر مشروع تعلقات ہیں) پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو بلایا۔ اور فرمایا: اے میرے بھائی! یہ تلوار لو، اگر تم اس کو ماریہ کے پاس دیکھو تو اُسے قتل کردو۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے عرض کیا، اے خدا کے رسول کیا میں "گرم کئے ہوئے سکہ" [2] کی طرح مامور ہوں کہ آپ کے حکم کو عملی جامہ پہناؤں (یا جو کچھ حاضر شخص دیکھتا ہے وہ غائب نہیں دیکھتا) مزید تحقیق کر کے ذمہ داری کو پورا کروں؟

فرمایا: نہیں! بلکہ اسی بنیاد پر کہ حاضر اس چیز کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھتا۔ عمل کرو۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے تلوار کمر سے باندھی اور اس کی طرف آیا، میں نے دیکھا کہ وہ ماریہ کے پاس ہے، میں نے تلوار کھینچی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا اور ایک کھجور کے درخت پر چڑھ گیا، اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس سے نیچے گرا دیا، اسی دوران اس کا پیراہن (کرتا) اوپر کو اُٹھ گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ تو اصلاً جنسی عضو رکھتا ہی نہیں، میں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ماجرے کی تفصیل بیان کی تو پیغمبرؐ نے فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے بدی، آلودگی اور اتہام کو ہمارے دامن سے دُور کر دیا ہے۔ [3]

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹ ص ۶۱۳۱

[2] "سکہ" عربی زبان میں اس وسیلہ اور آلہ کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ درہم و دینار وغیرہ پر نقش کرتے ہیں، اور اس مقصد کے لیے اُسے آگ میں گرم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنا نقش مکمل طور پر درہم و دینار پر منتقل کر دے، اس تعبیر سے مراد یہ ہے کہ حکم کو بے چون و چرا اور کسی تحقیق کے بغیر اجرا کیا جائے۔

[3] "مجمع البیان"، جلد ۹ ص ۱۳۲۔ تفسیر نور الثقلین میں بھی یہ شان نزول اس سے زیادہ تفصیلی صورت میں بیان ہوئی ہے۔ (جلد ۵ ص ۸۱)

تفسیر

فاسقوں کی خبروں پر اعتنا نہ کرو

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور ان کے پیشوا پیغمبرؐ کے مقابلہ میں وظائف اور ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو تھی، اور اس میں دو اہم احکام بیان ہوئے تھے، ایک خدا اور پیغمبرؐ پر کسی کام میں سبقت نہ کرنا اور دوسرا پیغمبرؐ کی بارگاہ میں گفتگو کرنے اور آپؐ کو آواز دینے کے وقت ادب و احترام کی رعایت کرنا۔

زیر بحث آیات اس عظیم رہبر کے سامنے اُمت کے وظائف اور ذمہ داریوں کو جاری رکھتے ہوئے کہتی ہیں، کہ جس وقت تم اس کی خدمت میں خبریں لے کر آؤ تو ان کی بنیاد تحقیق پر ہونی چاہیئے اور اگر کوئی فاسق آدمی کسی چیز کی خبر دے، تو بغیر تحقیق کے اُسے قبول نہ کریں، اور پیغمبرؐ پر اُسے قبول کرنے کے لیے دباؤ نہ ڈالیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق شخص تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو" (یا ایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا)۔

اس کے بعد اس کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ بغیر تحقیق عمل کرنے کی صورت میں کسی گروہ کو نادانی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، اور پھر اپنے کیے پر تمہیں پشیمان ہونا پڑے" (ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین)۔

جیسا کہ پیغمبرؐ اگر ولید بن عقبہ کے کہنے پر عمل کر لیتے اور قبیلہ "بنی المصطلق" کے ساتھ ایک مرتد قوم کی حیثیت سے جنگ کرتے تو پھر دردناک فاجعہ اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعد والی آیت کے لب و لہجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ایک گروہ اس جنگ کرنے پر اصرار کر رہا تھا، قرآن کہتا ہے: یہ کام تمہارے لیے شائستہ نہیں ہے یہ عین جہالت و نادانی ہے اور اس کا انجام ندامت و پشیمانی ہوگا۔

علماء علم اصول کے ایک گروہ نے خبر واحد کی حجیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے، کیونکہ آیت یہ کہتی ہے کہ "فاسق" کی خبر میں تحقیق و تلاش لازمی و ضروری ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ شخص "عادل" خبر دے تو اُسے بغیر تحقیق کے قبول کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس استدلال پر بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں، جن میں سے دو زیادہ اہم ہیں، باقی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

پہلا یہ کہ: اوپر والا استدلال "وصف کے مفہوم کی حجیت" کو قبول کرنے پر موقوف ہے جبکہ مشہور یہ ہے کہ وصف کا مفہوم حجت نہیں ہے۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسرا یہ کہ: جو علت آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے وہ اس قدر وسعت رکھتی ہے کہ "عادل" اور "فاسق" دونوں کی خبر کو شامل ہے کیونکہ ظنی خبر پر عمل، چاہے وہ جو بھی ہو، پشیمانی اور ندامت کا احتمال رکھتا ہے۔

لیکن یہ دونوں اعتراض قابل حل ہیں، کیونکہ مفہوم وصف اور ہر دوسری قید، ایسے موقعوں کے لیے جو اصطلاح کے مطابق، کسی مسئلہ کے قیود اور مقام احتراز کو بیان کرنے کے لیے ہوں، حجت ہوتی ہے، اور اُوپر والی آیت میں اس قید (قید فاسق) کا ذکر ظہور عرفی کے مطابق خبر عادل کی حجت کے بیان کے سوا اور کوئی قابل ملاحظہ فائدہ نہیں رکھتا۔

لیکن وہ علت جو آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔ ہر قسم کی ادلہ "ظنیہ" کو شامل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسے مواقع کے لیے ہے کہ جہاں عمل جاہلانہ یا سفیہانہ اور احمقانہ ہو، کیونکہ آیت میں "جہالت" کے عنوان پر تکیہ ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ زیادہ تر ادلہ جن پر تمام عقلاء عالم روزمرہ کی زندگی میں تکیہ کرتے ہیں ظنی دلائل ہی ہیں (ظواہر الفاظ، قول شاہد، قول اہل خبرہ، قول ذوالید وغیرہ کے قبیل سے)

معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بات جاہلانہ اور سفیہانہ شمار نہیں ہوتی، اور اگر وہ کبھی کبھار واقع کے مطابق نہ بھی ہو، تو پھر بھی اس میں ندامت کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا، کیونکہ یہ ایک عمومی راستہ ہے۔

بہرحال ہمارے نظریہ کے مطابق یہ آیت ان محکم آیات میں سے ہے، جو "خبر واحد کی حجیت" پر یہاں تک کہ "موضوعات" میں بھی دلالت کرتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ مباحث ہیں، جن کی تشریح و تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ موثق اخبار پر اعتماد کے ذریعہ ہی بشر کی زندگی کی تاریخ کی بنیاد قائم ہے، اس طرح سے کہ اگر حجیت خبر عادل یا موثق کا مسئلہ انسانی معاشرے میں سے حذف ہو جائے تو بہت سے گذشتہ علمی مواریث، اور انسانی معاشروں سے مربوط اطلاعات، یہاں تک کہ بہت سے ایسے مسائل جن کے ساتھ ہم آج اپنے معاشروں میں تعلق رکھتے ہیں، کلی طور پر حذف ہو جائیں گے، اور نہ صرف انسان پیچھے کی طرف پلٹ جائے گا، بلکہ اس کی موجودہ زندگی کی ترقی کی رفتار بھی رک جائے گی، لہٰذا تمام عقلاء کا اس کی حجیت پر اجماع ہے اور شارع مقدس نے بھی "قولاً" و "عملاً" اس کی تصدیق فرمائی ہے۔

لیکن جتنا ثقہ خبر واحد کی حجیت، زندگی کو سامان بخشتی ہے، اتنا ہی غیر موثق اخبار پر تکیہ کرنا، بہت خطرناک، اور معاشروں کے نظام کے بکھر جانے کا موجب ہے جو بہت سے مصائب کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے، لوگوں کے حقوق اور حیثیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور انسان کو بے راہ روی اور انحراف کی طرف کھینچ لے جاتا ہے، اور زیر بحث آیت میں قرآن کی عمدہ تعبیر کے مطابق، انجام کار ندامت کا سبب بنتا ہے۔

حاشیہ صفحہ گزشتہ

لہ بعض نے گمان کیا ہے کہ یہاں مفہوم شرط کے قبیل میں سے ہے، اور مفہوم شرط حجت ہے، حالانکہ یہ مفہوم شرط کے ساتھ کوئی ارتباط نہیں رکھتا، علاوہ ازیں یہاں جملہ شرطیہ موضوع کو بیان کرنے کے لیے ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے موقعوں پر "جملہ شرطیہ" بھی مفہوم نہیں رکھتا۔ (غور کیجئے گا)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے، کہ جھوٹی خبریں گھڑنا، اور غیر موثق اخبار پر تکیہ قدیمی جبار اور استعماری نظاموں کے حربوں میں سے ایک ہے، جس کے ذریعہ وہ ایک جھوٹی فضا پیدا کر کے بے خبر اور ناآگاہ لوگوں کو، فریب اور غفلت میں رکھ کر، انھیں گمراہ کرتے ہیں اور ان کے سرمایہ کو لوٹ لے جاتے ہیں۔

اگر مسلمان وقت کے ساتھ اس خدائی حکم پر جو اس آیت میں وارد ہوا ہے عمل کریں، اور فاسقوں کی خبروں کو بغیر تحقیق و تفتیش کے قبول نہ کریں تو ان عظیم بلاؤں سے بچ جائیں گے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اہم مسئلہ خود خبر پر وثوق و اعتماد کا ہے۔ البتہ کبھی تو یہ وثوق "خبر دینے والے کی ذات" پر اعتماد کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اور کبھی دوسرے خارجی قرائن کے ذریعہ اسی لیے کچھ موقعوں پر باوجود اس کے کہ خبر دینے والا فاسق ہوتا ہے ہم اس کی خبر پر اعتماد پیدا کر لیتے ہیں۔

اس بنا پر یہ وثوق و اعتماد جہاں کہیں سے حاصل ہو۔ چاہے بیان کرنے والے کی عدالت، تقویٰ اور صداقت سے حاصل ہو یا قرائن خارجی سے، وہ ہمارے لیے معتبر ہے، اور عقلاء کی سیرت بھی، جو شریعت اسلامی کی تصدیق کرتی ہے، اسی بنیاد پر قائم ہے۔

اسی بنا پر ہم فقہ اسلامی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے اخبار جن کی سند ضعیف ہے، چونکہ وہ "عمل مشہود" قرار پا چکے ہیں، اور وہ مختلف قرائن کی بنا پر اس خبر کی صحت سے واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہی معیار عمل قرار پایا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

اس کے برعکس بعض اوقات ایسے اخبار نقل ہوئے ہیں جن کا بیان کرنے والا معتبر شخص ہے، لیکن خارجی قرائن ہیں اس خبر کی نسبت بدگمان کر دیتے ہیں، یہ وہ منزل ہے کہ ہمارے لیے اس خبر کو چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے، اگرچہ اس خبر کے بیان کرنے والا شخص عادل و معتبر ہے۔

اس بنا پر ہر جگہ معیار خود (خبر) پر اعتماد ہے، اگرچہ عام طور پر راوی کی عدالت و صداقت اس اعتماد کا ایک وسیلہ و ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن یہ کوئی قانون کلی نہیں ہے (غور کیجیے)

بعد والی آیت میں ایک اہم مطلب کی تاکید کے لیے جو گذشتہ آیت میں بیان ہوا تھا، مزید کہتا ہے: "تم یہ جان لو کہ رسول تمہارے درمیان میں ہے، اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری اطاعت کرنے لگے، تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے" (واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم)۔[1]

---

[1] "لعنتم" "عنت" کے مادہ سے ایسے کام میں پڑنے کے معنی میں ہے کہ انسان جس کے عواقب سے ڈرتا ہے، یا ایسا کام ہے جس میں مشقت ہو، اور اسی بنا پر جب ٹوٹی ہوئی ہڈی پر دباؤ پڑے اور اس سے درد و تکلیف پیدا ہو، تو اسے "عنت" کہا جاتا ہے۔

یہ جملہ۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ قبیلہ "بنی المصطلق" کے مرتد ہونے کے بارے میں "ولید" کی خبر دینے کے بعد، ظاہر بین اور سادہ دل مسلمانوں کا ایک گروہ، پیغمبرؐ پر یہ دباؤ ڈال رہا تھا، کہ وہ قبیلۂ مذکور کے برخلاف جنگ کا اقدام کریں۔

قرآن کہتا ہے، یہ تمہاری خوش بختی ہے کہ خدا کا رسولؐ تمہارے درمیان ہے۔ اور عالم وحی سے اس کا رابطہ برقرار ہے اور جس وقت انحرافی خط اور راستے تمہارے درمیان پیدا ہو جائیں تو وہ اس طریق سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہے۔

لیکن وہ رہبر و رہنما ہے، تمہیں یہ امید اور توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ تمہاری اطاعت کرے اور تم سے حکم احکام لے، وہ تمہارے لیے ہر شخص سے زیادہ مہربان ہے، اپنے افکار اس پر لادنے کے لیے اس پر دباؤ نہ ڈالو، کیونکہ یہ بات تمہارے ہی نقصان میں ہے۔

آیت کے آخر میں مؤمنین پر خدا کی ایک اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن خدا نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب قرار دے دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں زینت بخشی ہے": (ولٰکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم)۔

"اور اس کے برعکس کفر و فسق و گناہ کو تمہارے لیے قابلِ نفرت قرار دے دیا ہے": (وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان)۔

درحقیقت یہ تعبیرات قانونِ "لطف" وہ بھی "لطف تکوینی" کی طرف ایک لطیف اشارہ ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: جس وقت کوئی حکیم کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو وہ ہر لحاظ سے اس کے اسباب فراہم کرتا ہے یہ اصل انسانوں کی ہدایت میں بھی پورے طور پر صادق آتی ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ تمام انسان۔ کسی جبر کے پروگرام کے تحت قرار پائے بغیر۔ اپنے میل اور رغبت اور قصد و ارادہ سے راہِ حق کو طے کریں۔ اس لیے ایک طرف سے تو رسولوں کو بھیجتا ہے، اور انبیاء کو کتبِ آسمانی کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے اور دوسری طرف سے "ایمان" کو انسانوں کے لیے محبوب قرار دیتا ہے۔ حق جوئی اور حق طلبی کے عشق کی آگ ان کے دل و جان کے اندر شعلہ ور کرتا ہے اور کفر و ظلم و نفاق و گناہ سے نفرت و بیزاری کا احساس ان کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

اور اس طرح ہر ایک انسان فطرتاً ایمان و پاکیزگی و تقویٰ کا خواہاں ہے اور کفر و گناہ سے بیزار ہوتا ہے

لیکن یہ بات کامل طور سے ممکن ہے کہ بعد کے مرحلوں میں یہ صاف و شفاف پانی جو آسمانِ خلقت سے انسانوں کے وجود میں ڈالا گیا ہے، آلودہ ماحول میں رہنے کے باعث اپنی صفا کھو بیٹھے اور گناہ، کفر اور عصیان کی نفرت انگیز بدبو حاصل کرلے۔

یہ فطری نعمت آسمانوں کو رسولؐ خدا کی پیروی اور آپ پر تقدم اور سبقت نہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

اس نکتہ کی یاد آوری بھی لازم وضروری ہے کہ اس آیت کا مضمون "مشورت" کے مسئلہ کے ساتھ ہرگز منافی نہیں ہے، کیونکہ "شوریٰ" کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے نظریہ کو بیان کرے، لیکن آخری فیصلہ اور نظریہ خود پیغمبر اکرمؐ کا ہوگا، جیسا کہ شوریٰ والی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں: شوریٰ ایک جداگانہ مطلب ہے اور اپنے فکر وعقیدہ کو لادنا دوسرا مطلب ہے۔ زیر بحث آیت تحمیل فکر کی نفی کرتی ہے نہ کہ مشورت کی۔

اس بارے میں کہ اُوپر والی آیت میں "فسوق" سے کیا مراد ہے؟ بعض نے اس کی تفسیر "کذب اور جھوٹ" کے ساتھ کی ہے لیکن اس کے مفہوم لغوی کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اور آیت میں کسی قید کے نہ ہونے کی بنا پر ہر قسم کے گناہ اور اطاعت سے خارج ہونے کو شامل ہے، اس بنا پر اس کے بعد "عصیان" کی تعبیر تاکید کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ "زینہ فی قلوبکم" (اسے تمہارے دلوں میں زینت دی ہے) کا جملہ "حبب الیکم الایمان" (ایمان کو تمہارا محبوب قرار دیا ہے) کے جملہ پر ایک تاکید ہے۔

بعض "فسوق" کو "گناہانِ کبیرہ" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جبکہ عصیان کو اس سے عام سمجھتے ہیں، لیکن اس فرق واختلاف پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

بہر حال آیت کے آخر میں ایک کلی اور عمومی قاعدہ کے طور پر فرماتا ہے: "جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں (ایمان ان کی نظر میں محبوب ومزین، اور کفر وفسق وعصیان ان کی نظر میں منفور ہے)۔ وہ ہدایت یافتہ ہیں" (اولئک ھم الراشدون) یعنی اگر تم اس موہبتِ الٰہی (ایمان سے عشق اور کفر وگناہ سے نفرت) کو محفوظ رکھو، اور اس پاکیزگی اور صفائے فطرت کو آلودہ نہ کرو، تو بلاشک وشبہ رشد وہدایت تمہارے انتظار میں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلے کے تمام جملے تو مومنین سے خطاب کی صورت میں تھے، لیکن یہ جملہ انہیں غائب کی صورت میں یاد کرتا ہے، یہ تعبیر کا فرق ظاہراً اس بنا پر ہے تاکہ اس بات کی نشاندہی کرے کہ یہ حکم اصحاب پیغمبرؐ کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ ایک ہمہ وقتی اور عمومی حکم ہے کہ جو بھی کوئی جس زمانہ میں بھی اپنی فطرت کی صفائی اور پاکیزگی کو محفوظ رکھے گا وہ اہل نجات وہدایت ہے۔

آخری زیر بحث آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ یہ ایمان کی محبوبیت اور کفر وعصیان سے نفرت، نوع بشر پر خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، فرماتا ہے: "یہ خدا کی طرف سے ایک فضل ہے، اور وہ نعمت ہے جو اس نے تمہیں عطا کی ہے اور خدا دانا وحکیم ہے" (فضلاً من اللہ ونعمۃ واللہ علیم حکیم)[1]

اُس کے علم وحکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رشد وسعادت کے عوامل تم میں پیدا کرے، اور اُسے انبیاء کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگ اور مکمل کرے اور انجام کار تمہیں منزل تک پہنچا دے۔

---

[1] "فضلاً ونعمۃ" یا تو "مفعول لاجلہ" ہے "حبب الیکم الایمان ..." کے لیے، اور یا یہ "مفعول مطلق" ہے فعل مقدر کے لیے اور تقدیر میں اس طرح تھا: "افضل فضلاً وانعم نعمۃ"۔

ظاہر یہ ہے کہ "فضل" اور "نعمت" دونوں کا ایک ہی واقعیت کی طرف اشارہ ہے، اور وہ وہی نعمتیں ہیں جو خدا کی طرف سے بندوں کو عطا ہوتی ہیں، البتہ "فضل" کا تو اس لحاظ سے اس پر اطلاق ہوتا ہے، چونکہ خدا اس کا محتاج نہیں ہے، اور نعمت اس لحاظ سے ہے کہ بندے اس کے محتاج ہیں، اس بنا پر افضل اور نعمت ایک سکہ کے دو رخوں کی طرح ہے۔

بلاشک و شبہ بندوں کی احتیاج کے بارے میں خدا کا علم اور مخلوقات کی پرورش اور ارتقاء کے سلسلہ میں اس کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتے ہیں، کہ وہ انھیں یہ عظیم معنوی نعمتیں، یعنی ایمان کو محبوب رکھنا، اور کفر و عصیان سے نفرت کرنا، مرحمت فرمائے۔

❖ ❖ ❖

چند نکات

۱۔ خدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی

اوپر والی آیات اسلام کے نکتہ نظر سے "جبر و اختیار" اور "ہدایت و اضلال" کے بارے میں ایک واضح تصویر پیش کرتی ہیں، کیونکہ یہ اس نکتہ کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ خدا کا کام رشد و ہدایت کے اسباب کا فراہم کرنا ہے۔

ایک طرف تو "رسول اللہ" کو لوگوں کے درمیان قرار دیتا ہے، اور قرآن جو ہدایت و نور کا ایک پروگرام ہے نازل فرماتا ہے اور دوسری طرف سے "ایمان سے عشق" اور "کفر و عصیان سے تنفر و بیزاری" زمین تیار کرنے کے انداز میں دل و جان کے اندر قرار دیتا ہے، لیکن انجام کار آزادی ارادہ و اختیار خود انھیں کے سپرد کرتے ہوئے، ان کی ذمہ داریوں کو اس سلسلہ میں شریعت کے طور پر نافذ کرتا ہے۔

اوپر والی آیات کے مطابق ایمان کے ساتھ عشق اور کفر سے نفرت، بغیر کسی استثناء کے، تمام انسانوں کے دل میں موجود ہے اور اگر کچھ لوگوں میں یہ سلسلہ موجود نہیں ہے تو وہ غلط قسم کی تربیتوں اور خود انھیں کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ خدا نے کسی بھی شخص کے دل میں "عصیان کی محبت" اور "ایمان سے بغض" خلق نہیں کیا ہے۔

❖ ❖ ❖

۲۔ رہبری اور اطاعت

یہ آیات ایک بار پھر اس بات کی تاکید کرتی ہیں کہ "خدائی رہبر" کا وجود ایک جمعیت کی نشو و نما اور رشد و ہدایت کے لیے لازمی و ضروری ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ "مطاع" ہو نہ کہ اپنے پیروکاروں کا "مطیع"۔ اس کے فرمان کو سر آنکھوں پر رکھیں، نہ کہ اس پر اپنے محدود مقاصد و افکار کے لیے دباؤ ڈالیں۔

یہ بات نہ صرف خدائی رہبروں کے بارے میں ثابت ہے، بلکہ مسئلہ "مدیریت" اور "فرماندہی" میں ہر جگہ یہی امر کارفرما ہونا چاہیئے۔

یہ حکم رہبروں کے استبداد کے معنی میں نہیں ہے اور نہ ہی ترکِ شوریٰ کے لیے ہے، جیسا کہ اُوپر بھی اشارہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ایمان "عشق" کی ایک نوع ہے نہ کہ صرف ادراکِ عقل

یہ آیات ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہیں، کہ ایمان ایک قسم کا شدید خدائی اور معنوی علاقہ اور لگاؤ ہے، اگرچہ اس کی بنیادیں عقلی استدلالات سے قائم ہوتی ہیں۔ اسی لیے امام صادقؑ سے منقول ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؑ سے سوال کیا کہ: کیا "حب و بغض" بھی ایمان میں سے ہیں؟ تو آپؑ نے جواب میں فرمایا:

"وھل الایمان الا الحب والبغض؟ ثم تلا ھذہ الآیۃ: حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولئک ھم الراشدون"

"کیا ایمان حب اور بغض کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، پھر امامؑ نے زیرِ بحث آیت سے استدلال فرمایا جو یہ کہتی ہے کہ: خدا نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب قرار دے دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے، اور کفر و فسق و عصیان کو تمہارے لیے قابلِ نفرت بنا دیا ہے، اور جو لوگ ایسے ہوں وہی ہدایت یافتہ ہیں"۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے اس طرح آیا ہے:

"وھل الدین الا الحب؟!"

"کیا دین محبت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے"؟!

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی چند آیات سے استدلال فرمایا: جن میں سے ایک زیرِ بحث آیت تھی، اور آخر میں مزید فرمایا:

"الدین ھو الحب والحب ھو الدین"

"دین محبت ہے اور محبت دین ہے"۔ [2]

لیکن اس میں شک نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اسے استدلالی اور منطقی اصولوں سے بھی سیراب و بارور ہونا چاہیئے۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ حدیث ۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۸۳، ۸۴۔

۹- وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

۱۰- اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

ترجمہ

۹۔ جس وقت مؤمنین کے دو گروہ آپس میں نزاع اور جنگ کریں تو ان کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تجاوز کرے تو جس نے تجاوز کیا ہے تو تم بھی اُس کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف پلٹ آئے، جب وہ لوٹ آئے (اور صلح کے لیے زمین ہموار ہو جائے) تو ان دونوں کے درمیان عدالت کے مطابق صلح کرادو، اور انصاف سے کام لو، کیونکہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۰۔ مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادو، اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ۔

شانِ نزول

ان آیات کے شان نزول میں آیا ہے کہ (مدینہ کے دو مشہور قبیلوں) قبیلہ "اوس" و "خزرج" کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہوگیا، اور اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہوگئے، اور لاٹھیوں اور جوتوں سے ایک دوسرے کو مارنے لگے، (تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس قسم کے حادثات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو راہ بتائی)۔[1]

بعض نے یہ کہا ہے کہ "انصار" میں سے دو افراد کے درمیان خصومت و اختلاف پیدا ہوگیا تھا، ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں اپنا حق زبردستی تجھ سے لے لوں گا، کیونکہ میرے قبیلہ کی جمعیت اور تعداد زیادہ ہے اور دوسرے نے یہ کہا کہ فیصلہ کے لیے رسول اللہ کے پاس چلتے ہیں، پہلے شخص نے اسے قبول نہ کیا اور اختلاف بڑھ گیا اور دونوں قبیلوں کے ایک گروہ نے ہاتھوں، جوتیوں اور شمشیر تک سے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں

(اور اس قسم کے اختلاف میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا)۔[2]

تفسیر

مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں

قرآن یہاں ایک کلی اور عمومی قانون کے عنوان سے ہمیشہ اور ہر مقام کے لیے کہتا ہے: "جس وقت مؤمنین کے دو گروہ آپس میں نزاع کریں اور لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو" (وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما)۔[3]

یہ ٹھیک ہے کہ "اقتتلوا" "قتال" کے مادہ سے جنگ کے معنی میں ہے، لیکن یہاں قرائن اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے کو شامل ہے، چاہے وہ جنگ اور لڑائی تک بھی نہ جا پہنچے، بعض شانِ نزول

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۲۲

[2] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۰

[3] باوجود اس کے کہ "طائفتان" تثنیہ ہے، لیکن اس کا فعل "اقتتلوا" جمع کی صورت میں آیا ہے، کیونکہ ہر گروہ ایک مجموعہ سے مرکب ہے۔

جو آیت کے لیے نقل ہوئے تھے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتے ہیں۔

بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر لڑائی جھگڑے اور نزاع کے لیے زمین ہموار ہو جائے، مثلاً لفظی تکرار اور کھینچا تانی جو خونیں نزاعوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ واقع ہوں تو وہاں بھی اصلاح کے لیے اقدام کرنا اس آیت کے مطابق ضروری ہے، کیونکہ القاء خصوصیت کے طریقہ سے اس معنی کو اُوپر والی آیت سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

بہر حال تمام مسلمانوں کے لیے ایک حتمی وظیفہ اور ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے، نزاع اور خونریزی سے روکیں اور خود کو اس سلسلے میں ذمہ دار سمجھیں، نہ کہ بعض بے خبر لوگوں کی طرح تماشائیوں کی صورت میں، بے پرواہی کے ساتھ، ان مناظر کے قریب سے گزر جائیں۔

ان مناظر کو دیکھنے کے بعد مومنین کی یہ اوّلین ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد دوسری ذمہ داری کو اس طرح بیان کرتا ہے "اور اگر ان دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر تجاوز اور ظلم و ستم کرے، اور صلح کی تجویز کو تسلیم نہ کرے، تو پھر تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم باغی اور ظالم گروہ کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف لوٹ آئے اور سر تسلیم خم کرے" (فان بغت احداھما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر اللہ)۔

واضح ہے کہ اگر باغی اور ظالم گروہ کا خون اس دوران میں بہ جائے تو وہ خود اسی کی گردن پر ہے اور اصطلاح کے مطابق اسکا خون ہدر اور رائیگاں گیا ہے۔ اگرچہ وہ مسلمان ہی ہوں کیونکہ نزاع دو مسلمان گروہوں کے درمیان پیدا ہوئی ہے۔

اس طرح سے اسلام نے ظلم و ستم سے روکنے کو چاہے وہ ظالم کے ساتھ جنگ کرنے کی قیمت پر ختم ہو لازمی و ضروری سمجھا ہے اور عدالت کے اجرا کی قیمت کو مسلمانوں کے خون سے بھی بالاتر جانا ہے اور یہ بات اسی صورت میں ہے کہ جب مسئلہ صلح و صفائی کے طریقہ سے حل نہ ہو۔

اس کے بعد تیسرے حکم کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اگر ظالم لوگ خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور صلح کے اسباب فراہم ہو جائیں، تو ان دونوں کے درمیان عدالت کے اصول کے مطابق صلح کرادو" (فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل)۔

یعنی صرف ظالم گروہ کی قدرت کو درہم برہم کرنے پر قناعت نہ کرو، بلکہ یہ جنگ صلح کے لیے زمین ہموار کرنے اور نزاع اور لڑائی کے عوامل کو جڑ سے کاٹنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہونی چاہیئے، ورنہ تھوڑے سے یا زیادہ زمانہ گزرنے کے ساتھ، ظالم جب بھی اپنے اندر طاقت و قوت محسوس کرے گا تو لڑنے کے لیے دوبارہ کھڑا ہو جائے گا اور نئے سرے سے جھگڑا اور نزاع شروع کر دے گا۔

بعض مفسرین نے "بالعدل" کی تعبیر سے یہ استفادہ کیا ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں کے درمیان کوئی حق پامال ہوا ہے، یا کوئی خون گرایا گیا ہے، جو لڑائی جھگڑے اور نزاع کے پیدا ہونے کا سبب بنا ہے، تو اس کی بھی اصلاح ہونی چاہیئے ورنہ "اصلاح بالعدل" نہ ہوگی۔[1]

---

[1] "تفسیر المیزان" جلد ۱۸ صفحہ ۳۴۲۔

اور چونکہ گروہی میلانات بعض اوقات افراد کو فیصلہ کرتے وقت "دو متخاصم گروہوں" میں سے ایک کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور فیصلہ کرنے والوں کی بے طرفی اور غیر جانب داری کو توڑ دیتے ہیں، اس لیے قرآن چوتھے اور آخری حکم میں مسلمانوں کو تنبیہ کر رہا ہے کہ، "عدل و انصاف سے کام لیں اور ہر قسم کی جانب داری کی نفی کریں، کیونکہ خدا عدالت کرنے والے لوگوں کو دوست رکھتا ہے" (واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین)۔[1]

بعد والی آیت میں اس امر کی تاکید اور اس کی علت بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے:

"مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں اس لیے تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو" (انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم)۔

جس طرح تم اپنے دو نسبی بھائیوں کے درمیان صلح کرانے میں سعی و کوشش کرتے ہو، اسی طرح دو متخاصم مومنین کے درمیان میں صلح کرانے کے لیے سنجیدگی اور دو ٹوک طریقہ سے وارد عمل ہوا کرو۔

کتنی پرکشش اور عمدہ تعبیر ہے کہ تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کے درمیان جھگڑے اور نزاع کو دو بھائیوں کے درمیان نزاع کا نام دیا، جسے بہت جلد صلح و صفائی کو اپنی جگہ دینی چاہیئے۔

اور چونکہ اکثر اوقات "روابط" اس قسم کے مسائل میں "ضوابط" کے جانشین بن جاتے ہیں، لہٰذا دوبارہ خبردار کرتے ہوئے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا کا تقویٰ اختیار کرو، تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ" (واتقوا اللہ لعلکم ترحمون)۔

اور اس طرح سے مسلمانوں کی ایک دوسرے کے لیے ایک اہم ترین اجتماعی ذمہ داری اجتماعی عدالت کے تمام پہلوؤں کے ساتھ بوقت اجرا واضح ہو جائے۔

چند نکات

۱۔ باغیوں سے جنگ کرنے کی شرائط

فقہ اسلامی میں کتاب جہاد میں "اھل البغی" سے قتال" کے عنوان سے ایک بحث بیان ہوئی ہے، جن سے مراد

---

[1] "مقسطین" "قسط" کے مادہ سے ہے۔ اور وہ اصل میں عادلانہ حصہ کے معنی میں ہے، اور جس وقت ثلاثی مجرد کے فعل کی صورت میں استعمال ہوتا ہے (قسط بروزن ضرب) تو ظلم کرنے اور دوسرے سے عادلانہ حصہ لینے کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن جب ثلاثی مزید کی صورت استعمال ہو اور "اقسط" کہا جائے تو عدالت اور ہر شخص کو اس کا عادلانہ حصہ دینے کے معنی میں ہے اس بارے میں کہ عدل و قسط کا ایک ہی معنی ہے یا یہ آپس میں فرق رکھتے ہیں۔ ہم اس کی تشریح جلد ۷ (سورۂ اعراف کی آیت ۲۹ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

وہ سنگر ہیں، جو امام عادل اور مسلمانوں کے سچے پیشوا کے برخلاف قیام کریں، اور ان کے لیے بہت سے احکام ہیں، جو اس باب میں آئے ہیں۔

لیکن جو بحث اوپر والی آیت میں پیش ہوئی ہے وہ ایک دوسرا معنی رکھتی ہے۔ اور یہ ایسے جھگڑے اور نزاع ہیں، جو مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان رونما ہوتے ہیں جس میں نہ تو امام معصوم کے خلاف قیام ہے اور نہ ہی صالح اور صحیح حکومت اسلامی کے خلاف قیام ہے، اگرچہ بعض فقہا اور مفسرین نے اس آیت سے سابقہ مسئلہ میں بھی استفادہ کرنا چاہا ہے، لیکن "کنز العرفان" میں "فاضل مقداد" کے قول کے مطابق یہ استدلال صحیح نہیں ہے"۔[1]

کیونکہ امام معصوم کے خلاف قیام موجب کفر ہے، جب کہ دو مومنین کے درمیان نزاع صرف فسق ہے نہ کہ کفر، لہٰذا قرآن مجید نے اوپر والی آیت میں دونوں گروہوں کو مومن اور ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے، اس طرح سے "اہل بغی" یعنی باغیوں کے احکام کو اس قسم کے افراد کے لیے عمومیت نہیں دی جا سکتی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فقہ میں اس گروہ کے احکام کے سلسلہ میں ہمیں کوئی بحث نہیں ملی، لیکن جو کچھ اوپر والی آیت سے، دوسرے قرائن کو ساتھ ملا کر، وہ خاص اشارے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ابواب میں آئے ہیں۔ ان سے ذیل کے "احکام" کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

الف: مسلمانوں کے متخاصم گروہوں کے درمیان صلح کرانا ایک واجب کفائی امر ہے۔

ب: اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ابتدا میں نسبتاً سادہ مراحل سے شروع کرنا چاہیئے، اور اصطلاح کے مطابق "الاسھل فالاسھل" کے قاعدے کی رعایت کرنی چاہیئے، لیکن اگر وہ مفید واقع نہ ہو تو پھر مسلحانہ مبارزہ اور جنگ و قتال بھی جائز بلکہ لازم و ضروری ہے۔

ج: باغیوں اور تجاوز کرنے والوں کے خون جو اس راہ میں گرائے جائیں، اور وہ مال جو اس دوران تلف ہوں وہ ہدر اور رائیگاں ہیں، کیونکہ یہ شرع کے حکم اور ایک واجب وظیفہ کے انجام دینے میں واقع ہوئے ہیں اور اصولاً اس قسم کے موقعوں پر کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

د: گفتگو کے طریقہ سے اصلاح کے مراحل میں حاکم شرع کی اجازت ضروری نہیں ہے، لیکن شدت عمل کے مرحلہ میں، خصوصاً جہاں معاملہ خونریزی پر منتہی ہو، وہاں حکومت اسلامی اور حاکم شرع کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، مگر ایسے مواقع پر جہاں کسی طرح سے دسترس نہ ہو تو وہاں مومنین عدول اور آگاہ افراد آپس میں صلاح مشورہ کریں گے۔

ھ: اس صورت میں جب کہ باغی اور ظالم گروہ "مصلح گروہ" میں سے کسی کا خون گرائے گا یا کوئی مال تلف کرے گا، تو شریعت کے حکم کے مطابق وہ ضامن ہے اور قتل عمد کی صورت میں حکم قصاص بھی جاری ہوگا، اس طرح ان مواقع پر جہاں مظلوم گروہ کے خون بہائے گئے ہیں یا مال تلف ہوئے ہیں، وہاں بھی حکم "ضمان" و "قصاص" ثابت ہے اور یہ جو بعض کے کلمات سے معلوم

---

[1] "کنز العرفان فی فقہ القرآن" کتاب الجہاد "باب انواع آخر من الجہاد" جلد ۱ صفحہ ۳۰۰۔

ہوتا ہے کہ صلح کے وقوع کے بعد باغی اور ظالم گروہ ان خونوں اور اموال کے مقابلہ میں جو ہدر گئے ہیں ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ زیر بحث آیت میں اس کی طرف اشارہ نہیں ہوا ہے! درست نہیں ہے کیونکہ آیت ان تمام مطالب کے بیان کے درپے نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے امور میں، ان تمام قواعد اور اصولوں کی طرف رجوع کرنا ہے، جو قصاص و اتلاف کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔

و: چونکہ اس جنگ و پیکار کا مقصد ظالم گروہ کو حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہے، لہٰذا اس جنگ میں اسیران جنگ اور "غنائم" کا مسئلہ درپیش نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں گروہ مسلمان ہیں، لیکن جھگڑے کی آگ کو خاموش کرنے کے لیے وقتی طور پر قید کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، لیکن صلح کے بعد فوراً قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا

ز۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ نزاع اور جھگڑے کے دونوں فریق، باغی اور ظالم ہوتے ہیں، انہوں نے دوسرے قبیلہ کے ایک گروہ کو قتل کیا اور ان کے مالوں کو تلف کیا ہے، اور انھوں نے بھی یہی کام پہلے قبیلہ کے بارے میں انجام دیا ہے، بغیر اس کے کہ دفاع کے لیے مقدار لازم پر قناعت کریں، چاہے ایک ہی مقدار میں دونوں بغاوت و ستم کریں، یا ایک زیادہ کرے اور دوسرا کم کرے۔

البتہ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں کوئی حکم صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن اس کا حکم القاء خصوصیت کے طریق سے زیر بحث آیت سے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا وظیفہ اور ذمہ داری یہ ہے کہ دونوں کے درمیان مصالحت کرائیں اور اگر وہ صلح کے لیے تیار نہ ہوں، تو دونوں کے درمیان جنگ کریں، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی طرف لوٹ آئیں، اور وہ احکام جو باغی اور متجاوز کے بارے میں بیان ہوئے ہیں، دونوں کے لیے جاری کیے جائیں۔

اس گفتگو کے آخر میں ہم پھر دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ ان باغیوں کا حکم، ان لوگوں کے حکم سے، جو امام معصوم، یا اسلامی عادل حکومت کے خلاف قیام کریں، بالکل الگ ہے اور اس دوسرے گروہ کے لیے زیادہ سخت اور شدید احکام ہیں جو فقہ اسلامی کی "کتاب الجہاد" میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ اخوت اسلامی کی اہمیت

"انما المؤمنون اخوۃ" کا جملہ جو اوپر والی آیات میں آیا ہے ایک اساسی اور بنیادی اسلامی شعار ہے۔ ایسا شعار جو بہت ہی مضبوط، عمیق، موثر اور پُرمعنی شعار ہے۔

دوسرے مسلک کے لوگ جب اپنے ہم مسلک لوگوں کے ساتھ زیادہ تعلق اور لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ تو وہ انھیں "رفیق" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں، لیکن اسلام مسلمانوں کے دوستی کے تعلقات اور رشتہ کی سطح اس قدر اوپر لے گیا ہے، کہ وہ اسے دو انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ نزدیک ترین تعلق کی صورت میں، اور اس تعلق کو بھی مساوات اور برابری کی بنیاد پر پیش کرتا ہے، اور وہ "دو بھائیوں" کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے۔

اس اہم اسلامی اصل کی بنا پر مسلمان چاہے جس نسل سے ہوں، یا جس قبیلہ سے، چاہے کوئی سی زبان بولتے ہوں، اور کسی سن و سال کے ہوں، ایک دوسرے سے برادری کا عمیق احساس رکھتے ہیں، چاہے ان میں سے

ایک دُنیا کے مشرق میں رہتا ہو اور دوسرا مغرب میں زندگی بسر کرتا ہو۔

مراسم "حج" میں جب مسلمان، تمام نقاط جہاں اور اطراف عالم سے اس مرکز توحید میں جمع ہوتے ہیں، تو وہاں یہ علاقہ اور لگاؤ، نزدیکی، پیوند اور ہم بستگی پُورے طور پر محسوس ہوتی ہے اور وہ اس اہم اسلامی قانون کے بعینہٖ پورا ہونے کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسلام تمام مسلمانوں کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور سب کو ایک دوسرے کے بہن بھائی کہہ کر خطاب کرتا ہے، نہ صرف الفاظ میں اور نعرے کے طور پر، بلکہ عمل میں، اور آپس کی ذمہ داریوں میں سب بہن بھائی ہیں۔

اسلامی روایات میں بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے، خاص طور پر اس کے عملی پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

ہم ذیل میں چند پُر معنی احادیث آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے۔

"المسلم اخو المسلم، لایظلمه، ولا یخذله، ولا یسلمه"

"مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ ہرگز اس پر ظلم وستم نہیں کرتا، اس کی مدد سے دستبردار نہیں ہوتا اور اس کو حوادث کے مقابلہ میں تنہا نہیں چھوڑتا۔ [1]

۲۔ ایک اور حدیث میں انھیں جناب سے نقل ہوا ہے۔

"مثل الاخوین مثل الیدین یغسل احداهما الاخری"

"دو دینی بھائی دونوں ہاتھوں کے مانند ہیں، جن میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا ہے" (ایک دوسرے کے ساتھ ہمکاری رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے عیوب کو پاک صاف کرتے ہیں) [2]

۳۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"المؤمن اخو المؤمن، کالجسد الواحد، اذا اشتکی شیئاً منه وجد ذالک فی سائر جسده، وارواحهما من روح واحدة"

"مومن، مومن کا بھائی ہے، اور وہ سب ایک جسم کے اعضاء کے مانند ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء کو قرار نہیں آتا اور ان سب کے ارواح ایک ہی رُوح سے لیے گئے ہیں۔ [3]

---

[1] "محجۃ البیضاء" جلد ۳ ص ۳۴۳ کتاب آداب الصحبۃ والمعاشرۃ باب ۲۔

[2] وہی مدرک ص ۳۱۹۔

[3] اصول کافی جلد ۲ ص ۱۴۳ (باب اخوۃ المؤمنین بعضھم لبعض حدیث ۳، ۴)

۴۔ ایک دوسری حدیث میں اسی امامؑ سے منقول ہے۔

" المؤمن اخو المؤمن عینه ودلیله، لا یخونه، ولا یظلمه، ولا یغشه، ولا یعده عدة فیخلفه؛

" مومن، مومن کا بھائی ہے، وہ اس کی آنکھ کی مانند ہے اور اس کا رہنما ہے، وہ اس کے ساتھ کبھی خیانت نہیں کرتا اور اس پر ظلم وستم روا نہیں رکھتا، اس سے پھرتا نہیں، اور جو وعدہ اس کے ساتھ کرتا ہے اس سے تخلف نہیں کرتا، [1]

حدیث کے معروف اسلامی مآخذوں اور منابع میں، مومن کے اپنے مسلمان بھائی پر حقوق اور مومنین کے ایک دوسرے پر حقوق کے انواع واقسام، ایمانی بھائیوں کے دیدار، مصافحہ، معانقہ اور انہیں یاد کرنے اور ان کے دل کو مسرور اور خوش کرنے، خصوصاً مومنین کی حاجات کو پورا کرنے اور ان امور کی انجام دہی میں سعی وکوشش کرنے، اور ان کے دل سے غم واندوہ کو دور کرنے اور انہیں کھانا کھلانے، کپڑے پہنانے اور ان کا اکرام واحترام کرنے کے ثواب کے بارے میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں، جس کے اہم حصوں کو " اصولِ کافی " کے مختلف ابواب میں اوپر والے عنوانات کے تحت مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس بحث کے آخر میں ہم ایک روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پیغمبر اکرمؐ سے مومن کے اس کے مومن بھائی پر تیس حقوق کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو اس سلسلہ میں جامع ترین روایت ہے۔

قال رسول الله (ص): للمسلم علی اخیه ثلاثون حقا: لا براءة منها الا بالاداء او العفو، یغفر زلته، ویرحم عبرته، ویستر عورته، ویقبل عثرته، ویقبل معذرته، ویرد غیبة، ویدیم نصیحته، ویحفظ خلته، ویرعی ذمته، ویعود مرضه.

ویشهد میته، ویجیب دعوته، ویقبل هدیته ویکافیه، ویشکر نعمته ویحسن نصرته، ویحفظ حلیلته، ویقضی حاجته، ویشفع مسألته ویسمت عطسته.

ویرشد ضالته، ویرد سلامه، ویطیب کلامه، ویبر انعامه، ویصدق اقسامه، ویوالی ولیه ولا یعادیه، وینصره ظالما ومظلوما: فاما نصرته ظالما فیرده عن ظلمه، واما نصرته مظلوما فیعینه علی اخذ حقه، ولا یسلمه ولا یخذله، ویحب له من الخیر ما یحب

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ص ۱۲۲ (باب اخوة المؤمنین بعضهم لبعض) حدیث ۳، ۴

لنفسه، ویکره له من الشر مایکره لنفسه۔

"پیغمبر اسلام نے فرمایا: مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر تیس حق رکھتا ہے، جن سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ ان حقوق کو ادا نہ کردے، یا اس کا مسلمان بھائی اس کو معاف کردے۔

اس کی لغزشوں کو معاف کردے، اس کی پریشانی میں اس پر مہربانی کرے۔ اس کے رازوں کو پوشیدہ رکھے اس کی غلطیوں کی تلافی کرے، اس کے عذر کو قبول کرے، بدگوئی کرنے والوں سے اس کا دفاع کرے، ہمیشہ اس کا خیر خواہ رہے، اس کی دوستی کی پاسداری کرے۔ اس کے عہد و پیمان کی رعایت کرے حالت بیماری میں اس کی عیادت کرے، اس کی موت کی حالت میں اس کے جنازہ میں حاضر ہو۔

اس کی دعوت کو قبول کرے، اس کے ہدیہ کو قبول کرے اس کے عطیہ کا بدلہ دے، اس کے احسان کا شکریہ ادا کرے اس کی مدد میں کوشش کرے، اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے، اس کی حاجت پوری کرے۔ اس کی درخواست کی شفاعت کرے، اور اس کی چھینک پر "یرحمک اللہ" کہے۔

اس کی گمشدہ چیزوں کی رہنمائی کرے، اس کے سلام کا جواب دے، اس کی گفتگو کو اچھا سمجھے، اس کے انعام کو خوب قرار دے، اس کی قسموں کی تصدیق کرے، اس کے دوست کو دوست رکھے، اور اس کے ساتھ دشمنی نہ کرے، اس کی مدد میں کوشش کرے چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکے، اور مظلوم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کی اس کا حق حاصل کرنے میں مدد کرے۔

اسے حوادث زمانہ کے مقابلہ میں تنہا نہ چھوڑے، نیکیوں اور اچھائیوں میں سے جن چیزوں کو اپنے لیے پسند کرتا ہے اس کے لیے بھی پسند کرے اور برائیوں میں سے جن چیزوں کو اپنے لیے نہیں چاہتا اس کے لیے بھی نہ چاہے۔ [1]

بہر حال مسلمانوں کے ایک دوسرے پر حقوق میں سے ایک مدد کرنا اور آپس میں اصلاح کرنا ہے، جس طرح سے کہ اوپر والی آیات اور روایات میں آیا ہے (اصلاح ذات البین کے سلسلہ میں ہم ساتویں جلد سورۂ انفال کی آیت ۱ صفحہ ۸۱ میں ایک اور بحث کر چکے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۲۳۶

۱۱۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○

۱۲۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ○

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان لانے والو! تمہارے مردوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ٹھٹھا اور مذاق نہ اڑائے، شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتیں، دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، شاید وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع نہ کرو، اور بُرے اور ناپسند القاب کے ساتھ ایک دوسرے کو یاد نہ

کرو، اور یہ بات تو بہت ہی بُری ہے کہ کسی شخص پر ایمان کے بعد کفر کا نام (الزام) رکھو، اور جو توبہ نہ کریں وہی تو ظالم و ستمگر ہیں۔

۱۲۔ اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، اور ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو، اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، (یقیناً) تم سب اس چیز سے کراہت رکھتے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کے لیے مختلف شان ہائے نزول نقل کیے ہیں، منجملہ اُن کے یہ ہے کہ:

لایسخر قوم من قوم : کا جملہ "ثابت بن قیس" (پیغمبرؐ کے خطیب) کے بارے میں نازل ہوا ہے، جس کو کانوں سے کم سُنائی دیتا تھا اور جس وقت وہ مسجد میں آتے تھے تو پیغمبرؐ کے نزدیک اس کے لیے جگہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ آنحضرت کے ارشادات سُن سکے۔ ایک دن وہ مسجد میں وارد ہوئے تو لوگ نماز سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ مجمع کو چیرتا ہوا کہتا جا رہا تھا کہ جگہ دو جگہ دو، ! یہاں تک کہ وہ ایک مسلمان کے پاس پہنچ گیا تو اس نے کہا کہ یہیں بیٹھ جا ! تو وہ اس کے پیچھے بیٹھ گیا، لیکن بہت غصے ہوا جس وقت فضا روشن ہوئی تو ثابت نے اس مرد سے کہا، : تو کون ہے ؟ اس نے اپنا نام لیا اور کہا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ ثابت نے کہا : کیا فلاں عورت کا بیٹا ؟ ! اور اس کی ماں کا نام، اس بُرے لقب کے ساتھ، جو زمانہ جاہلیت میں لیا کرتے تھے، لیا۔ اس پر وہ شخص شرمندہ ہوا، اور اپنا سر نیچے کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اس قسم کے بُرے کاموں سے منع کیا۔

مفسرین نے کہا کہ: " ولا نساء من نساء" جناب ام سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن کا بعض ازواج پیغمبرؐ نے مخدومہ کے مخصوص لباس کی وجہ سے جو انھوں نے پہن رکھا تھا، یا اُن کے چھوٹے قد کی وجہ سے مذاق اڑایا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں اس عمل سے روکا۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ " ولا یغتب بعضکم بعضاً " کا جملہ اصحاب رسول اللہ میں سے دو افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے ساتھی "سلمان" کی غیبت کی تھی، کیونکہ انھوں نے اُسے پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا تھا تاکہ وہ انکے لیے کھانا لے آئیں۔ پیغمبرؐ نے "سلمان" کو "اسامہ بن زید" کے پاس جو "بیت المال" کے مسئول تھے، بھیج دیا "اسامہ" نے کہا: اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے تو ان دو افراد نے "اسامہ کی غیبت کی اور کہا کہ اس نے بخل سے کام لیا ہے۔ "اور سلمان" کے بارے میں کہا: اگر اُسے چاہ میسحہ (ایک پانی سے بھرے ہوئے کنوئیں) کی طرف بھی بھیجیں تو اس کا پانی بھی نیچے چلا جائے گا: اس کے بعد وہ خود چل پڑے تاکہ اسامہ کے پاس جاکر اپنے کام کے بارے میں جستجو کریں، تو پیغمبرؐ نے فرمایا: مجھے تمہارے مُنہ سے گوشت کھانے کے آثار نظر آرہے ہیں، انھوں نے عرض کیا: اے رسُول خدا ہم نے تو آج بالکل ہی گوشت نہیں کھایا ہے! آپؐ نے فرمایا: ہاں! تم نے "سلمان" اور "اسامہ" کا گوشت کھایا تھا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو غیبت کرنے سے منع کیا۔[1]

استہزاء، بدگمانی، غیبت، تجسس، اور بُرے القاب سے یاد کرنا ممنوع ہے

چونکہ قرآن مجید اس سُورہ میں اسلامی معاشرے کو اخلاقی معیاروں کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتا ہے، لہٰذا مختلف اسلامی گروہوں کے بارے میں نزاع و مخاصمت کی صورت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں بحث کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں ان کے اختلافات کی جڑوں کے ایک حصّہ کی تشریح کرتا ہے تاکہ ان کے منقطع ہونے سے اختلافات بھی ختم ہو جائیں اور لڑائی جھگڑے اور نزاع کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

اوپر والی دونوں آیات میں سے ہر ایک میں اُن امور کے تین تین حصوں کو، جو جنگ اور اختلاف کی آگ کو روشن کرنے کے لیے چنگاری بن سکتے ہیں۔ صریح اور مُنہ بولتی تعبیروں کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: " اے ایمان لانے والو! تمہارے مردوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ٹھٹا اور مذاق نہ اڑائے " (یا ایھا الذین اٰمنوا لا یسخر قوم من قوم)۔

" کیونکہ شاید وہ لوگ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے، ان سے بہتر ہوں " (عسٰی ان یکونوا خیرًا منھم)۔

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۵۔ قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی شان نزول نقل کی ہے۔

۱۳۔ اسی طرح عورتوں میں سے بھی کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (ولا نساء من نساء عسٰی ان یکن خیرًا منھن)۔

یہاں مخاطب مؤمنین ہیں چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں، قرآن سب کو خبردار کرتا ہے، کہ وہ اُس بُرے عمل سے پرہیز کریں، کیونکہ استہزار اور تمسخر کا سرچشمہ، خود کو برتر سمجھنے کا احساس اور کبر و غرور ہے، جو طول تاریخ میں بہت سی خونیں جنگوں کا عامل رہا ہے۔

اور یہ "اپنے آپ کو بڑا سمجھنا" زیادہ تر ظاہری اور مادی اقدار سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً فلاں شخص اپنے آپ کو دوسرے سے زیادہ مالدار، زیادہ خوبصورت یا زیادہ معروف قبیلہ میں شمار کرتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ خیال، کہ وہ علم و عبادت اور دوسرے معنویات میں فلاں جمعیت سے برتر ہے، اس کو تمسخر اور استہزار پر آمادہ کرتا ہے، درحالیکہ خدا کے نزدیک قدر و قیمت کا معیار تقویٰ ہے، اور اس کا تعلق نیت اور دل کی پاکیزگی، تواضع، اخلاق اور ادب کے ساتھ ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ: میں خدا کے نزدیک فلاں شخص سے برتر ہوں، اسی بناء پر دوسروں کی تحقیر اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا، بدترین کاموں میں سے ایک ہے، اور قبیح ترین اخلاقی عیب ہے، جس کا ردعمل، ہوسکتا ہے کہ انسانوں کی ساری زندگی میں آشکار ہو۔

اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں فرماتا ہے: "اور ایک دوسرے کے عیب نہ نکالو اور طعن و تشنیع نہ کرو": (و لا تلمزوا انفسکم)۔

"لا تلمزوا" "لمز" بروزن (طنز) کے مادہ سے، عیب نکالنے اور طعن کرنے کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے "ھمز" اور "لمز" کے درمیان اس طرح فرق بیان کیا ہے۔ کہ "لمز" تو لوگوں کے سامنے ان کے عیوب گنوانا ہے اور "ھمز" ان کے پیٹھ پیچھے ان کے عیوب کو بیان کرنا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ "لمز" تو آنکھ اور اشارہ سے عیب جوئی کرنا ہے، جبکہ "ھمز" زبان سے "عیب جوئی ہے (اس موضوع کے سلسلہ میں مزید تشریح انشاء اللہ سورۂ ھمزہ کی تفسیر میں آئے گی)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں "انفسکم" کی تعبیر کے ساتھ مومنین کی وحدت اور ایک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے، کہ تمام مومنین نفس واحد کی طرح ہیں، اگر تم کسی دوسرے کی عیب جوئی کرو تو واقع میں تم نے خود اپنی ہی عیب جوئی کی ہے۔

اور آخر میں تیسرے مرحلہ میں مزید کہتا ہے: "اور ایک دوسرے کو بُرے اور ناپسندیدہ القاب کے ساتھ یاد نہ کرو": (ولا تنابزوا بالالقاب)۔

بہت سے منہ پھٹ اور بے مہار لوگ گذشتہ زمانہ میں بھی اور آج بھی دوسروں کو بُرے القاب سے یاد کرنے پر مصر رہے ہیں اور ہیں، اور اس طریقہ سے ان کی تحقیر کرنے ان کی شخصیت کی سرکوبی کرنے یا بعض اوقات

ان سے انتقام لینے پر اصرار کرتے ہیں اور اگر کسی نے سابقہ زمانہ میں کوئی بُرا کام کرلیا تھا۔ اس کے بعد اس نے توبہ کرلی، اور وہ مکمل طور پر پاک ہوگیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ اس کے لیے اسی لقب کو جو اس کی سابقہ وضع کو بیان کرنے والا ہے۔ برقرار رکھتے ہیں۔

اسلام صریح طور پر اس بُرے عمل سے منع کرتا ہے، اور ہر وہ نام اور لقب جو معمولی سے معمولی غیر مطلوب مفہوم رکھتا ہے اور کسی مسلمان کی تحقیر و تذلیل کا سبب بنتا ہے اُسے ممنوع قرار دیتا ہے،

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "صفیہ" دختر "حی ابن اخطب" (وہی یہودی عورت جو فتح خیبر کے واقعہ کے بعد مسلمان ہوگئی اور پیغمبر اسلام کی زوجیت میں آئی) ایک دن پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئی، در آنحالیکہ ان کے آنسو جاری تھے، پیغمبر نے ماجرا پوچھا تو اس نے کہا کہ عائشہ مجھے ملامت کرتی ہے اور کہتی ہے: اے یہودی کی لڑکی،! تو پیغمبر نے فرمایا، تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ میرا باپ ہارون ہے، اور میرا چچا موسیٰ ہے، اور میرا شوہر محمدؐ ہے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

اسی بناء پر آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: بہت بُری بات ہے یہ کہ تم کسی پر اس کے ایمان لانے کے بعد کفر کا نام رکھو" (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان)۔

بعض نے اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا مومنین کو اس بات سے منع کررہا ہے کہ ایمان لانے کے بعد لوگوں کی عیب جوئی کی بناء پر اپنے لیے فسق کے نام کو قبول کرلیں۔

لیکن پہلی تفسیر، صدر آیہ، اور اس شان نزول کی طرف توجہ کرتے ہُوئے، جو بیان ہوئی ہے، زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "اور وہ لوگ جو توبہ نہ کریں، اور ان اعمال سے دست بردار نہ ہوں، ظالم و ستمگر ہیں" (ومن لم یتب فاولئک ھم الظالمون)۔

اس سے بدتر ظلم اور کیا ہوگا کہ انسان اپنی نیش دار باتوں سے، اور تحقیر اور عیب جوئی سے کسی صاحب ایمان کے دل کو آزار پہنچائے، جو عشق خدا کا مرکز ہے۔ اور ان کی شخصیت اور آبرو کو، جو ان کی زندگی کا سرمایہ ہے، ختم کردے۔

ہم بیان کرچکے ہیں کہ دونوں زیر بحث آیات میں سے ہر ایک میں، اسلامی، اجتماعی اخلاق کے مسائل کے سلسلہ میں، تین تین حکم پیش ہُوئے ہیں، پہلی آیت کے تین احکام ترتیب کے ساتھ تمسخر نہ کرنا، ترک عیب جوئی اور تنابز بالالقاب تھے، اور دوسری آیت کے تین احکام بالترتیب، بدگمانی سے اجتناب، عیوب کا تجسس اور غیبت ہیں۔

اس آیت میں پہلے فرماتا ہے: "اے وہ لوگ! جو ایمان لائے ہو، بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، کیونکہ بعض

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۳۶۔

گمان گناہ ہیں" (یا ایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرًا من الظن انّ بعض الظن اثم)۔

"کثیرًا من الظن" سے مراد بُرے گمان ہیں، جو اچھے گمانوں کی نسبت لوگوں میں زیادہ ہیں، لہٰذا اس کو کثیر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ورنہ "حسن ظن اور گمانِ نیک" نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ قرآن مجید سورۂ نور کی آیت ۱۲ میں فرماتا ہے: لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرًا۔

"جس وقت تم نے اس نارو انسبت کو سنا تھا تو با ایمان مردوں اور عورتوں نے اپنی نسبت (اور اس کے لیے جو خود انھیں کی طرح تھا) اچھا گمان کیوں نہ کیا"؟!

(قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "نھی" "کثیر" گمانوں سے ہوئی ہے، لیکن مقام تعلیل میں کہتا ہے، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس وجہ سے ہو کہ بعض بُرے گمان واقع کے مطابق ہوتے ہیں، اور بعض واقع کے مخالف، جو گمان واقع کے خلاف ہوتے ہیں وہ تو مسلّما گناہ ہیں۔ لہٰذا ان کی "ان بعض الظن اثم" سے تعبیر ہوئی ہے۔ اس بنا پر اسی گناہ کا وجود اس بات کے لیے کافی ہے کہ سب سے پرہیز کرے۔

یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے، کہ بُرا اور اچھا گمان عام طور پر اختیاری نہیں ہوتا، یعنی وہ ایک سلسلۂ مقدمات کے زیر اثر جو انسان کے اختیار سے خارج ہیں، ذہن میں منعکس ہوتا ہے، اس بنا پر اس سے کس طرح روکا جا سکتا ہے؟!

۱۔ اس نہی سے مراد، ترتیب آثار سے نہی ہے، یعنی جس وقت کسی مسلمان کے بارے میں تمہارے ذہن میں کوئی بُرا گمان پیدا ہو تو اس کے لیے عمل میں معمولی سے معمولی اعتنا بھی نہ کرو۔ اپنی طرز رفتار میں تبدیلی نہ کرو، اور دوسرے سے اپنے سلوک اور معاملات کو نہ بدلو، اس بنا پر جو چیز گناہ ہے وہ بُرے گمان کے مطابق عمل کرنا ہے۔

لہٰذا ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے

"ثلاث فی المؤمن لا یستحسن، وله منھن مخرج، فمخرجه من سوء الظن ان لا یحققه"

تین چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود مؤمن میں پسندیدہ نہیں ہے، جبکہ اس کے لیے ان سے فرار کی راہ موجود ہے، منجملہ ان کے ایک سوءِ ظن ہے، جس سے راہ فرار یہ ہے کہ اس کو عمل میں نہ لایا جائے۔ [1]

۲۔ انسان مختلف مسائل میں غور و فکر کرنے سے، بہت سے مواقع پر بُرے گمان کو اپنے سے دور کر سکتا ہے، اور وہ اس طرح سے کہ ان کو صحت پر محمول کرنے کے راستوں میں غور کرے، اور ان سے صحیح احتمالات کو جو اس پر عمل کے بارے میں موجود ہیں اپنے ذہن میں مجسم کرے، اور آہستہ آہستہ بُرے گمان پر غلبہ حاصل کرے۔

اس بنا پر بدگمانی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمیشہ انسان کے اختیار سے خارج ہو۔

---

[1] محجۃ البیضاء جلد ۵، صفحہ ۲۶۹۔

لہٰذا روایات میں بطور حکم آیا ہے کہ اپنے بھائی کے اعمال کو جہاں تک ہو سکے بہترین صورت پر محمول کرو، جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے اور تیرے مسلمان بھائی سے جو سخت بات صادر ہو گئی ہے اس کے لیے ہرگز بد گمانی نہ کر جب تک تو اسکے لیے نیکی پر محمول کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔

"قال امیرالمومنین علیہ السلام ضع امر اخیك علی احسنہ حتی یاتیك ما یقبلك منہ، ولا تظنن بکلمۃ خرجت من اخیك سوء وانت تجد لھا فی الخیر محملا۔"[1]

بہر حال یہ اسلامی دستور انسانوں کے اجتماعی روابط کے سلسلے میں ایک جامع ترین اور ایک انتہائی حیاتی حکم ہے، جو معاشرے میں امن و امان کے مسئلہ کو کامل طور سے ضمانت دیتا ہے، جس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

پھر بعد والے حکم میں "تجسس سے نہی" کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور ہرگز دوسروں کے کاموں میں تجسس نہ کرو" : (ولا تجسسوا)۔

"تجسس" اور "تحسس" دونوں جستجو کرنے کے معنی میں ہیں، لیکن پہلا عام طور پر غیر مطلوب امور میں آتا ہے اور دوسرا عام طور پر امر خیر میں آتا ہے، جیسا کہ یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو حکم دیتے ہیں،: (یابنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ: "اے میرے بیٹو جاؤ اور (میرے گمشدہ) یوسف اس کے بھائی کے بارے میں جستجو کرو۔" (یوسف: ۸۷)

درحقیقت بُرا گمان ایک عامل ہے جستجو کرنے کا، اور جستجو کرنا ایک عامل ہے لوگوں کے رازہائے نہانی اور اسرار کے کشف کے لیے، اور اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے خصوصی راز فاش ہوں۔

دوسرے لفظوں میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی خصوصی زندگی میں ہر لحاظ سے امن و امان میں رہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر یہ اجازت دے دی جائے کہ ہر آدمی دوسروں کے بارے میں جستجو کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو لوگوں کی حیثیت اور آبرو تباہ و برباد ہو جائے گی اور ایک جہنم وجود میں آجائے گی جس میں معاشرے کے تمام افراد معذب ہوں گے۔

البتہ یہ دستور، حکومت اسلامی میں سازشوں سے مبارزہ کرنے کے لیے اطلاعاتی اداروں (سی آئی ڈی) کے وجود کے ساتھ منافی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی اس معنی میں نہیں ہے، کہ یہ ادارے لوگوں کی خصوصی زندگی میں بھی جستجو کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ اس بارے میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

اور آخر میں تیسرے اور آخری دستور میں، جو حقیقت میں پہلے دو پروگراموں کا معلول اور نتیجہ ہے، فرماتا ہے: "تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے" (ولا یغتب بعضکم بعضا)۔

اور اس طرح سے بُرا گمان تو تجسس کا سرچشمہ بنتا ہے اور تجسس، افشائے عیوب اور اسرار پنہانی کا موجب ہوتا

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب التہمۃ وسوء الظن حدیث ۳۔ اسی معنی کے مشابہ نہج البلاغہ میں بھی مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے۔ کلمات قصار کلمہ ۳۶۰۔

ہے اور ان امور سے آگاہی غیبت کا سبب بنتی ہے اور اسلام نے معلول اور علت دونوں سے منع کیا ہے۔

اس کے بعد اس عمل کی قباحت اور برائی کو کامل طور سے مجسم کرنے کے لیے اس کو ایک عمدہ مثال میں ڈھال کر کہتا ہے، "کیا تم میں سے کوئی بھی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے"؟ (ایحب احدکم ان یأکل لحم اخیہ میتًا)۔

"یقیناً تم سب اس امر سے کراہت رکھتے ہو" (فکرھتموہ)۔

ہاں مسلمان بھائی کی آبرو اس کے بدن کے گوشت کی مانند ہے اور اس آبرو کو غیبت کے ذریعہ ختم کرنا، اور پوشیدہ بھیدوں کو افشا کرنا، اس کے بدن کا گوشت کھانے کے مانند ہے۔

اور "مردہ" کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ "غیبت" لوگوں کے پیٹھ پیچھے کی جاتی ہے، جو مُردوں کی طرح اپنے آپ سے دفاع پر قدرت نہیں رکھتے۔

اور یہ ایک ایسا ظلم ہے جو انتہائی بزدلانہ ہے، کہ جسے انسان اپنے بھائی کے بارے میں روا رکھ سکتا ہے۔

ہاں! یہ تشبیہ، غیبت کی حد سے زیادہ بُرائی، اور اس کے عظیم گناہ کو بیان کرنے والی ہے۔

اسلامی روایات میں بھی جیسا کہ بیان کیا جائے گا مسئلہ "غیبت" کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور بہت کم ایسے گناہ ہیں، جس کی سزا، اسلام کی نظر میں، اس قدر سنگین ہو،

اور چونکہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان تینوں گناہوں میں سے بعض سے آلودہ ہوں، اور وہ ان آیات کے سُننے سے متنبہ اور بیدار ہو جائیں، اور تلافی کے لیے تیار ہوں، اس لیے آیت کے آخر میں ان کے لیے راستہ کھلا رکھتے ہوئے فرماتا ہے: "تقوٰے الٰہی اختیار کرو، اور خدا سے ڈرو، کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے" (واتقوا اللہ ان اللہ توّاب رحیم)۔

سب سے پہلے تقویٰ اور خدا سے ڈرنے کی رُوح زندہ ہونی چاہیئے اور اس کے بعد گناہ سے توبہ کی جائے، تاکہ خدا کا لطف اور اس کی رحمت ان کے شامل حال ہو۔

❖ ❖ ❖

چند نکات

۱۔ معاشرے میں کامل اور ہر پہلو سے امن و امان

وہ چھ احکام جو اوپر والی دو آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔ (تمسخر، غیبت جوئی، بُرے القاب، گمان بد، تجسس اور غیبت سے نہی) اگر کسی معاشرے میں ان پر کامل طور سے عمل ہو، تو معاشرے کے تمام افراد کی عزت و آبرو کا ہر لحاظ سے بیمہ ہو جاتا ہے۔ نہ تو کوئی شخص خود کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے دوسروں کو تفریح و تمسخر کا ذریعہ بنا سکتا ہے، اور نہ ہی وہ کسی کی عیب جوئی کے لیے زبان کھول سکتا ہے اور نہ بُرے القاب کے ساتھ لوگوں کی حرمت و شخصیت کو خراب کرتا ہے۔

نہ اُسے کسی کے بارے میں بُرا گمان کرنے کا حق ہے۔ نہ وہ افراد بشر کی شخصی زندگی کے بارے میں جستجو میں لگتا ہے، اور نہ ہی ان کے پوشیدہ عیوب دوسروں کے سامنے فاش کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کے پاس چار سرمائے ہیں۔ اور ان سب کو اس قانون کے قلعوں کے اندر محفوظ رہنا چاہیئے اور وہ ہیں: جان، مال، اور عزت و آبرو،

اوپر والی آیات اور اسلامی روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ لوگوں کی آبرو اور حیثیت، ان کے مال و جان کی طرح ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے (اُن سے بھی) زیادہ اہم ہے،!

اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں کامل طور امن و امان کی حکمرانی ہو۔ لوگ ایک دوسرے پر نہ صرف عمل میں اور ہاتھ کے ساتھ حملہ نہ کریں۔ بلکہ لوگوں کی زبان کے لحاظ سے اور اس سے بھی بڑھ کر فکر اور سوچ کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے امن و امان میں ہوں اور ہر شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی دوسرا شخص اپنے افکار میں بھی تہمت کے تیر اس کی طرف نہیں پھینکتا، اور یہ ایسی بلند ترین سطح کی امنیت ہے، جو ایک مذہبی اور مومن معاشرے کے سوا کہیں بھی امکان پذیر نہیں ہے۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں۔

" ان اللہ حرم من المسلم دمہ ومالہ وعرضہ، وان یظن بہ السوء:

" خدا نے مسلمانوں کا خون، مال اور عزت و آبرو دوسروں پر حرام کردی ہے، اور اسی طرح یہ بھی کہ اس کے بارے میں بُرا گمان کرے۔"[1]

بُرا گمان کرنا، نہ صرف طرف مقابل اور اس کی حیثیت پر صدمہ وارد کرتا ہے، بلکہ بُرا گمان کرنے والے کے لیے بھی ایک بہت بڑی بلا و مصیبت ہے، کیونکہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے، اور اجتماعی تعاون سے الگ تھلگ ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

اور یہ فعل ایک ایسی وحشتناک دُنیا اس کے لیے فراہم کرتا ہے، جو غربت و بے کسی اور تنہائی و گوشہ نشینی سے پُر ہو۔ جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہوا ہے:

" من لم یحسن ظنہ استوحش من کل احد:

" جو شخص بُرا گمان رکھتا ہو وہ ہر شخص سے ڈرتا ہے، اور وحشت رکھتا ہے۔"[2]

دوسرے لفظوں میں وہ چیز جو انسان کی زندگی کو جانوروں سے جدا کرتی ہے، اور اسے رونق و حرکت اور تکامل و ارتقا بخشتی ہے، وہ رُوح تعاون اور سب کا مل جُل کر کام کرنا ہی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں امکان پذیر ہے۔ جبکہ

---

[1] "المحجۃ البیضاء"، جلد ۵ صفحہ ۲۶۸

[2] "غرر الحکم" صفحہ ۶۹۷

لوگوں میں اعتماد اور خوش بینی ہو، در آنحالیکہ بُرا گمان اس اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے، اور تعاون کے رشتوں کو توڑ دیتا ہے، اور رُوح اجتماعی کو کمزور کر دیتا ہے۔

نہ صرف سُوءِ ظن بلکہ تجسس اور غیبت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا ہے۔

بدبین افراد ہر چیز سے ڈرتے ہیں، اور ہر شخص سے وحشت رکھتے ہیں، اور ان کی رُوح پر ہمیشہ ایک جانکاہ پریشانی چھائی رہتی ہے، نہ تو وہ کوئی دوست اور مونس و غم خوار پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے اجتماعی کاموں کے لیے کوئی شریک و ہمکار بنا سکتے ہیں اور نہ پریشانی کے دنوں کے لیے کوئی یار و مددگار۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی لازم ہے کہ یہاں "ظن" سے مراد ایسے گمان ہیں جن کے لیے کوئی دلیل نہ ہو، اس بنا پر جہاں گمان کا انحصار کسی دلیل یعنی ظن معتبر پر ہو وہ اس گمان سے مستثنیٰ ہے، اُس گمان کی طرح، جو دو عادل گواہوں کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

❖ ❖ ❖

۲۔ تجسس نہ کرو

ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن نے اُوپر والی آیت میں تجسس کو پوری صراحت کے ساتھ منع کیا ہے، اور چونکہ اس کے لیے کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں لگائی، لہٰذا یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ دوسروں کے کاموں میں جستجو کرنا، اور ان کے بھیدوں کو فاش کرنے کی کوشش کرنا، گناہ ہے، لیکن وہ قرائن جو آیت کے اندر اور باہر موجود ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں، کہ یہ حکم افراد کی شخصی اور خصوصی زندگی سے مربوط ہے، اور اجتماعی زندگی میں بھی اس حد تک، کہ اس سے معاشرے کی سرنوشت میں کوئی اثر نہ پڑتا ہو، یہی حکم صادق ہے۔

لیکن یہ بات واضح اور روشن ہے کہ جہاں اس کا دوسروں کی سرنوشت اور معاشرے کی حالت سے تعلق ہو، تو پھر مسئلہ کی دوسری شکل ہو جاتی ہے، لہٰذا پیغمبرؐ نے کچھ اشخاص اطلاعات جمع کرنے کے لیے مقرر کیے ہُوئے تھے، جنہیں "عیون" کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ وہ ایسی اطلاعات جو داخل اور خارج میں اسلامی معاشرے سے متعلق ہیں آپؐ کے لیے اکٹھی کریں۔

اسی بنا پر حکومت اسلامی بھی مامورین اطلاعاتی رکھ سکتی ہے یا اطلاعات جمع کرنے کے لیے ایک وسیع ادارہ قائم کر سکتی ہے اور جہاں کہیں معاشرے کے برخلاف سازش کا خوف ہو، یا امن و امان کو خطرے میں ڈالنے یا حکومت اسلامی کو نقصان پہنچانے کا خطرہ ہو، وہاں تجسس کریں، یہاں تک کہ بعض افراد کی خصوصی و داخلی زندگی میں بھی جستجو کریں۔

لیکن یہ امر ہرگز اس اسلامی بنیادی قانون کی حرمت کو توڑنے کے لیے بہانہ نہیں بننا چاہیئے، کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو اس بات کا مجاز قرار دے لیں کہ وہ مسئلہ "سازش" اور نقص امن کے بہانہ سے لوگوں کی خصوصی اور شخصی زندگی پر حملہ آور ہوں، ان کا اعمال نامہ کھولیں، ان کے ٹیلیفونوں پر کنٹرول کریں اور وقت بے وقت ان کے گھروں کی تلاشی لیں۔

خلاصہ یہ کہ تجسس "اور معاشرے کے امن و امان کی حفاظت کے لیے لازمی اطلاعات کے درمیان کی سرحد

بہت ہی دقیق اور ظریف ہے، اور امور اجتماعی کے ادارہ کے ذمہ داروں کو دقت کے ساتھ اس سرحد کی نگرانی کرنا چاہیئے، تاکہ انسانوں کے اسرار کی حرمت کی حفاظت بھی ہو، اور معاشرے اور حکومت اسلامی کا امن وامان بھی خطرے میں نہ پڑے۔

۳۔ غیبت بہت بڑا گناہ ہے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی حیثیت، آبرو اور شخصیت ہے، اور جو چیز اُسے خطرے میں ڈال دے، وہ ایسا ہے، جیسا کہ اس کی جان کو خطرے میں ڈال دیا، بلکہ بعض اوقات شخصیت کو قتل کرنا شخص کو قتل کرنے سے زیادہ اہم شمار ہوتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں اس کا گناہ قتل نفس کے گناہ سے بھی زیادہ سخت اور سنگین ہے۔

غیبت کے حرام ہونے کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ یہ ہے، کہ یہ عظیم سرمایہ برباد نہ ہو، اور اشخاص کی حرمت ضائع نہ ہو، اور ان کی حیثیت کو داغدار نہ کرے، یہ ایسی بات ہے جسے اسلام نے بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ "غیبت" بدنیتی پیدا کرتی ہے، اجتماعی رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اعتماد کے سرمایوں کو ختم کرتی ہے اور تعاون اور مل جل کر کام کرنے کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلام مسئلہ وحدت اور جامعہ اسلامی کے اتحاد، تنظیم اور استحکام کو حد سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، جو چیز اس وحدت کو مضبوط بناتی ہو، وہ اسلام سے تعلق اور لگاؤ رکھتی ہے، اور جو چیز اس کو کمزور کرے وہ اس کے لیے قابل نفرت ہے، اور غیبت ضعف پہنچانے اور کمزور کرنے کا ایک اہم عامل ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر "غیبت" کینہ وعداوت کا بیج دلوں میں بوتی ہے، اور بعض اوقات خونیں نزاعوں اور قتل وکشتار کا سرچشمہ بنتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسلام میں غیبت بزرگ ترین گناہان کبیرہ میں شمار ہوتی ہے تو یہ اس کے انفرادی اور اجتماعی بُرے آثار کی وجہ سے ہے۔

روایات اسلامی میں اس سلسلہ میں بہت ہی ہلا دینے والی تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔ جن کا ایک نمونہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:

"ان الدرهم يصيبه الرجل من الربا اعظم عند الله في الخطيئة من ست وثلاثين زنية، يزنيها الرجل! وان الربا عرض الرجل المسلم!"

"وہ درہم جو انسان ربا اور سود کے ذریعہ حاصل کرے، اس کا گناہ خدا کے ہاں چھتیس زناؤں سے بڑھ کر ہے۔ اور ہر ربا سے بالاتر مسلمان کی آبرو ہے"[1]

---

[1] "المحجة البيضاء" جلد ۵ ص ۲۵۳

یہ موازنہ اس بنا پر ہے، کہ "زنا" خواہ کتنا ہی بُرا ہو، وہ "حق اللہ" کا پہلو رکھتا ہے، لیکن سُود خوری، اور اس بدتر غیبت یا کسی اور طریقہ سے آبرو ریزی کرنا "حق الناس" کا پہلو رکھتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ نے بلند آواز میں خطبہ پڑھا اور بلند آواز میں فرمایا:

"یامعشر من اٰمن بلسانہ ولم یؤمن بقلبہ! لاتغتابوا المسلمین، ولا تتبعوا عوراتھم، فانہ من تتبع عورۃ اخیہ تتبع اللہ عورتہ، ومن تتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی جوف بیتہ!؟

"اے وہ گروہ جو زبان سے تو ایمان لائے ہو۔ لیکن دل سے ایمان نہیں لائے، تم مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو، اور ان کے پوشیدہ عیبوں کی جستجو نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے دینی بھائی کے پوشیدہ امور کی جستجو کرے خدا اس کے اسرار اور رازوں کو فاش کر دیتا ہے، اور اُسے خود اسی کے گھر کے اندر رسوا اور ذلیل کر دیتا ہے" [1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو وحی کی:

"من مات تائبًا من الغیبۃ فھو اٰخر من یدخل الجنۃ، و من مات مصرًا علیھا فھو اوّل من یدخل النار"!

"جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس نے غیبت سے توبہ کر لی ہو تو وہ آخری شخص ہوگا جو جنت میں داخل ہوگا، اور جو اس حالت میں مرے کہ غیبت پر اصرار رکھتا ہو، تو وہ پہلا شخص ہوگا، جو جہنم میں داخل ہوگا" [2]

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے بھی منقول ہے کہ:

"الغیبۃ اسرع فی دین الرجل المسلم من الاکلۃ فی جوفہ"

غیبت کی تاثیر مسلمان کے دین میں اس کے جسم میں جذام کے اثر سے بھی زیادہ تیز ہے" [3]

یہ تشبیہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ غیبت، جذام کی طرح جو بدن کے گوشت کو کھا جاتا ہے۔ سُرعت کے ساتھ انسان کے ایمان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہُوئے کہ غیبت کے محرک، حسد، تکبر، بخل، کینہ پروری اور تنگ نظری جیسے قبیح و مذموم صفات ہیں۔ واضح ہو جاتا ہے، کہ غیبت اور اس طرح سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو تباہ کرنا، کیوں انسان کے ایمان کو اس طرح سے برباد کر دیتا ہے (غور کیجیے)

---

[1] سابقہ مدرک صفحہ ۲۵۳

[2] سابقہ مدرک صفحہ ۲۵۲

[3] اصولِ کافی جلد ۲ باب الغیبۃ حدیث نمبر ۱ (آکلہ بروزن قابلہ ایک قسم کی بیماری ہے جو انسان کے بدن کا گوشت کھا جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں منابع اسلامی میں بہت زیادہ روایات ہیں اور ہم ایک اور حدیث کو بیان کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من روی علی مؤمن روایة یرید بها شینه، وهدم مروته، لیسقط من اعین الناس، اخرجه الله من ولایته الی ولایة الشیطان، فلا یقبله الشیطان"

"جو شخص کسی مومن کی عیب جوئی اور آبروریزی کے لیے کوئی بات نقل کرے، تاکہ اس کو لوگوں کی نظروں سے گرا دے تو خدا اس کو اپنی ولایت سے نکال کر شیطان کی ولایت میں داخل کر دیتا ہے، لیکن شیطان بھی اس کو قبول نہیں کرتا" [1]

یہ تمام تاکیدیں، اور ہلا دینے والی عبارتیں، اس فوق العادہ کی اہمیت کی وجہ سے ہے، جو اسلام میں مومنین کی آبرو اور ان کی اجتماعی حیثیت کی حفاظت کے لیے ہے، اور اس مخرب تاثیر کی وجہ سے بھی ہے جو غیبت سے، معاشرت کی وحدت، آپس کے اعتماد اور دلی تعلقات میں پیدا ہوتی ہے اور اس سے بدتر بات یہ ہے کہ غیبت، اجتماعی سطح پر، کینہ و عداوت، اور دشمنی و نفاق کی آگ بھڑکانے، اور فحشاء و منکر کی اشاعت کا ایک عامل ہے، کیونکہ جس وقت لوگوں کے پوشیدہ عیوب غیبت کے ذریعہ آشکار ہو جاتے ہیں تو گناہ کی عظمت و اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں آلودہ ہو جانا آسان ہو جاتا ہے۔

❊ ❊ ❊

۴۔ غیبت کا مفہوم

"غیبت"۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے۔ یہ ہے، کہ کسی شخص کے پیٹھ پیچھے کوئی بات کہیں، البتہ وہ ایسی بات ہو جو اس کے کسی خاص عیب کو فاش کرے، چاہے وہ عیب جسمانی ہو یا اخلاقی، اس کے اعمال میں ہو یا گفتگو میں، یہاں تک کہ اُن امور میں جو اس سے متعلق ہیں، مثلاً لباس، گھر، بیوی اور اولاد وغیرہ۔

اس بنا پر اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ظاہر و آشکار صفات کو بیان کرے تو وہ غیبت نہیں ہوگی، مگر یہ کہ اس کا مذمت اور عیب جوئی کا ارادہ ہو، تو اس صورت میں وہ حرام ہے، مثلاً یہ کہ مذمت کے طور پر کہے کہ فلاں شخص نابینا، یا کوتاہ قد، یا کالا، یا کوسہ، یعنی بے ڈاڑھی مونچھ کا۔

اس طرح سے پوشیدہ عیوب کا ذکر کرنا، چاہے کسی بھی نیت اور ارادہ سے ہو، غیبت اور حرام ہے، اور ظاہر عیوب کا ذکر، اگر مذمت کے ارادے سے ہو تو حرام ہے، چاہے ہم اس کو غیبت کے مفہوم میں داخل سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

یہ سب کچھ اس صورت میں ہے، جبکہ یہ صفات واقعاً اس شخص میں موجود ہوں۔ لیکن اگر ایسی اصلاً اس میں موجود ہی نہ ہو تو وہ "تہمت" کے عنوان میں داخل ہوگی، جس کا گناہ کئی گنا زیادہ شدید اور زیادہ سنگین ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ باب ۱۵۰ حدیث ۲ صفحہ ۶۰۰۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

" الغیبۃ ان تقول فی اخیك ماستره الله علیه، واما الامر الظاهر فیه، مثل الحدة والعجلة، فلا، والبهتان ان تقول مالیس فیه؛

" غیبت" یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں وہ بات کہے، جسے خدا نے پنہاں رکھا ہے، لیکن وہ چیز جو ظاہر ہے، مثلاً سخت مزاجی اور جلد بازی تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے، لیکن بہتان یہ ہے کہ تو ایسی چیز کہے کہ جو اس میں موجود نہ ہو۔[1]

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عام عذر جو بعض لوگ غیبت کے بارے میں پیش کرتے ہیں، سننے کے لائق نہیں ہے۔ مثلاً بعض اوقات غیبت کرنے والا یہ کہتا ہے کہ غیبت نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اس کی صفت ہے، حالانکہ اگر وہ اس کی صفت نہ ہوتی تو پھر تو وہ تہمت ہوتی نہ کہ غیبت۔

یا یہ کہ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو ایسی بات ہے، جسے میں اس کے سامنے بھی کہتا ہوں، حالانکہ اس کو اس کے سامنے کہنا نہ صرف غیبت کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کرتا، بلکہ اس کو ایذاء و تکلیف پہنچانے کی بناء پر اس سے بھی زیادہ سنگین گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

❊ ❊ ❊

۵۔ غیبت کا علاج اور اس سے توبہ

غیبت بہت سے مذموم صفات کے مانند آہستہ آہستہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس طرح سے کہ غیبت کرنے والا اپنے کام سے لذت اٹھانے لگتا ہے اور اس سے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی آبرو ریزی کرے، راضی اور خوش ہوتا ہے اور یہ ایک بہت ہی خطرناک اخلاقی مرحلہ ہے۔

یہی وہ موقع ہے، جب غیبت کرنے والے کو ہر چیز سے پہلے غیبت کے اندرونی محرکات کا علاج کرنا چاہیئے، جو اس کی روح کی گہرائیوں میں ہیں اور گناہ پر ابھار رہے ہیں، ایسے محرکات جیسے کہ "بخل" و "حسد" و "کینہ پروری" و "عداوت" اور خود کو افضل و برتر سمجھنا ہیں۔

اسے چاہیئے کہ خود سازی کے طریق سے اور ان بُرے صفات کے نتائج بد اور ان کے بُرے ثمرات کے بارے میں غور و فکر کرنے سے، اور اسی طرح ریاضت نفس کے طریقہ سے، ان آلودگیوں کو اپنے جان و دل سے دھو ڈالے، تاکہ اپنی زبان کو غیبت کی آلودگی سے باز رکھ سکے۔

اس کے بعد توبہ کے مقام میں آئے، اور چونکہ غیبت "حق الناس" کا پہلو رکھتی ہے، اگر صاحبِ غیبت تک رسائی ہو اور اس سے کوئی نئی مشکل پیدا نہ ہوتی ہو، تو اس سے عذر خواہی کرے، چاہے وہ سربستہ شکل میں ہی ہو، مثلاً کہے میں بعض

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب الغیبۃ والبہت حدیث ۱۔

اوقات نادانی اور بے خبری میں آپ کی غیبت کر بیٹھا ہوں مجھے معاف کردو، اور اس سے زیادہ تشریح نہ کرے، تاکہ کہیں تازہ فساد کا سبب نہ بن جائے۔

اور اگر طرفِ مقابل تک دسترس نہیں ہے، یا اُسے پہچانتا نہیں ہے، یا وہ فوت ہوگیا ہے، تو اس کے لیے استغفار کرے اور نیک عمل انجام دے، شاید اس کی برکت سے خداوند متعال اس کو بخش دے، اور طرفِ مقابل کو راضی کرلے۔

۶۔ استثنائی مواقع

غیبت کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ قانون غیبت میں بھی، ہر دوسرے قانون کی طرح، کچھ باتیں مستثنیٰ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے، کہ بعض اوقات "مشورہ" کے طور پر مثلاً بیوی یا شوہر کے انتخاب میں، یا کسب وکار وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے، کوئی شخص کسی سے سوال کرتا ہے، تو مشورت میں امانت کا جو اسلام کا ایک مسلمہ قانون ہے۔ تقاضا یہ ہے کہ اگر طرفِ مقابل میں اُسے کوئی عیب معلوم ہو۔ تو وہ اُسے بتادے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مسلمان جال میں پھنس جائے، اور اس قسم کی غیبت جو اس قسم کی نیت سے انجام پائے حرام نہیں ہے۔

اسی طرح ایسے ہی دوسرے موقعوں پر، جہاں ایسے اہم مقاصد ہوں، جسے کاموں میں مشورہ کا مقصد ہوتا ہے، یا کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے یا ظلم کے خلاف دادرسی کے لیے صورت پذیر ہو۔

البتہ جو شخص علی الاعلان اور آشکارا گناہ کرتا ہے اور اصطلاح کے مطابق "متجاھر بہ فسق" ہے وہ موضوع غیبت سے خارج ہے اور اگر کوئی اس کے گناہ کو اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ حکم اُسی گناہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کے بارے میں وہ متجاہر ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ نہ صرف غیبت کرنا حرام ہے، بلکہ غیبت کا سننا بھی حرام ہے اور غیبت کی مجلس میں حاضر ہونا بھی حرام کاموں میں سے ہے، بلکہ کچھ روایات کے مطابق تو مسلمانوں پر غیبت کا رد کرنا واجب ہے، یعنی غیبت کے مقابلہ میں دفاع کے لیے کھڑے ہوں، اور اس مسلمان بھائی کا، جس کی حیثیت و شخصیت خطرے میں پڑ گئی ہے، دفاع کریں، اور کتنا زیبا اور خوبصورت ہوگا وہ معاشرہ، جس میں یہ اخلاقی اصول دقیقاً اجرا ہوں۔

۱۳۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۳۔ اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھارے قبیلے اور کنبے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن تم میں سے زیادہ مکرم و گرامی خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے اور خدا علیم و خبیر ہے۔

تفسیر

تقویٰ بہترین انسانی صفت

گذشتہ آیات میں رُوئے سخن مومنین کی طرف تھا، اور خطاب "یاایھا الذین امنوا" کی صورت میں تھا، اور متعدد آیات کے ضمن میں، وہ باتیں، جو ایک "مؤمن معاشرے" کو خطرے سے دوچار کرتی ہیں، بیان کی ہیں، اور ان سے منع کیا ہے۔

جبکہ زیر بحث آیت میں، سارا انسانی معاشرہ مخاطب ہے اور وہ اہم ترین اصل اور بنیاد، جو نظم و ثبات کی ضامن ہے، بیان کرتا ہے۔ اور کاذب اور چھوٹی اقدار کے مقابلہ میں حقیقی انسانی اقدار کی میزان کو مشخص کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ "اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں شعوب و قبائل قرار دیا ہے۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو" (یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم

شعوبًا وقبائل لتعارفوا)۔

لوگوں کی ایک مرد اور ایک عورت سے خلقت سے مراد، وہی انسانوں کے انساب کی آدم وحوا کی طرف بازگشت ہے، اس بنا پر چونکہ وہ سب کے سب ایک ہی جڑ سے ہیں، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ نسب وقبیلہ کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر کریں اور اگر خدا نے ہر قبیلہ اور گروہ کے لیے کچھ خصوصیات خلق کی ہیں تو وہ لوگوں کی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کی حفاظت کے لیے ہے، کیونکہ یہ فرق اور تفاوت شناخت اور پہچان کے لیے ہے اور افراد کی پہچان کے بغیر انسانی معاشرے میں کوئی نظم وضبط قائم نہیں ہوسکتا، کیونکہ اگر وہ سب کے سب یکساں اور ایک دوسرے کے مشابہ اور مانند ہوتے تو سارے انسانی معاشرے کو فتنہ وفساد گھیر لیتا۔

اس بارے میں کہ "شعوب" (جمع "شعب" بروزن صعب) لوگوں کے ایک عظیم گروہ کے معنی میں ہیں، اور "قبائل" جمع "قبیلہ" کے درمیان کیا فرق ہے؟ مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

ایک جماعت نے تو یہ کہا ہے کہ "شعوب" کا دائرہ "قبائل" کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے، جیسا کہ موجودہ زمانہ میں "شعب" کا ایک "ملت وقوم" پر اطلاق ہوتا ہے۔

بعض "شعوب" کو "طوائف عجم" کی طرف اشارہ، اور "قبائل" کو "طوائف عرب" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

اور آخر میں بعض نے "شعوب" کو انسان کے جغرافیائی منطقوں کی طرف منسوب ہونے کے لحاظ سے، اور "قبائل" کو نسل اور خون کی طرف منسوب ہونے سے متعلق سمجھا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال قرآن مجید زمانہ جاہلیت کے بزرگ ترین فخر ومباہات کے سبب، یعنی نسب وقبیلہ پر فخر کو ختم کرنے کے بعد واقعی اور حقیقی انسانی اقدار کے معیار کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ: "تم میں سے زیادہ مکرم وگرامی خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے" (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم)۔

اس طرح سے تمام ظاہری اور مادی امتیازات پر خطِ بطلان کھینچتے ہوئے بڑائی کی واقعیت وحقیقت کو مسئلہ تقویٰ وپرہیزگاری اور خوفِ خدا میں قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ خدا کے تقرب اور اس کی ساحت قدس سے نزدیکی کے لیے کوئی امتیاز سوائے تقویٰ کے مؤثر نہیں ہے۔

اور چونکہ تقویٰ ایک روحانی اور باطنی صفت ہے، جسے سب سے پہلے انسان کے دل وجان میں مستقر ہونا چاہیئے اور ممکن ہے کہ اس کے مدعی تو بہت ہوں، مگر اس سے متصف بہت کم ہوں، لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا علیم وخبیر ہے" (ان اللہ علیم خبیر)۔

وہ پرہیزگاروں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے، اور ان کے درجۂ تقویٰ وخلوصِ نیت اور ان کی پاکیزگی اور صفائی سے آگاہ ہے ان کو اپنے علم کے مطابق مکرم ومحترم اور گرامی رکھتا ہے اور اجر وپاداش دیتا ہے، جھوٹے دعویداروں کو بھی پہچانتا ہے اور انھیں سزا اور عذاب دیتا ہے۔

نکتہ

۱۔ سچی اور جھوٹی قدریں

اس میں شک نہیں کہ ہر انسان فطرتاً اس چیز کا خواہاں ہے کہ وہ ایک صاحب قدر و افتخار ہستی قرار پائے، لہٰذا اسی وجہ سے اقدار کو کسب کرنے کے لیے اپنے پورے وجود کے ساتھ کوشش کرتا ہے۔

لیکن اقدار کے معیار کی پہچان تہذیبوں اور تمدنوں کے اختلاف کی وجہ سے کامل طور سے مختلف ہے، اور بعض اوقات جھوٹی قدریں سچی قدروں کی جگہ لے لیتی ہیں۔

کوئی گروہ اپنی واقعی اور حقیقی قدر و قیمت "کسی معروف و معتبر قبیلہ" کے ساتھ انتساب میں سمجھتا ہے، لہٰذا اپنے قبیلہ اور طائفہ کے مقام کی شان کے لیے ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، تاکہ اس کو بڑا اور بزرگ بنانے کے طریقہ سے خود کو اس سے منسوب کرنے کے ذریعہ بڑا کرے۔

خاص طور سے زمانہ جاہلیت کی اقوام کے درمیان انساب و قبائل کے ذریعہ افتخار سب سے زیادہ رائج موہوم افتخار تھا، یہاں تک کہ ہر قبیلہ خود کو "برتر قبیلہ"، اور ہر نسل خود کو "والاترنسل" سمجھتی تھی، افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی تک اس کی تلچھٹ اور بقایا جات بہت سے افراد و اقوام کی روح کی گہرائیوں میں موجود ہیں۔

ایک دوسرا گروہ مال و دولت کے مسئلہ اور کاخ و قصر و خدم و حشم اور ایسی ہی چیزوں کا مالک ہونے کو قدر و قیمت کی نشانی سمجھتا ہے، اور ہمیشہ اسی کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے، جبکہ ایک اور جماعت اجتماعی اور سیاسی بلند مقامات کو شخصیت کا معیار سمجھتی ہے۔

اور اس طرح سے ہر گروہ اپنے مخصوص راستے پر قدم اٹھاتا ہے۔ اور کسی ایک خاص قدر و منزلت سے اپنا دل باندھتا ہے اور اسی کو معیار سمجھتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ سب امور، ایسے متزلزل اور ذات سے خارج اور مادی اور جلدی گزر جانے والے امور ہیں، اسلام جیسا ایک آسمانی دین ہرگز ان کی موافقت نہیں کرسکتا، لہٰذا ان سب پر خط بطلان کھینچتے ہوئے، انسان کی واقعی اور حقیقی قدر و قیمت کو اس کی ذاتی صفات، خصوصاً تقویٰ و پرہیزگاری ایفائے عہد اور پاکیزگی میں شمار کرتا ہے، یہاں تک کہ علم و دانش جیسے اہم موضوعات کے لیے بھی۔ اگر وہ ایمان و تقویٰ اور اخلاقی قدروں کی راہ میں کام نہ آئیں۔ کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ قرآن ایک ایسے ماحول میں ظاہر ہوا، جہاں "قبیلہ" کی قدر و قیمت تمام قدروں سے زیادہ اہم شمار ہوتی تھی، لیکن یہ خود ساختہ بت ٹوٹ پھوٹ گیا اور انسانوں کو "خون" و "قبیلہ" و "رنگ" و "نژاد" (نسل) و

"مال" و "مقام" اور مال و دولت کی قید سے آزاد کر دیا، اور اسے اپنے آپ کو پانے کے لیے اس کی جان و روح کے اندر اور اس کی بلند صفات میں رہبری کی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اُن شان ہائے نزول میں، جو اس آیت کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ ایسے نکات دکھائی دیتے ہیں جو اس دستور الٰہی کی گہرائی کی حکایت کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

فتح مکہ کے بعد پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ اذان کہیں "بلال" نے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہی تو "عتاب بن اسید" نے جو آزاد کیے گئے لوگوں میں سے تھا، کہا، میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرا باپ دُنیا سے رخصت ہو گیا اور اس نے یہ دن نہ دیکھا اور "حارث بن ہشام" نے بھی کہا: کیا رسول اللہ کو اس "کالے کوّے" کے علاوہ اور کوئی نہیں ملا؟! (تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور حقیقی اور واقعی قدر و قیمت کا معیار بیان ہوا)۔ [1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبرؐ نے یہ حکم دیا تھا کہ بعض "موالی" کو لوگ بیٹی کا رشتہ دیں۔ (موالی آزاد شدہ غلاموں یا غیر عرب کو کہتے ہیں) تو ان لوگوں نے تعجب کیا اور کہا اے رسولِ خدا، کیا آپ یہ حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنی بیٹیاں موالی کو دیں؟! تو یہ آیت نازل ہوئی اور ان بے ہودہ افکار پر خط بطلان کھینچا۔ [2]

ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ نے مکہ میں لوگوں کے لیے خطبہ پڑھا اور فرمایا،

"یا ایھا الناس ان اللہ قد اذھب عنکم عیبۃ الجاھلیۃ، وتعاظمھا بآبائھا، فالناس رجلان: رجل برتقی کریم علی اللہ، وفاجر شقی ھین علی اللہ، والناس بنو آدم، وخلق اللہ آدم من تراب، قال اللہ تعالیٰ: یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر:

اے لوگو! خدا نے جاہلیت کے ننگ عیب اور آباؤ اجداد اور بزرگوں پر فخر و مباہات کرنے کو ختم کر دیا ہے۔ لوگوں کے صرف دو گروہ ہیں: نیکوکار صاحب تقویٰ اور خدا کے ہاں قدر و قیمت رکھنے والے یا بدکار و شقی اور بارگاہ خداوندی میں پست و حقیر سب کے سب لوگ آدم کی اولاد ہیں، اور خدا نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں اس لیے شعوب و قبائل قرار دیا ہے، تاکہ تمھاری پہچان ہو سکے، خدا کے نزدیک زیادہ مکرم و گرامی وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اور خدا دانا اور آگاہ ہے"۔ [3]

---

[1] "روح البیان" جلد ۹ ص ۹۰۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہی شان نزول بیان کی گئی ہے جلد ۹ ص ۶۱۶۰۔

[2] سابقہ مدرک۔

[3] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ ص ۶۱۶۱

کتاب "آداب النفوس" طبری میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایام تشریق کے دوران (جو ذی الحجہ کے ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ کے دن ہیں) سرزمین منیٰ میں، جبکہ آپؐ ایک اونٹ پر سوار تھے، لوگوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"یا ایھا الناس! الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد، الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی، ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود، الا بتقوی الا ھل بلغت؟ قالوا نعم! قال لیبلغ الشاھد الغائب"

اے لوگو! جان لو کہ تمہارا خدا ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہے نہ تو عرب کو عجم پر کوئی برتری ہے، اور نہ ہی عجم کو عرب پر، نہ کسی کالے کو کسی گورے پر اور نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر، مگر تقویٰ اور پرہیز گاری کے ساتھ، کیا میں نے خدا کا حکم تمہیں پہنچا دیا ہے؟ سب نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: یہ بات حاضرین غائبین تک پہنچا دیں۔[1]

ایک اور دوسری حدیث میں بھی مختصر اور پُرمعنی جملوں میں آنحضرتؐ سے یہ منقول ہوا ہے:

"ان اللہ لا ینظر الی احسابکم، ولا الی انسابکم، ولا الی اجسامکم، ولا الی اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم، فمن کان لہ قلب صالح تحنن اللہ علیہ، وانما انتم بنو آدم واحبکم الیہ اتقاکم"

"خدا تمہارے گھرانے اور نسب کی وضع و کیفیت کو نہیں دیکھتا، نہ تمہارے جسموں کی طرف نہ تمہارے مال و منال کی طرف، لیکن وہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے، جو شخص صالح اور نیک دل رکھتا ہے تو خدا اس پر لطف و محبت کرتا ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔[2]

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان وسیع بحثوں اور پُربار تعلیمات کے باوجود اب بھی مسلمانوں کے درمیان کچھ لوگ "نسل" و "خون" اور "زبان" کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کی وحدت کو اخوت اسلامی اور وحدت دینی پر مقدم سمجھتے ہیں اور انھوں نے زمانہ جاہلیت کی عصبیت کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ اور اگرچہ ان پر اس راستے میں سخت مصائب اٹھانے پڑے ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیدار ہونا ہی نہیں چاہتے اور نہ ہی اسلام کے حکم کی طرف لوٹنا

---

[1] مدرک سابق صفحہ ۱۶۲، اس روایت میں "احمر" کی تعبیر سُرخ جلد کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ گندم گوں کے معنی میں ہے، کیونکہ زیادہ تر لوگ اس ماحول میں اسی قسم کے تھے، اتفاقاً لفظ "احمر" روایات میں خود گندم پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

چاہتے ہیں خداوند عالم سب لوگوں کو جاہلیت کے تعصبات کے شر سے محفوظ رکھے۔

اسلام نے "جاہلیت کی عصبیت" سے۔ جو جس شکل و صورت میں ہو۔ مبارزہ کیا ہے۔ تاکہ پورے عالم کے مسلمانوں کو۔ چاہے وہ جس نسل و قوم و قبیلہ سے ہوں ایک پرچم کے نیچے جمع کرے، نہ کہ قومیت و نسل کے پرچم تلے اور نہ ہی کسی دوسرے پرچم کے نیچے، کیونکہ اسلام ہرگز اس قسم کے تنگ محدود نظریات کو قبول نہیں کرتا اور ان سب کو موہوم اور بے بنیاد شمار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے جاہلیت کی عصبیت کے بارے میں فرمایا:

"دعوها فانها منتنه"

"اسے چھوڑ دو، یہ بدبودار اور متعفن چیز ہے۔" [1]

لیکن اس متعفن اور بدبودار فکر کو بہت سے ایسے لوگ جو ظاہراً اپنے آپ کو مسلمان شمار کرتے ہیں، اور قرآن اور اخوتِ اسلامی کا دم بھرتے ہیں، اب تک گلے کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہے!

کتنا زیبا اور خوبصورت ہوگا وہ معاشرہ جو اسلامی قدروں کے معیار "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کی بنیاد پر تعمیر ہوگا، اور نسل، مال، دولت، اور جغرافیائی منطقوں اور طبقوں کی جھوٹی قدریں ختم ہو جائیں گی ہاں! تقوائے الٰہی، اندرونی مسئولیت کا احساس، خواہشات کے مقابلہ میں قیام، اور راستی و درستی، پاکی و حق و عدالت کا پابند ہونا، صرف یہی چیزیں انسانی قدروں کا معیار ہیں۔ نہ کہ ان کی غیر اگرچہ موجودہ معاشروں کے پریشان حال بازار میں یہ اصل قدریں بھلا دی گئی ہیں اور جھوٹی قدروں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔

زمانۂ جاہلیت کی قدروں کے نظام میں، جو آباؤ اجداد، مال و دولت اور اولاد پر فخر کرنے کے محور پر چکر لگاتا تھا، ایک مٹھی بھر چور اور ڈاکو پرورش پاتے تھے، لیکن اس نظام کے بدل جانے سے اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی بلند و بالا اصل کے احیاء سے، سلمان و ابوذر و عمار یاسر و مقداد جیسے انسان حاصل ہوئے۔

انسانی معاشروں کے انقلاب میں اہم چیز ان کی قدروں کے نظام کا انقلاب ہے اور اس اصل اصیل اسلامی کا احیاء ہے۔ ہم اس گفتگو کو پیغمبر گرامی اسلام کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ جس میں آپؐ نے فرمایا:

کلکم بنو آدم، و آدم خلق من تراب، ولینتهین قوم یفخرون بآبائهم او لیکونن اهون علی اللہ من الجعلان،

"تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، آباؤ اجداد کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرنے سے پرہیز کرو، ورنہ تم خدا کے نزدیک ان حشرات اور کیڑے مکوڑوں سے، جو گندگی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، زیادہ حقیر اور پست ہو جاؤ گے۔" [2]

---

[1] "صحیح مسلم" (مطابق نقل فی ظلال جلد ۷، ص ۵۲۸۔

[2] "فی ظلال" جلد ۷، ص ۵۲۸۔

۲۔ تقویٰ کی حقیقت

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن نے تقویٰ کو عظیم ترین امتیاز قرار دیا ہے اور صرف اسی کو انسانوں کی قدر و منزلت کے ناپنے کا معیار سمجھا ہے۔

ایک دوسری جگہ تقویٰ کو بہترین زاد راہ اور توشہ شمار کیا ہے اور کہتا ہے "وتزودوا فان خیر الزاد التقوٰی"

(بقرہ - ۱۹۷)

ایک اور جگہ تقویٰ کے لباس کو انسان کے لیے بہترین لباس شمار کرتا ہے، : ولباس التقوٰی ذالک خیر"

(اعراف - ۲۶)

متعدد آیات میں، انبیاء کی دعوت کے ابتدائی اصولوں میں سے ایک کو "تقویٰ" کہا ہے، اور آخر میں ایک اور جگہ اس موضوع کی اہمیت کو اس حد تک اوپر لے گیا ہے کہ خدا کو "اصل تقویٰ" شمار کرتے ہوئے کہتا ہے، : ھو اھل التقوٰی و اھل المغفرۃ : (مدثر - ۵۶)

قرآن تقویٰ کو نور الٰہی سمجھتا ہے کہ جہاں وہ راسخ ہو جائے علم و دانش کی تخلیق کرتا ہے : "واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ"

(بقرہ - ۲۸۲)

اور "نیکی" و "تقویٰ" کو ایک دوسرے کا قرین شمار کرتا ہے: وتعاونوا علی البر والتقوٰی" (مائدہ - ۲)

اور عدالت کو تقویٰ "کا قرین کہتا ہے: اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی۔ (مائدہ - ۸)

اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس عظیم معنوی سرمایے اور اس عظیم ترین انسانی افتخار یعنی تقویٰ کی ان تمام امتیازات کے ساتھ حقیقت کیا ہے؟

قرآن نے کچھ ایسے اشارے بیان کیے ہیں جو تقویٰ کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں، متعدد آیات میں "تقویٰ" کی جگہ "قلب" کو شمار کیا ہے، ان میں ایک جگہ کہتا ہے،

"اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوٰی" وہ لوگ جو رسول خدا کے سامنے اپنی آوازیں دھیمی رکھتے ہیں اور ادب کی رعایت کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں کا تقویٰ کے قبول کرنے کے لیے خدا نے امتحان لے لیا ہے۔

(حجرات - ۳)

قرآن نے "تقویٰ کو" فجور" کا مقابل قرار دیا ہے جیسا کہ سورۂ شمس کی آیہ ۸ میں بیان ہوا: فالھمھا فجورھا و تقواھا : خدا نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کو فجور اور تقویٰ کی راہ دکھادی۔

قرآن ہر اس عمل کو، جس نے روح اخلاص و ایمان یعنی نیک و پاکیزہ نیت سے سرچشمہ حاصل کیا ہو، تقویٰ کی بنیاد پر شمار کرتا ہے جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۸ میں مسجد "قبا" کے بارے جس کے مقابلہ میں مسجد ضرار بنائی گئی تھی۔ فرماتا ہے:

"لمسجد اسس علی التقوٰی من اول یوم احق ان تقوم فیہ" وہ مسجد جو پہلے دن سے ہی تقویٰ کی بنیاد

پر مبنی ہے، زیادہ حق رکھتی ہے کہ تو اسی میں نماز پڑھے "

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ "تقویٰ" وہی مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ہے، جو دل میں ایمان کے راسخ ہو جانے کے بعد انسانی وجود پر حکومت کرتا ہے اور اس کو "فسق و فجور" اور گناہ سے باز رکھتا ہے اور نیکی و پاکی و عدالت کی طرف دعوت دیتا ہے، انسان کے اعمال کو خالص اور اس کی فکر و نیت کو آلودگیوں سے صاف کرتا ہے۔

جب ہم اس لفظ کی لغوی اصل و بنیاد کی طرف لوٹتے ہیں، تو پھر بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کیونکہ "تقویٰ" "وقایۃ" سے کسی چیز کی حفاظت و نگہداری میں کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور اس قسم کے مواقع پر مراد، روح و جان کی ہر قسم کی آلودگی سے حفاظت، اور ایسے امور میں جن میں خدا کی رضا ہو اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر لانا ہے۔

بعض بزرگوں نے تقویٰ کے لیے تین مراحل بیان کیے۔

۱۔ صحیح اعتقادات کی تحصیل کے ذریعہ عذاب جاودانی سے نفس کو محفوظ رکھنا۔

۲۔ ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرنا چاہے وہ ترک واجب ہو یا فعل معصیت۔

۳۔ اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانا جو انسان کے دل کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے، اور حق سے منحرف کرتی ہے، اور یہ خواص بلکہ خاص الخاص لوگوں کا تقویٰ ہے۔[1]

امیر المومنین علی علیہ السلام نے (نہج البلاغہ) میں تقویٰ کے سلسلہ میں کئی منہ بولتی اور زندہ تعبیریں بیان فرمائی ہیں۔ اور تقویٰ ان مسائل میں سے ہے جس میں حضرت کے بہت سے خطبوں، خطوط اور کلمات قصار میں تکیہ ہوا ہے۔

ایک جگہ تقویٰ کا گناہ اور آلودگی سے موازنہ کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں:

" الا وان الخطایا خیل شمس حمل علیها اهلها، وخلعت لجمها، فتقحمت بهم فی النار! الا وان التقوی مطایا ذلل حمل علیها اهلها، واعطوا ازمتها، فاوردتهم الجنة "[2]

" جان لو کہ گناہ سرکش سواریوں کے مانند ہیں، جن پر گنہگار سوار ہوتے ہیں اور جن کی لگامیں ٹوٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور وہ ان کو قعر جہنم میں لے جا کر سر کے بل پٹک دیتی ہیں لیکن تقویٰ ایسی آرام دہ اور سبک رفتار سواری ہے جن کے مالک ان پر سوار ہوتے ہیں، تو ان کی لگامیں ہاتھ میں لیے ہوتے ہیں، اور وہ انھیں بہشت کے وسط میں لے جا کر داخل کر دیتی ہے "[3]

اس لطیف تشبیہ کے مطابق، تقویٰ وہی اپنے آپ کو بچائے، نفس پر کنٹرول کرنے، اور شہوات پر تسلط کی حالت ہے۔ درحالیکہ تقویٰ کا نہ ہونا، سرکش شہوات کے مقابلہ میں سر تسلیم خم ہونا، اور ان پر ہر قسم کے کنٹرول کا ختم ہو جانا ہے۔

ایک اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار جلد ۷، صفحہ ۱۳۶۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

" اعلموا عباد الله ان التقوى دار حصن عزيز ، والفجور دار حصن ذليل ، لا يمنع اهله ، ولا يحرز من لجأ اليه ، الا وبالتقوى تقطع حمة الخطايا "

"اے بندگانِ خدا ، جان لو کہ تقویٰ ایک مستحکم اور شکست ناپذیر قلعہ ہے ، لیکن فسق و فجور اور گناہ ایک کمزور اور بے دفاع حصار ہے ، جو اپنے اہل کو آفات و بلیات سے نجات نہیں دیتا ، اور جو شخص اس کی پناہ لے گا وہ امان میں نہیں ہے ۔ جان لو کہ انسان صرف تقویٰ کے ذریعہ ہی گناہ کی گزند سے بچ سکتا ہے"[1]

ایک اور مقام پر مزید فرماتے ہیں ۔

" فاعتصموا بتقوى الله فان لها حبلا وثيقا عروته ومعقلا منيعا ذروته "

" تقوائے الٰہی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو کیونکہ وہ ایک محکم رشتہ اور عروۃ الوثقیٰ ہے ، اور ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ ہے ۔"[2]

ان تعبیرات کے مجموعہ سے تقویٰ کی حقیقت اور رُوح اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے ۔

یہ نکتہ بھی یاد آوری کے لائق ہے کہ تقویٰ ایمان کے درخت کا پھل ہے ، اور اسی بنا پر اس عظیم سرمائے کو حاصل کرنے کے لیے ایمان کی بنیادوں کو محکم بنانا چاہیئے ۔

البتہ اطاعت پر عمل درآمد اور گناہ سے پرہیز ، اور اخلاق پر دگراموں پر توجہ ، تقویٰ کو نفس میں راسخ کرتی ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی رُوح اور جان میں نورِ یقین اور ایمانِ شہودی کا پیدا ہونا ہے اور نور " تقویٰ " جتنا بڑھتا جاتا ہے ، اتنا ہی نور " یقین " بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے ، لہٰذا ہم اسلامی روایات میں دیکھتے ہیں کہ " تقویٰ " کو " ایمان " سے ایک درجہ بلند ، اور " یقین " سے ایک درجہ نیچے شمار کیا جاتا ہے ۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ فرماتے ہیں :

" الايمان فوق الاسلام بدرجة ، والتقوى فوق الايمان بدرجة ، واليقين فوق التقوى بدرجة ، وما قسم في الناس شيء اقل من اليقين "

" ایمان اسلام سے ایک درجہ بلند ہے ، اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ اُونچا ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ اونچا ہے اور لوگوں کے درمیان کوئی چیز " یقین " جتنی کم تقسیم نہیں ہوتی "[3]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۷ ۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ ۔

[3] بحار الانوار جلد ۷۰ ، ص ۱۳۶ ۔

ہم اس بحث کو ان معروف اشعار کے ساتھ، جو تقویٰ کی حقیقت کو ایک مثال کے ضمن میں واضح کرتے ہیں، ختم کرتے ہیں۔

خل الذنوب صغيرها وكبيرها فهو التقى
واصنع كماش فوق ار ض الشوك يحذر ما يرى
لا تحقرن صغيرة ان الجبال من الحصى

"تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دے، بس تقویٰ یہی ہے۔"
"اور اس شخص کی مانند ہو جا، جو کسی خارزار زمین سے گزر رہا ہے، اور اپنے لباس اور دامن کو اس طرح سمیٹتا ہے کہ کہیں اس میں کانٹا نہ چبھ جائے، اور ہمیشہ اپنے اطراف پر نظر رکھتا ہے۔"
"ہرگز کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھنا، کیونکہ بڑے بڑے پہاڑ چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے مل کر ہی بنتے ہیں۔"

۱۴۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۱۵۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○

ترجمہ

۱۴۔ بادیہ نشیں عربوں نے کہا: ہم ایمان لائے ہیں، کہہ دے! تم ایمان نہیں لائے ہو لیکن تم یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے، اور ابھی تک ایمان تو تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا، اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمھارے اعمال کی پوری پوری جزا دے گا، بیشک خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۵۔ واقعی مومن تو صرف وہی لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں نے کبھی شک نہیں کیا اور اپنی جان اور مالوں کے ساتھ انھوں نے جہاد کیا ہے اور وہی سچے ہیں۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شان نزول بیان کی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے،

قبیلۂ بنی اسد کا ایک گروہ، قحط اور خشک سالی کے ایک سال میں، مدینہ میں وارد ہوا، اور انھوں نے پیغمبرؐ سے کچھ مدد حاصل کرنے کے لیے زبان پر شہادتیں جاری کیں، اور پیغمبرؐ سے کہا کہ عرب کے دوسرے قبائل نے سواریوں پر سوار ہو کر آپؐ سے جنگ کی لیکن ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپؐ کے پاس آئے ہیں اور ہم نے آپؐ سے کوئی جنگ نہیں کی، دراصل وہ اس طریقہ سے یہ چاہتے تھے کہ پیغمبرؐ پر احسان جتلائیں، اس وقت اُوپر والی آیات نازل ہوئیں، (اور انھیں بتایا کہ ان کا اسلام ظاہری ہے اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر وہ ایمان لائے بھی ہیں، تو اس سے پیغمبرؐ پر کوئی منت اور احسان نہیں رکھنا چاہیے بلکہ خدا نے ان پر احسان کیا ہے کہ انھیں ہدایت کی ہے) [1]

لیکن اس شانِ نزول کا وجود — دوسرے تمام مواقع کی طرح — آیت کے مفہوم کی عمومیت سے ہرگز مانع نہیں ہے۔

تفسیر

"اسلام" اور "ایمان" کا فرق

گذشتہ آیات میں انسانوں کی قدر و قیمت کے معیار یعنی تقویٰ کے بارے میں گفتگو تھی، اور چونکہ "تقویٰ" ایمان کے درخت کا پھل ہے، وہ بھی وہ ایمان جو دل و جان کی گہرائیوں میں نفوذ کرے، لہٰذا زیر بحث آیات میں "ایمان" کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے اس طرح بیان ہوا۔

بادیہ نشین اعراب نے کہا: ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دے: تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، لیکن ایمان تو ابھی تک تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا ہے۔ (قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم)۔

اس آیت کے مطابق "اسلام" اور "ایمان" میں فرق یہ ہے، کہ "اسلام" ایک ظاہری قانونی شکل رکھتا ہے۔ اور جو شخص زبان پر شہادتیں جاری کرتا ہے، مسلمانوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے، اور اس پر اسلام کے احکام جاری ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایمان ایک واقعی اور باطنی امر ہے، اور اس کی جگہ انسان کا دل ہے، نہ کہ اس کی زبان اور اس کا ظاہر۔

ممکن ہے "اسلام" کے مختلف محرکات ہوں، یہاں تک کہ مادی محرکات اور شخصی منافع، لیکن "ایمان"، حتمی طور پر معنوی محرکات سے علم و آگاہی سے غذا حاصل کرتا ہے، اور وہی ہے کہ جس کی شاخوں پر تقویٰ کا حیات بخش پھل ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے جو پیغمبرِ گرامی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ایک واضح اور ناطق عبارت میں منقول ہوئی ہے:

الاسلام علانیۃ، والایمان فی القلب؛

"اسلام ایک آشکار اور ظاہری چیز ہے، لیکن ایمان کی جگہ دل ہے"۔ [2]

---

[1] "تفسیر المیزان" و "روح البیان" اور "فی ظلال" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۲۸۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔

"الاسلام یحقن بہ الدم و تؤدی بہ الامانۃ، وتستحل بہ الفروج، والثواب علی الایمان۔

"اسلام کے ساتھ انسان کا خون محفوظ، اس کی امانت کا ادا کرنا ضروری، اور اس سے شادی بیاہ حلال ہوتا ہے۔ لیکن ثواب ایمان پر ملتا ہے۔ [1]

نیز اسی دلیل کی بنا پر بعض روایات میں اسلام کا مفہوم اقرار لفظی میں منحصر سمجھا گیا ہے، جبکہ ایمان کا عمل کے ساتھ اقرار کی صورت میں تعارف کرایا گیا ہے: (الایمان اقرار وعمل، والاسلام اقرار بلا عمل) [2]

یہی معنی ایک دوسری تعبیر میں "اسلام و ایمان" کی بحث میں بیان ہوئے ہیں: "فضیل بن یسار کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے سنا ہے، آپؑ نے فرمایا۔

"ان الایمان یشارك الاسلام، ولا یشارکہ الاسلام، ان الایمان ما وقر فی القلوب، والاسلام ما علیہ المناکح والمواریث وحقن الدماء،

"ایمان تو اسلام کے ساتھ شریک ہے، لیکن اسلام ایمان کے ساتھ شریک نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں ہر مومن مسلمان ہے، لیکن ہر مسلمان مومن نہیں ہے، ایمان وہ ہے جو دل میں ساکن ہو، لیکن اسلام ایک ایسی چیز ہے جس کے مطابق نکاح، میراث اور خون کی حفاظت کے قوانین جاری ہوتے ہیں۔ [3]

لیکن مفہوم کا یہ فرق اس صورت میں ہے جب یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مقابلہ میں قرار پائیں، لیکن جب الگ الگ بیان کیے جائیں، تو ممکن ہے کہ اسلام اسی چیز پر بولا جائے، جس پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے، یعنی دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے بعد زیر بحث آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے، "اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں تمہارے اعمال کا ثواب کامل طور پر عطا کرے گا اور تمہارے اعمال کی جزا میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، (وان تطیعوا اللہ ورسولہ لا یلتکم من اعمالکم شیئا)۔

"کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے" (ان اللہ غفور رحیم)۔

"لا یلتکم" "لیت" (بروزن ریب) کے مادہ سے حق کو کم کرنے کے معنی میں ہے۔ [4]

---

[1] "کافی" جلد ۲ "باب ان الاسلام یحقن بہ الدم" حدیث ۲۰۱۔

[2] "کافی" جلد ۲ "باب ان الاسلام یحقن بہ الدم" حدیث ۲۰۱۔

[3] اصول کافی جلد ۲ "باب ان الایمان یشرك الاسلام" حدیث ۳۔

[4] اس بنا پر مذکورہ فعل اجوف یائی ہے، اگر "ولت" (مثال وادی) کا مادہ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔

آخری جملے حقیقت میں ایک مسلم قرآنی اصل کی طرف اشارہ ہیں، کہ اعمال کے قبول ہونے کی شرط "ایمان" ہے، کہتا ہے، اگر تم خدا اور رسول پر قلبی ایمان رکھتے ہو، جس کی نشانی خدا اور اس کے رسول کے فرمان کی اطاعت ہے تو تمہارے اعمال کی قدر کی جائے گی، اور خدا تمہاری چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی قبول کرے گا، اور ان کا اجر دے گا، یہاں تک کہ اس ایمان کی برکت سے وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اور چونکہ اس امر (باطنی یعنی ایمان کا حصول کوئی آسان کام نہیں ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں اس کی نشانیاں پیش کرتا ہے، ایسی نشانیاں جو مومن کو، مسلم سے، اور سچے کو جھوٹے سے، اور پیغمبر کی دعوت کو عاشقانہ طور پر قبول کرنے والوں کو، جان کی حفاظت یا مال دنیا کے حصول کی خاطر ایمان کا اظہار کرنے والوں سے، اچھی طرح سے جدا کر دیتی ہیں، فرماتا ہے:

"واقعی مومنین وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، اس کے بعد انھوں نے کبھی کوئی شک و شبہ نہیں کیا اور اپنے اموال اور نفسوں کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیا ہے" (انما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ)۔

ہاں! ایمان کی سب سے پہلی نشانی، اسلام کی راہ میں شک و شبہ اور دودلی نہ کرنا ہے، دوسری نشانی اموال کے ساتھ جہاد کرنا، اور تیسری نشانی جو سب سے زیادہ افضل ہے دو برتر ہے، نفسوں (جانوں) کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

اس طرح اسلام نے واضح ترین نشانیاں بیان کر دی ہیں، قیام و ثبات قدم، اور شک و تردید ایک طرف سے، اور مال و جان کی قربانی دوسری طرف سے۔

کیسے ممکن ہے کہ ایمان دل میں راسخ نہ ہو، جبکہ انسان محبوب کی راہ میں مال و جان کے خرچ کرنے سے مضائقہ نہیں کرتا۔

لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "اسی قسم کے لوگ راست گو ہیں، اور ایمان کی روح ان کے وجود میں موجزن ہے" (اولئک ھم الصادقون)۔

اس معیار کو، جسے قرآن نے "سچے مومنین" اور "اسلام کا اظہار کرنے والے" جھوٹوں کی شناخت کے لیے بیان کیا ہے، قبیلہ "بنی اسد" کے فقراء میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ہر زمانہ کے لیے واقعی مومنین کو جھوٹے دعویداروں سے جدا کرنے کے لیے، اور ان لوگوں کے دعووں کی قدر و قیمت کی نشاندہی کرنے کے لیے، جو ہر جگہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، اور اپنے آپ کو پیغمبر کا طلب گار سمجھتے ہیں، لیکن ان کے عمل میں معمولی سے معمولی نشانی بھی ایمان و اسلام کی نظر نہیں آتی۔

ان کے مقابلہ میں ایسے لوگ ہیں جو نہ صرف کوئی دعویٰ نہیں رکھتے، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو کم تر شمار کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایثار و قربانی کے میدان میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اور اگر ہم اس قرآنی معیار کو واقعی مومنین کی جانچ کے لیے استعمال کریں تو معلوم نہیں لاکھوں کروڑوں مدعیان اسلام کے انبوہ کے درمیان میں سے کس قدر واقعی مومن نکلیں، اور کس قدر ظاہری مسلمان؟!

۱۶۔ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

۱۷۔ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۱۸۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۔ کہہ دے کیا تم خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کر رہے ہو، حالانکہ وہ ان تمام چیزوں کو، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں جانتا ہے، اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

۱۷۔ وہ تجھ پر یہ احسان جتا رہے ہیں، کہ وہ اسلام لے آئے ہیں کہہ دے، تم اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ جتلاؤ، بلکہ یہ تو خدا نے تم پر احسان کیا ہے کہ تمھیں ایمان کی طرف ہدایت کی ہے، اگر تم (ایمان کے دعوے میں) سچے ہو۔

۱۸۔ خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو، اس کو بھی دیکھ رہا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ گزشتہ آیات کے نزول کے بعد بدو عربوں کا ایک گروہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور

قسم کھا کر کہنے لگے کہ وہ ایمان کے دعوے میں سچے ہیں، اور ان کا ظاہر و باطن ایک ہے، اس پر پہلی زیر بحث آیت نازل ہوئی، اور انھیں آگاہ کیا کہ قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے خدا سب کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔[1]

❊ ❊ ❊

تفسیر

مسلمان ہونے کا احسان مت جتلاؤ

گذشتہ آیات میں سچے مسلمانوں کی نشانیاں بیان ہوئی تھیں — اور جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہوا ہے — اسلام کا دعویٰ رکھنے والی جماعت کا اصرار یہ تھا کہ ایمان کی حقیقت ان کے دل میں مستقر ہے۔ قرآن ان کے لیے بھی اور ان تمام افراد کے لیے بھی جو اُن ہی جیسے ہیں یہ اعلان کر رہا ہے، کہ اصرار کرنے اور قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ "ایمان" و "کفر" کے مسئلہ میں تمھارا اس خدا کے ساتھ واسطہ ہے جو ہر چیز سے باخبر ہے، خصوصاً اس آیت میں عتاب آمیز لہجہ میں کہتا ہے، "ان سے کہہ دے، کیا تم خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کرنا چاہتے ہو، وہ ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، جانتا ہے" (قل اتعلمون اللہ بدینکم واللہ یعلم ما فی السماوٰت وما فی الارض)۔

اور زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے، "خدا ہر چیز سے آگاہ ہے" (واللہ بکل شیء علیم)۔

اس کی ذات مقدس عین علم ہے، اور اس کا علم اس کا عین ذات ہے، اور اسی بنا پر اس کا علم ازلی و ابدی ہے۔

اس کی پاک ذات ہر جگہ حاضر و موجود ہے، اور تمھاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، وہ تو انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، ان حالات میں تمھارے ادعا کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سچوں کو اور جھوٹے دعویٰ کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کی دل و جان کی گہرائیوں سے واقف ہے، یہاں تک کہ ان کے ایمان کی شدت و ضعف کے درجات بھی جو بعض اوقات خود اُن سے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں، اس کے نزدیک واضح و روشن ہیں، ان حالات میں خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کرنے پر اصرار کیوں کرتے ہو؟

❊ ❊ ❊

اس کے بعد پھر دوبارہ بدو عربوں کی گفتگو کی طرف لوٹتا ہے جو اپنے اسلام لانے کو پیغمبر پر احسان جتانے کے لیے کہتے تھے: ہم تو آپ کے پاس تسلیم کے دروازے سے آئے ہیں، جبکہ بہت سے قبائل عرب جنگ کے دروازے سے آئے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: "وہ تجھ پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ہیں" (یمنون علیک

---

[1] "مجمع البیان"، "المیزان"، "روح البیان" و "تفسیر قرطبی"۔

ان اسلموا)۔

"ان سے کہہ دے اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ رکھو" (قل لا تمنوا علیّ اسلامکم)۔

"بلکہ یہ تو خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی طرف ہدایت کی، اگر تم ایمان کے دعوے میں سچے ہو" (بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان ان کنتم صادقین)۔

"منّت"۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں "من" کے مادہ سے، ایک خاص وزن کے معنی میں ہے، جس سے چیزوں کو وزن کرتے ہیں، اس کے بعد ہر وزنی اور گراں قدر نعمت پر اس کا اطلاق ہونے لگا، منت کی دو قسمیں ہیں، اگر اس میں عملی پہلو ہو (گرانقدر نعمت کے عطا کرنے کے معنی میں) تو ممدوح ہے اور خدا کی منتیں اس قسم کی ہیں، لیکن اگر اس میں لفظی پہلو ہو، جیسا کہ بہت سے انسانوں کے احسان، تو یہ ایک قبیح اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلے جملہ میں کہتا ہے: وہ تجھ پر یہ احسان رکھتے ہیں، کہ انہوں نے اسلام کو قبول کیا ہے، اور یہ اس بات پر ایک دوسری تاکید ہے کہ وہ ایمان کے دعوے میں سچے نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے ظاہری طور پر اسلام کو قبول کیا ہے۔

لیکن آیت کے ذیل میں کہتا ہے "اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو یہ خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی طرف ہدایت کی۔

بہر حال یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ عام طور پر کوتاہ فکر افراد یہ تصور کرتے ہیں، کہ ایمان کو قبول کرنے، اور عبادات و اطاعات انجام دینے سے انہوں نے قدس الٰہی میں، یا اس کے پیغمبرؐ یا اولیاء کی بارگاہ میں کوئی خدمت کی ہے، اور اسی وجہ سے اجر و پاداش کی امید رکھتے ہیں۔

حالانکہ اگر کسی کے دل میں نورِ ایمان چمکنے لگے، اور یہ توفیق اسے نصیب ہو جائے، کہ وہ مومنین کے زمرہ میں شمار ہونے لگے، تو سمجھ لو عظیم ترین لطف الٰہی اس کے شاملِ حال ہوا ہے۔

"ایمان" ہر چیز سے پہلے عالم ہستی کے بارے میں انسان کو ایک نیا ادراک دیتا ہے، وہ خود خواہی اور غرور کے حجاب اور پردوں کو دور کر دیتا ہے، انسان کی نظر کے افق کو وسیع کرتا ہے۔ اور اس کی نظر میں عالمِ خلقت کے بے نظیر شکوہ اور عظمت کو مجسم کر دیتا ہے۔

اس کے بعد اس کے عواطف پر نور اور روشنی چھڑک کر ان کی پرورش کرتا ہے، اور انسان کی عظیم اور بلند و بالا اقدار کو اس میں زندہ کرتا ہے، اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اس میں بڑھاتا ہے، اسے علم و قدرت، شہامت و شجاعت، ایثار و قربانی، عفو و درگزر اور اخلاص سے مالا مال کر دیتا ہے، اور ایک ضعیف انسانی موجود کو ایک قوی و پُرثمر انسان بنا دیتا ہے۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر مدارج کمال تک اُسے اُوپر لے جاتا ہے، اور اُسے افتخار کی انتہائی بلندی تک پہنچا دیتا ہے، اس کو عالم ہستی کے قوانین سے ہم آہنگ، اور عالم ہستی کو اس کے لیے مسخر قرار دیتا ہے۔

تو اب کیا یہ وہ نعمت ہے جو خدا نے انسان کو عطا کی ہے، یا یہ وہ منّت و احسان ہے، جو انسان خدا کے پیغمبرؐ پر جتلا رہا ہے؟

اسی طرح عبادات واطاعات میں سے ہر ایک تکامل وارتقاء کی طرف ایک قدم ہے : یہ قلب کو صفا بخشتا ہے، شہوات پر کنٹرول کرتا ہے، رُوح اخلاص کو تقویت دیتا ہے ، اور اسلامی معاشرے کو وحدت اتحاد، قوت اور عظمت عطا کرتا ہے)

ان میں سے ہر ایک ، ایک عظیم تربیتی کلاس ہے ، اور ایک اصلاحی درس ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں انسان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ہر صبح شام نعمت ایمان کا شکر بجالائے ، اور ہر نماز اور ہر عبادت کے بعد سر سجدہ میں رکھے ، اور خدا کی اس ساری توفیق پر شکر ادا کرے۔

اگر خدا پر ایمان اور اس کی اطاعت کے بارے میں انسان کی نظر اور سوچ اس قسم کی ہو تو پھر نہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو "طلبگار" نہیں سمجھتا ، بلکہ ہمیشہ خدا و پیغمبرؐ کا "مدیون" (مقروض) اور خود کو احسانوں تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے۔

عبادات کو عاشقانہ انجام دیتا ہے ، اور اس کی اطاعت کی راہ میں نہ صرف پاؤں کے ساتھ بلکہ سر کے بل دوڑتا ہے اور اگر خدا اس کے اس عمل کی کوئی جزاء دیتا ہے تو وہ اس کو بھی اس کا ایک دوسرا لطف وکرم سمجھتا ہے ، ورنہ نیک کاموں کے انجام دینے کا فائدہ تو خود انسان ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اور درحقیقت اس توفیق کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے اس کے قرضوں کی میزان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اس بناء پر اس کی ہدایت لطف ہے ، اور اس کے پیغمبرؐ کی دعوت ایک اور لطف ہے ، اور اطاعت وفرمانبرداری کی توفیق ایک مزید لطف ، اور اجر وثواب ایک اور لطف بالائے لطف ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ، جو سورہ "حجرات" کا اختتام ہے ، دوبارہ اسی چیز کی جو گذشتہ آیت میں آئی ہے ، تاکید کرتا ہے ، اور فرماتا ہے : "خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے اور جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو۔ انھیں دیکھتا ہے" (ان اللہ یعلم غیب السماوات والارض واللہ بصیر بما تعملون)۔

تم اس بات پر اصرار نہ کرو کہ تم حتمی اور یقینی طور پر مؤمن ہو ، اور قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ، وہ تمہارے دل کے زاویوں اور گوشوں کی خبر رکھتا ہے ، اور جو کچھ اس میں گزرتا ہے ، وہ اس سے مکمل طور پر آگاہ ہے ، وہ زمین کی گہرائیوں اور اعماق کے اسرار اور آسمانوں کے غیوب سے آگاہ ہے ، اس بناء پر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر سے بے خبر ہو؟

خداوندا ! تو نے ہم پر احسان کیا ہے ، اور ہمارے دل میں ایمان کا نور روشن کیا ہے ، تجھے ہدایت کی عظیم نعمت کی قسم ، ہمیں اس راستہ پر ثابت قدم رکھ ، اور تکامل وارتقاء کی راہ میں ہماری رہبری فرما۔

خداوندا ! تو ہمارے دل کی گہرائیوں سے آگاہ ہے ، ہماری نیتوں کو اچھی طرح جانتا ہے ، ہمارے عیوب کو اپنے بندوں سے پوشیدہ رکھ ، اور اپنے فضل وکرم سے ہماری اصلاح فرما۔

بار الٰہا ! ہمیں توفیق اور ایسی قدرت عطا فرما کہ ہم ان عظیم اخلاقی قدروں کو جو تو نے اس پر عظمت سورہ میں بیان فرمائی ہیں ، اپنے وجود کے اندر زندہ کریں ، اور ان کے احترام کی پاسداری کریں۔

آمین یا رب العالمین!

سُورۂ "قٓ"

یہ سُورہ "مکّہ" میں نازل ہوا
اور
اس کی ۴۵ آیات ہیں

دوم محرم الحرام ۱۴۰۶

سورۂ "ق"
کے
مطالب و مضامین

اس سورہ کے مباحث کا محور مسئلہ "معاد" ہے، اور تقریباً اس کی تمام آیات اسی محور کے گرد گھومتی ہیں، اور اس میں دوسرے مسائل ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔

معاد سے مربوط مسائل میں امورِ ذیل بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ کفار کا مسئلہ معاد سے انکار اور تعجب (معاد جسمانی سے)۔

۲۔ مسئلہ معاد پر نظامِ آفرینش کی طرف توجہ دلانے کے طریق سے استدلال، خصوصاً مردہ زمینوں کا بارش کے نزول کے ذریعہ احیاء۔

۳۔ مسئلہ معاد پر پہلی خلقت کی طرف توجہ دلانے کے طریقہ سے استدلال۔

۴۔ "یوم الحساب" کے لیے ثبت اعمال کے مسئلہ کی طرف اشارہ اور اس کے لیے اقوال۔

۵۔ موت سے مربوط مسائل، اور اس جہان سے دوسرے گھر کی طرف انتقال،

۶۔ روزِ قیامت کے حوادث کا ایک گوشہ، اور جنت و دوزخ کے اوصاف۔

۷۔ اختتام جہان کے بپا دینے والے حوادث کی طرف اشارہ، جو دوسرے جہان کے لیے ایک سرآغاز ہیں۔

اس کے ضمن میں گذشتہ اقوام کی وضع و کیفیت ان کی دردناک اور شوم سرنوشت کی طرف مختصر اور مؤثر اشارے ہیں۔ (جیسے قوم فرعون، عاد، لوط، شعیب اور تبع کی سرنوشت) نیز خدا کی طرف توجہ اور اس کے ذکر کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام کو کچھ احکام دیئے گئے ہیں، اور سورہ کے آغاز اور اختتام پر عظمت قرآن کے بارے میں ایک مختصر سا اشارہ کیا گیا ہے۔

سورہ "ق" کی تلاوت کی فضیلت

روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس سورہ کو بہت اہمیت دیتے تھے، یہاں تک کہ ہر جمعہ کے دن نماز

جمعہ کے خطبہ میں اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔[1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے، کہ آپ ہر عید اور ہر جمعہ کے دن اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے،[2]

یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ جمعہ اور عید کا دن، انسانوں کی بیداری اور آگاہی کا دن ہے، یہ پہلی فطرت کی طرف لوٹنے، اور خدا اور یوم الحساب کی طرف توجہ کرنے کا دن ہے، اور چونکہ اس سورہ کی آیات، مسئلہ معاد، موت اور قیامت کے حوادث کو بہت ہی مؤثر طریقہ سے بیان کرتی ہیں، علاوہ ازیں مسائل پر غور و فکر کرنا انسانوں کی بیداری اور تربیت میں عمیق اور گہری تاثیر رکھتا ہے، لہٰذا آنحضرتؐ اس پر خاص توجہ فرماتے تھے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

من قرأ سورة "ق" هون الله عليه تارات الموت وسكراته،

"جو شخص سورۂ "ق" کی تلاوت کرے گا، خداوند عالم اس پر موت کی مشکلات اور سکرات کو آسان کردے گا"[3]

نیز ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:[4]

"من ادمن فی فرائضه ونوافله سورة "ق" وسع الله فی رزقه واعطاه كتابه بيمينه وحاسبه حساباً يسيراً:

"جو شخص ہمیشہ واجب اور مستحب نمازوں میں سورۂ ق کی تلاوت کرتا رہے گا، خدا اس کی روزی میں وسعت پیدا کردے گا اور اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا۔ اور قیامت میں اس کا حساب کتاب آسان کردے گا"[5]

یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے، کہ یہ سب افتخار و فضیلت صرف الفاظ کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کا پڑھنا تو افکار و نظریات کے بیدار ہونے کا وسیلہ ہے اور وہ عمل صالح اور سورہ کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگی کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

---

[1] "تفسیر قرطبی" جلد ۹ ص ۶۱۷۱۔

[2] "تفسیر فی ظلال" جلد ۶ ص ۳۵۷۔

[3] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۴۰

[4] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۴۰

سورۂ "ق"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱- قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ ○

۲- بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ○

۳- ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ○

۴- قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ○

۵- بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱- ق ، قرآن مجید کی قسم۔

۲- انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ انہیں کے درمیان میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر آیا ہے، اور کافروں نے یہ کہا، : یہ تو ایک عجب چیز ہے۔

۳- کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے، تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بازگشت تو بہت ہی بعید ہے۔

۴- لیکن ہم جانتے ہیں جو کچھ زمین ان کے بدن میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس

وہ کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔

۵۔ جب حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی، لہٰذا وہ اپنے پراگندہ کام میں حیران و متحیر ہیں،

تفسیر

ہٹ دھرم منکرین اپنے کام میں سرگردان ہیں

یہاں پر ہمیں اس سُورہ کی ابتداء میں پھر بعض حروف مقطعہ کا سامنا ہے اور وہ حرف "ق" ہے، اور ـــ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ـــ حروف مقطعہ کی ایک قابل توجہ تفسیر یہ ہے ـــــــــــــــــــــــــــــــ

کہ قرآن اپنی عظمت کے باوجود "الف" "با" جیسے ایک عام مادہ سے بنا ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ قرآن مجید کا ایجاد کرنے والا اور نازل کرنے والا بے انتہا علم و قدرت کا مالک ہے، جس نے ان عام اور سادہ آلات سے اس قسم کی اعلیٰ ترکیب تخلیق کی ہے۔

البتہ حروف "مقطعات" کے لیے اور دوسری تفسیریں بھی ہیں، جن کا آپ سُورۂ "بقرہ"، "آلِ عمران"، "اعراف" اور "حٰم" کے سوروں کی ابتداء میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "ق" کو خدا کے بعض اسماء کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (جیسے "قادر" و "قیوم")

بہت سی تفسیروں میں یہ بھی بیان ہؤا ہے کہ "ق" ایک بہت بڑے پہاڑ کا نام ہے جو پورے کرۂ ارض کو محیط ہے اب یہ بات کہ یہ کونسا پہاڑ ہے جو کرۂ زمین یا سارے جہان کا احاطہ کیے ہُوئے ہے؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ یہاں اس پر بحث کا مقام نہیں ہے۔ اس جگہ ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ: یہاں "ق" کا "کوہ قاف" کی طرف اشارہ بہت بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ یہ بات اس سُورہ کے مباحث کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ یہاں حرف "ق" ان تمام دوسرے حروف مقطعہ کی طرح ہے جو قرآن کی سُورتوں کے ابتداء میں آئے ہیں، علاوہ ازیں اگر اس سے مراد "کوہ قاف" ہوتا، تو اسے "واؤ" قسم کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا "والطور" وغیرہ کی طرح سے، اور ایک لفظ کو ذکر نا بغیر مبتداء و خبر کے یا واؤ قسم کے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر تمام قرآنوں کا "رسم الخط" یہ ہے کہ "ق" مفرد صورت میں لکھا ہؤا ہے، حالانکہ "کوہ قاف" کو "قاف" کی صُورت میں لکھتے ہیں۔

منجملہ ان امور کے، جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں، کہ حروف مقطعات میں سے اس حرف کا ذکر، قرآن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، یہ ہے کہ اس کے بعد بلا فاصلہ قرآن مجید کی قسم کھاتے ہوئے فرماتا ہے:

"قسم ہے قرآن مجید کی" (والقرآن المجید)۔

"مجید" "مجد" کے مادہ سے "وسیع شرافت" کے معنی میں ہے، اور چونکہ قرآن بے انتہا عظمت و شرافت رکھتا ہے، لہٰذا اس کے لیے لفظ "مجید" ہر لحاظ سے سزاوار ہے۔ اس کا ظاہر زیبا اور خوبصورت ہے، اس کے مضامین و مطالب عظیم ہیں۔ اس کے احکام اعلیٰ ہیں اور اس کے پروگرام تربیتی اور حیات بخش ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ قسم کس مقصد کے لیے ذکر ہوئی ہے اور اصطلاح کے مطابق "مقسم لہ" کیا ہے؟ مفسرین نے بہت سے احتمالات دیئے ہیں، لیکن بعد والی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جواب قسم وہی پیغمبر اسلام کی "نبوت" یا موت کے بعد انسانوں کا دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا اور معاد کا مسئلہ ہے[1]

اس کے بعد کفار و مشرکین عرب کے چند بے بنیاد اعتراضات کو بیان کرتے ہوئے، ان میں سے دو اعتراضات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: "بلکہ انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ایک ڈرانے والا پیغمبر خود انھیں میں سے آیا ہے، کافروں نے کہا: یہ تو ایک عجیب چیز ہے" (بل عجبوا ان جاءھم منذر منھم فقال الکافرون ھذا شیء عجیب)۔

یہ ایک ایسا اعتراض ہے کہ قرآن نے بارہا اس کی طرف اور اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کو بار بار دھرانا، اور اس کی تکرار اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ یہ کفار کے اصل اور بنیادی اعتراضات میں سے تھا، جس کا وہ ہمیشہ تکرار کرتے تھے۔

نہ صرف پیغمبر اسلام پر بلکہ تمام پیغمبروں پر ان کا یہی اعتراض تھا، کبھی کہتے: "ان انتم الا بشر مثلنا تریدون ان تصدونا عما کان یعبد آباؤنا": "تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو اور یہ چاہتے ہو کہ ہمیں اس چیز سے جس کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کیا کرتے تھے، باز رکھو۔" (ابراہیم - ۱۰)

اور کبھی کہتے: "ما ھذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منہ ویشرب مما تشربون": "یہ تو تمہاری طرح ہی ایک بشر ہے، جو تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے، اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔" (مؤمنون - ۳۳)

اور کبھی اس بات کا اضافہ کرتے: "لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرا": "اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ ہو نازل ہوا۔ تاکہ وہ اس کے ساتھ مل کر ڈراتا؟"!

(فرقان - ۷)

---

[1] اور تفسیر میں اس طرح ہے: والقرآن المجید انک رسول اللہ۔ یا: ان البعث حق۔

لیکن یہ سب حق کو تسلیم نہ کرنے کے لیے بہانے تھے۔

قرآن زیر بحث آیت میں اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیتا، کیونکہ وہ اس کا بارہا جواب دے چکا ہے، کہ اگر بالفرض ہم کسی فرشتے کو بھی بھیج دیتے تو اس کو بھی بشر کی صورت میں بھیجتے، یعنی انسان کا رہبر و رہنما صرف انسان ہی ہو سکتا ہے، تاکہ وہ اس کے تمام دردوں، حاجتوں، میلانوں، خواہشوں اور مسائل زندگی سے باخبر ہو اور دوسری طرف سے عملی پہلوؤں سے وہ ان کے لیے نمونہ بن سکے اور وہ یہ نہ کہنے پائیں کہ اگر وہ ہمارا ہم جنس ہوتا تو کبھی بھی پاک و پاکیزہ نہ رہ سکتا، کیونکہ

قاضی ار با ما نشیند بر فشاند دست را
محتسب گر می خورد معذور دارد مست را

اگر قاضی ہمارے ساتھ بیٹھتا تو اپنے ہاتھ کو جھاڑتا رہتا، محتسب اگر شراب پی لیتا تو مست کو معذور سمجھتا۔

لہٰذا اس کے پروگرام صرف اسی کے لیے مفید ہیں نہ کہ نوع بشر کے لیے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس اعتراض کے بعد اور یہ کہ وہ کس طرح نوع بشر سے ہے؟ انہیں ایک دوسرا اعتراض جو پیغمبرؐ کی دعوت کے مضمون پر تھا، وہ ایک ایسے مسئلہ پر تھا جو ان کے لیے ہر لحاظ سے عجیب و غریب تھا، وہ کہتے تھے: "جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر زندہ ہو جائیں گے، جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ یہ بازگشت تو ایک بعید بات ہے" (ءاذا متنا وکنا ترابا ذالک رجع بعید)[1]

بہر حال وہ دوبارہ زندہ ہو جانے کو عقل سے دور ایک مسئلہ خیال کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو اسے محال سمجھتے تھے، اور اس کے ادعا کو کہنے والے کے جنون کی دلیل قرار دیتے تھے، جیسا کہ سورۂ سبا کی آیت ۷ و ۸ میں بیان ہوا ہے: وقال الذین کفروا ھل ندلکم علیٰ رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید افتریٰ علی اللہ کذبا ام بہ جنۃ: "کافروں نے کہا، آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی دکھائیں جو یہ کہتا ہے کہ جب ہم کامل طور سے منتشر اور پراگندہ ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ نئے سرے سے زندہ ہو کر لوٹ آئیں گے، کیا اس نے خدا پر بہتان باندھا ہے؟ یا اسے جنون ہو گیا ہے"؟!

صرف یہی ایک مقام نہیں ہے کہ جہاں انھوں نے پیغمبر اسلامؐ پر یہ اعتراض کیا، بلکہ انھوں نے بارہا یہی کہا، اور بارہا اس کا جواب سنا اور پھر ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اس کا تکرار کیا۔

بہر حال قرآن مجید یہاں چند ایک طریق سے اس کا جواب دیتا ہے۔

سب سے پہلے خدا کے غیر متناہی علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم جانتے ہیں جو کچھ زمین ان کے

---

[1] "اذا" کا جواب محذوف ہے اور وہ بعد والے جملے سے سمجھ میں آتا ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے: "ءاذا متنا وکنا ترابا نرجع وننزع حیا ذالک رجع بعید"۔

بدن میں سے کم کرے گی اور ہمارے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے " (قد علمنا ما تنقص الارض منھم وعندنا کتاب حفیظ)۔

اگر تمھارا اعتراض اس بنا پر ہے کہ انسان کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، اور اس کا گوشت مٹی ہو جائے گا، اور وہ زمین میں مل جائے گا اور اس کے ذرات، بخارات اور گیسوں میں تبدیل ہو کر، ہوا میں پھیل جائیں گے، تو انھیں کون اکٹھا کر سکتا ہے؟ اور اصلاً کون ایسا ہے جو ان سے باخبر ہو؟

تو اس کا جواب معلوم ہے، وہی خدا جس کا علم تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ ان تمام ذرات کو پہچانتا ہے اور بوقت ضرورت وہ ان سب کو اسی طرح سے جمع کرے گا جس طرح مٹی کے ایک ٹیلے کے درمیان سے مقناطیس کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ لوہے کے بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کیا جا سکتا ہے، ہر انسان کے پراگندہ ذرات کی جمع آوری خدا کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان ہے

اور اگر ان کا اعتراض یہ ہے، کہ انسان کے اعمال کا حساب کتاب معاد و قیامت کے لیے کون محفوظ رکھے گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب لوح محفوظ میں ثبت ہیں اور اصولی طور پر کوئی چیز اس عالم میں گم نہیں ہوتی یہاں تک کہ تمھارے اعمال بھی باقی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شکل بدل جاتی ہے۔

"کتاب حفیظ" اس کتاب کے معنی میں ہے جو تمام انسانوں اور ان کے غیر کے اعمال کی محافظ ہے، اور یہ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے، جس کی تشریح و تفصیل ہم سورۂ رعد کی آیت ۳۹ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔ (جلد ۱۰ تفسیر نمونہ)

اس کے بعد دوسرے جواب کی طرف رُخ کرتا ہے جو زیادہ تر نفسیاتی پہلو رکھتا ہے، کہتا ہے: "لیکن جب حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی" (بل کذبوا بالحق لما جاءھم)۔

یعنی وہ جان بوجھ کر حق کا انکار کرتے ہیں، ورنہ حق کے چہرے پر کوئی گرد و غبار نہیں ہے، اور جیسا کہ بعد والی آیات میں آئے گا۔ وہ اسی دُنیا میں خود اپنی آنکھوں سے بار بار معاد کا منظر دیکھتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کرتے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "چونکہ وہ ضلالت پر تلے ہوئے ہیں، لہٰذا ہمیشہ اُلٹی سیدھی ہانکتے ہیں، خود اپنے کام میں حیران ہیں اور اُلٹے پلٹے کاموں میں گرفتار ہیں" (فھم فی امر مریج)۔

کبھی وہ پیغمبرؐ کو مجنون کہتے ہیں، کبھی کاہن اور کبھی شاعر۔

کبھی کہتے ہیں: اس کی باتیں "اساطیر الاولین" گزشتہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

کبھی کہتے ہیں: "کوئی بشر اُسے تعلیم دیتا ہے"۔

کبھی اس کے کلمات کے نفوذ و اثر کو "جادو" کی ایک قسم کہتے ہیں اور کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی اس کے مانند آیات لا سکتے ہیں یہ اُلٹی سیدھی باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انھوں نے حق کو پہچان تو لیا ہے، لیکن بہانہ بازی میں لگے ہوئے ہیں اسی لیے ایک بات پر نہیں ٹکتے۔

"مریج" "مرج" کے مادہ سے (جو حرج کے وزن پر ہے) "مختلط، مشوش اور مشتبہ" امر کے معنی میں ہے، اور اسی لیے اس زمین کو جس میں مختلف قسم کی بکثرت گھاس اُگی ہوئی ہو۔ "مرج" (چراگاہ) کہا جاتا ہے۔

۶۔ اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○

۷۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ○

۸۔ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰی لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ○

۹۔ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِیْدِ ○

۱۰۔ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ○

۱۱۔ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ○

ترجمہ

۶۔ کیا انھوں نے آسمان کی طرف جو ان کے سر کے اوپر ہے نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اس کو کس طرح سے بنایا ہے، اور کس طرح سے ستاروں کے ذریعہ اُسے سجایا ہے، اور اس میں کسی قسم کا شگاف اور غیر موزونی نہیں ہے۔

۷۔ اور ہم نے ہی زمین کو پھیلایا ہے، اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ قائم کیے ہیں، اور ہر قسم کی لہلہاتی ہوئی گھاس اس میں اُگا دی ہے۔

۸۔ تاکہ ہر توبہ کرنے والے بندے کے لیے بصیرت اور بیداری کا وسیلہ اور ذریعہ ہو۔

۹ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا، اور اس کے ذریعہ باغات اور ان دانوں کو اگایا جنہیں کاٹ کر تیار کیا جاتا ہے۔

۱۰ اور بلند قامت کھجوروں کے درخت، جن کے پھل ایک دوسرے پر تہ بہ تہ لگے ہوئے ہوتے ہیں

۱۱ یہ سب کچھ بندوں کو روزی دینے کے لیے، اور ہم نے بارش کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا ہے، ہاں! مُردوں کو زندہ کرنا بھی اسی طرح ہے۔

تفسیر

ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو

یہ آیات، اسی طرح سے "معاد کے دلائل" کو پیش کر رہی ہیں کبھی "حق تعالیٰ کی غیر متناہی قدرت کے" طریقہ سے اور کبھی "اسی دنیا میں معاد کے مناظر کے وجود" سے مدد لیتی ہیں،

سب سے پہلے منکرین کو، آسمانوں کی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے،: "کیا انھوں نے اپنے سر کے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا، کہ ہم نے انھیں کس طرح سے بنایا ہے، جس میں کوئی ستون اور پائے نہیں ہیں، اور کس طرح سے ہم نے اُسے ستاروں کے ذریعہ سے سجایا ہے جبکہ اس میں کوئی شگاف اور غیر موزونیت نہیں ہے؟ (افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنیناھا وزیناھا ومالھا من فروج)۔

یہاں دیکھنے سے مراد غور و فکر اور سوچ بچار کے ساتھ دیکھنا ہے جو انسان کو اس وسیع و عریض آسمان اور اس کے عجائبات کے خالق کی عظیم قدرت سے آشنا کرتا ہے، جو خیرہ کرنے والی عظمت بھی رکھتا ہے اور بہت زیادہ زیبائیاں بھی اور استحکام و نظم و حساب بھی۔

ومالھا من فروج (اس میں کوئی شگاف نہیں ہے) کا جملہ یا تو نقص و عیب اور غیر موزونیت کے نہ ہونے کے معنی میں ہے۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے ــــ یا خاص طور پر اس آسمان میں شگاف نہ ہونے کے معنی میں ہے، جو اطراف

زمین کو احاطہ کیے ہُوئے ہے اور جسے فضائے زمین کہا جاتا ہے ، اور قرآن کے قول کے مطابق وہ (ایک محفوظ چھت) ہے (انبیاء ، ۳۲) جو اُن آسمانی پتھروں کو، جو مُسلسل اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں، روکے ہُوئے ہے اور سطح زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی انھیں جلا کر خاکستر کر دیتی ہے ، اور اسی طرح نقصان دہ کیہانی شعاعوں سے بھی بچاتی ہے۔

ورنہ ستاروں کی جگہ کے معنی میں جو آسمان ہے ، وہ تو ایک خالی فضا ہے ، جس میں یہ سیارے اور کُرّے تیر رہے ہیں۔

یہاں ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والا جُملہ " ایتھر" کے نظریہ کی طرف اشارہ ہو ، اس نظریہ کے مطابق تمام عالم ہستی اور ستاروں کا درمیانی فاصلہ ایک بے رنگ و بے وزن " ایتھر" نامی مادہ سے پُر ہے ، جو نور و روشنی کی لہروں کو اٹھائے ہوتے ہے اور اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا ہے ، اس نظریہ کے مطابق تمام عالم ہستی میں کوئی شگاف یا سوراخ نہیں ہے اور ثوابت اور سیارے " ایتھر" کے اندر تیر رہے ہیں۔

البتہ یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتیں ، اگرچہ تیسری تفسیر جس کا تکیہ " ایتھر" کے مفروضے پر ہے قابلِ اعتماد نہیں ہے ، کیونکہ " ایتھر" کا موضوع ماہرین کی نظر میں ابھی تک قطعی و یقینی طور پر ثابت نہیں ہُوا ہے۔

اس کے بعد زمین کی خلقت کی عظمت کو پیش کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے ، : " اور ہم نے زمین کو پھیلایا ، اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ قائم کیے ، اور اس میں طرح طرح اور قسم قسم کی ہری بھری لہلہاتی ہوئی گھاس اُگائی " (والارض مددناھا و القینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل زوج بھیج)۔

ہاں زمین کی پیدائش ایک طرف ، اس کا پھیلاؤ (پانی کے نیچے سے باہر آنا) ، دوسری طرف ، پہاڑوں کا پیدا ہونا ، جن کی جڑیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں ، اور وہ زرہ کی طرح زمین کو اندرونی اور بیرونی دباؤ سے اور چاند اور سورج کی کشش سے پیدا ہونے والے مدّ و جزر سے محفوظ رکھتے ہیں ، تیسری طرف انواع و اقسام کے گھاس ان تمام عجائب اور خوبصورتیوں کے ساتھ ، چوتھی طرف ، یہ سب کے سب اس کی بے پایاں قدرت کی دلیل ہیں۔ [1]

" من کل زوج " کی تعبیر عالم گیاہ و نباتات میں مسئلہ زوجیت کی طرف اشارہ ہے ، جو اُن آیات کے نزول کے موقع پر ہرگز ایک اصل کلی کے عنوان سے ظاہر نہیں ہُوا تھا ، اور علم و دانش بشر نے کئی صدیوں کے بعد اس کے رُخ سے پردہ اُٹھایا ہے ، اور یا یہ گھاس اور نباتات کے مختلف اصناف و انواع کی طرف اشارہ ہے ، کیونکہ عالم گیاہ و نباتات میں زیادہ فوق العادہ اور حیرت انگیز تنوع پایا جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں نتیجہ نکالتے ہُوئے کہتا ہے ، : ہم نے ان سب کو ان بندوں کی بصیرت اور بیداری کے لیے خلق

---

[1] ہم پہاڑوں کی خلقت کے بارے میں ، اسی طرح زمین کے بچھانے اور پھیلانے کے سلسلہ میں اور عالم گیاہ کی زوجیت کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ رعد کی آیت ۳ کے ذیل میں جلد ۱۰ ص .... سے آگے بیان کر چکے ہیں۔

کیا ہے، جو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری طرف لوٹ آئیں اور حق کو پالیں" (تبصرة وذکریٰ لکل عبد منیب)۔[1]

ہاں! وہ ذات، جو آسمانوں کو اتنا عظیم اور خوبصورت، اور زمین کو اتنا پُرنعمت وجمال ونظم وحساب کے ساتھ پیدا کرنے پر قدرت رکھتی ہے، تو وہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہ ہوگی، اور قیامت کیوں برپا نہ کرسکے گی؟ کیا یہ عظیم خیرہ کردینے والی قدرت امکان معاد پر واضح دلیل نہیں ہے!

بعد والی آیت میں ایک دوسرے استدلال کی بنیاد رکھتے ہوئے کہتا ہے: "اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا ہے، اور اس کے ذریعہ باغات اور ان دانوں کو اگاتے ہیں، جنھیں کاٹا جاتا ہے" (ونزلنا من السماء ماء مبارکاً فانبتنا به جنات وحب الحصید)۔

"جنات" یہاں پھل دار باغات کی طرف اشارہ ہے، اور "حب الحصید" (ایسے دانے جن کو کاٹ کر تیار کیا جاتا) ایسے دانوں کی طرف اشارہ ہے، جیسے جو، گندم، اور ان کے مانند دوسرے غلے جن سے انسانوں کی غذا کے اصلی مواد کو تیار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور اسی طرح کھجور کے ایسے بلند قامت درخت جن کے پھل اوپر نیچے ملے ہوئے ہوتے ہیں" (والنخل باسقات لها طلع نضید)۔

"باسقات" جمع ہے "باسقہ" کی جو مرتفع اور بلند کے معنی میں ہے، اور "طلع" کھجور کے درخت کے پھل پر جب وہ ظاہر ہونے لگتا ہے بولا جاتا ہے،

اور "نضید" کا معنی متراکم اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، خصوصاً کھجور کے درخت کے خوشے جس وقت غلاف کے اندر ہوتے ہیں تو پورے طور پر ایک دوسرے پر سوار اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور جس وقت غلاف سے باہر آتے ہیں تو بہت ہی تعجب خیز ہوتے ہیں۔

آخر میں کہتا ہے: "ہم نے ان سب کو بندوں کو روزی دینے کے لیے خلق کیا ہے، اور بارش کے ان حیات بخش قطرات سے ہم نے مردہ زمینوں کو زندگی بخشی ہے، ہاں! مردوں کا زندہ ہونا اور ان کا قبروں سے باہر نکلنا بھی اسی طرح ہے" (رزقاً للعباد واحیینا به بلدة میتاً کذلك الخروج)۔[2]

اور اس طرح سے وہ بندوں پر اپنی عظیم نعمتوں کی یاد آوری کے ضمن میں اس کی شناخت کی راہ میں، ان کی شکر گزاری

---

[1] "تبصرة" "مفعول لہ" بھی ہوسکتا ہے اور "مفعول مطلق" بھی لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے "ذکریٰ" بھی اسی پر عطف ہے اور وہی معنی دیتا ہے۔

[2] دوسری آیات میں بھی اس سلسلہ میں بحث ہوچکی ہے۔ (اسی تفسیر کی جلد ۱۸ سورۂ فاطر کی آیت ۹ کے ذیل میں اور اسی جلد میں سورۂ یٰسٓ کی آخری آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

کی حس کو تحریک کرتے ہوئے، انھیں یاد دلاتا ہے کہ تم معاد کا نمونہ ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے اسی جہان میں دیکھتے ہو۔ کہ مردہ، خشک زمینیں جو ہر قسم کے آثار زندگی سے خالی ہوتی ہیں، بارش کے قطروں کے نزول کے زیر اثر حرکت میں آجاتی ہیں اور قیامت کا شور وغل برپا کر دیتی ہیں اور ہر گوشہ وکنار سے گھاس اُگنے لگتی ہے اور" وحدہ لا شریک لہ" کہتی ہے۔

یہ عظیم جنبش اور عالم نباتات و گیاہ میں حیات و زندگی کی طرف حرکت اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ آفریدگار عالم مردہ موجودات کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتا ہے، کیونکہ کسی چیز کا واقع ہونا، اس کے" امکان" کی سب سے قوی دلیل ہے۔

۱۲۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ
۱۳۔ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ
۱۴۔ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ
۱۵۔ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ع

ترجمہ

۱۲۔ اُن سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس (وہ قوم جو یمامہ میں رہتی تھی، اور اُن کی طرف ایک پیغمبر آیا تھا، جس کا نام حنظلہ تھا) اور قوم ثمود نے بھی (اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔

۱۳۔ اور اسی طرح قوم عاد اور فرعون اور قوم لوط۔

۱۴۔ اور اصحاب الایکہ (قوم شعیب) اور قوم تبع (جو سرزمین یمن میں رہتی تھی) ان میں سے ہر ایک نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی تکذیب کی، اور عذاب کا وعدہ ان کے بارے میں پورا ہو کر رہا۔

۱۵۔ کیا ہم پہلی خلقت سے عاجز آ گئے ہیں۔ (کہ معاد کی خلقت پر قادر نہ ہوں) لیکن وہ (ان تمام واضح و روشن دلائل کے باوجود) پھر بھی نئی خلقت میں شک و تردید رکھتے ہیں۔

تفسیر

صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن سے مقابلہ ہے؟

یہ آیات اسی طرح معاد و قیامت سے مربوط مباحث کو مختلف طریقوں سے بیان کر رہی ہیں۔

پہلے پیغمبرؐ کی دل داری کے لیے فرماتا ہے: "صرف تو ہی نہیں ہے کہ اس کافر گروہ نے تیری تکذیب کی ہے، اور تیری دعوت کے مطالب کو جھٹلایا ہے خصوصاً معاد کے بارے میں" ان سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس اور قوم ثمود نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی": (کذبت قبلھم قوم نوح و اصحاب الرس وثمود)۔

"قوم ثمود" وہی خدا کے عظیم پیغمبر صالح کی قوم ہے، جو حجاز کے شمال میں "حجر" کی سرزمین میں رہتی تھی، اور "اصحاب الرس" کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بہت سوں کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ ایک قبیلہ تھا جو سرزمین یمامہ میں رہتا تھا، اور ان کے پیغمبر کا نام حنظلہ تھا، انہوں نے اس کی تکذیب کی اور آخر کار اُسے کنویں میں پھینک دیا (اس بات پر توجہ رہے کہ "رس" کا ایک معنی کنواں ہے) اور اس کا دوسرا معنی وہ مختصر اثر ہے جو کسی چیز کا باقی رہ جائے، کیونکہ اس قوم کے بہت کم اثرات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں)

بعض دوسرے اُسے شعیب کی قوم سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے پانی کے بہت زیادہ کنویں تھے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "اصحاب الایکہ" جو بعد والی آیت میں آیا ہے وہ اس قوم شعیب کی طرف اشارہ ہے، لہٰذا اس احتمال کی نفی ہو جاتی ہے۔

بعض انہیں قوم ثمود کے بقایا میں سے جانتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیات میں "ثمود" جداگانہ طور پر آیا ہے۔ لہٰذا یہ معنی بھی بعید نظر آتا ہے۔ اس بنا پر مناسب وہی پہلی تفسیر ہے، جس کی مفسرین کے درمیان عام شہرت ہے۔

* * * * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "طائفۂ عاد، قوم فرعون اور لوط کے بھائیوں نے بھی" (وعاد و فرعون و اخوان لوط)۔

لوط کے بھائیوں سے مراد وہی قوم لوط ہے، کیونکہ قرآن نے ان عظیم پیغمبروں کو بھائی کے عنوان سے یاد کیا ہے۔

"اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے بھی"۔: (و اصحاب الایکۃ وقوم تبع)۔

"ایکہ" بہت زیادہ اور گھنے درختوں کے معنوں میں ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں جنگل کے مشابہ ہے، اور

اصحاب الایکہ قوم شعیب کا ایک گروہ ہے، جو شہر "مدین" کے علاوہ کسی اور جگہ رہتا تھا، کسی ایسے شہر میں جس میں بہت زیادہ درخت تھے [1]

اور "قوم تبع" سے مراد یمن کے لوگوں کا ایک گروہ ہے "تبع" یمن کے بادشاہوں کا لقب ہے، کیونکہ لوگ ان کی اتباع اور پیروی کیا کرتے تھے، اور یہاں پر قرآن کی ظاہری تعبیر اور ایک اور دوسری آیت میں (۳۷۔ دخان) یمن کا ایک خاص بادشاہ ہے جس کا نام بعض روایات میں "اسعد ابوکرب" ذکر ہوا ہے، اور ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک مومن آدمی تھا، اور لوگوں کو انبیاء کی دعوت کی پیروی کی طرف بلاتا تھا، اگرچہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی، [2]

اس کے بعد ان آٹھوں اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "ان میں سے ہر ایک نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے بارے میں خدا کے عذاب کا وعدہ پورا ہو کر رہا" (کل کذب الرسل فحق وعید)۔

یہ جو کہتا ہے: انہوں نے "خدا کے رسولوں" کی تکذیب کی۔ حالانکہ ہر ایک نے صرف اپنے پیغمبر کی تکذیب کی۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو فعل ان سے سرزد ہوا وہ مجموعی طور پر تمام انبیاء کی تکذیب تھی، اگرچہ ہر ایک نے ایک ایک پیغمبر کی تکذیب کی تھی۔

اور یا یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک پیغمبر کی تکذیب بقیہ کی تکذیب بھی شمار ہوتی ہے، کیونکہ سب کی دعوت کا مطلب اور مفہوم ایک ہی ہے۔

بہر حال ان اقوام نے اپنے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی اور مسئلہ توحید و معاد کی بھی، اور انجام کار دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے، بعض طوفان میں گرفتار ہوئے، بعض سیلاب میں بعض دوسرے صاعقہ اور آسمانی بجلی میں، بعض زلزلہ میں، یا ان کے علاوہ دوسری چیزوں میں، اور انجام کار انھوں نے تکذیب کا تلخ پھل چکھا۔

لہٰذا تم مطمئن رہو اگر یہ کافر قوم بھی جو تمہارے مقابلہ میں کھڑی ہے اسی حالت میں رہی تو ان کی سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں ہوگی۔

اس کے بعد امکان قیامت کے دلائل میں سے ایک اور کو ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا ہم پہلی خلقت سے تھک ہار کر عاجز آ گئے ہیں کہ اب دوسری خلقت اور قیامت پر قدرت حاصل نہ ہو؟" (افعیینا بالخلق الاول) [3]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: انھیں پہلی پیدائش کے بارے میں تو کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ وہ خدا کو ہی انسانوں کا خالق سمجھتے ہیں" لیکن وہ ان واضح دلائل کے باوجود نئی پیدائش اور قیامت کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں" (بل هم فی لبس من خلق جدید)۔

درحقیقت وہ خواہشات نفسانی، تعصب اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تناقض میں گرفتار ہیں، ایک طرف تو یہ سمجھتے ہیں

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جلد ۱۰ ص اور جلد ۱۵ ص سورۂ حجر کی آیت ۷۸ اور سورۂ شعراء کی آیت ۱۷۶ کی طرف رجوع کریں۔

[2] قوم تبع کے بارے میں مزید تشریح کیلئے جلد ۲۱ (سورۂ دخان کی آیت ۳۷ کے ذیل میں) مطالعہ کریں۔

[3] اوپر والے جملہ میں ایک محذوف ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے: افعیینا بالخلق الاول حتی نعجز عن الثانی: کیا ہم پہلی خلقت سے عاجز تھے کہ دوسری سے عاجز ہوں گے؟

کہ خدا نے ہی انسانوں کو خلق کیا ہے اور انھیں سب کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب انسانوں کی مٹی سے جدید خلقت کے مسئلہ تک پہنچتے ہیں، تو اس کو عجیب غریب اور باور نہ ہونے والا مسئلہ شمار کرتے ہیں، حالانکہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔" وحکم الامثال فی مایجوز وفی مالا یجوز واحد"

اس طرح سے ان آیات میں اور گذشتہ آیات میں چار مختلف طریقوں سے مسئلہ معاد پر استدلال کرتا ہے، علم خدا کے طریق سے اس کی قدرت کے طریقے سے، اس کے بعد عالم گیاہ میں معاد کے مناظر کی تکرار کے طریقہ سے، اور انجام کار پہلی خلقت کی طرف توجہ کرنے کے طریقے سے۔

اور جب ہم معاد کے سلسلہ میں قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہی دلائل دوسرے دلائل کے اضافہ کے ساتھ الگ الگ مختلف آیات میں آئے ہیں اور قرآن نے اپنی طاقتور منطق اور پرکشش، سادہ، آسان اور قاطع تعبیروں کے ساتھ منکرین کے سامنے معاد جسمانی کے مسئلہ کو بہترین طریقہ پر ثابت کیا ہے، کہ اگر وہ اپنے آپ کو پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں تعصب، ہٹ دھرمی، اور اندھی تقلید سے بچا لیتے تو وہ بہت جلد اس واقعیت کو تسلیم کر لیتے، اور یہ جان لیتے کہ قیامت و معاد کی کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہے۔

۱۶۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○

۱۷۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ○

۱۸۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○

ترجمہ

۱۶۔ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم اس کے نفس کے وسوسوں کو جانتے ہیں، اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

۱۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب انسان کے ساتھ رہنے والے دونوں فرشتے دائیں اور بائیں طرف سے، اس کے اعمال کو لکھتے ہیں۔

۱۸ انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا، مگر اس کے پاس ہی ایک نگران فرشتہ اپنے کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

تفسیر

تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی وہ لکھتے ہیں

ان آیات میں معاد سے مربوط مسائل کے ایک اور حصّہ کو بیان کیا جارہا ہے۔ اور وہ روزِ حساب کے لیے انسانوں کے اعمال کے ثبت و ضبط کا مسئلہ ہے۔

سب سے پہلے خدا کے غیر متناہی علم، اور انسانوں پر اس کے علمی احاطہ کی بات کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے انسان کو خلق کیا ہے، اور ہم اس کے نفس کے وسوسوں کو جانتے ہیں": (ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس به نفسه)۔

"توسوس" "وسوسہ" کے مادہ سے مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق ایسے غیر مطلوب افکار کے معنی میں ہے، جو انسان کے دل میں گزرتے ہیں، اور اس کی اصل لفظ "وسواس" سے لی گئی ہے، جو آلات زینت کی صدا، اور اسی طرح مخفی پیغام وصدا کے معنی میں ہے۔

یہاں پر اس سے مراد یہ ہے کہ جب خدا دل میں گزرنے والے خیالوں اور ان جلدی گزر جانے والے وسوسوں سے جو اس کی فکر سے گزرتے ہیں، آگاہ ہے، تو وہ یقینی طور پر ان کے تمام عقائد واعمال وگفتار سے بھی باخبر ہے۔ اور روز حساب کے لیے سب کے حساب وکتاب پر نظر رکھتا ہے۔

"ولقد خلقنا الانسان" کا جملہ ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو، کہ خالق بشر سے محال ہے کہ وہ اس کے وجود کے جزئیات سے بے خبر ہو، اور وہ خلقت بھی ایسی جو ہمیشہ کے لیے جاری ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے ممکنات تک فیض وجود پہنچتا رہتا ہے، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارا رابطہ اس سے منقطع ہو جائے تو ہم سب ختم ہو جائیں، جیسا کہ سورج کی روشنی اس منبع فیض بخش یعنی کرۂ آفتاب سے لمحہ بہ لمحہ جدا ہوتی اور فضا میں پھیلتی رہتی ہے، (بلکہ ــــ جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ہمارا اس کی ذات مقدس کے ساتھ ارتباط اس سے بھی زیادہ بالاتر ہے)

ہاں! وہ خالق ہے، اور اس کی خلقت دائم ومستمر، اور ہم تمام حالات میں اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، ان حالات میں کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہمارے ظاہر وباطن سے بے خبر ہو۔

اور آیت کے ذیل میں اس مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں": (ونحن اقرب اليه من حبل الوريد)

کتنی عمدہ وہلا دینے والی تعبیر ہے، ہماری حیات جسمانی اس رگ کے ساتھ وابستہ ہے جو ہمیشہ خون کو ایک طرف سے ہمارے دل میں داخل کرتی ہے، اور دوسری طرف سے خارج کرتی ہے اور تمام اعضاء تک پہنچاتی ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے عمل میں وقفہ آجائے تو فوراً موت واقع ہو جائے۔

خدا تو ہمارے دل کی رگ سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔

یہ وہی چیز کہ دوسری جگہ کہتا ہے: "واعلموا ان الله يحول بين المرء وقلبه وانه اليه تحشرون: "جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور تم سب ہی قیامت میں اس کے پاس جمع ہو جاؤ گے۔ (انفال۔ ۲۴)

البتہ یہ سب کی سب تشبیہ ہیں اور خدا کا قرب اس سے بھی برتر وبالاتر ہے، اگرچہ محسوسات میں اس سے زیادہ بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

خدا کے اس احاطہ علمی اور اس کے قبضہ قدرت میں ہونے کی صورت میں، ہماری ذمہ داری واضح و روشن ہے، نہ تو ہمارے افعال و گفتار ہی اس سے پنہاں ہیں، اور نہ ہی افکار و نیات اور نہ وہ وسوسے تک جو ہمارے دل میں گزرتے ہیں۔

اس واقعیت کی طرف توجہ، انسان کو بیدار کرتی ہے، اور دادگاہ عدل الٰہی میں، اس کی سنگین بازپرس، اور دقیق اعمال نامہ سے اُسے آشنا کرتی ہے اور ایک بے خبر اور لاپرواہ انسان سے اُسے ایک ہوشیار صحیح راستہ پر، قابل اعتماد اور باتقویٰ انسان بناتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "ابوحنیفہ" نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا، کہ میں نے آپ کے فرزند "موسیٰ" کو دیکھا ہے، وہ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ ان کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور وہ انھیں منع نہیں کرتے تھے، حالانکہ یہ کام درست نہیں ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا، میرے بیٹے "موسیٰ" کو بلاؤ، حضرت کو بلایا گیا، تو امام صادقؑ نے ابوحنیفہ کی بات اپنے بیٹے سے بیان کی، آپؑ نے جواب میں فرمایا، اے باباجان!

" ان الذی کنت اصلی لہ کان اقرب الی منہم یقول اللہ عزوجل و نحن اقرب الیہ من حبل الورید!"

" میں جس کی نماز پڑھ رہا تھا، وہ ان کی نسبت مجھ سے زیادہ قریب تھا، جیسا کہ خداوند متعال فرماتا ہے، ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، امام صادقؑ نے انھیں اپنی آغوش میں لیا اور فرمایا:

" بابی انت وامی یا مستودع الاسرار!

"میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں، اے وہ کہ اسرار الٰہی جس کے دل میں ودیعت کئے گئے ہیں"[1]

مفسرین اور ارباب لغت نے "ورید" کے معنی کے سلسلہ میں گوناگوں تفاسیر بیان کی ہیں، ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ ورید وہی رگ ہے کہ جو انسان کے دل یا جگر کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اور بعض اُسے ان تمام رگوں کے معنی میں سمجھتے ہیں، جو انسان کے بدن سے گزرتی ہیں، جبکہ بعض دوسروں نے اس کی رگ گردن کے ساتھ تفسیر کی ہے، اور کبھی اس کو "وریدان" کہتے ہیں، یعنی گردن کی دونوں رگیں۔

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، خصوصاً سورۂ انفال کی آیت ۲۴ کی طرف توجہ رکھتے ہوئے، جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ لفظ "ورید" اصل میں لفظ "ورود" سے جو پانی کی تلاش میں جانے کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے اور چونکہ خون اس رگ کے ذریعہ دل میں داخل ہوتا ہے، یا دوسرے اعضاء میں وارد ہوتا ہے، لہٰذا اس کو "ورید" کہا جاتا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے، کہ موجودہ زمانہ کی متداول اصطلاح "ورید" اور "شریان" سے متعلق اصطلاح

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۰۰۔

وہ رگیں جو خون کو تمام اعضاء سے دل کی طرف لے جاتی ہیں، اور وہ رگیں جو خون کو دل سے اعضاء کی طرف پہنچاتی ہیں، علم زیست شناسی کے ساتھ مخصوص اصطلاح ہے، اور وہ اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے، "اس وقت کو یاد کرو، جب وہ دونوں فرشتے، جو انسان کی دائیں اور بائیں طرف نگرانی پر مامور ہیں۔ اس کے اعمال کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں" (اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید)۔[1]

یعنی انسان کے ظاہر و باطن پر خداوند عالم کے احاطہ علمی کے علاوہ دو فرشتے بھی اس کے اعمال کے حساب و کتاب کی حفاظت اور نگہداری پر مامور ہیں، جو اس کی دائیں اور بائیں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوتے، تاکہ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ اتمام حجت ہو، اور حساب اعمال کی نگہداشت کے مسئلہ پر ایک تاکید ہو۔

"تلقی" دریافت، اخذ اور ضبط کے معنی میں ہے، اور "متلقیان" دو فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کو رقم کرنے پر مامور ہیں۔

"قعید" "قعود" کے مادہ سے بیٹھنے والے کے معنی میں ہے[2]۔ اور یہاں مراد مامور اور نگران ہے، دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ دو فرشتے انسان کی دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں، کیونکہ انسان کبھی بیٹھا ہوتا ہے اور کبھی چل رہا ہوتا ہے، بلکہ یہ تعبیر اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ دونوں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ وہ دونوں انسان کے دائیں بائیں شانے پر یا دائیں بائیں داڑھوں پر ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں اور اس کے اعمال کو ثبت کرتے ہیں، اور بعض غیر معروف روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

(بحار الانوار جلد ۵۹ ص ۱۹۶ روایت ۳۲)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ روایات اسلامی میں آیا ہے کہ دائیں طرف کا فرشتہ تو نیکیوں کو لکھتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ

---

[1] "اذ" "اذ یتلقی المتلقیان" کے جملہ میں ظرف ہے اور وہ ایک فعل محذوف سے متعلق ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: اذکروا اذ یتلقی المتلقیان، اس معنی کو مفسرین کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے، لیکن ایک گروہ اس کو "اقرب" سے متعلق سمجھتا ہے۔ جو کہ اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید اور اسی طرح اذ یتلقی المتلقیان کا جملہ اپنے استقلال کو محفوظ رکھتا ہے اور ایک دوسرے کو مقید نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں دوسری تفسیر میں صدر و ذیل کا تناسب چنداں واضح نظر نہیں آتا۔

[2] "قعید" مفرد ہے جبکہ "متلقیان" تثنیہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے، کہ آیت میں ایک محذوف ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے "اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین قعید، وعن الشمال قعید" جن میں سے ایک دوسرے کے قرینہ سے محذوف ہے۔

برائیوں کو لکھتا ہے اور پہلا فرشتہ دوسرے کا حاکم ہے، جس وقت انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ اس سے دس گنا لکھ لیتا ہے، اور جب بُرا عمل اس سے سرزد ہوتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ اُسے لکھنا چاہتا ہے، تو پہلا فرشتہ اس سے کہتا ہے، "جلدی نہ کرو" لہٰذا وہ اس کے لکھنے میں سات گھنٹے کی تاخیر کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگر مرتکب پشیمان ہو گیا اور اس نے توبہ کر لی تو پھر فرشتہ کوئی چیز نہیں لکھتا، اور اگر اس نے توبہ نہ کی تو پھر اس کے لیے صرف ایک ہی گناہ لکھتا ہے۔ [1]

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن انسان کے مرنے کے بعد وہ فرشتے کہتے ہیں پروردگارا! تو نے اپنے بندہ کی رُوح قبض کر لی ہے، اب ہماری ماموریت کہاں ہے؟

خدا فرماتا ہے: میرا آسمان میرے فرشتوں سے پُر ہے، جو ہمیشہ میری عبادت کرتے ہیں، اور زمین بھی مطیع و فرمانبردار مخلوق سے پُر ہے، تم میرے بندے کی قبر کی طرف جاؤ اور وہاں تسبیح و تکبیر و تہلیل کہو، اور اُسے قیامت کے دن تک میرے بندے کی نیکیوں میں لکھو۔ [2]

ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

جو مسلمان بیمار ہو جاتا ہے، خدا اس کے اعمال کے محافظ فرشتوں سے کہتا ہے، جب تک وہ بیمار ہے، وہ اعمال جو وہ صحت کی حالت میں انجام دیا کرتا تھا، اس کے لیے لکھتے رہو، اس کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا:

"من مرض او سافر کتب اللہ تعالیٰ لہ ما کان یعمل صحیحاً مقیماً:

"جو شخص بیمار ہو جائے یا سفر میں ہو تو خدا وہی (نیک) اعمال جو وہ حالت صحت میں اور حالتِ قیام میں انجام دیا کرتا تھا اس کے لیے لکھتا ہے۔ [3]

اور یہ سب کے سب الطاف خداوندی کی وسعت کی طرف پر معنی اشارے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں پھر بشت اعمال کرنے والے فرشتوں کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا، مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگرانی کرنے والا فرشتہ اپنی ماموریت کی انجام دہی کے آمادہ ہے، (ما یلفظ من قول الّا لدیہ رقیب عتید)۔ [4]

گذشتہ آیت میں انسان کے تمام اعمال رقم ہونے کے بارے میں گفتگو تھی، اور اس آیت میں خاص طور پر اس کے الفاظ اور باتوں پر بھی تکیہ کیا گیا ہے، اور یہ اس حد سے زیادہ اہمیت اور نقش مؤثر کی بنا پر ہے، جو انسانوں کی زندگی میں ان

---

[1] "مجمع البیان" ج ۹ ص ۴۴۔

[2] سابقہ مدرک

[3] "روح المعانی" جلد ۲۶۔ صفحہ ۱۰۵ (زیر بحث آیات کے ذیل میں یہی مضمون کتاب "کافی" میں امام صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔

(بحار الانوار جلد ۵۹ ص ۱۰، روایت ۳۴-۳۵)

[4] "لدیہ" کی ضمیر "قول" کی طرف لوٹتی ہے یہ احتمال بھی ہے کہ کہنے والے کی طرف لوٹے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

کی گفتار کو حاصل ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ہی جملہ اجتماعی راستے کو خیر یا شر کی طرف موڑ دیتا ہے۔

اور اس بناء پر بھی کہ بہت سے لوگ اپنی باتوں کو اپنے اعمال کا جزء نہیں سمجھتے، اور وہ اپنے آپ کو بات کرنے میں آزاد آزاد خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے موثر ترین اور خطرناک ترین اعمال اُس کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔

اس بناء پر اس آیت کا ذکر گزشتہ آیت کے بعد، عام کے بعد خاص کے ذکر کے قبیل سے ہے۔

رقیب "مراقب اور نگران کے معنی میں ہے اور "عتید" اس شخص کے معنی میں ہے، جو کسی کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو، لہٰذا اس گھوڑے کو جو دوڑنے کے لیے تیار ہو "فرس عتید" کہتے ہیں اور جو شخص کسی چیز کو ذخیرہ، اور اس کی حفاظت کرتا ہے اسے بھی "عتید" کہا جاتا ہے (مادہ "عتاد" بر وزن جہاد سے ذخیرہ کرنے کے معنی میں ہے)

اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ رقیب و عتید وہی دو فرشتے ہیں جنہیں گزشتہ آیت میں "متلقیان" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، دائیں طرف کے فرشتے کا نام "رقیب" ہے اور بائیں طرف کے فرشتے کا نام "عتید" اگرچہ زیر بحث آیت میں اس مطلب کی صراحت نہیں ہے لیکن مجموع آیات کے ملاحظہ سے اس قسم کی تفسیر بعید نظر نہیں آتی۔

اس بارے میں کہ یہ دونوں فرشتے کونسی باتوں کو لکھتے ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ لکھتے ہیں، یہاں تک کہ اس نالہ و فریاد کو بھی جو سر درد رکھنے والا سر درد کے موقع پر کرتا ہے، جب کہ بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ صرف خیر و شر، واجب و مستحب یا حرام و مکروہ الفاظ لکھتے ہیں، اور مباحات کے ساتھ انھیں کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن آیت کی تعبیر کی عمومیت بتاتی ہے کہ انسان کے تمام الفاظ و گفتار ثبت ہوتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ان المؤمنین اذا قعدا یتحدثان قالت الحفظة بعضها لبعض اعتزلوا بنا، فلعل لهما سرًّا وقد ستر الله علیهما!"

"جب دو مومن ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور خصوصی باتیں کرنے لگتے ہیں، تو محافظ اعمال فرشتے ایک دوسرے سے کہتے ہیں، ہمیں ایک طرف ہو جانا چاہیئے شاید ان کے درمیان کوئی ایسا راز ہو جسے خدا نے مستور رکھا ہو"

راوی کہتا ہے: کیا خدا یہ نہیں فرماتا: ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید" انسان کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ نگران فرشتہ اور ثبت اعمال کے لیے آمادہ فرشتہ اس کے پاس حاضر ہے"

امامؑ نے فرمایا:

"ان کانت الحفظة لا تسمع فان عالم السر یسمع ویری"

"اگر محافظین ان کی باتوں کو نہیں سنتے تو وہ خدا جو اسرار سے باخبر ہے وہ تو سنتا اور دیکھتا ہے"[1]

---

[1] "اصول کافی" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۱۰۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم مؤمن کے اکرام واحترام کے لیے اس کی بعض باتوں کو جو خاص راز کا پہلو رکھتی ہیں ان فرشتوں سے پوشیدہ رکھتا ہے، لیکن وہ خود ان تمام اسرار کا محافظ ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے علاوہ ہیں۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیت ۷۸ میں ہم اس چیز کو پیش کر چکے ہیں۔[1]

٭ ٭ ٭ ٭

ایک نکتہ

دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے

بعض فلاسفہ کہتے ہیں: "جس طرح شدت بُعد پوشیدگی کا موجب ہے اسی طرح شدت قرب بھی پوشیدگی کا موجب ہے، مثلاً اگر سورج ہم سے بہت دور ہو جائے تو وہ دکھائی نہیں دے گا۔ اور اگر ہم اس سے بہت زیادہ نزدیک ہو جائیں، تو اس کی روشنی اتنی خیرہ کرنے والی ہے، کہ پھر بھی ہم اس کو دیکھنے پر قادر نہیں ہیں۔

اور درحقیقت خدا کی ذات پاک بھی اسی طرح کی ہے، "یا من هو اختفی لفرط نوره" اے وہ کہ جو شدت نورانیت کی وجہ سے ہماری نگاہ سے پوشیدہ ہوا ہے"!

زیر بحث آیات میں بھی بندوں سے خدا کی حد سے زیادہ نزدیکی ایک عمدہ تشبیہ کے ضمن میں بیان ہوئی ہے، کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی ہم سے زیادہ نزدیک ہے۔

یہ نزدیکی، ہماری اس سے زیادہ شدید وابستگی سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔

یہاں تک کہ اس قسم کی تشبیہیں بھی: کہ تمام عالم جسم ہے اور وہ روح عالم ہے۔ تمام عالم شعاع کی مانند ہے اور وہ قرص آفتاب ہے۔ یہ سب اس قرب کے رابطہ کو بیان نہیں کر سکتیں، اور بہترین تعبیر وہی ہے، جو امیر المومنینؑ نے (نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں)، بیان فرمائی ہے:

"مع کل شیء لا بمقارنة وغیر کل شیء لا بمزایلة"

"وہ تمام موجودات کے ساتھ ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ ان کے قرین ہو، اور تمام موجودات سے جُدا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ان سے الگ ہو"

فلاسفہ کی ایک جماعت نے اس حد سے زیادہ قرب کے بیان کے لئے ایک اور تشبیہ بیان کی ہے، انھوں نے خدا کی ذات کو "اسم" کے معنی سے اور باقی موجودات کو "حرف" کے معنی سے تشبیہ دی ہے۔

---

[1] جلد ۱۲ ص (سورہ اسراء کی آیہ ۷۸ کے ذیل میں، رجوع کریں۔

اس کی وضاحت : یہ ہے کہ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں (کعبہ کی طرف رُخ کرو) "رو بہ کعبہ کن" تو لفظ "بہ" کا اکیلے کوئی مفہوم نہیں ہے، جب تک اس کے ساتھ لفظ "کعبہ" کا اضافہ نہ ہو، وہ گونگا، مبہم اور ناقابل فہم ہے، اس بنا پر کسی حرف کا اکیلے کوئی معنی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ کسی "اسمی" معنی کے ہمراہ نہ ہو۔

تمام موجودات عالم کی ہستی بھی اسی طرح ہے، کہ اس کی ذات کے ساتھ وابستگی اور پیوند کے بغیر نہ اصلاً اس کا کوئی مفہوم ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی وجود و بقا ہے، اور یہ چیز خدا کے بندوں کے ساتھ انتہائی قرب اور بندوں کے خدا کے ساتھ انتہائی قرب کی نشاندہی کرتی ہے، اگرچہ بے خبر اس معنی سے غافل ہیں۔

دوست نزدیک تر از من بہ من است وین عجب تر کہ من از وی دورم
چکنم با کہ تواں گفت کہ دوست در کنار من و من مہجورم!

"میرا دوست مجھ سے خود مجھ سے بھی زیادہ نزدیک ہے، لیکن زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ میں پھر بھی اس سے دور ہوں، میں کیا کروں اور کس سے کہہ سکتا ہوں کہ دوست تو میرے پہلو میں ہے۔ لیکن میں پھر بھی ہجر و فراق میں ہوں۔"

۱۹۔ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ○
۲۰۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ○
۲۱۔ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ○
۲۲۔ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○

ترجمہ

۱۹۔ اور انجام کار سکرات موت حق کے ساتھ پہنچ جائے گی، (اور انسان سے کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تو بھاگا کرتا تھا۔
۲۰۔ اور صور پھونکا جائے گا، وہی دن تو وحشت ناک وعدہ کے پورا ہونے کا دن ہے۔
۲۱۔ اور ہر انسان محشر میں وارد ہوگا، جب کہ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ اس کے ساتھ ساتھ ہوگا۔
۲۲۔ (اس کو خطاب ہوگا) تو اس منظر (اور عظیم دادگاہ) سے غافل تھا، اور ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تیری نظر بہت تیز ہوگئی ہے۔

تفسیر

قیامت اور تیز بین آنکھیں

ان آیات میں "معاد" سے مربوط مسائل میں سے کچھ اور دوسرے مناظر کو پیش کیا گیا ہے، "موت" کا منظر "نفخ صور"

کا منظر اور "محشر میں حاضر ہونے کا" منظر۔

پہلے فرماتا ہے: "آخر کار سکرات موت حق کے ساتھ پہنچ جائے گی" (وجاءت سکرة الموت بالحق)۔

"سکرة الموت" "مستی" سے مشابہ ایک حالت ہے جو موت کے مقدمات کے ظاہر ہونے کے اثر میں حد سے زیادہ ہیجان و انقلاب کی صورت میں انسان کو عارض ہوتی ہے، اور بعض اوقات اس کی عقل پر بھی غالب آجاتی ہے، اور اس کو اضطراب اور ایک شدید بے آرامی میں ڈبو دیتی ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو، درحالیکہ موت ایک اہم انتقالی مرحلہ ہے جس میں انسان کو، اس جہاں سے جس میں اس نے سالہا سال تک رہنے کی عادت ڈالی تھی، اپنے تمام رشتوں اور تعلقات کو چھوڑنا پڑے گا، اور اُسے اس عالم میں قدم رکھنا ہوگا جو اس کے لیے کاملاً نیا اور اسرار آمیز ہے، خاص طور پر یہ بات کہ انسان موت کے وقت ایک نیا ادراک اور نئی نگاہ پیدا کرلیتا ہے، اس جہاں کی بے ثباتی کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے، اور موت کے بعد کے حوادث کو بھی کم و بیش دیکھ رہا ہوتا ہے، یہ وہ منزل ہے کہ ایک عظیم وحشت اس کو سر سے پاؤں تک گھیر لیتی ہے، اور مستی کے مشابہ ایک حالت اس کو عارض ہو جاتی ہے، لیکن وہ "مست" نہیں ہوتا۔ [1]

یہاں تک کہ انبیاء اور مردان خدا بھی جو موت کے وقت کامل اطمینان اور آرام کی حالت میں ہوتے ہیں، اس انتقالی لمحہ کی شدتوں اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں، جیسا کہ پیغمبرؐ کے حالات میں آیا ہے کہ اپنی عمر مبارک کے آخری لمحات میں اپنا ہاتھ ایک پانی کے برتن میں ڈالتے تھے اور اپنے منہ پر پھیرتے تھے، اور "لا الٰہ الا اللہ" کہتے تھے اور فرماتے تھے:

"ان للموت سکرات": موت کے لیے سکرات ہے۔ [2]

علی موت کے لمحہ اور اس کی سکرات کی ایک بہت ہی عمدہ تصویر کھینچتے ہیں، فرماتے ہیں۔

اجتمعت علیهم سکرة الموت وحسرت الفوت، ففترت لها اطرافهم وتغیرت لها الوانهم، ثم ازداد الموت فیهم ولوجا فحیل بین احدهم وبین منطقه، وانه لبین اهله ینظر ببصره ویسمع باذنه علی صحة من عقله، وبقاء من لبه، یکفر فیما افنی عمره؟ وفیما اذهب دهره؟ ویتذکر اموالا جمعها اغمض فی مطالبها واخذها من مصرحاتها ومشتبهاتها قد لزمته تبعات جمعها، واشرف علی فراقها، تبقی لمن ورائه ینعمون فیها ویتمتعون بها۔ [3]

---

[1] "سکر" (بروزن سکر) اصل میں پانی کی راہ کو مسدود کرنے کے معنی میں ہے اور سکر (بروزن فکر) مسدود مقام و محل کے معنی میں آیا ہے، اور چونکہ مستی کی حالت میں گویا انسان اور اس کی عقل کے درمیان ایک سد پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کو "سکر" (بروزن شکر) کہا جاتا ہے۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۱۱۸۔

سکرات موت۔ اپنے پاس کی ہر چیز کو کھو دینے کی حسرت کے ساتھ۔ ان پر ہجوم کرتی ہے، ان کے بدن کے اعضاء سُست ہو جاتے ہیں، ان کے چہروں کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ موت ان میں نفوذ کرنے لگتی ہے، ان کے اور ان کی زبان کے درمیان جدائی ڈال دیتی ہے، حالانکہ وہ اپنے گھر والوں کے درمیان ہے اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اپنے کان سے سُن رہا ہوتا ہے، اور اس کی عقل و ہوش صحیح و سالم ہوتے ہیں، لیکن وہ بات نہیں کر سکتا۔

اس حالت میں وہ سوچتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کس راستے میں فنا کی؟ اور اپنا زمانہ کس راستے میں ختم کیا؟ اس دولت و ثروت کی یاد اُسے ستاتی ہے، جس کے جمع کرنے میں اس نے چشم پوشی سے کام لیا تھا، اور حلال و حرام اور مشکوک و مشتبہ اکٹھا کرتا رہا تھا، اور اس کے جمع کرنے کے نتائج اور ذمہ داری اپنے کندھے پر لے گا، حالانکہ اُن سے جدائی اور فراق کا وقت آن پہنچا ہے، اور وہ پسماندگان کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، وہ تو اس سے متنعم ہوں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اس کا حساب و کتاب اور اس کے لیے جوابدہی اس کے ذمہ ہوگی۔ [1]

اور دُنیائے انسانیت کا یہ عظیم معلم ایک دوسری جگہ خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"انکم لو قد عاینتم ما قد عاین من مات منکم لجزعتم ووهلتم وسمعتم واطعتم ولکن محجوب عنکم ما قد عاینوا وقریب ما یطرح الحجاب"۔ [2]

اگر وہی چیز جس کا تمہارے مردوں نے مشاہدہ کیا ہے، تم بھی دیکھ لیتے، تو گھبرا جاتے، اور ڈر جاتے، حق کی باتوں کو سنتے اور اطاعت کرتے، لیکن انھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم سے مستور ہے اور عنقریب پردے ہٹ جائیں گے اور تم بھی اس کا مشاہدہ کرو گے۔ (لیکن افسوس .....)

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کو جاری رکھتا ہے، :"اس شخص کو جو سکرات موت کی حالت میں ہے، کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جسے تو پسند نہیں کرتا تھا اور اس سے بھاگتا تھا" (ذالک ما کنت منہ تحید)۔ [3]

ہاں موت ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے اکثر لوگ بھاگتے ہیں، کیونکہ وہ اس کو "فنا" سمجھتے ہیں نہ کہ عالم "بقاء" کا ایک دریچہ یا ان شدید رشتوں اور تعلقات کی وجہ سے جو وہ دُنیا اور مادی نعمتوں کے ساتھ رکھتے ہیں اور ان سے دل نہیں ہٹا سکتے یا اپنے نامہ اعمال کے سیاہ ہونے کی وجہ سے!

جو کچھ بھی ہے، وہ اس سے بھاگتے ہیں، لیکن کیا فائدہ، کیونکہ یہ ایک ایسی سرنوشت ہے جو سب کے انتظار میں ہے، اور ایک ایسا اونٹ ہے جو ہر گھر کے دروازے پر بیٹھا ہے، اور کسی میں اس سے بھاگنے کی طاقت نہیں ہے، آخر کار سب

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۹۔

[2] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۰۔

[3] "تحید" حید بروزن صید کے مادہ سے۔

کے سب موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے، جس سے تم بھاگتے تھے؟!

اس بات کا کہنے والا ممکن ہے خدا ہو، یا فرشتے یا وجدان بیدار یا سب کے سب۔

اس حقیقت کو قرآن دوسری آیات میں بھی دل نشیں کراتا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۷۸ میں فرماتا ہے: "اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ: "تم جہاں کہیں بھی ہوں گے موت تمہیں وہیں آئے گی چاہے تم مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔

بعض اوقات مغرور انسان ان تمام عینی حقائق اور واقعیتوں کو آنکھ سے دیکھنے کے باوجود خود خواہی اور حب دنیا کی وجہ سے بالکل ہی بھلا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ قسم کھانے لگتا ہے کہ میں تو عمر جاودانی رکھتا ہوں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال": کیا تم ہی نہیں تھے، جو پہلے یہ قسم کھایا کرتے تھے، کہ تمہارے لیے ہرگز فنا و زوال نہیں ہے"؟ (حجر - ۴۴)

لیکن چاہے وہ قسم کھائے یا نہ کھائے، وہ یقین کرے یا نہ کرے، موت ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شخص کو دامن گیر ہوگی اور اس سے راہِ فرار نہیں ہے۔

اس کے بعد نفخ صور کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "صور پھونکا جائے گا، اور وہ دن وحشتناک وعدوں کے پورا ہونے کا دن ہے" (ونفخ فی الصور ذالک یوم الوعید)۔

"نفخ صور" سے مراد وہی "دوسرا نفخ" ہے، کیونکہ - جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ دو مرتبہ "صور" پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ جسے "نفخۂ" فزع" یا "صعق" کہتے ہیں، وہ نفخہ ہے جو اس عالم کے اختتام پر صورت پذیر ہوگا، اور تمام انسان اس کے سننے سے مر جائیں گے اور عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور دوسرا نفخہ جو "قیام" و "جمع" و "حضور" کا نفخہ ہے، وہ نفخہ ہے جو قیامت کے آغاز میں انجام پائے گا، جس سے تمام انسان زندہ ہو جائیں گے اور اپنی قبروں سے نکل کر حساب و کتاب کے لیے عدل الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

"نفخ" اصل میں پھونکنے کے معنی میں ہے، اور "نفخۃ" ایک بار پھونکنے" کے معنی میں ہے، اور "صور" "شیپور" (بگل) کے معنی میں ہے، جس کے ذریعہ عام طور پر فوجیوں کو جمع ہونے، یا حاضر ہونے، یا آرام کرنے یا سونے کے لیے احکام دیتے ہیں، اور "صور اسرافیل" کے بارے میں اس کا استعمال ایک قسم کا کنایہ اور تشبیہ ہے۔ جس کی تفصیل جلد ۱۹ (سورۂ زمر کی آیہ ۶۸) کے ذیل میں آئی ہے۔

بہر حال آیت کے ذیل میں (ذالک یوم الوعید) "آج عذاب کے وعدہ کا دن ہے" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ "نفخۂ صور" سے مراد یہاں وہی دوسرا نفخہ اور قیامت ہے۔

بعد والی آیت میں محشر میں ورود کے وقت انسانوں کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: "اس دن ہر انسان، (خواہ نیک ہو یا بد) عرصہ محشر میں اس حال میں وارد ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک تو ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ ہوگا" (وجاءت کل نفس معھا سائق وشھید)۔

"سائق" اُسے دادگاہ عدل الٰہی کی طرف ہانک کر لے جائے گا۔ اور "شہید" اس کے اعمال پر گواہی دے گا۔

ٹھیک اس جہان کی عدالتوں کی طرح کہ حکومت کا مامور شخص متہم کے ساتھ ہوتا ہے، اور اس کے اعمال کا شاہد گواہی دیتا ہے۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "سائق" وہ شخص ہے جو نیکوکاروں کو ہنکا کر جنت کی طرف لے جائے گا۔ اور بدکاروں کو جہنم کی طرف۔ لیکن لفظ "شہید" (شاہد و گواہ) کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی یعنی عدل الٰہی کی دادگاہ و عدالت کی طرف ہنکانا زیادہ مناسب ہے۔

اس بارے میں کہ ہنکانے والا اور شاہد فرشتوں میں سے ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور؟ طرح طرح کی تفسیریں کی گئی ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "سائق" نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہے۔ اور "شہید" سیئات (برائیاں) لکھنے والا فرشتہ ہے۔ اس طرح سے وہ ایسے فرشتے ہیں جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

ایک روایت سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ "سائق" موت کا فرشتہ ہے اور "شہید" پیغمبر اسلامؐ ہیں، لیکن یہ روایت آیات کے لب و لہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ضعیف نظر آتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سائق" وہ فرشتہ ہے، جو ہر انسان کو ہنکاتا ہے اور شہید انسان کا عمل ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "سائق" تو فرشتہ ہے اور "شہید" انسان کے بدن کے اعضاء ہیں، یا اس کا وہ نامۂ اعمال ہے جو اس کی گردن میں لٹکایا جائے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "سائق" اور "شہید" ایک ہی فرشتہ ہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے پر عطف ان دو صفات کی مغائرت کی وجہ سے ہے، یعنی اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کو دادگاہ عدل الٰہی کی طرف ہنکاتا بھی ہے اور اس کے اعمال پر گواہ بھی ہے۔

لیکن ان میں سے اکثر تفاسیر ظاہر آیت کے خلاف ہیں اور آیت کا ظاہر — جیسا کہ اکثر مفسرین نے بھی یہی سمجھا ہے یہ ہے کہ دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ آئیں گے، ایک اس کو چلائے گا اور دوسرا اس کے اعمال کی گواہی دیگا۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے، کہ بعض فرشتوں کی گواہی، قیامت کے میدان میں دوسرے گواہوں کے موجود ہونے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، مثلاً ایسے گواہ جیسے انبیاء، اعضائے بدن، نامۂ اعمال، اور وہ زمان و مکان جن میں گناہ انجام پایا ہے۔

بہرحال پہلا فرشتہ حقیقت میں "فرار" سے مانع ہے، اور دوسرا فرشتہ "انکار" سے مانع ہے۔ اور اس طرح سے ہر انسان اس دن اپنے اعمال میں گرفتار ہوگا، اور ان کی جزا و سزا سے گریز کی کوئی راہ نہ ہوگی۔

* * *

یہاں مجرموں کو یا تمام انسانوں کو خطاب ہوگا کہ تو اس عظیم دادگاہ سے غافل تھا، اور اب ہم نے تیری آنکھ سے

پردہ ہٹا دیا ہے۔ آج تیری آنکھ اور نظر تیز ہوگئی ہے" (لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید)۔

ہاں! مادی دُنیا کے پردے: امیدیں، آرزوئیں، دُنیا کے ساتھ عشق اور لگاؤ، بیوی اور اولاد، مال و مقام، سرکش ہوا و ہوس، بغض و حسد، تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی تجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آج کے دن کے لیے اسی زمانہ سے دیکھتا، جبکہ معاد و قیامت کی نشانیاں واضح تھیں، اور اس کے دلائل روشن و آشکار!

آج غفلت کا گرد و غبار بیٹھ گیا ہے، جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے ہٹ گئے ہیں، خواہشات، امیدوں اور آرزوؤں کے پردے چاک ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ جو پردۂ غیب میں مستور تھا وہ سب ظاہر ہوگیا ہے، چونکہ آج کا دن "یوم البروز" ہے، اور "یوم الشہود" اور "یوم تبلی السرائر" ہے۔

اسی بنا پر آج تیری نظر تیز ہوگئی ہے، اور تو حقائق کو اچھی طرح سے درک کر سکتا ہے۔

ہاں! حقیقت کا چہرہ پوشیدہ نہیں ہے، اور جمال یار پر پردہ نہیں ہے، لیکن راستہ کے غبار کو ہٹانا چاہیئے تاکہ اس کا دیدار کیا جا سکے۔

جمال یار ندارد حجاب و پردہ ولے　　غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

لیکن طبیعت کے کنویں میں ڈوب جانا، اور انواع و اقسام کے حجابوں میں گرفتار ہونا انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقائق کو اچھی طرح سے دیکھ سکے، لیکن وہ دن جس میں تمام تعلقات اور رشتے ختم ہو جائیں گے تو انسان طبعی طور پر ایک نیا ادراک اور نئی نگاہ پیدا کرے گا، اور اصولی طور پر قیامت کا دن حقائق کے ظہور اور آشکار ہونے کا دن ہے۔

یہاں تک کہ اس جہان میں بھی ان لوگوں کے لیے جو ان حجابوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا سکتے ہیں، اور اپنے آپ کو شہوات کی قید کے پنجہ سے رہائی دلا سکتے ہیں، ایسا ادراک و نظر پیدا ہو جاتا ہے، جس سے دنیا والے محروم ہیں۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "حدید" اصل میں "لوہے" کے معنی میں ہے، اور تیز چاقو یا تیز تلوار کے معنی میں بھی ہے، اس کے بعد اس کا تیز بینی اور تیز فہمی پر اطلاق ہونے لگا، جیسا کہ "برندہ" (کاٹنے والی) تلوار اور چھری کی صفت ہے، لیکن فارسی زبان میں زبانِ گویا اور نطقِ فصیح پر بھی برندہ کا اطلاق ہوتا ہے، اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ "بصر" سے مراد یہاں ظاہری آنکھ نہیں ہے، بلکہ وہی عقل اور دل کی آنکھ ہے۔

علی علیہ السلام روئے زمین میں خدا کی حجتوں کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

"ھجم بھم العلم علی حقیقۃ البصیرۃ، و باشروا روح الیقین، و استلانوا ما استوعرہ المترفون، وانسوا بما استوحش منہ الجاھلون، وصحبوا الدنیا بابدان ارواحھا معلقۃ بالمحل الاعلیٰ، اولئک خلفاء اللہ فی ارضہ والدعاۃ الی دینہ"

"علم و دانش نے حقیقت بصیرت کے ساتھ ان کا رُخ کیا ہے اور روح یقین کو انھوں نے لمس کیا ہے،

جس چیز کو دنیا پرست مشکل شمار کرتے ہیں، وہ ان کے لیے آسان ہے، اور جس چیز سے جاہل لوگ وحشت رکھتے ہیں اس سے اُن کو اُنس ہے، وہ اس دنیا میں ایسے بدنوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، جن کے ارواح عالم بالا سے پیوستہ ہیں، وہ زمین میں خدا کے خلفاء ہیں اور خدا کے دین کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔"[1]

چند نکات

۱۔ موت کی حقیقت

عام طور پر لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ موت ایک عدمی امر ہے اور وہ فنا کے معنی میں ہے، لیکن یہ نتیجہ ہرگز اس معنی کے ساتھ موافق نہیں ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، اور جس کی طرف دلائل عقلی رہنمائی کرتے ہیں۔

"موت" قرآن کی نظر سے ایک امر وجودی ہے، ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف ایک انتقال اور عبور ہے اسی لیے قرآن کی بہت سی آیات میں "موت" کو "توفی" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو واپس لینے اور فرشتوں کے ذریعہ رُوح کو بدن سے حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

اوپر والی آیات "وجاءت سکرة الموت بالحق" "موت کے شدائد حق کے ساتھ انسان کے پاس آتے ہیں" کی تعبیر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے[2] بعض آیات میں موت کو صراحت کے ساتھ خدا کی مخلوق شمار کیا ہے، الذی خلق الموت والحیٰوة: (ملک ۲)

اسلامی روایات میں موت کی حقیقت کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں۔

ایک حدیث میں منقول ہوا ہے کہ علی بن الحسین امام سجاد علیہ السلام سے لوگوں نے سوال کیا: "ما الموت؟ موت کیا چیز ہے؟

آپؑ نے جواب میں فرمایا:

"للمؤمن کنزع ثیاب وسخة قملة، وفک قیود، واغلال ثقیلة، والاستبدال بافخر الثیاب، واطیبها روائح، واوطی المراکب وانس المنازل۔

---

[1] نہج البلاغہ "کلمات قصار" کلمہ ۱۲۷۔

[2] اس بارے میں کہ "بالحق" میں "با" کے کیا معنی ہیں؛ مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں، بعض نے اس کو "با" تعدیہ" لیا ہے اور حق کو موت کے معنی میں، جس سے اس جملہ کا معنی یہ ہوگا۔ سکرات موت اس مطلب کو جو ایک حقیقت ہے۔ یعنی موت۔ کو ساتھ لاتے ہیں، اور کبھی اس کو "ملابست کے معنی میں" لیتے ہیں یعنی "سکرات موت حق کے ساتھ آپہنچے ہیں"۔

" وللكافر كخلع ثياب فاخرة، والنقل من منازل انيسة، و والاستبدال باوسخ الثياب واخشنها واوحش المنازل، واعظم العذاب!:

" مومن کے لیے تو ایسا ہے جیسے کہ میلا کچیلا جوڑوں سے پُر لباس اتار پھینکنا، اور بھاری طوق و زنجیر کھولنا، اور اس کو بہترین لباس، بہترین خوشبوؤں کے عطروں، اور تیز رفتار سواریوں اور بہترین منزلوں سے بدل لینا، اور کافر کے لیے ایسا ہے جیسے کہ فاخرہ لباس کو اتارنا اور مانوس منازل سے منتقل ہو کر میلے کچیلے اور سخت ترین لباس کو تبدیل کرنا، اور وحشت ناک ترین منازل اور بزرگ ترین عذاب میں منتقل ہو جانا"

امام محمد بن علیؑ سے بھی یہی سوال ہوا تھا تو آپؑ نے فرمایا:

" هو النوم الذى يأتيكم كل ليلة الا انه طويل مدته، لا ينتبه منه الا يوم القيامة"

" موت وہی نیند ہے جو ہر رات تمہیں آتی ہے، مگر یہ کہ اس کی مدت طولانی ہے اور انسان اس سے قیامت کے دن تک بیدار نہیں ہوتا۔[1]

ہم نے برزخ سے مربوط مباحث میں بیان کیا ہے، کہ برزخ میں اشخاص کی حالت مختلف ہے، بعض جیسے سوئے ہوئے ہیں، اور بعض (شہدائے راہ خدا اور قوی الایمان مومنین کی مانند) طرح طرح کی نعمتوں میں غرق ہوں گے، جابر اور اشقیاء کی جماعت عذاب میں گرفتار ہوگی۔

امام حسین بن علی سید الشہداء علیہ السلام نے بھی کربلا میں عاشور کے دن اور جنگ کے شدت اختیار کرنے کے وقت موت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر اپنے اصحاب سے بیان فرمائی تھی:

" صبرًا بنى الكرام! فما الموت الا قنطرة تعبر بكم عن البؤس والضراء الى الجنان الواسعة، والنعيم الدائمة، فايكم يكره ان ينتقل من سجن الى قصر، وما هو لاعدائكم الا كمن ينتقل من قصر الى سجن وعذاب، ان ابى حدثنى عن رسول الله (ص) ان الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر، والموت جسر هؤلاء الى جنانهم، وجسر هؤلاء الى جحيمهم:

" صبر کرو! اے کریم اور بزرگوار لوگوں کے بیٹو! موت تو صرف ایک پل ہے جو تمہیں تکلیفوں اور ناراحتیوں اور

---

[1] بحار الانوار جلد ۶، ص ۵۵ (ظاہراً امام محمد بن علی سے مراد نویں امام امام جواد ؑ ہیں۔

رنج والم سے بہشت کے وسیع باغات اور جاودانی نعمتوں کی طرف منتقل کردیتی ہے، تم میں سے کون ایسا ہے، جو زندان سے قصر میں منتقل ہونے سے تکلیف میں ہو، لیکن تمہارے دشمنوں کی مثال اس شخص کی مانند ہے جسے قصر سے زندان اور عذاب کی طرف منتقل کریں۔ میرے باپ نے رسولؐ خدا سے نقل فرمایا کہ دنیا مومن کے لیے زندان ہے اور کافر کے لیے بہشت اور موت اُن کے لیے تو جنت کے باغات کے لیے ایک پل ہے اور ان کے لیے جہنم کا پل ہے۔ [1]

ایک اور حدیث میں منقول ہوا ہے کہ: امام موسیٰ بن جعفرؑ ایک ایسے شخص کے پاس گئے جو سکرات موت میں مبتلا تھا، اور کسی شخص کو جواب نہیں دیتا تھا، لوگوں نے عرض کیا، اے فرزند رسول (ص)، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ موت کی حقیقت کی ہمارے لیے تشریح فرمائیے اور ہمیں بتائیے کہ ہمارا بیمار اب کس حالت میں ہے؟

آپؑ نے فرمایا: "موت تصفیہ کا ایک ذریعہ ہے۔" جو مومنین کو گناہ سے پاک کرتی ہے، اور اس جہاں کی آخری تکلیف اور ناراحتی ہے اور ان کے گناہوں کا آخری کفارہ ہے، جب کہ کافروں کو ان کی نعمتوں سے جدا کرتی ہے، اور وہ آخری لذت ہے جو انھیں پہنچتی ہے اور ان کے اچھے کام کا جو کبھی کبھار انجام دیا کرتے تھے۔ آخری اجر ہے، باقی رہا تمہارا یہ شخص جو حالتِ احتضار میں ہے تو وہ کلی طور پر گناہوں سے پاک ہو چکا ہے اور معاصی سے خارج ہو چکا ہے، اور خالص ہو گیا ہے جس طرح سے کہ میلا کچیلا لباس دھونے سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور اس نے ابھی سے یہ شائستگی اور لیاقت پیدا کر لی ہے کہ وہ ہمیشہ کے گھر میں ہم اہل بیت کی معاشرت میں رہے۔" [2]

* * *

۲۔ سکرات موت

اوپر والی آیت میں "سکرات موت" کے بارے میں گفتگو تھی، اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ "سکرات" "سکرۃ" کی جمع ہے، اور اور وہ اس حالت کے معنی میں ہے، جو شدت حادثہ کے زیر اثر مستی کے مشابہ انسان کو عارض ہوتی ہے اور اس کو سخت مضطرب کر دیتی ہے لیکن وہ مستی نہیں ہوتی،

یہ ٹھیک ہے کہ موت مومنین کے لیے ایک وسیع تر اور مواہب الٰہیہ سے پُر جہان کی طرف انتقال کا آغاز ہے۔ لیکن اس کے باوجود انتقال کی یہ حالت کسی بھی انسان کے لیے آسان نہیں ہے، کیونکہ روح سالہا سال سے اس بدن کے ساتھ خوگر رہی ہے اور اس کے ساتھ تعلق رکھا ہے۔

اسی لیے جب امام صادق علیہ السلام سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جب روح بدن سے خارج ہوتی ہے تو انسان تکلیف

---

[1] معانی الاخبار ص ۲۸۹ باب معنی الموت حدیث ۳۔

[2] معانی الاخبار ص ۲۸۹ باب معنی الموت۔

کیوں محسوس کرتا ہے تو آپ نے فرمایا: لانہ نمی علیھا البدن: "اس بنا پر کہ بدن کی نشوونما اسی کے ساتھ ہوئی ہے"[1]
یہ ٹھیک اس طرح ہے کہ ایک فاسد دانت کو منہ سے نکال دیں تو یقیناً اس کے بعد سکون و آرام ہوتا ہے۔ لیکن جدائی کا لمحہ دردناک ہوتا ہے۔

بعض اسلامی روایات میں آیا ہے کہ تین دن انسان کے لیے وحشتناک ہوتے ہیں: ایک وہ دن جس میں وہ پیدا ہوا اور اس ناآشنا عالم کو دیکھتا ہے، اور ایک وہ دن جس میں وہ مرتا ہے، اور موت کے بعد والے عالم کا مشاہدہ کرتا ہے، اور ایک وہ دن جس میں وہ عرصہ محشر میں وارد ہوگا، اور ایسے احکام دیکھے گا جو دُنیا میں نہیں تھے، اسی لیے خداوند عالم یحییٰ بن زکریا کے بارے میں فرماتا ہے:
"وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیّاً"[2] اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبانی بھی اس کے مشابہ گفتگو کو نقل کرتا ہے، اور ان دو پیغمبروں کو ان تین دنوں میں اپنی عنایت کا مشمول قرار دیتا ہے،[3]
لیکن یہ مسلم ہے کہ جو لوگ اس دُنیا کے ساتھ خاص علاقہ رکھتے ہیں، اس سے ان کا انتقال بہت ہی زیادہ سخت ہے، اور اس سے دل کو توڑنا جس کے ساتھ ان کو لگاؤ ہے زیادہ مشکل ہے، علاوہ ازیں جو لوگ زیادہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، سکرات موت اُن کے لیے زیادہ شدید اور زیادہ دردناک ہے۔

۳۔ موت حق ہے

نہ صرف زیر بحث آیات میں "سکرات موت" کا "حق" کے ساتھ تعارف ہوا ہے، بلکہ دوسری متعدد آیات میں موت کو حق کہا گیا ہے۔ سُورۂ حجر کی آیہ ۹۹ میں آیا ہے: واعبد ربک حتّٰی یأتیک الیقین "اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ "یقین" (موت) تیرے پاس آجائے، (سورۂ مدثر کی آیہ ۴۷ میں بھی اس کے مشابہ تعبیر نظر آتی ہے)
یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ انسان ہر چیز کا تو انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، کہ انجام کار موت ہم سب کے گھروں کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور سب کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔
موت کی حقانیت کی طرف توجہ، تمام انسانوں کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر طریقہ پر غور و فکر اور سوچ بچار کریں، اور اس راستہ سے کہ جو ان کے آگے ہے باخبر ہوں اور اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔
قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے: ایک شخص عمر کے پاس آیا اور کہا: میں فتنہ کو دوست رکھتا ہوں،

---

[1] "بحار"، جلد ۶، ص ۱۵۸۔
[2] وہی مدرک (کچھ تغیر کے ساتھ) یحییٰ (ع) کے بارے میں سُورۂ مریم کی آیہ ۱۵ میں آیا: وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیّاً، اور حضرت مسیح کے بارے میں اسی سُورہ کی آیت ۳۳ میں آیا ہے۔ والسلام علیّ یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیّاً مجھ پر سلام ہو جس دن پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ ہو کر دوبارہ اُٹھایا جاؤں گا۔

اور حق سے بیزار ہوں، اور اس چیز کی گواہی دیتا ہوں جسے کبھی نہیں دیکھا۔ عمر نے اس کو قید کر دیا، یہ بات علیؑ کے کانوں تک پہنچی آپ نے فرمایا: اے عمر! اس شخص کو قید کرنا ظلم ہے، اور تو ایک ستم کا مرتکب ہوا ہے، اس نے کہا کیوں؟ آپ نے فرمایا کیونکہ وہ اپنے مال اور اولاد کو دوست رکھتا ہے۔ جنھیں خدا نے قرآن کی ایک آیت میں "فتنہ" سے تعبیر کیا ہے:

"انما اموالکم و اولادکم فتنۃ"[1] وہ موت سے بیزار ہے اور قرآن میں اسے "حق" سے تعبیر کیا گیا ہے "وجاءت سکرۃ الموت بالحق"[2] وہ خدا کی یکتائی کی شہادت دیتا ہے جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس مقام پر عمر نے کہا: لولا علی لھلک عمر، "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"[3]

---

[1] تغابن - ۱۵۔

[2] ق - ۱۹۔

[3] "تفسیر روح البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۱۸۔

۲۳۔ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝

۲۴۔ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝

۲۵۔ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝

۲۶۔ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝

۲۷۔ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ۝

۲۸۔ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝

۲۹۔ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

۳۰۔ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝

ترجمہ

۲۳۔ اس کا ہمنشین فرشتہ کہتا ہے، یہ اس کا نامہ اعمال ہے، جو میرے پاس حاضر اور تیار ہے۔

۲۴۔ (خدا حکم دے گا) جہنم میں ڈال دو، ہر کافر متکبر اور ہٹ دھرم کو۔

۲۵۔ وہ شخص جو شدت کے ساتھ خیر سے مانع ہے، متجاوز ہے، اور شک میں پڑا ہوا ہے، (یہاں تک کہ دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا ہے)

۲۶۔ وہ شخص کہ جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار دے دیا ہے (ہاں) اُسے شدید عذاب میں ڈال دو۔

۲۷۔ اور شیاطین میں سے اس کا ہمنشین کہے گا: پروردگارا! میں نے اُسے سرکشی کے لیے نہیں اُبھارا تھا، لیکن وہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔

۲۸۔ خدا کہے گا، میرے پاس جدال و مخاصمت نہ کرو، میں نے تو پہلے ہی تم پر اتمام حجت کر دیا ہے۔

۲۹۔ میرا کلام تغیر ناپذیر ہے، اور میں کبھی بھی اپنے بندوں پر ستم نہیں کروں گا۔

۳۰۔ اس دن کو یاد کرو، جب ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو پُر ہو گئی؟ اور وہ کہے کیا اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔

تفسیر

فرشتوں اور شیاطین میں سے انسان کے ہمنشین

ان آیات میں پھر معاد و قیامت کے ایک اور منظر کی تصویر کشی ہوئی ہے، ایک ایسا ہلا دینے والا منظر کہ انسان کا قرین فرشتہ اس کے اعمال اور کرتوتوں کو کھول کر رکھ دے گا، اور اس کی سزا کے لیے خدا کا حکم صادر ہو جائے گا۔

پہلے فرماتا ہے: "اس کا قرین کہے گا یہ اس کا اعمال نامہ ہے، جو میرے پاس حاضر اور تیار ہے" اور وہ اس کے تمام چھوٹے بڑے کاموں سے جو اس نے ساری عمر میں کیے ہیں پردہ اُٹھا دے گا، (وقال قرینہ ھذا ما لدی عتید)۔

اس سلسلے میں کہ یہاں "قرین" سے کون مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ لیکن اکثر نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتہ ہے جو دُنیا میں انسان کے ہمراہ تھا، اور اس کے اعمال کو ضبط کرنے پر مامور تھا اور وہ دادگاہ عدل الٰہی میں گواہی دے گا۔

گذشتہ آیات جو یہ کہتی تھیں کہ جو شخص بھی عرصۂ محشر میں وارد ہوگا، اس کے ساتھ ایک "سائق" اور "شہید" ہوگا۔ وہ بھی اس معنی پر گواہ ہے، علاوہ ازیں اس آیت اور اس کی بعد والی آیت کا لب و لہجہ بھی اس معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ (غور کیجیے)

لیکن بعض نے کہا ہے کہ "قرین" سے مراد یہاں "شیطان" ہے کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ لفظ اس شیطان کے لیے جو مجرموں کا ہمنشین ہے اطلاق ہوا ہے، اس تفسیر کی بنا پر آیت کا معنی اس طرح ہوگا، "اس کا ہمنشین شیطان کہے گا: میں نے اس مجرم کو جہنم کے لیے آمادہ کیا ہے، اور انتہائی کوشش جو میں کر سکتا تھا وہ میں نے اس کام میں صرف کی ہے۔"

لیکن یہ معنی نہ صرف گذشتہ آیات سے، اور اس آیت سے جو اس آیت کے بعد بلا فاصلہ آئی ہے۔ مناسب نہیں ہے، بلکہ شیطان کا انسانوں کے گمراہ کرنے کے گناہ سے خود کو بری کہنا، جو بعد کی چند آیات میں آئے گا۔ اس کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے، کیونکہ اس تفسیر کے مطابق شیطان مجرموں کے اغوا کرنے میں اپنی ذمہ داری کا اعتراف کر رہا ہے، جبکہ آگے آنے والی آیات میں یہ آیا ہے، "قال قرینہ ربنا ما اطغیتہ ولکن کان فی ضلالٍ بعید:" اس کا قرین کہے گا، میں نے اُسے سرکشی کے لیے نہیں اُبھارا تھا لیکن وہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔" اور یہ پورے طور پر اس کے ساتھ تضاد رکھتی ہے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی بیان ہوئی ہے جو سب سے زیادہ بعید نظر آتی ہے، اور کوئی بھی قرینہ اس پر گواہی نہیں دیتا، اور وہ یہ ہے کہ قرین سے مراد انسان کے دوست و احباب اور ہمنشین ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد خدا ثبت اعمال پر مامور دو فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "جہنم میں ڈال دو ہر متکبر خود خواہ اور ہٹ دھرم کافر کو" (القیا فی جھنم کل کفار عنید)۔

"عنید" "عناد" کے مادہ سے تکبر، خود پسندی اور حق کو تسلیم نہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اس بارے میں کہ یہ دو افراد جو اس گفتگو کے مخاطب ہیں کون ہیں؟ پھر طرح طرح کی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک گروہ نے اوپر والی تفسیر کو انتخاب کیا ہے، جبکہ بعض نے خازنانِ جہنم (وہ دو نفر جو جہنم پر مامور ہیں) کو مخاطب سمجھا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ہو سکتا ہے مخاطب صرف ایک ہی شخص ہو، وہی شہید و گواہ جو مجرم کے ہمراہ عرصۂ محشر میں وارد ہوگا، اور جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور فعل کو تاکید کے لیے تثنیہ لایا گیا ہے۔ گویا دو مرتبہ تکرار کرتا ہے۔ "القٰ" "القٰ" پھینک دے "پھینک دے" ..... اور مخاطب واحد کے لیے تثنیہ کا استعمال عربی زبان میں موجود ہے۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے، اور پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں ان کفار عنید" کی چند قبیح اور مذموم صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ شخص شدت کے ساتھ خیر سے مانع ہے، متجاوز ہے اور شک و تردید میں گرفتار ہے، بلکہ دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا ہے" (مناع للخیر معتد مریب)۔

"مناع" چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا اس شخص پر بولا جاتا ہے جو کسی چیز سے بہت زیادہ منع کرے، اس بنا پر "مناع للخیر" وہ شخص ہے جو ہر صورت میں ہر کارِ خیر کا مخالف ہو۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت " ولید بن مغیرہ" کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ اپنے بھتیجوں سے کہتا تھا، جو شخص تم میں سے اسلام قبول کرے گا تو میں جب تک زندہ ہوں اس کی مدد نہیں کروں گا۔" [1]

"معتد" متجاوز کے معنی میں ہے، چاہے وہ دوسرے لوگوں کے حقوق میں متجاوز ہو، یا احکام الٰہی کی حدود سے تجاوز کرے۔

"مریب" "ریب" کے مادہ سے اس شخص کے معنی میں ہے، جو شک میں پڑا ہوا ہو۔ ایسا شک جو بدبینی کے ساتھ ہو، یا جو دوسروں کو اپنی گفتار و عمل کے ساتھ شک میں ڈالتا ہے، اور ان کی گمراہی کا باعث بنتا ہے۔

اس گروہ عنید کے اوصاف کو جاری رکھتے ہوئے بعد والی آیت میں پھر مزید کہتا ہے: " وہی شخص جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیا ہے، اور اس نے شرک اور دو گانگی کی راہ اختیار کرلی ہے" (الذی جعل مع اللہ الٰھا آخر)۔

ہاں "اس قسم کے شخص کو عذاب شدید میں ڈال دو" (فالقیاہ فی العذاب الشدید)۔

ان چند آیات میں اس دوزخی گروہ کی چھ صفات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے پانچ پہلی حقیقت میں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں، اور چھٹی ان تمام اوصاف کی اصل جڑ کی توضیح ہے، کیونکہ:

"کفار" اس شخص کے معنی میں ہے جو کفر میں بہت زیادہ اصرار کرتا ہے۔

اور یہ عناد پر منتہی ہوتا ہے۔

شخص معاند بھی منع خیرات پر اصرار کرتا ہے اور اس قسم کا آدمی طبعاً و فطرتاً دوسروں کے حقوق اور حدود الٰہی پر تجاوز کرتا ہے، افراد متجاوز یہ اصرار کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی شک میں ڈال دیں اور ان سے ایمان کو سلب کرلیں۔

اس طرح سے پانچوں صفتیں "کفار" و "عنید" و "مناع للخیر" و "معتد" اور "مریب" ایک دوسرے کے ساتھ نہ ٹوٹنے والا رشتہ رکھتی ہیں، گویا ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں [2]

چھٹی صفت یعنی "الذی جعل مع اللہ الٰھا آخر" میں ان تمام انحرافات کی اصلی جڑ بنیاد جو شرک ہے بیان ہوئی ہے، کیونکہ دقت کے ساتھ واضح ہوجاتا ہے کہ شرک ان تمام بدبختیوں کا عامل ہے۔

بعد والی آیت اس کافر ہٹ دھرم گروہ کی سرنوشت کے ایک دوسرے ماجرے سے پردہ اٹھاتی ہے، اور وہ قیامت میں ان کا شیطان کے ساتھ مخاصمہ، جھگڑا اور بحث ہے، وہ تو اپنے تمام گناہ اغوا کرنے والے شیطانوں کی گردن میں

---

[1] "روح المعانی" جلد ۲۶ ص ۱۸۰۔

[2] "المیزان" جلد ۲۰ صفحہ ۳۸۱۔

ڈالتے ہیں، "لیکن اس کا قرین شیطان کہے گا، پروردگارا! میں نے اسے طغیان اور سرکشی کے لیے آمادہ نہیں کیا تھا، اور اسے جبراً اس راستہ پر نہیں لایا تھا، اس نے خود ہی اپنے میل وارادہ سے اس راستہ کو اختیار کیا ہے۔ اور وہی دُور دراز کی گمراہی میں تھا" (قال قرینہ ربنا ما اطغیتہ ولکن کان فی ضلال بعید)۔

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ ابراہیم کی آیہ ۲۲ میں آئی ہے، کہ شیطان اپنی برأت کے لیے کہے گا: وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلومونی ولوموا انفسکم: "میرا تم پر کسی قسم کا کوئی تسلط نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے اُسے قبول کر لیا، اس بنا پر مجھے سرزنش نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو سرزنش کرو"

البتہ شیطان یہ نہیں چاہتا کہ انسان کے اغوا کرنے میں اپنے نقش واثر کا کلی طور پر انکار کر دے، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس بات کو ثابت کرے کہ اس میں کوئی جبر واکراہ نہیں تھا، اور انسان نے اپنے میل ورغبت سے اس کے وسوسوں کو قبول کیا ہے، اس بنا پر "لاغوینھم اجمعین" میں ان تمام کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا" (ص - ۸۲) والی آیت کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے۔

اگرچہ ان آیات میں صرف شیطان کے دفاع کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور شیطان پر کفار کے اعتراض کے بارے میں کوئی گفتگو نظر نہیں آتی، لیکن قرآن کی باقی آیات اور بعد والی آیت کے قرینہ سے طرفین کی گفتگو اجمالی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قیامت میں ایک دوسرے کے ساتھ کھینچا تانی اور بحث مباحثہ کریں گے، کیونکہ بعد والی آیت میں آیا ہے: "خدا فرماتا ہے: میرے پاس جدال ومخاصمت نہ کرو، میں نے پہلے سے تم پر اتمام حجت کر دیا ہے" اور تمھیں اس منحوس سرنوشت سے باخبر کر دیا ہے" (قال لا تختصموا لدی وقد قدمت الیکم بالوعید)[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو میں نے شیطان سے کہا ہے: اذھب فمن تبعک منھم فان جھنم جزاؤکم جزاء موفورا: "جا! ان میں سے جو کوئی بھی تیری اتباع کرے گا، تو تم سب کی وافر سزا جہنم ہے" (اسراء - ۶۳)

اور دوسری طرف سے انسانوں کو بھی خبردار کر دیا ہے: لاملئن جھنم منک وممن تبعک منھم اجمعین: "یقیناً میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے پُر کر دوں گا" (ص - ۸۵)

یہ تہدیدیں اور وعیدیں قرآن کی دوسری آیات میں بھی آئی ہیں اور وہ سب اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ خدا نے انسانوں پر بھی اور شیاطین پر بھی اتمام حجت کر دیا تھا، اور انھیں گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے سے ڈرایا تھا۔

اس کے بعد اور زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "میری بات تغیر ناپذیر ہے، اور میرے کسی کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی، اور

---

[1] "لدی" "یبدل" سے متعلق ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ قول سے متعلق ہونا چاہیئے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

میں ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کروں گا" (ما یبدّل القول لدیّ و ما انا بظلام للعبید)[1]

یہاں "قول" سے مراد وہی تہدیدیں اور وعیدیں ہیں، جن کی طرف خدا نے مختلف آیات میں اشارہ کیا ہے، اور ان کے کچھ نمونے ہم نے اُوپر پیش کیے ہیں۔

"ظلام" کی تعبیر "صیغہ مبالغہ" کی شکل میں (بہت ظلم کرنے والا) جبکہ خدا معمولی سے معمولی ظلم بھی نہیں کرتا، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا کا مقام علم و قدرت و عدل اس قسم کا ہے کہ اگر وہ کوئی چھوٹا سا ظلم بھی کسی پر کرے تو وہ بہت بڑا اور زیادہ ہوگا، اور "ظلام" کا مصداق ہوگا، اسی بنا پر وہ ہر قسم کے ظلم سے دُور ہے۔

یا افراد و مصادیق کی طرف ناظر ہے، کیونکہ اگر وہ کسی بندے پر کوئی چھوٹا سا ظلم بھی کرے تو اس کے مشابہ افراد بہت ہیں اور مجموعی طور پر بہت سا ظلم ہو جائے گا۔

بہرحال یہ تعبیر بندوں کے اختیار اور ارادے کی آزادی کی دلیل ہے، نہ تو شیطان مجبور ہے کہ شیطنت کرے اور نہ ہی کفار مجبور ہیں کہ راہ کفر و عناد اور راہ شیطان کو اختیار کریں، اور نہ ہی کسی شخص کے لیے اس کے قصد و ارادہ سے باہر قطعی سرنوشت مقرر ہوئی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے، کہ وہ یہ کیسے فرماتا ہے: میری بات تغیر ناپذیر ہے، جبکہ بعض لوگ اس کے عفو و درگزر اور بخشش کے مشمول ہوتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے، کہ عفو و بخشش بھی حساب شدہ پروگرام کے مطابق ہی ہوتی ہے، اور اس بات کی فرع ہے کہ انسان نے کوئی ایسا کام انجام دیا ہو، جس سے وہ مجرم ہونے کے ساتھ ساتھ عفو و بخشش کی قابلیت اور شائستگی بھی رکھتا ہو اور یہ بات خود خدا کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، کہ وہ لوگ جو عفو و بخشش کے لائق ہیں انھیں اپنی عفو کا مشمول قرار دے اور یہ بات بھی تغیر ناپذیر ہے۔

❊ ❊ ❊ ❊

آخری زیر بحث آیت میں حوادث قیامت کے ایک مختصر اور ہلا دینے والے حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اس وقت کو یاد کرو جب ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو پُر ہو گئی؟ اور وہ جواب میں کہے گی: کیا اس سے زیادہ بھی کچھ موجود ہے" (یوم نقول لجہنم ہل امتلأت وتقول ہل من مزید)[2]

اس سلسلے میں کہ "ہل من مزید" سے کیا مراد ہے؟ دو تفاسیر کی گئی ہیں، پہلی یہ کہ یہ استفہام انکاری ہے،

---

[1] "لدی" "یبدل" سے متعلق ہے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ قول سے متعلق ہونا چاہیئے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

[2] اس بارے میں کہ یہاں "یوم" کس سے متعلق ہے؟ تین نظریئے پائے جاتے ہیں، پہلا یہ کہ "اذکروا" محذوف سے متعلق ہے اور اس کا مخاطب تمام انسان ہیں، دوسرا یہ کہ "یبدل" سے متعلق ہے اور تیسرا یہ کہ "ظلام" سے متعلق ہے، جو اس سے پہلے والی آیت میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

یعنی جہنم کہے گی: اس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے، تو اس طرح سے یہ سورہ سجدہ کی آیت ۱۳ کے ساتھ جو یہ کہتی ہے: لاملئن جہنم من الجنۃ والناس اجمعین"؛ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے پُر کر دوں گا" کامل طور سے ہم آہنگ ہے، اور اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ اس دن تہدید الٰہی کامل طور سے پوری ہو جائے گی اور دوزخ کافروں اور مجرموں سے بھر جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس جملہ سے مراد اور زیادہ کی طلب ہے، یعنی "کیا اور افراد بھی ایسے ہوں گے، جو دوزخ میں آئیں گے"؟ اور اصولی طور پر ہر چیز کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ہم جنس کی تلاش میں رہتی ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتی، نہ بہشت نیکو کاروں سے اور نہ ہی دوزخ بدکاروں سے۔

لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے، کہ اس بات کا مفہوم تو یہ ہے کہ دوزخ ابھی تک پُر نہیں ہوئی اور یہ چیز اوپر والی آیت (سورۂ سجدہ۔ آیہ ۱۳) سے جو یہ کہتی ہے: ہم دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے پُر کر دیں گے: سازگار نہیں ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ زیادتی کا مطالبہ پُر نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، کیونکہ "اوّلاً" ممکن ہے، کوئی ظرف مثلاً غذا سے پُر ہو، پھر بھی کوئی تمنا کرے کہ اس کے اُوپر اور ڈالا جائے کہ وہ چھلکنے لگے؛ "ثانیاً" یہ تقاضا ممکن ہے دونوں پر مکان کے تنگ ہونے اور زیادہ دردناک عذاب کے تقاضا کے معنی میں ہو، یا وسعت پانے اور اس کے بعد بہت سے افراد کو اپنے اندر قبول کرنے کی تمنا مراد ہو۔

بہرحال یہ آیت اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دوزخی بہت زیادہ ہیں اور دوزخ ایک ہولناک اور وحشتناک منظر رکھتی ہے اور خدا کی تہدید واقعی اور یقینی ہے، اور ایسی ہے کہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا ہر انسان کو لرزہ بر اندام کر دیتا ہے، اور اس کو خبردار کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن افراد میں سے ایک تو ہو، اور یہی فکر اُسے چھوٹے بڑے گناہوں سے کنٹرول کر سکتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دوزخ جس میں کچھ بھی شعور نہیں ہے، کیسے اس سے خطاب کیا جاتا ہے اور وہ جواب دیتی ہے؟

اس سوال کے تین جواب ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ ایک قسم کی تشبیہ اور زبان حال کا بیان ہے، یعنی خدا "تکوینی" زبان میں جہنم سے سوال کرے گا، اور وہ بھی "زبان حال" سے جواب دے گی اور اس تعبیر کی نظیر مختلف زبانوں میں فراواں ہے۔

دوسرا یہ کہ آخرت کا گھر حیات و زندگی واقعی کا گھر ہے، یہاں تک کہ بہشت اور جہنم جیسی موجودات بھی ایک قسم کی حیات اور ادراک و شعور رکھتی ہوں گی، بہشت شدت سے مؤمنین کی مشتاق ہوگی اور دوزخ شدت کے ساتھ مجرموں کے انتظار میں ہوگی۔

وہ مقام جہاں انسان کے بدن کے اعضاء کلام اور گفتگو کرنے لگیں گے، اور شہادت اور گواہی دیں گے وہاں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ بہشت و دوزخ اس طرح ہوں۔

بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق اس دُنیا کے تمام ذرات بھی ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اسی لیے وہ خدا کی

حمد و تسبیح کرتے ہیں اور ان کی یہ تسبیح و حمد قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے۔ [1]

دوسرا یہ کہ مخاطب دوزخ پر مامور اور اس کے خازن ہیں اور وہی ہیں جو جواب دیں گے۔

یہ سب تفسیریں قابل قبول ہیں اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۲ ص ..... (سورہ اسراء کی آیت ۴۴ کے ذیل میں رجوع کریں)

۳۱۔ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ○
۳۲۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ○
۳۳۔ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ○
۳۴۔ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ط ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ○
۳۵۔ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ○
۳۶۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ط هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ○
۳۷۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ○

ترجمہ

۳۱۔ (اس دن) بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک ہو جائے گی، اور ان میں کوئی فاصلہ نہیں ہوگا۔
۳۲۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، اور (یہ وعدہ) ان لوگوں سے بھی ہے جو خدا کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے عہد و پیمان اور احکام کی حفاظت کرتے ہیں۔
۳۳۔ وہ شخص جو خدائے رحمٰن سے پوشیدہ طور سے ڈرے، اور توبہ و انابہ سے پُر

دل کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہو۔

۳۴۔ (ان سے کہیں گے) سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ، آج کا دن ہمیشگی کا دن ہے۔

۳۵۔ جو کچھ وہ چاہیں گے وہاں ان کے لیے موجود ہوگا، اور ہمارے پاس دوسری مزید نعمتیں بھی ہیں (جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی۔

۳۶۔ کتنی ہی بہت سی ایسی اقوام ہیں، جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا ہے، ایسی اقوام جو اُن سے زیادہ طاقتور تھیں اور شہروں اور (ملکوں) کو انھوں نے فتح کیا تھا، کیا فرار کی کوئی جگہ ہے؟

۳۷۔ یہ اس شخص کے لیے، جو عقل رکھتا ہے، یا کان دھر کے سُنتا ہے اور دل سے حاضر ہے، ایک تذکر اور نصیحت ہے۔

تفسیر

اے مجرمو! فرار کی کوئی راہ نہیں ہے!

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کے مباحث عام طور پر مسئلہ معاد اور اس سے مربوط امور کے محور کے گرد چکر لگاتے ہیں، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گذشتہ آیات میں ہٹ دھرم کفار کے جہنم میں پھینکنے، اور ان کے شدت عذاب کی کیفیت، اور ان صفات کے متعلق جو انھیں دوزخ کی طرف کھینچ لے گئے تھے، گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں ایک اور منظر کی تصویر کشی کرتا ہے، کامل احترام کے ساتھ پرہیزگاروں کے جنت میں داخل ہونے کا منظر، اور بہشت کی انواع و اقسام کی نعمتوں اور ان صفات کی طرف اشارہ جو انسان کو بہشتیوں کی صف میں قرار دیتی ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرنے سے حقائق زیادہ واضح اور روشن ہو جائیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اس دن بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک ہو جائے گی اور ان سے اس کا کوئی فاصلہ نہیں ہوگا

(و ازلفت الجنة للمتقين غير بعيد)۔

"ازلفت" "زلفیٰ" (بروزن کبریٰ) کے مادہ سے قرب و نزدیکی کے معنی میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہتا کہ پرہیزگاروں کو جنت کے قریب کریں گے، بلکہ یہ کہتا ہے کہ جنت کو ان کے قریب کریں گے! یہ ایک ایسا مطلب ہے، جو اس دُنیا کے حالات کو مدنظر رکھتے ہُوئے قابلِ تصور نہیں ہے، لیکن اس بنا پر کہ دارِ آخرت کے اصول کچھ ایسے ہیں جو اس جہان کے حالات سے بہت مختلف ہیں، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ خدا پرہیزگار مومنین کے انتہائی اکرام و احترام کی بنا پر بجائے اس کے کہ انھیں جنت کی طرف لے جائے، جنت کو ان کی طرف لے آئے گا،!

سُورۂ شعراء کی آیت ۹۰ و ۹۱ میں آیا ہے: و ازلفت الجنة للمتقين و برزت الجحيم للغاوين: اس دن جنت پرہیزگاروں کے قریب کردی جائے گی، اور دوزخ کو گمراہوں کے لیے آشکار و ظاہر کریں گے،

اور یہ خدا کا مومن بندوں پر انتہائی لطف و کرم ہے، جس سے بالاتر کا تصور نہیں ہوسکتا۔

"غیر بعید" کی تعبیر بھی تاکید کے عنوان سے ہے۔ [1]

بہرحال آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مسئلہ قیامت میں واقع ہوگا۔ اگرچہ تعبیر فعل ماضی (ازلفت) کے ساتھ ہوئی ہے، کیونکہ وہ یقینی حوادث جو مستقبل میں واقع ہوں، بہت سی تعبیروں میں فعل ماضی کی صورت میں بیان ہوتے ہیں، لیکن بعض نے اس کا واقعات ماضی کے ساتھ معنی کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ جنت کا پرہیزگاروں کے نزدیک ہونا دُنیا میں حاصل ہو چکا ہے، کیونکہ جنت کے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اِدھر وہ دُنیا سے جائیں گے اور اُدھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

لیکن قبل و بعد کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہُوئے جو قیامت کے منظر کی گفتگو کر رہی ہیں، یہ معنی بعید نظر آتا ہے اور مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

اس کے بعد بہشتیوں کے اوصاف کی تفصیل بتاتا ہے: "یہ وہ جنت ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، اور یہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو خدا کے حکم کی اطاعت کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے عہد و پیمان اور احکام کی حفاظت کرتے ہیں" (هذا ما توعدون لكل اواب حفيظ)۔

یہاں ان کے اوصاف میں سے دو اوصاف کی طرف اشارہ ہُوا ہے،

"اواب" اور "حفیظ"

"اواب" "اوب" (بروزن ذوب) کے مادہ سے بازگشت کے معنی میں ہے، جو ممکن ہے چھوٹے بڑے گناہوں

---

[1] "غیر بعید" ممکن ہے کہ "ظرف" ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ "حال" ہو، یا صفت ہو محذوف مصدر کی اور تقدیر میں "ازلافا غیر بعید" ہو۔

سے توبہ کے معنی میں ہو یا اس کی اطاعت کی طرف بازگشت کے معنی میں ہو، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ "مبالغہ کا صیغہ" ہے: یہ نشاندہی کرتا ہے، کہ بہشتی ایسے پرہیزگار لوگ ہیں کہ جو عامل بھی انھیں خدا کی اطاعت سے دُور کرتا ہو، وہ اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس کی اطاعت کی طرف لوٹ آتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں سے توبہ کرتے ہیں تاکہ نفس مطمئنہ کے مقام تک پہنچ جائیں۔

"حفیظ" محافظ اور نگران کے معنی میں ہے، کیا اس سے مراد خدا کے عہد و پیمان کی حفاظت ہے، جو اس نے انسانوں سے لیا ہے۔ کہ اس کی اطاعت کریں اور شیطان کی عبادت نہ کریں (یٰس۔ ۶۰) یا خدا کے قوانین اور حدودِ الٰہی کی حفاظت؟ یا گناہوں کو چھوڑنا اور انھیں توبہ کے لیے یاد رکھنا اور ان کی تلافی کرنا؟ یا یہ سب امور؟۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ حکم مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے۔ آخری تفسیر جو جامعیت رکھتی ہے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ان اوصاف کو جاری رکھتے ہوئے۔ جو حقیقت میں گذشتہ اوصاف کی تفسیر و توضیح ہیں۔ بعد والی آیت میں ان کے دو اور اوصاف کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے: "وہی شخص جو تنہائی میں خدائے رحمٰن سے ڈرے اور توبہ کرنے والے دل کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہو" (من خشی الرحمٰن بالغیب وجاء بقلب منیب)۔

پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنے کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ اس کے باوجود کہ ہرگز خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھتے، اس کے آثار میں غور کر کے اور استدلال کے طریقے سے اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ایسا ایمان جو کامل مسئولیت کے احساس سے توأم ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے، کہ لوگوں کی آنکھ سے پنہاں مراد ہو، وہ نہ صرف لوگوں کے سامنے بلکہ تنہائی اور خلوت میں بھی کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔

یہ خوف اور "خشیت" اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ ان کا دل "منیب" ہو، ہمیشہ کے لیے خدا کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی اطاعت میں آگے بڑھے، اور ہر لغزش و گناہ سے توبہ کرے۔ اس حالت کو آخر عمر تک برقرار رکھے، اور اسی حالت میں عرصۂ محشر میں وارد ہو،

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ان لوگوں میں یہ چار صفات پائی جاتی ہیں، جب بہشت ان کے نزدیک ہو جائے گی تو خدا کے فرشتے احترام و اکرام کے عنوان سے ان سے کہیں گے، سلامتی کے ساتھ جنت میں وارد ہو جاؤ" (ادخلوھا بسلام)۔

ہر قسم کی بُرائی، دکھ درد، آفت و بلا، سزا و عذاب سے مکمل جسمانی و روحانی سلامتی،

اس کے بعد ان کے اطمینان قلب کے لیے مزید کہتا ہے: "آج جاودانی اور ہمیشگی کا دن ہے، نعمتوں کی ہمیشگی، اور بہشت کی اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ ہمیشگی" (ذالک یوم الخلود)۔

ان دو نعمتوں (سلامتی کی بشارت اور ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہنے کی بشارت) کے بعد خداوند مہربان انہیں دو بشارتیں اور دیتا ہے جو مجموعی طور پر چار بشارتیں ہو جاتی ہیں، ان چار اوصاف کی طرح جو ان میں پائے جاتے تھے، فرماتا ہے: "وہ جو کچھ بھی چاہیں گے بہشت میں ان کے لیے موجود ہے" (لھم مایشاءون فیھا)۔

اور اس کے علاوہ "دوسری نعمتیں بھی ہمارے پاس موجود ہیں جو کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ کہ وہ ان کی تمنا کریں"۔ (ولدینا مزید)۔

اس سے زیادہ بہتر، عمدہ تر، اور دل پسند تعبیر کا تصور بھی نہیں ہوتا، پہلے کہتا ہے، بہشتی لوگ جو کچھ چاہیں (اس جملہ کے معنی کی وسعت کے ساتھ) انواع و اقسام کی نعمتیں بغیر کسی استثنا کے ان کے اختیار میں ہوں گی، اور ان کے علاوہ بھی ایسی نعمتیں اور مواہب ہیں، جو ہرگز کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ لیکن خداوند رحمٰن و رحیم، جس نے بہشتی پرہیزگاروں کو، اپنے خاص الطاف سے نوازا ہے۔ انھیں ان نعمتوں سے بھی بہرہ ور کرے گا اور اس طرح سے جنت کی نعمتیں اتنی حد سے زیادہ وسیع پہلو پیدا کریں گی، جن کی توصیف بیان سے باہر ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی اجر و پاداش اور مومنین کے اعمال کے درمیان کوئی موازنہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہت ہی برتر و بالاتر ہے۔ اور اس مرحلہ میں ہم ہر جگہ اس کے فضل و کرم کے روبرو ہیں، کیا اس کی سزا میں اور کیا اس کے عدل کے سامنے۔

* * *

بہشت و دوزخ، اور بہشتیوں اور دوزخیوں کے صفات اور ان کے درجات و مراتب کے بارے میں گفتگو کو ختم کرنے کے بعد، اس بحث سے کامل طور پر نتیجہ نکالنے کے لیے، مجرموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کتنی بہت سی قومیں ایسی ہیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، وہ قومیں جو ان سے زیادہ قوی اور طاقتور تھیں انہوں نے کئی ملک فتح کے تھے اور کئی شہروں پر مسلط ہوئے تھے، لیکن وہ کفر و ظلم و ستم اور گناہ کی وجہ سے نابود ہو گئیں" (وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشًا فنقبوا فی البلاد)۔

کیا اس قسم کے افراد کے لیے موت اور عذاب الٰہی سے فرار کی کوئی راہ ہے؟ (ھل من محیص)۔

"قرن" اور "اقتران" اصل میں دو چیزوں یا کئی چیزوں کے ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے معنی میں ہے، اور اس جماعت کو جو ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں "قرن" کہا جاتا ہے، اس کے بعد یہ لفظ زمانہ کے ایک حصہ پر بولا جانے لگا، جسے کبھی تو تیس سال اور کبھی سو سال کہا ہے۔

"اس بنا پر کئی "قرنوں" کو ہلاک کرنے کا معنی کئی گذشتہ اقوام کو ہلاک کرنا ہے"۔

"بطش" کسی چیز کو قوت و قدرت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے، اور کبھی جنگ و جدال کے معنی میں بھی آتا ہے۔

"نقبوا" "نقب" کے مادہ سے اس سوراخ کے معنی میں ہے جو دیوار یا چمڑے میں کرتے ہیں، لیکن "ثقب" صرف اس سوراخ کو کہتے ہیں جو لکڑی میں کرتے ہیں۔

یہ لفظ" جب کسی فعل کی صورت میں استعمال ہو، تو سیر و حرکت اور اصلاح کے مطابق راستہ کھولنے اور پیش روی کرنے کے معنی میں آتا ہے، اور کشور کشائی اور مختلف علاقوں میں نفوذ کے معنی میں بھی آیا ہے

" منقبت " بھی اسی مادہ سے ہے، اور یہ لفظ ان برجستہ اشخاص کے افعال و صفات پر ــــ اس نفوذ و تاثیر کی بنا پر جو وہ لوگوں میں رکھتے ہیں، یا راستے کو ترقی کے لیے کھولتے ہیں۔ بولا جاتا ہے۔

" نقیب " اس شخص کو کہتے ہیں، جو کسی جمعیت کے بارے میں بحث و تحقیق کرتا ہے اور ان کے اوضاع و احوال سے باخبر ہوتا ہے اور ان کے اندر نفوذ پیدا کرتا ہے۔

" محیص " " حیص " (بروزن حیف) کے مادہ سے کسی چیز سے انحراف اور عدول کرنے کے معنی میں ہے، اور اسی مناسبت سے مشکلات سے فرار کرنے اور میدانِ جنگ میں شکست کھا جانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بہر حال یہ آیت پیغمبرؐ کے زمانے کے ہٹ دھرم کفار کو تنبیہ کر رہی ہے، کہ وہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں، اور ان کے آثار کو تاریخ کے صفحات میں اور روئے زمین پر دیکھیں، غور کریں کہ خدا نے اس سے پہلے کی سرکش اقوام کے ساتھ کیا کیا؟ وہ قومیں جو ان سے زیادہ کثرت میں تھیں اور زیادہ طاقتور تھیں، اور پھر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچیں۔

یہ معنی بارہا قرآن مجید میں آیا ہے، منجملہ سورۂ زخرف کی آیہ ۸ میں بیان ہوا ہے: " فاھلکنا اشد منھم بطشاً "

" ہم نے ان اقوام کو جو ان سے زیادہ طاقتور تھیں ہلاک کر دیا "

بعض مفسرین زیرِ بحث آیت کو قومِ ثمود" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو حجاز کے شمال میں " حجر " کی کوہستانی سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی وہ پہاڑوں کو کاٹ کر ان میں پُر شکوہ گھر اور قصر و محلات بناتی تھی، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور ان میں بھی اور ان کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی شامل ہے۔

" ھل من محیص " (کیا بھاگنے کی کوئی راہ ہے؟) کا جملہ ممکن ہے گذشتہ اقوام کی زبانی ہو، جو عذاب کے چنگل میں گرفتاری کے وقت اس مطلب کا ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے، یا پروردگار کی طرف سے پیغمبرؐ کے زمانے کے ہٹ دھرم کفار کے بارے میں ہو، یعنی کیا اس دردناک سرنوشت سے جو گذشتہ سرکش اقوام کے سامنے آئی فرار کر سکتے ہیں؟

آخری زیرِ بحث آیت میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے:

" یقیناً گذشتہ لوگوں کی سرنوشت میں، اس شخص کے لیے۔ جو عقل رکھتا ہے، یا کان لگا کر سنتا ہے اور حاضر (دماغ) ہے تذکر اور ایک نصیحت ہے" (ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید)۔

یہاں بھی اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی جو درک مسائل کے بارے میں بحث کرتی ہیں، " قلب " سے مراد وہی " عقل " و شعور و ادراک ہے، لغت کی کتابوں میں بھی " قلب " کا ایک معنی " عقل " ہی بتایا گیا ہے۔ " راغب " نے " مفردات " میں زیرِ بحث آیت میں " قلب " کی علم و فہم سے تفسیر کی ہے، " لسان العرب " میں بھی یہی بیان ہوا ہے کہ بعض اوقات " قلب " عقل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے [1]

---

[1] لسان العرب مادۂ قلب۔

ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے بھی اسی آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ "قلب" سے مراد عقل ہے[1]

اصل میں اس لفظ "قلب" کی جڑ بنیاد، بدلنے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کے معنی میں ہے، اور اصطلاح کے مطابق قلب انقلاب ہے، اور چونکہ انسان کی فکر و عقل ہمیشہ دگرگونی کی حالت میں ہے، اس لیے اس کو "قلب" کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر قرآنی آیات میں دل کے سکینہ و آرام یا اطمینان قلب پر تکیہ ہوا ہے: هو الذی انزل السکینة فی قلوب المؤمنین: "وہ وہی ہے کہ جس نے مؤمنین کے دل میں سکینہ و آرام نازل کیا" (فتح-۴) "الا بذکر الله تطمئن القلوب "آگاہ رہو کہ خدا کی یاد دلوں کے اطمینان کا باعث ہے" (رعد-۲۸) ہاں! اس بے قرار موجود کو صرف یادِ خدا سے قرار و سکون حاصل ہوتا ہے۔

- القی السمع "(کان کو ڈالے) کان دھرنے، اور انتہائی انہماک اور توجہ سے سننے سے کنایہ ہے، اس تعبیر کے مشابہ جو ہم فارسی میں بولتے ہیں "گوش ما نزد تواست" (ہمارا کان تمہارے پاس ہے یعنی ہم تیری باتوں کو اچھی طرح سے سن رہے ہیں۔

"شہید" یہاں اس شخص کے معنی میں ہے جو حضور قلب رکھتا ہو، اور اصطلاح کے مطابق، اس کا دل مجلس میں ہے اور وہ وقت کے ساتھ مطالب کو سمجھتا ہے۔

اور اسی طرح سے آیت مجموعی طور پر اس طرح معنی دیتی ہے:

دو گروہ ان مواعظ سے پند و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو عقل و ہوش رکھتا ہے، اور خود مستقل طور پر مسائل کا تحلیل و تجزیہ کر سکتا ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جو اس حد میں تو نہیں ہیں، لیکن وہ علماء اور دانشمندوں کے لیے اچھے سامعین بن سکتے ہیں، اور حضور قلب کے ساتھ ان کی باتوں کو سنتے ہیں، اور حقائق کو ان کے ارشاد و رہنمائی کے طریق سے معلوم کرتے ہیں۔

اس گفتگو کی شبیہ سورۂ ملک کی آیہ ۱۰ میں بھی آئی ہے جس میں دوزخیوں کے قول کو اس طرح نقل کرتا ہے: "لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر": اگر ہم سننے والے کان یا کافی عقل و ادراک رکھتے ہوتے تو ہرگز دوزخیوں کی صف میں قرار نہ پاتے" کیونکہ راہ حق کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں، لہٰذا وہ لوگ جو خود اہل تحقیق ہیں اس کو اچھی طرح حاصل کر لیتے ہیں اور جو اس قسم کے نہیں ہیں، وہ عادل اور سمجھدار علماء کی رہنمائی کے ذریعے اپنی راہ معلوم کر سکتے ہیں، اسی بنا پر ضروری ہے کہ یا تو انسان کے پاس کافی مقدار میں علم و عقل ہو، یا سننے والے کان رکھتا ہو۔[2]

---

[1] اصول کافی جلد ۱ کتاب العقل والجہل حدیث ۱۔

[2] توجہ رکھیں کہ دونوں آیات میں یہ دو مطالب "او" کے لفظ کے ساتھ ایک دوسرے پر عطف ہوا ہے، جو نشاندہی کرتا ہے کہ کم از کم ان دونوں میں سے ایک ضروری ہے۔

۳۸۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ○

۳۹۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ ○

۴۰۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ○

ترجمہ

۳۸۔ ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کو چھ دن (چھ دوروں) میں پیدا کیا ہے۔ اور تکان تو ہم کو چھو بھی نہیں گئی۔

۳۹۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر و شکیبائی اختیار کر، اور طلوع آفتاب سے پہلے، اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا۔

۴۰۔ اور رات کے ایک حصّہ میں اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد۔

تفسیر

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے

گذشتہ آیات کو بیان کرنے اور مختلف دلائل کے بعد جو قیامت کے بارے میں ان میں بیان ہوئی ہیں، ان آیات میں امکان معاد کے دلائل میں سے ایک دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے بعد پیغمبرؐ کو صبر و شکیبائی اور پروردگار کی تسبیح و حمد کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ مخالفین کی کارشکنیوں کو اس طریقہ سے انھیں برداشت کرتے ہوئے بے کار کردے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو چھ دن (چھ دوروں) میں پیدا کیا ہے، اور ان کے پیدا کرنے میں ہمیں کسی قسم کی تھکان اور کمزوری نہیں ہوئی (ولقد خلقنا السماوات والارض وما بینھما فی ستة ایام وما مسنا من لغوب)

"لغوب" تعب اور خستگی کے معنی میں ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جس کی قدرت محدود ہو اگر وہ کسی ایسے کام کو انجام دینا چاہے، جو اس کی توانائی سے زیادہ ہو تو وہ تھک کر چور ہو جائے گا، لیکن اس ہستی کے بارے میں جس کی قدرت غیر محدود اور اس کی توانائی غیر متناہی ہو یہ امور کوئی مفہوم نہیں رکھتے، اس بنا پر وہ ذات جو قادر ہے کہ کسی قسم کے تعب و رنج کے بغیر ان باعظمت آسمانوں اور زمین کو اور ان سب ستاروں، سیاروں کرّوں اور کہکشاؤں کو ایجاد کرے، وہ اس بات کی بھی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے، اور زندگی کا لباس اس کے بدن پر پہنا دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک شان نزول نقل کی ہے کہ: یہودی یہ خیال کرتے تھے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو چھ "دن" (ہفتہ کے چھ دن) میں پیدا کیا ہے، اس کے بعد ہفتہ کے دن اس نے آرام کیا، اور اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا، اور اسی بنا پر وہ اس طرح سے بیٹھنے کو غیر مطلوب شمار کرتے ہیں، اور اُسے خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی[1] اور اس قسم کی ہنسانے والی خرافات کو ختم کر دیا۔

لیکن یہ شانِ نزول اس بات سے مانع نہیں ہے، کہ آیت امکان معاد کے مسئلہ کا تعاقب کرے، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ پروردگار کی توحید، علم اور قدرت پر بھی ایک دلیل ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو ان تمام عجائبات اور غرائب کے ساتھ اور لاکھوں کروڑوں زندہ موجودات، اور عجیب و غریب اسرار اور اس کے مخصوص نظاموں کو پیدا کیا ہے، کہ جن کے ایک ہی گوشہ میں غور و فکر کرنا اس توانا پیدا کرنے والے کی طرف جس کے دست قدرت نے اس عظیم گردش کرنے والے کو حرکت دی ہے، اور ہر جگہ نور حیات و زندگی کو پھیلایا ہے، ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی "چھ دن" میں خلقت کا موضوع بارہا آیات قرآنی میں آیا ہے۔[2]

کلمہ "یوم" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، عربی زبان میں اس کا متبادل "روز" فارسی زبان میں، یا باقی زبانوں میں بہت سے مواقع پر دوران کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ چوبیس گھنٹوں کے معنی میں، یا بارہ گھنٹوں کے معنی میں، مثلاً ہم کہتے ہیں: ایک دن لوگ پیغمبر اسلام کے سایہ میں زندگی بسر کرتے تھے، اور دوسرے دن بنی اُمیہ اور بنی عباس کے جبار بادشاہ ان پر مسلط ہو گئے۔

واضح رہے کہ "روز" ان تعبیروں میں "دور" کے معنی میں ہے، چاہے وہ ایک سال ہو یا سو سال، یا ہزاروں لاکھوں سال، مثلاً ہم کہتے ہیں ایک دن کرۂ زمین آگ کا ایک ٹکڑا تھا، دوسرے دن وہ سرد ہوئی، اور زندگی کے لیے آمادہ، تو یہ تمام تعبیریں

---

[1] تفسیر "درالمنثور" جلد ۶ ص ۱۱۰۔

[2] مثلاً سورۂ اعراف ۵۴ سورۂ یونس ۳ سورۂ ہود، سورۂ سجدہ ۴، سورۂ حدید ۴، سورۂ فرقان ۵۹۔

ادوار کی طرف اشارہ ہیں۔

اس بنا پر اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آسمانوں زمین اور ان دونوں کی تمام موجودات کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔

اس گفتگو کی تفصیل و تشریح ہم جلد چھ ص ۱۱۶ سورۂ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

اس بنا پر اس سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سورج اور کرۂ زمین کی خلقت سے پہلے تو شب و روز تھے ہی نہیں تاکہ خدا نے عالم کو چھ دن میں پیدا کیا ہو۔

معاد کے مختلف دلائل اور قیامت کے مختلف مناظر کی تصویر کشی کرنے کے بعد، چونکہ ایک گروہ حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا اور باطل پر اڑے ہوئے ہٹ دھرمی کرتا رہتا ہے لہٰذا پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: "جو کچھ وہ کہتے ہیں۔ اس پر صبر کرو اور شکیبائی سے کام لو" (فاصبر علی مایقولون)۔

کیونکہ صرف صبر و شکیبائی کی قوت سے ہی ان مشکلات پر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے، اور دشمن کی سازشوں کو درہم و برہم کیا جا سکتا ہے، اور حق کی راہ میں ان کی ناروا نسبتوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ صبر و استقامت مدد و نصرت کی محتاج ہے، اور بہترین مدد و نصرت، خدا کی یاد، اور جہاں کو پیدا کرنے والے کے علم و قدرت کے مبدأ سے ارتباط پیدا کرتا ہے، اس حکم کے بعد مزید کہتا ہے:

"اور آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا" (وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب)۔

اسی طرح "رات کے ایک حصہ میں اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد بھی" (ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود)۔

یہ دوامی یاد اور مسلسل تسبیح، بارش کے حیات بخش قطروں کی طرح تیرے دل و جان کی سرزمین پر پڑنی چاہیئے یہ اُسے سیراب کرتی ہے، تجھے ہمیشہ نشاط و حیات بخشتی ہے، اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلہ میں استقامت کی دعوت دیتی ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کی ان چار مواقع پر (طلوع آفتاب سے پہلے، اس کے غروب سے پہلے، رات کے وقت اور سجدوں کے بعد) تسبیح کرنے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ یہ تعبیریں روزانہ کی پنجگانہ نمازوں کی طرف اشارہ ہے اور بعض کے نزدیک پُرفضیلت نوافل کی طرف اشارہ ہے اس طرح سے کہ "قبل طلوع الشمس" نماز صبح کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اس کا آخری وقت طلوعِ آفتاب ہے۔

اور "قبل الغروب" (غروب آفتاب سے پہلے) نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان دونوں کا آخری وقت غروبِ آفتاب ہے۔

"ومن اللیل" (رات میں سے) نماز مغرب و عشاء کو بیان کرتا ہے "وادبار السجود" (سجدوں کے بعد) مغرب

کے نوافل کی طرف اشارہ ہے، جو مغرب کے بعد بجالائے جاتے ہیں۔

"ابن عباس" نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے، اس قید کے ساتھ کہ "ادبار السجود" کو تمام نوافل نمازوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جو فرائض کے بعد انجام دیئے جاتے ہیں، لیکن چونکہ روزانہ کی نوافل میں ہمارے نظریہ کے مطابق صرف مغرب وعشاء کے نوافل ہیں جو ان نمازوں کے بعد انجام پاتے ہیں، لہٰذا یہ تعمیم صحیح نہیں ہے۔

بعض دوسروں نے "قبل طلوع الشمس" کو نماز صبح کی طرف اور "قبل الغروب" کو نماز عصر کی طرف اور من اللیل فسبحہ کو مغرب وعشاء کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس طرح سے بغیر کسی واضح وجہ کے نماز ظہر کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اور یہ چیز اس تفسیر کے ضعف کی دلیل ہے۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ جب آپؑ سے آیہ "وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب" کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا، تو آپؑ نے فرمایا:

تقول حین تصبح وحین تمسی عشر مرات لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک، ولہ الحمد، یحیی ویمیت، وھو علی کل شیء قدیر:

"ہر صبح وشام دس مرتبہ یہ ذکر کہے لا الہ الا اللہ ....."[1]

یہ تفسیر پہلی تفسیر کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، اور ممکن ہے کہ یہ دونوں ہی آیت کے معنی میں جمع ہوں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس معنی کی نظیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۰ میں بھی آئی ہے۔ جہاں فرماتا ہے: وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن اٰناء اللیل فسبح واطراف النھار لعلک ترضٰی۔

"طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے، اور اسی طرح رات کے دوران میں، اور دن کے اطراف میں پروردگار کی تسبیح کرتا کہ تو راضی وخوش ہو جائے۔"

لعلک ترضٰی کا جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ یہ عبادات اور تسبیحات فکر ونظر کے سکون اور دل کی مسرت میں اہم اثر رکھتی ہیں اور اس کو سخت قسم کے حوادثات کے مقابلہ میں قوت وتوانائی بخشتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ سورۂ طور کی آیہ ۴۹ میں اس طرح آیا ہے، ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم، "رات کے کچھ حصہ میں خدا کی تسبیح کر اور ستاروں کے پشت پھیرنے کے وقت،"[2]

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] توجہ کرنا چاہیئے کہ یہاں "ادبار" (بروزن اقبال) پشت کرنے کے معنی میں ہے، اور زیر بحث آیات میں "ادبار" بروزن (ابزار) "دبر" کی جمع ہے جو پشت کے معنی میں ہے، اس بنا پر "ادبار السجود" کا معنی سجدوں کے بعد ہے، اور "ادبار النجوم" کا معنی ستاروں کا پشت پھیرنے کا وقت ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا: "ادبار السجود" وہ دو رکعت نافلہ ہے جو تم مغرب کے بعد پڑھتے ہو (توجہ رہے کہ مغرب کے نافلہ چار رکعت ہیں، جن میں سے یہاں دو رکعت کی طرف اشارہ ہوا ہے) اور "ادبار النجوم" دو رکعت نافلہ صبح ہیں، جو نماز صبح سے پہلے اور ستاروں کے غروب ہونے کے وقت بجالاتے ہیں۔[1]

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ "ادبار السجود" سے وہی نماز وتر ہے جو آخر شب میں انجام دی جاتی ہے[2]

بہرحال پہلی تفسیر سب سے مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ مفہوم تسبیح کی وسعت اور کشادگی میں بہت سی دوسری تفسیریں جن کی طرف روایات میں اشارہ ہوا ہے۔ شامل ہو جاتی ہیں:

نکتہ

صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے:

یہ پہلا موقع نہیں ہے، جہاں قرآن مجید مشکلات اور ہٹ دھرم اور دشمن افراد کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی کی تلقین کرتا ہے، قرآن مجید عظیم پیغمبر اسلام کو بھی اور عام مومنین کو بھی بار بار یہ اہم مسئلہ دل نشیں کراتا ہے، اور بکثرت تجربات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ غلبہ و کامیابی انہی افراد کے لیے ہے، جو صبر و استقامت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے دوستوں میں سے ایک سے (جو شاید اس زمانہ کے سخت حالات میں بے تاب ہو جاتا تھا) فرمایا: علیك بالصبر فی جمیع امورك: "تجھ پر لازم ہے کہ تمام کاموں میں صبر و شکیبائی رکھے"۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کو صبر و تحمل اور مدارات کا حکم دیا، اور انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ لوگوں نے ان کی طرف بہت سی ناروا نسبتیں بھی دیں۔ اور جب آپ کا سینہ تنگ ہو گیا تو خدا نے ان پر یہ آیت نازل کی: ولقد نعلم انك یضیق صدرك بما یقولون فسبح بحمد ربك وكن من الساجدین: "ہم جانتے ہیں کہ تو ان کی باتوں سے بے چین ہو جاتا ہے، اور تیرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے۔ پس تو اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالا اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا" (حجر۔ ۹۷، ۹۸)

پھر بھی انھوں نے آپ کی تکذیب ہی کی اور ہر طرف سے تہمت کے تیر آپ کی طرف پھینکے، اور اس بنا پر آپ محزون و مغموم ہوئے، خدا نے ان کی دل داری اور تسلی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی: قد نعلم انه لیحزنك الذی یقولون فانهم لا یكذبونك ولكن الظالمین بآیات الله یجحدون ولقد كذبت رسل من قبلك فصبروا علی ما كذبوا و اوذوا حتی اتاهم نصرنا: "ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] گذشتہ مدرک۔

تجھے اندوہگین کرتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ (صرف) تیری تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ستمگر آیات خدا کی تکذیب کرتے ہیں، انھوں نے تجھ سے پہلے بھی خدا کے رسُولوں کی تکذیب کی تھی، اور انھوں نے تکذیبوں اور آزاروں کے مقابلہ میں صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری نصرت ان کی مدد کے لیے آن پہنچی۔ (انعام۔ ۳۳، ۳۴)

اس کے بعد امامؑ مزید فرماتے ہیں: پیغمبرؐ نے اپنے آپ کو صبر و شکیبائی کے لیے آمادہ و تیار کر لیا، لیکن اس موقع پر ان لوگوں نے معاملہ کو حد سے زیادہ کر دیا، اور انھوں نے خدا کا نام لے کر اس کی ساحت قدس کی نسبت تکذیب کی، تو پیغمبرؐ نے فرمایا میں نے اپنے لیے اور اپنے گھر والوں اور اپنی حیثیت کے لیے ناملائم باتوں پر تو صبر کر لیا۔ لیکن میں اپنے پروردگار کو بُرا بھلا کہنے پر صبر نہیں کر سکتا، اس موقع پر خداوند عزوجل نے اس (زیر بحث آیت) کو نازل فرمایا: ولقد خلقنا السماوات والارض وما بینھما ۔۔۔۔[1] ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ چھ دوروں میں پیدا کیا ہے (اور عالم کی خلقت میں ہم نے جلدی اور عجلت سے کام نہیں لیا) اور ہمیں کوئی دُکھ اور رنج نہیں پہنچا، اس بنا پر تم بھی عجلت نہ کرو اور ان کی باتوں کے سامنے صبر کرو، یہ وہ مقام تھا کہ پیغمبرؐ نے صبر و شکیبائی کو تمام حالات میں پیش نظر رکھا، (یہاں تک کہ دشمنوں پر کامیاب ہوئے)[1]

---

[1] "اصول کافی" (بمطابق نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۱۷)۔

۴۱۔ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۙ
۴۲۔ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۝
۴۳۔ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ۝ۙ
۴۴۔ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ۝
۴۵۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝

ترجمہ

۴۱۔ کان دھر کے سُن اور اس دِن کا منتظر رہ جب ایک ندا کرنے والا قریب کے مکان سے ندا دے گا۔

۴۲۔ وہ دن جس میں سب لوگ قیامت کے صیحہ (چیخ) کو حق کے ساتھ سُنیں گے، وہ دن خروج کا دن ہے۔

۴۳۔ ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

۴۴۔ وہ دن جب زمین ان کے اُوپر سے پھٹ جائے گی، اور (وہ قبروں سے) تیزی کے ساتھ باہر نکلیں گے، اور یہ جمع کرنا ہمارے لیے آسان ہے۔

۴۵۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم اُس سے اچھی طرح آگاہ ہیں، اور تم ان کو مجبور کرنے پر مامور نہیں ہو پس اس بنا پر

تم تو قرآن کے ذریعہ ان لوگوں کو جو میرے عذاب سے ڈرتے ہیں، نصیحت کرتے رہو۔

تفسیر

قیامت کے صیحہ (چیخ) کے ساتھ ہی سب زندہ ہو جائیں گے

یہ آیات جو سورۂ "ق" کی آخری آیات ہیں اس سورہ کی باقی آیات کی طرح مسئلہ معاد و قیامت کو ہی بیان کرتی ہیں، اور پھر اس کے ایک اور گوشہ کو پیش کرتی ہیں، اور وہ مسئلہ "نفخ صور" اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کا ہے۔

فرماتا ہے: "کان دھر کے سُن اور اس دن کا منتظر رہ جس دن ایک ندا کرنے والا نزدیک کے مکان سے ندا کریگا" (واستمع یوم ینادالمناد من مکان قریب)۔

"وہ دن جس میں قیامت کے صیحہ (چیخ) کو حق کے ساتھ سنیں گے، وہ دن خروج کا دن ہے" (یوم یسمعون الصیحة بالحق ذالك یوم الخروج)۔

"استمع" (کان دھر کے سُن) میں مخاطب اگرچہ پیغمبرؐ کی ذات ہے، لیکن مسلمہ طور پر اس سے مراد تمام انسان ہیں۔

"کان دھرنے" سے مراد، یا تو انتظار کرنا ہے، کیونکہ جو لوگ کسی حادثہ کا انتظار کرتے ہیں، جو ایک وحشتناک حادثہ سے شروع ہوگا وہ ہمیشہ کان کھڑے رکھتے ہیں، اور منتظر رہتے ہیں، یا خدا کی اس گفتگو پر کان دھرنا مراد ہے، اور معنی اس طرح ہوگا:

"اس گفتگو کو سُن جو تیرا پروردگار قیامت کے صیحہ (چیخ) کے بارے میں کر رہا ہے۔[1]

لیکن یہ ندا دینے والا کون ہوگا؟ ممکن ہے کہ خدا کی ذات پاک ہو جو یہ ندا دے گی، لیکن زیادہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ اسرافیل ہوگا، جو "صور" پھونکے گا، اور قرآن کی آیات میں نام کے ساتھ تو نہیں، لیکن دوسری تعبیروں کے ساتھ اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"مکان قریب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ صدا اس طرح فضا میں پھیل جائے گی، کہ گویا ہر ایک کے کان

---

[1] پہلی تفسیر کے مطابق "یوم" "استمع" کا مفعول ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "استمع" کا مفعول محذوف ہے، اور تقدیر میں "استمع حدیث ربك" ہوگا۔ باقی رہا "یوم" کا منصوب ہونا اس صورت میں اس فعل کی وجہ سے ہے جو یوم الخروج سے سمجھا جاتا ہے، اور معنی کے اعتبار سے اس طرح ہے: "یخرجون یوم ینادالمناد"۔

کی جڑیں ہے اور سب کے سب اس کو قریب سے سنیں گے، موجودہ زمانہ میں ہم مختلف وسائل سے کہنے والوں کی باتوں کو جو دُنیا کے کہیں دُور دراز مقام پر کر رہا ہوتا ہے، قریب سے سُن سکتے ہیں، گویا وہ بالکل ہمارے قریب ہی بیٹھا ہُوا ہے اور ہم سے بات کر رہا ہے، لیکن اس دن سب لوگ ان وسائل کی احتیاج کے بغیر، منادی حق کی آواز کو، جو قیامت کی صدا بلند کر رہا ہوگا اپنے قریب سے سنیں گے۔ [1]

بہرحال یہ صیحہ، وہ پہلا صیحہ نہیں ہے جو اس جہان کے ختم کرنے کے لیے ہوگا، بلکہ یہ دوسرا صیحہ ہے، یعنی وہی قیام و حشر کا صیحہ، اور حقیقت میں دوسری آیت پہلی آیت کی توضیح و تفسیر ہے: کہتا ہے:

وہ دن جس میں صیحہ کو حق کے ساتھ سنیں گے، قبروں سے نکلنے اور زمین کی مٹی سے باہر آنے کا دن ہے۔

اور اس غرض سے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس عظیم دادگاہ اور عدالت میں حاکم کون ہے؟ مزید کہتا ہے: "ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں، اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے" (انا نحن نحیی ونمیت والینا المصیر)۔

احیاء سے مراد وہی دُنیا میں پہلی مرتبہ زندہ کرنا ہے، اور مارنے سے مراد عمر کے آخر میں مرنا ہے، اور "الینا المصیر" کا جملہ قیامت میں زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

درحقیقت آیت اس نکتہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس طرح پہلی موت و حیات ہمارے ہاتھ میں ہے، اسی طرح پھر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹانا، اور قیام قیامت بھی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے، اور ہماری ہی طرف ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے: "ان کی بازگشت ہماری طرف اس دن ہوگی، جب زمین ان کے اُوپر سے شگافتہ ہو جائے گی اور وہ زندہ ہو جائیں گے اور سرعت کے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے" (یوم تشقق الارض عنھم سراعا) [2]

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال دیا ہے کہ "مکان قریب" "صخرہ بیت المقدس" ہے (وہی مخصوص پتھر جو بیت المقدس میں ہے، جس سے آسمان کی طرف پیغمبر کا معراج شروع ہُوا تھا) منادی اس کے پاس کھڑا ہو جائے گا اور پکارے گا: ایتھا العظام البالیہ! والاوصال المنقطعۃ، واللحوم المتمزقۃ، قومی لفصل القضاء. وما اعد اللہ لکم من الجزاء!

اے بوسیدہ ہڈیو! اور اے کٹی ہوئی رگو! اور اے بکھرے ہوئے گوشت، فیصلہ اور جزا کے لیے جو تمہارے لیے مقرر ہو چکی ہوئی ہے، اُٹھ کھڑے ہو۔

لیکن اس احتمال پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔

[2] "سراع" جمع ہے "سریع" کی، جیسا کہ "کرام" جمع ہے "کریم" کی اور یہاں حال ہے، یخرجون کے فاعل کا جو محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا "یخرجون سراعا"۔ بعض سراع کو مصدر سمجھتے ہیں جو حال کی جگہ واقع ہُوا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "قیامت میں لوگوں کا یہ حشر اور جمع کرنا ہمارے لیے سہل اور آسان ہے" (ذالک حشر علینا یسیر)۔

"حشر" جمع کرنے اور ہر طرف سے اکٹھا کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ واضح ہے کہ وہ خدا جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، پیدا کرنے والا ہے، اس کے لیے مردوں کا حشر و نشر تو ایک سادہ اور آسان کام ہے۔ اصولی طور پر مشکل و آسان تو اس کے لیے ہوتا ہے، جس کی قدرت محدود ہو، وہ ذات جس کی قدرت غیر محدود ہے، تمام چیزیں اس کے لیے یکساں اور آسان ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے: پہلا شخص جو زندہ ہوگا، اور قبر سے باہر نکل کر میدانِ محشر میں وارد ہوگا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے اور علی علیہ السلام ان کے ہمراہ ہوں گے۔[1]

* * *

آخری زیرِ بحث آیت میں جو اس سورہ کی بھی آخری آیت ہے، باری تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ان کے سخت اور ہٹ دھرم مخالفین کے مقابلہ میں ایک بار پھر تسلی اور دلداری دے رہا ہے، اور فرماتا ہے: "جو کچھ وہ کہتے ہیں، ہم اس سے بخوبی آگاہ ہیں" (نحن اعلم بما یقولون)۔

اور تم انھیں ایمان کے لیے مجبور کرنے پر مامور نہیں ہوئے ہو، جو تم قہر اور جبر کے ساتھ انہیں اسلام کی طرف کھینچو" (وما انت علیھم بجبار)۔

تمہاری ذمہ داری تو صرف ابلاغِ رسالت، حق کی طرف دعوت اور بشارت و انذار ہے" جب ایسا ہے تو ان لوگوں کو جو میرے عذاب و عقاب سے ڈرتے ہیں، قرآن کے ذریعہ میری یاد دلاؤ اور پند و نصیحت کرو" (فذکر بالقران من یخاف وعید)۔[2]

تفسیر قرطبی میں آیا ہے کہ "ابنِ عباس" کہتے ہیں: کچھ لوگوں نے عرض کیا، اے رسولِ خدا ہمیں انذار کیجیے اور ڈرایئے تو اوپر والی آیت نازل ہوئی۔ اور کہا: فذکر بالقران من یخاف وعید۔[3]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مومن افراد کو خوف دلانے اور بیدار کرنے کے لیے کافی ہے، اس کا ہر صفحہ قیامت کی یاد دھانی کراتا ہے، اور اس کی مختلف آیات، گذشتہ لوگوں کی سرنوشت کو واضح کرتی ہیں اور بہشت کی نعمتوں، دوزخ کے عذابوں کا بیان اور ان حوادث کی توصیفیں، جو قیامت کے قریب اور دادگاہ عدلِ الٰہی میں واقع ہوں گے، سب کے

---

[1] کتاب خصال، مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۱۹۔

[2] توجہ رکھیں کہ "وعید" اصل میں "وعیدی" تھا "یا" حذف ہوگئی ہے، اور کسرہ جو اس پر دلیل ہے باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ "یخاف" کا مفعول ہے۔

[3] "قرطبی" جلد ۹ ص ۶۱۹۸۔

سب بہتر ہیں پند و نصیحت کی صورت میں موجود ہیں۔

واقعاً اس منظر کی یاد آوری، کہ زمینیں پھٹ جائیں گی، اور مٹی میں جان پڑ جائے گی، مُردے لباس حیات پہن لیں گے اور حرکت میں آجائیں گے، قبروں سے باہر نکل کھڑے ہوں گے، درحالیکہ وحشت و اضطراب سب کو سرتاپا گھیرے ہُوئے ہوگا اور انھیں درگاہ عدل الٰہی کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا، یہ ایک لرزہ خیز منظر ہوگا۔

خصوصاً جبکہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مختلف انسانوں کی قبریں ایک قبرستان بن چکی ہوگی۔ اور بہت سے افراد کو اس نے اپنے اندر جگہ دے رکھی ہوگی جن میں سے بعض صالح اور بعض غیر صالح ہوں گے۔ اور بعض مومن اور بعض کافر ہوں گے، اور بقولِ شاعر:

رب قبر قد صار قبرًا مرارًا ضاحک من تزاحم الاضداد

ودفین علی بقایا دفین فی طویل الاجال والامداد

کتنی بہت سی قبریں ایسی ہیں جو بار بار قبریں بنی ہیں ایسی قبریں جو تزاحم اضداد سے ہنستی ہیں۔

اور کتنے بہت سے ایسے افراد ہیں جو دوسرے انسانوں کے بقیہ حصّوں میں دفن ہُوئے ہیں، طول زمان اور قرون واعصار میں۔

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو تیری "وعید" سے ڈرتے ہیں، اور تیرے قرآن سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

خداوندا! اس دن جب وحشت و اضطراب نے سب کو گھیرا ہُوا ہوگا، ہمیں اپنی رحمت سے سکون عنایت فرما۔

بارِالٰہا! زندگی کے دن تو جتنے بھی ہوں بڑی تیزی سے گزر جائیں گے۔ لیکن جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گا وہ تیرا آخرت کا گھر ہے، ہمیں حسن عاقبت اور آخرت میں نجات مرحمت فرما۔

آمین یارب العالمین

سورۂ "ق" کا اختتام

جمعرات ۱۷ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ

سُورۂ ذاریات

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۶۰ آیات ہیں

شروع ۱۷ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ

سُورۂ ذاریات
کے
مطالب

اس سُورہ میں بحث کا محور پہلے درجہ میں معاد و قیامت اور مؤمنین اور کفار کی جزاء و سزا سے مربوط مسائل ہیں، لیکن اس لحاظ سے سورۂ "ق" کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس سُورہ میں بحث کے لیے دوسرے عنوانات بھی نظر آتے ہیں۔

کلی طور پر کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس سُورہ کے مباحث ذیل کے پانچ محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس کے ایک حصّہ میں معاد و قیامت اور اس کے متعلقات کے مباحث بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ اس سُورہ کے دوسرے حصّہ میں مسئلہ توحید اور نظام آفرینش میں خدا کی آیات اور نشانیوں کا بیان ہوا ہے، جو طبعی طور سے معاد کے مباحث کی تکمیل کرتا ہے۔

۳۔ تیسرا حصّہ ان فرشتوں کی داستان کے بارے میں ہے۔ جو ابراہیمؑ کے مہمان ہوئے تھے۔

۴۔ اس سُورہ کی دوسری آیات موسیٰؑ و قوم عاد و قوم ثمود اور قوم نوح کے داستانوں سے متعلق مختصر اشارے ہیں، اور ان کے ذریعہ دوسرے کفار اور مجرموں کو خبردار کرتا ہے۔

۵۔ اور آخر میں اس سُورہ کا ایک اور حصّہ متعصب اور ہٹ دھرم اقوام کے گذشتہ انبیاء سے مبارزہ کرنے کو بیان کرتا ہے اور پیغمبرؐ اسلام کو جو سخت ترین مخالفین کے مقابلہ میں قرار پائے تھے۔ تسلی دیتا ہے، اور استقامت کی دعوت۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الذاريات في يومه او ليلته اصلح الله له معيشته واتاه برزق واسع ونور له قبره بسراج يزهر الى يوم القيامة"

"جو شخص دن یا رات کے وقت سُورۂ ذاریات کو پڑھے گا خدا اس کی زندگی کے حالات اور معیشت

کی اصلاح کرے گا۔ اس کو وسیع روزی دے گا، اور اس کی قبر کو ایک ایسے چراغ سے روشن کرے گا، جو قیامت کے دن تک چمکتا رہے گا۔ [1]

ہم بارہا بیان کر چکے ہیں، کہ ان عظیم اجروں کو حاصل کرنے کے لیے صرف زبان کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد ایسی تلاوت ہے، جو فکر و نظر میں تحریک پیدا کرے۔ اور انسان کو عمل پر ابھارے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کی نامگذاری "ذاریات" کے ساتھ اس سورہ کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورہ ذاریات۔ ثواب الاعمال، مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۲۰۔

سُورۂ ذاریات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ○
۲۔ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ○
۳۔ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ○
۴۔ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ○
۵۔ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ○
۶۔ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے۔

۱۔ ان ہواؤں کی قسم جو بادلوں کو چلاتی ہیں (اور گرد وغبار اور نباتات کے بیجوں کو حرکت میں لاتی ہیں۔

۲۔ اور پھر ان بادلوں کی قسم جو (بارش کا) بار سنگین اپنے ساتھ اُٹھاتے ہیں۔

۳۔ پھر قسم ہے ان کشتیوں کی جو آسانی کے ساتھ چلتی ہیں۔

۴۔ اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں۔

۵۔ (ہاں! ان سب کی قسم) جو کچھ تجھے وعدہ دیا گیا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔
۶۔ اور بلاشک وشبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی۔

تفسیر

طوفانوں اور بارش لانے والے بادلوں کی قسم

سُورہ" والصافات" کے بعد یہ دوسری سُورت ہے جو بار بار کی قسموں کے ساتھ شروع ہوتی ہے، پُرمعنی اور فکر انگیز قسمیں، بیدار کرنے والی اور آگاہی بخش قسمیں۔

قرآن کی بہت سی دوسری سُورتیں، جن سے ہم انشاء اللہ آئندہ کے مباحث میں گفتگو کریں گے، اسی قسم کی ہیں؛ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ قسمیں غالباً مسئلہ معاد و قیامت کے بیان کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہیں، چند موقعوں کے سوا جو مسئلہ توحید اور دوسری باتوں کے ساتھ مربوط ہیں، اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان قسموں کا مضمون قیامت کے مطالب کے ساتھ ایک خاص ربط رکھتا ہے، اور ایک خاص عمدگی اور زیبائی کے ساتھ قرآن اس اہم بحث کا مختلف طریقوں سے جواب دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی قسمیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس آسمانی کتاب کے اعجاز کی صورتوں، اور قرآن کے زیباترین اور روشن ترین حصوں میں سے ایک ہے، جن میں سے ہر ایک کی تشریح وتفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

اس سُورہ کے آغاز میں خدا نے پانچ مختلف موضوعات کی قسم کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، اور ایک حصہ علیحدہ صورت میں آیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے" قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو فضا میں چلاتی ہیں اور گرد و غبار اور گیاہ اور پھولوں کے بیج روئے زمین میں ہر جگہ بکھیرتی ہیں" (والذاریات ذروًا)۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے:" قسم ہے ان بادلوں کی جو بارش کا سنگین بوجھ اپنے ساتھ اُٹھائے پھرتے ہیں" (فالحاملات وقرًا)[2]

---

[1] "ذاریات" جمع ہے "ذاریہ" کی، ایسی ہواؤں کے معنی میں جو چیزوں کو اطراف میں۔

[2] "وقر" (بروزن فکر) بھاری بوجھ کے معنی میں ہے، نیز کانوں کے بھاری ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ "وقار" بھی سنگینی حرکات اور سکون و بردباری کے معنی میں ہے۔

"اور قسم ہے ان کشتیوں کی جو عظیم دریاؤں اور سمندروں کی سطح پر آسانی کے ساتھ چلتی ہیں" (فالجاریات یسرًا)۔[1]

"اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں" (فالمقسمات امرًا)۔

ایک حدیث میں جسے بہت سے مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے یہ آیا ہے کہ "ابن الکوا"[2] نے ایک دن علی علیہ السلام سے، جبکہ آپؑ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، سوال کیا، "الذاریات ذروًا" سے کیا مراد ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ہوائیں!

اس نے عرض کیا: "فالحاملات وقرًا" فرمایا: بادل!

اس نے عرض کیا: "فالجاریات یسرًا" فرمایا: کشتیاں!

اس نے عرض کیا: "فالمقسمات امرًا" فرمایا: فرشتے مراد ہیں!

اس کے باوجود دوسری تفسیریں بھی ہیں، جو اس تفسیر کے ساتھ قابلِ جمع ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ "جاریاتِ یسرًا" سے مراد وہ نہریں اور دریا ہیں جو بارشوں کے ذریعہ جاری ہوتے ہیں اور "فالمقسمات امرًا" سے مراد وہ رزق ہیں جو فرشتوں کے ذریعہ کھیتی باڑی کے طریق سے تقسیم ہوتے ہیں۔

اس طرح سے ہواؤں کے بارے میں پھر بادلوں کے بارے میں اور اس کے بعد دریاؤں اور نہروں کے بارے میں، اور آخر میں نباتات کے اگانے کے سلسلے میں گفتگو ہوئی ہے، جو مسئلہ معاد کے ساتھ جو اس کے بعد آیا ہے، قریبی مناسبت رکھتی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امکانِ معاد کی ایک دلیل مردہ زمینوں کو بارش کے ذریعہ زندہ کرنے کا مسئلہ ہے جو قرآن میں بارہا مختلف عبارتوں میں ذکر ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ممکن ہے یہ چاروں اوصاف سب کے سب ہواؤں کے اوصاف ہوں، وہ ہوائیں جو بادلوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اور وہ ہوائیں جو انھیں اپنے دوش پر اُٹھائے پھرتی ہیں اور وہ ہوائیں جو انھیں ہر طرف چلاتی ہیں اور وہ ہوائیں جو بارش کے قطروں کو ہر طرف بکھیرتی ہیں۔[3]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات کی تعبیریں جامع اور کلی ہیں، لہٰذا وہ ان تمام معانی کو اپنے اندر

---

[1] "جاریات" "جاریہ" کی جمع ہے جو کشتی کے معنی میں ہے، جاری پانی کی نہروں کے معنی میں بھی آیا ہے۔ "فیھا عین جاریۃ" (غاشیہ - ۱۲) اور اسی طرح سورج کے معنی میں، آسمان میں اس کی حرکت کی بناء پر، اور نوجوان لڑکی کو بھی "جاریۃ" کہا جاتا ہے کیونکہ جوانی کی خوشی اس کے تمام وجود میں جاری ہوتی ہے۔

[2] اس کا نام عبداللہ تھا، جو امیرالمومنین علیؑ کے زمانہ میں رہتا تھا اور آپ کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا، خود کو ان کا دوست کہتا تھا اور کارشکنی کرتا تھا۔

[3] "تفسیر فخر رازی" جلد ۲۸ صفحہ ۱۰۔

جگہ دے سکتی ہیں۔ لیکن عمدہ وہی پہلی تفسیر ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر فرشتے مراد ہوں، تو فرشتے کن امور کو تقسیم کرتے ہیں؟

اس کے لیے ہمارا جواب یہ ہے کہ تقسیم کار ممکن ہے کہ اس عالم کے کل امور کی تدبیر سے مربوط ہو، کیونکہ فرشتگان الٰہی کے کچھ گروہ خدا کے فرمان سے اس کے امور کی تدبیر کو اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تقسیم ارزاق، یا زمین کے مختلف منطقوں میں بارش کے قطرات کی تقسیم سے مربوط ہو، [1]

ان چار قسموں کو بیان کرنے کے بعد جو سب کی سب اُس مطلب کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں، جو اُن کے بعد آرہا ہے، فرماتا ہے، "جو کچھ تمھیں وعدہ دیا گیا ہے، وہ یقیناً سچ ہے" (انما توعدون لصادق) [2]

دوبارہ تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے،: "اس میں شک نہیں کہ اعمال کی جزاء واقع ہو کر رہے گی" (وان الدین لواقع)۔

"دین" یہاں جزاء کے معنی میں ہے، جیسا کہ "مالک یوم الدین" میں آیا ہے، اور اصولاً قیامت کا ایک نام "یوم الدین" (روزِ جزا) ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے، کہ واقع ہونے والے وعدوں سے مراد، یہاں قیامت و حساب و جزا و سزا و بہشت و دوزخ سے مربوط وعدے، اور معاد سے مربوط تمام امور ہیں، اس بنا پر پہلا جملہ قیامت کے تمام وعدوں کو شامل ہے، اور دوسرا جملہ مسئلہ جزاء پر ایک تاکید ہے۔

بعد کی چند آیات میں بھی "یوم الدین" کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے وہ قسمیں جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں، وہ ان قسموں کے نتائج کے ساتھ ایک واضح و روشن تعلق اور مناسبت رکھتی ہیں، کیونکہ بادلوں کا چلنا، بارش کا برسنا، اور اس کے نتیجہ میں مردہ زمینوں کا زندہ ہونا خود قیامت و معاد کے منظر کی اس دُنیا میں نشاندہی کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے "ماتوعدون" کی یہاں ایک زیادہ وسیع مفہوم کے ساتھ تفسیر کی ہے، جو خدا کے تمام وعدوں، قیامت و دنیا و تقسیم ارزاق اور اس جہان میں اور دوسرے جہان میں مجرموں کی سزا کے ساتھ مربوط ہیں اور مومنین صالح کی کامیابی کو شامل ہیں، اسی سورہ کی آیت ۲۲ جو کہتی ہے۔ "وفی السماء رزقکم وما توعدون" (تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے آسمانوں میں ہے) ممکن ہے اسی معنی کی تائید ہو، اور چونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ لہٰذا یہ عمومیت بعید نہیں ہے۔

بہرحال خدا کے سب وعدے سچے ہیں، کیونکہ "وعدہ کی مخالفت" یا تو "جہالت" کے سبب سے ہوتی ہے، یا "عجز" ہے، وہ جہالت جو وعدہ کرنے والے کی فکر اور سوچ کو بدل کر رکھ دیتی ہے، اور وہ عجز جو اُسے وعدہ کی وفا سے روک دیتا ہے، لیکن خدا "عالم" اور "قادر" ہے، لہٰذا اس کے وعدے تخلف ناپذیر ہیں، یعنی پکے ہیں۔

---

[1] اس نکتہ کی توجہ بھی ضروری ہے کہ "والذاریات" میں "واؤ" قسم کا واؤ ہے، اور "فا" بعد والے جملہ میں فاء عاطفہ ہے، جو یہاں قسم کا مفہوم رکھتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان چار قسموں میں ایک قسم کے ربط کو بیان کرتی ہے۔

[2] توجہ رکھنی چاہیئے کہ "انما" میں "ما" موصولہ ہے اور "ان" کا اسم ہے اور "صادق" اس کی خبر ہے۔

۷۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۙ
۸۔ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ
۹۔ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۭ
۱۰۔ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۙ
۱۱۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۙ
۱۲۔ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۭ
۱۳۔ يَوْمَ هُمْ عَلَي النَّارِ يُفْتَنُوْنَ
۱۴۔ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ

ترجمہ

۷۔ قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت شکنوں والا ہے۔
۸۔ یقیناً تم مختلف اور طرح طرح کی باتوں میں لگے ہوئے ہو۔
۹۔ وہی لوگ اس (روز جزا) پر ایمان لانے سے منحرف ہوتے ہیں جو حق کو قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔
۱۰۔ قتل ہو جائیں جھوٹے (اور موت انھیں آلے)
۱۱۔ وہی جو جہالت اور غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
۱۲۔ اور ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ جزا کا دن کب ہوگا؟

۱۳۔ (ہاں!) وہ وہی دن ہے، جس میں انھیں آگ میں جلائیں گے۔

۱۴۔ اپنا عذاب چکھو، یہ وہی چیز ہے، جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔

تفسیر

قسم ہے آسمان کی اور اس کی زیبا شکنوں کی

یہ آیات بھی گزشتہ آیات کی طرح قسم کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں، اور قیامت کے بارے میں کافروں کے اختلافات، اور دوسرے مختلف مسائل منجملہ ان کے پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت اور مسئلہ توحید کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت شکنوں والا ہے" (والسماء ذات الحبك)۔

"حبك" بروزن کتب (جمع حبک (بروزن کتاب) کے لغت میں بہت سے معنی بتائے گئے ہیں، منجملہ ان کے: راستے، بل، اور شکن ہے جو بیابان کی ریت پر ہواؤں کی وجہ سے یا پانی کی سطح پر یا آسمان کے بادلوں پر پیدا ہوتے ہیں۔

"مجعد" (گھنگھریالے) بالوں کو بھی "حبك" کہا جاتا ہے۔

بعض اوقات مفسرین نے "حبک" کی زیبائی اور زینت میں بھی تفسیر کی ہے۔

اور اسی طرح موزوں و مرتب شکل و صورت کے معنی میں بھی۔

اور اس کا اصلی ریشہ اور جڑ "حبک" (بروزن کبک) ہے جو باندھنے اور محکم کرنے کے معنی میں ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ایسے خوبصورت بل اور شکن ہیں، جو موجوں کے درمیان، آسمان کے بادلوں، بیابان کے ریت کے ٹیلوں اور سر کے بالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اب رہی اس معنی کی آسمانوں پر تطبیق تو یہ یا تو فلکی صورتوں اور عام ستاروں کی مختلف شکلوں کی وجہ سے ہے۔ (ثابت ستاروں کا وہ مجموعہ جو ایک خاص شکل بنا لیتا ہے صورت فلکی کہلاتا ہے)

یا آسمانی بادلوں میں جو پرکشش موجیں اور لہریں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی وجہ سے ہے، جو بعض اوقات اس قدر خوبصورت اور زیبا ہوتی ہیں کہ مدتوں تک انسان کی آنکھ کو اپنی طرف متوجہ کیے رہتی ہیں۔

یا کہکشاؤں کا وہ عظیم انبوہ ہے جو مجعد اور گھنگریالے بالوں کی طرح پیچ و خم کھاتی ہوئیں آسمان پر ظاہر ہوتی ہیں خاص طور سے وہ عمدہ عکس، جو ماہرین نے دوربینوں کے ذریعہ ان کہکشاؤں کے لیے دیکھے ہیں۔ کامل طور سے مجعد اور گھنگریالے

اور پیچیدہ بالوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس معنی کی بنا پر، قرآن آسمان اور ان عظیم کہکشاؤں کی جن پر اس زمانہ میں علم و دانش کی تیز آنکھ ابھی تک نہیں پڑی تھی قسم کھاتا ہے۔ [1]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ یہ معانی ایک دوسرے سے کوئی منافات نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ سب ہی اس قسم میں جمع ہوں، سورۂ مؤمنون کی آیت ۱۷ میں بھی یہ آیا ہے۔ ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق، "ہم نے تمہارے اوپر سات راستے خلق کیے ہیں" جو آسمانوں کے تنوع اور ان کی کثرت اور کرّوں اور کہکشاؤں اور مختلف عوالم کی طرف اشارہ ہے۔ [2]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "حبک" کے ریشۂ اصلی کا آسمانوں کے استحکام اور کرّوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط پیوند سے جیسا کہ نظامِ شمسی کا سورج کے ساتھ تعلق ہے۔ اشارہ ہو سکتا ہے۔

بعد والی آیت جوابِ قسم، یعنی وہ مطلب جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "تم سب کے سب مختلف اور قسم قسم کی گفتگو میں پڑے ہوئے ہو" (انکم لفی قول مختلف)۔

تم ہمیشہ ایک دوسرے کی ضد اور نقیض باتیں کرتے ہو، اور یہی تناقض تمہاری باتوں کے بے بنیاد ہونے کی دلیل ہے۔

معاد و قیامت کے بارے میں کبھی تو یہ کہتے ہو کہ: ہم اصلاً یہ بات باور نہیں کرتے کہ بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جائیں۔

اور کبھی یہ کہتے ہو کہ ہمیں اس بارے میں شک و تردد ہے۔

اور کبھی اور بڑھا کر کہتے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد اور بڑوں کو لے آؤ تاکہ وہ گواہی دیں کہ موت کے بعد قیامت اور معاد ہے تو پھر ہم قبول کریں گے۔

اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں کبھی تو یہ کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے، کبھی یہ کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے، کبھی اُسے جادوگر بتاتے ہو اور کبھی یہ کہتے ہو کہ اس کا کوئی معلم و استاد ہے جو ان باتوں کی اُسے تعلیم دیتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے بارے میں کبھی تو اُسے "اساطیر الاولین" (گذشتہ لوگوں کے افسانے اور خرافات) کا نام دیتے ہو، کبھی اُسے شعر کہتے ہو اور کبھی جادو، اور کبھی جھوٹ۔

قسم ہے آسمان کے شکنوں کی، کہ تمہاری باتیں تناقض اور پیچ و خم سے پُر ہیں اگر تم کوئی اصل بنیاد رکھتے ہوتے، تو کم از کم ایک مطلب پر تو ٹھہرتے، اور ہر روز کسی نئے مطلب کے پیچھے نہ جاتے۔

یہ تعبیر حقیقت میں مخالفین کے دعووں کے بطلان پر ایک استدلال ہے، جو وہ توحید، معاد، پیغمبر اور قرآن کے

---

[1] "لسان العرب" اور "مفردات راغب" میں مادۂ "حبک" کی طرف رجوع کریں۔

[2] اس آیت کی تفسیر میں مبسوط شرح تفسیر نمونہ جلد ۱۴ سورۂ مؤمنون آیت ۱۷ کے ذیل میں آچکی ہے۔

بارے میں کرتے ہیں۔

(اگرچہ اُن آیات کے قرینہ سے جو بعد میں آئیں گی، ان آیات کا اصلی تکیہ مسئلہ معاد پر ہے)۔

اور ہم جانتے ہیں کہ جھوٹے دعویداروں کے جھوٹ کا پول کھولنے میں۔ چاہے قضائی مسائل میں ہو یا دوسرے مسائل میں۔ ان کی ایک دوسری کے خلاف باتوں سے استناد ہوتا ہے، قرآن بھی ٹھیک اسی مطلب پر تکیہ کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں حق سے اس انحراف کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قیامت پر ایمان سے وہی لوگ منحرف ہوتے ہیں جو حق کے دلائل کو قبول کرنے اور منطق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے روگردانی کرتے ہیں" ورنہ موت کے بعد کی زندگی کے دلائل واضح و آشکار ہیں۔ (یؤفک عنہ من افک)۔

توجہ رکھنی چاہیئے کہ آیت کی تعبیر کلی اور سربستہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے: "لوٹائے جائیں گے اس سے وہ جس سے وہ لوٹائے گئے ہیں۔

"کیونکہ "افک" اصل میں منصرف کرنے اور کسی چیز سے پھیرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے "جھوٹ" کو جو انحرافی پہلو رکھتا ہے، "افک" کہا جاتا ہے، جیسا کہ مختلف ہواؤں کو "مؤتفکات" کہا جاتا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گذشتہ آیات میں قیامت کے بارے میں گفتگو تھی، لہٰذا ظاہر ہے کہ اصلی مقصود اسی عقیدہ سے انحراف ہے، اور چونکہ گزشتہ آیت میں گفتگو کافروں کی ایسی باتوں کے متعلق تھی جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، لہٰذا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو واضح منطق اور دلیل سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر مجموع آیت اس طرح معنی دیتی ہے: وہی لوگ قیامت پر ایمان رکھنے سے منحرف ہوں گے، جو دلیل عقل کی راہ اور حق طلبی کی منطق سے منحرف ہو گئے ہیں۔

البتہ کوئی مانع نہیں ہے کہ مراد ہر قسم کے حق سے انحراف ہو، چاہے وہ قرآن سے انحراف ہو یا توحید و نبوت پیغمبر و معاد سے ہو، (اور ان ہی میں سے آئمہ معصومینؑ کی ولایت کا مسئلہ ہے، جو بعض روایات میں وارد ہوا ہے) لیکن بہرحال مسئلہ قیامت جو اصل موضوع ہے، یقینی طور پر اس میں شامل ہے۔

بعد والی آیت میں جھوٹ بولنے والوں اور اُسے بیان کرنے والوں کو شدت کے ساتھ مذمت اور تہدید کرتے ہوئے کہتا ہے، "قتل کیے جائیں جھوٹ بولنے والے اور ان کے لیے موت ہو (مردہ باد)" (قتل الخرّاصون)۔

"خراص" مادہ "خرص" (بروزن درس) سے اصل میں ہر اس بات کے معنی میں ہے، جو گمان تخمینہ اور اندازے کی بنا پر کہی جائے (اٹکل پچو) اور چونکہ اس قسم کی باتیں جھوٹ ہوتی ہیں لہٰذا یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس طرح سے "خراصون" وہ لوگ ہیں جو بے بنیاد اور بے سر و پا باتیں کرتے ہیں، اور یہاں بعد والی آیات کے قرینہ سے وہ لوگ مراد ہیں، جو قیامت کے بارے میں بے بنیاد اور منطق سے دُور باتوں کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن بہرصورت یہ جملہ ان پر نفرین کی صورت میں ہے۔ ایسی نفرین جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ ایسی موجودات

ہیں، جو موت اور نابودی کے لائق ہیں، اور وہ اس طرح ہیں جن کا عدم ان کے وجود سے بہتر ہے۔

بعض نے "قتل" کی یہاں لعن وطرد اور رحمتِ خدا سے محرومیت کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

اور یہاں سے اس حکم کلی کو بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اصولی طور پر وہ فیصلے جن کا واضح مدرک موجود نہ ہو اور اندازے وتخمین اور بے بنیاد گمانوں پر قائم ہوں، ایسے کام ہیں، جو گمراہ کرنے والے اور نفرین وعذاب کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد ان اٹکل پچو باتیں کرنے والے جھوٹے لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جو جہالت، غفلت اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں" (الذین ھم فی غمرۃ ساھون)۔

"غمرۃ" اصل میں اس زیادہ پانی کے معنی میں ہے، جو کسی جگہ کو ڈھانپ لے، اس کے بعد عمیق اور گہری جہالت ونادانی پر جو کسی کو ڈھانپ لے، اطلاق ہوا ہے۔

"ساھون" "سھو" کے مادہ سے ہر قسم کی غفلت کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جہالت کا پہلا مرتبہ "سہو واشتباہ" ہے، اس کے بعد "غفلت" اور پھر "غمرہ" ہوتا ہے۔

اس بنا پر وہ سہو کے مرحلہ سے شروع کرتے ہیں، اس کے بعد غفلت و بے خبری تک پہنچتے ہیں، اور اس راہ کو جاری رکھتے ہوئے مکمل طور پر "جہالت" میں ڈوب جاتے ہیں، اور ان دونوں تعبیروں۔ سہو وغمرہ۔ کے درمیان جمع کرنا ممکن ہے اوپر والی آیت میں اس حرکت کے آغاز وانجام کی طرف اشارہ ہو۔

اس طرح کہ "خراصون" سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اپنی جہالت ونادانی میں غرق ہیں اور حق سے فرار کرنے کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ، اور بے بنیاد باتیں بناتے رہتے ہیں۔

اور اسی لیے "ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ روزِ جزا کس وقت ہوگا اور قیامت کب آئے گی" (یسئلون ایان یوم الدین)۔

یسئلون کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ یہی سوال کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ اصولی طور پر ضروری ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کا وقت مخفی اور پوشیدہ ہے، تاکہ ہر شخص ہر زمانہ میں اس کے واقع ہونے کا احتمال دے اور قیامت پر ایمان کا تربیتی اثر جو ہمیشہ کی آمادگی اور خود سازی ہے، وہ حاصل ہو،

یہ گفتگو اس کے مانند ہے کہ بیمار ڈاکٹر سے بار بار سوال کرے کہ میری عمر کا اختتام کب ہوگا؟ تو ہر شخص اس سوال کو بے بنیاد سمجھے گا اور کہے گا کہ اہم بات تو یہ ہے کہ تو یہ جانے کہ موت حق ہے تاکہ تو اپنا علاج کرے تاکہ کہیں "جلدی آنے والی موت" میں گرفتار نہ ہو جائے۔

لیکن ان کا تو ٹھٹھا کرنے اور بہانہ جوئی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں تھا، وہ واقعی طور پر قیامت کے برپا ہونے کی تاریخ معلوم کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود قرآن انھیں چبھتا ہوا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "قیامت اس دن ہوگی جب انھیں آگ پر جلایا جائے گا" (یوم ھم علی النار یفتنون)۔

اور انھیں کہا جائے گا: "اپنے عذاب کو چکھو، یہ وہی چیز تو ہے، جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے" (ذوقوا فتنتکم ھٰذا الذی کنتم بہ تستعجلون)۔

"فتنہ" اصل میں سونے کو کٹھالی میں رکھنے کے معنی میں ہے، تاکہ اچھا اور خالص سونا کھوٹے اور ناخالص سے پہچانا جائے، اور اسی مناسبت سے ہر قسم کی آزمائش اور امتحان کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور "انسان کے آگ میں داخل ہونے" کے معنی میں بھی آیا ہے، اور کبھی بلا و عذاب اور پریشانی کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ
۱۶۔ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۭ
۱۷۔ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝
۱۸۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝
۱۹۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

ترجمہ

۱۵۔ پرہیزگار جنت کے باغوں اور چشموں کے درمیان ہوں گے۔
۱۶۔ اور جو کچھ ان کے پروردگار نے انھیں مرحمت فرمایا ہے، اُسے حاصل کریں گے، کیونکہ وہ اس سے پہلے (دارِ دنیا میں) نیکوکاروں میں سے تھے۔
۱۷۔ وہ رات کے کچھ ہی حصّہ میں سوتے تھے۔
۱۸۔ اور سحر کے وقتوں میں استغفار کیا کرتے تھے۔
۱۹۔ اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کے لیے ایک حق تھا۔

تفسیر

نیکوکار سحر خیزوں کا اجر

گذشتہ آیات کے بعد، جن میں جاہل جھوٹ بولنے والوں، اور قیامت و معاد کے منکرین اور ان کے عذاب

کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں پرہیزگار مومنین اور ان کے اوصاف اور اجر و پاداش کی بات ہو رہی ہے تاکہ ایک دوسرے کا موازنہ کر کے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی روش ہے ــ حقائق اور زیادہ واضح و روشن ہو جائیں۔

فرماتا ہے: "پرہیزگار جنت کے باغات اور چشموں کے درمیان ہوں گے" (ان المتقین فی جنات و عیون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ باغ میں قدرتی طور پر پانی کی نہریں ہوتی ہیں، لیکن اس کا لطف اور عمدگی اس بات میں ہے کہ چشمے خود باغ کے اندر سے پھوٹیں اور درختوں کو ہمیشہ سیراب کرتے رہیں، یہ وہ امتیاز اور خصوصیت ہے جو جنت کے باغات میں پائی جاتی ہے نہ صرف ایک ہی قسم کا چشمہ بلکہ اس میں انواع و اقسام کے چشمے موجود ہیں،[1]

اس کے بعد جنت کی دوسری نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجمالی اور سربستہ صورت میں کہتا ہے: "ان کے پروردگار نے جو کچھ انھیں مرحمت فرمایا ہے، وہ اسے حاصل کرتے ہیں" (آخذین ما آتاھم ربھم)۔

یعنی وہ انتہائی رغبت اور شوق اور کمال رضا کے ساتھ اور خوشی خوشی خدا کی ان نعمتوں کو قبول کریں گے۔

اور آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، کہ یہ عظیم اجر اور جزا بلاوجہ نہیں ہیں، "وہ اس سے پہلے دار دنیا میں نیکوکاروں میں سے تھے" (انھم کانوا قبل ذالک محسنین)۔[2]

احسان اور نیکوکاری جو یہاں آئی ہے، ایک وسیع معنی رکھتی ہے جو خدا کی اطاعت کو بھی شامل ہے اور خلق خدا سے انواع و اقسام کی نیکیوں کو بھی۔

* * *

بعد والی آیات ان کے نیکوکار ہونے کی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے، ان کے اوصاف میں سے تین اوصاف کو بیان کرتی ہیں۔

پہلی یہ کہ "وہ راتوں کے تھوڑے حصہ میں سوتے تھے" (کانوا قلیلاً من اللیل مایھجعون)۔

"یھجعون" "ھجوع" کے مادہ سے رات کو سونے کے معنی میں ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رات کے اکثر حصہ میں بیدار رہتے ہیں اور تھوڑا حصہ سوتے تھے۔ اور اصطلاح کے مطابق ہمیشہ شب زندہ دار تھے۔

---

[1] لفظ "فی" کا "جنات" کے بارے میں مفہوم واضح ہے۔ کیونکہ پرہیزگار جنت کے اندر ہیں، لیکن "عیون" (چشموں) کے بارے میں اس معنی میں نہیں ہے، کہ وہ چشموں کے اندر ہوں گے بلکہ وہ بہتے ہوئے چشموں کے درمیان میں ہوں گے۔

[2] "قبل ذالک" سے مراد۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ قیامت اور بہشت میں وارد ہونے سے پہلے ہے۔ یعنی عالم دنیا میں، لیکن بعض نے اُسے شریعت کے آنے سے پہلے کے معنی میں لیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ "مستقلات عقلیہ" پر وحی کے نازل ہونے سے پہلے ہی عمل کیا کرتے تھے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ حکم پرہیزگاروں اور محسنین کے لیے ایک عمومی حکم کی صورت میں بعید نظر آتا ہے، لہٰذا یہ تفسیر مناسب نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے کم اتفاق ہوتا تھا کہ وہ ساری رات سوئیں، دوسرے لفظوں میں "لیل" (رات) جنس اور عموم کی صورت میں مدنظر ہے۔

اس بنا پر وہ ہر رات کے ایک حصہ میں بیدار رہتے تھے اور عبادت و نماز شب میں مشغول رہتے تھے، اور ایسی راتیں جن میں وہ ساری رات سوئے رہے ہوں، اور رات کی عبادت کلی طور پر اُن سے فوت ہوگئی ہو، بہت کم تھیں۔

یہ تفسیر ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بھی نقل ہوئی ہے۔[1]

اس آیت کے لیے دوسری تفسیریں بھی ذکر کی گئی ہیں، لیکن چونکہ وہ بعید نظر آتی تھیں۔ لہٰذا ان کو بیان نہیں کیا گیا۔[2]

ان کی دوسری صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے، "وہ ہمیشہ سحر کے اوقات میں استغفار کرتے ہیں" (و بالاسحار ھم یستغفرون)۔

آخر شب میں جب غافلوں کی آنکھیں نیند میں ہوتی ہیں اور ماحول ہر لحاظ سے پُرسکون ہوتا ہے۔ مادی زندگی کا شور و غل خاموش ہوتا ہے اور وہ عوامل جو انسان کی فکر کو اپنی طرف مشغول رکھتے ہیں، سب خاموش ہیں۔ یہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور اس کے حضور میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں استغفار سے مراد وہی "نمازِ شب" ہے، اس بنا پر کہ "نمازِ وتر کا قنوت" استغفار پر مشتمل ہے۔

"اسحار" "سحر" (بروزن بشر) کی جمع ہے، اصل میں "پوشیدہ اور پنہاں" ہونے کے معنی میں ہے، اور چونکہ رات کی آخری گھڑیوں میں ایک خاص قسم کی پوشیدگی ہر چیز پر چھائی ہوتی ہے، لہٰذا اس کا نام "سحر" رکھا گیا ہے۔

لفظ "سحر" (بروزن شعر) بھی ایسی ہی چیز کو کہا جاتا ہے جو حقائق کے چہرے کو ڈھانپ دے، یا جس کے اسرار دوسروں سے پوشیدہ ہیں۔

---

[1] مرحوم "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے (جلد ۹ ص ۱۵۵) تفسیر صافی میں بھی یہ حدیث کافی سے اس صورت میں نقل ہوئی ہے۔ کانوا اقل اللیالی یفوتھم لا یقومون فیھا، (بہت کم راتیں ان سے فوت ہوتی تھیں جن میں وہ عبادت کے لیے نہ اٹھتے ہوں۔ (تفسیر صافی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] "ما یھجعون" میں "ما" ممکن ہے زائدہ ہو اور تاکید کے لیے ہو، یا موصولہ ہو، یا مصدریہ ہو، (جیسا کہ تفسیر فخر رازی اور المیزان میں آیا ہے) اگرچہ بعض نے صرف زائدہ اور مصدریہ کہا ہے (جیسا کہ قرطبی اور روح البیان میں آیا ہے) لیکن یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ "نافیہ" ہے تو یہ بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

تفسیر "درمنثور" میں ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا:

"ان آخر اللیل فی التھجد احب الی من اولہ، لان اللہ یقول وبالاسحار ھم یستغفرون:

"آخری رات تہجد (نمازِ شب) کے لیے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ اس کے اوّل سے کیونکہ خدا فرماتا ہے: پرہیزگار سحر کے وقتوں میں استغفار کرتے ہیں" [1]

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہوا ہے:

"کانوا یستغفرون اللہ فی الوتر سبعین مرۃ فی السحر:"

"بہشتی نیکوکار سحر کے وقت نمازِ وتر میں ستر مرتبہ خدا سے طلبِ مغفرت کرتے ہیں۔" [2]

اس کے بعد بہشتی پرہیزگاروں کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان کے اموال میں سائل و محروم کے لیے ایک حق ہے" (وفی اموالھم حق للسائل والمحروم)۔

"حق" کی تعبیر یہاں یا تو اس بنا پر ہے کہ خدا نے ان پر لازم قرار دیا ہے (مثلاً زکوٰۃ، خمس اور سارے واجب شرعی حقوق) یا انھوں نے خود سے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے، اور عہد کیا ہے تو اس صورت میں حقوق واجب کے علاوہ کو بھی شامل ہوگا۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت صرف دوسری قسم کے لیے ہے، اور حقوق واجب کو شامل نہیں ہے، کیونکہ حقوق واجب تو سب لوگوں کے اموال میں ہوتے ہیں، چاہے وہ پرہیزگار ہوں، یا دوسرے، یہاں تک کہ کفار بھی، اس بنا پر جب وہ یہ کہتا ہے کہ: ان کے اموال میں اس قسم کا حق ہے، یعنی واجبات کے علاوہ وہ اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اموال میں سے راہِ خدا میں سائلوں اور محروموں پر خرچ کریں، لیکن کہا جا سکتا ہے، کہ نیکوکاروں کا دوسروں سے فرق یہ ہے کہ نیکوکار ان حقوق کو ادا کرتے ہیں، جبکہ دوسرے اس کے پابند نہیں ہیں۔

یہ تفسیر بھی بیان کی گئی ہے کہ "سائل" کی تعبیر حقوق واجبہ کے بارے میں ہے، کیونکہ وہ سوال اور مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں، اور "محروم" کی تعبیر مستحب حقوق میں ہے جن میں مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

"فاضل مقداد" "کنز العرفان" میں تصریح کرتے ہیں کہ "حق معلوم" سے مراد وہ حق ہے جو وہ خود اپنے مال میں قرار دیتے ہیں، اور خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ [3]

اس معنی کی نظیر سورۂ معارج کی آیہ ۲۴، ۲۵ میں بھی آئی ہے فرماتا ہے: والذین فی اموالھم حق معلوم

---

[1] درالمنثور، جلد ۶، صفحہ ۱۱۳۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] "کنز العرفان" جلد ۱، صفحہ ۲۰۰۔

للسائل والمحروم۔

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا، اور اس سورہ کی تمام آیات مکی ہیں، آخری نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ان روایات سے بھی جو منابع اہل بیتؑ سے پہنچی ہیں، اس بات کی تاکید ہوئی ہے کہ "حق معلوم" سے مراد زکوٰۃ واجب کے علاوہ کی کوئی چیز ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

" لکن اللہ عزوجل فرض فی اموال الاغنیاء حقوقاً غیر الزکاۃ، فقال عزوجل: والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل، فالحق المعلوم غیر الزکاۃ، وھو شیء یفرضہ الرجل علی نفسہ فی مالہ ..... ان شاء فی کل یوم وان شاء فی کل جمعۃ وان شاء فی کل شھر ....."[1]

" لیکن خدا نے دولت مندوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کچھ حقوق قرار دیئے ہیں، منجملہ ان کے فرمایا ہے: ان کے اموال میں سائل و محروم کے لیے حق معلوم ہے، اس بناء پر "حق معلوم" زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو انسان خود اپنی ذات پر لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے دے ..... چاہے تو روزانہ دے یا ہر جمعہ کو دے یا ماہانہ دے ....."[1]

اس سلسلہ میں دوسری متعدد احادیث مختلف تعبیروں کے ساتھ امام علی بن الحسینؑ، امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں،[2]

اور اس طرح سے آیت کی تفسیر واضح و روشن ہے۔

اس بارے میں کہ "سائل" اور "محروم" میں کیا فرق ہے؟ ایک گروہ نے تو یہ کہا ہے: "سائل" وہ شخص ہے جو لوگوں سے مدد کا تقاضا کرے، لیکن "محروم" وہ آبرومند شخص ہے جو معاش کے لیے اپنی انتہائی جد و جہد اور کوشش کرتا ہے، لیکن اس کا ہاتھ کہیں نہیں پہنچتا اور اس کا کسب و کار اور زندگی پیچیدہ ہوگئی ہے، اور اس کے باوجود اپنی غیرت کی حفاظت کرتا ہے، اور کسی سے مدد نہیں مانگتا،

یہ وہی شخص ہے جسے "محارف" سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ محارف کی تفسیر میں کتب لغت اور روایات اسلامی میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

" وہ ایک ایسا آدمی ہے، جو جس قدر بھی کوشش کرتا ہے اس کی کوئی درآمد نہیں ہوتی، گویا زندگی کے راستے اس

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۶ ص ۲، ابواب ما تجب فیہ الزکات باب ۱، حدیث ۲۔

[2] وہی مدرک۔

کے سامنے بند ہو گئے ہیں۔"

بہر حال یہ تعبیر اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ ہرگز اس انتظار میں نہ بیٹھے رہو کہ حاجت مند تمہارے پاس آئیں، اور مدد کی درخواست کریں۔ بلکہ تم پر لازم ہے کہ تم جستجو کرو، اور آبرومند محروم افراد کو جو قرآن کے قول کے مطابق (بقرہ ۲۷۳) یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف؛

بے خبر لوگ پاک دامنی کی وجہ سے انھیں غنی اور مالدار خیال کرتے ہیں" پیدا کرو، اور ان کی مدد کرو، ان کی مشکلات کی گرہ کھولو اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کرو، اور یہ ایسا اہم حکم ہے، جو محروم مسلمانوں کی شخصیت و حیثیت کی حفاظت کے لیے بہت اہم ہے۔

یقیناً ان لوگوں کو (اسی سورۂ بقرہ کی آیت میں قرآن کے قول کے مطابق) ان کے چہروں سے پہچانا جاسکتا ہے۔

تعرفھم بسیماھم۔

ہاں! اگرچہ وہ خاموش ہیں، لیکن آگاہ افراد کے لیے ان کے چہرے کی گہرائی میں ان کی اندرونی جانکاہ تکلیفات کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں، اور "ان کے چہرے کا رنگ ان کے اندرونی بھید کی خبر دیتا ہے۔"

⁂

چند نکات

۱۔ "خدا" اور "خلقِ خدا" کی طرف توجہ

ان آیات میں "متقین" اور "محسنین" کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ حقیقت میں ان کا دو حصّوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے، خالق کی طرف توجہ وہ بھی ایسے لمحات میں جو ہر لحاظ سے اس کے ساتھ راز و نیاز اور حضورِ قلب کے لیے فراہم ہیں اور فکری مشغولیت کے عوامل، اور ذہنی مصروفیات کم سے کم ہوتے ہیں، یعنی رات کے آخری حصّوں میں۔

اور دوسرے حاجت مندوں کی حاجات کی طرف توجہ، چاہے وہ اپنی حاجت کو ظاہر کریں یا پوشیدہ رکھیں۔

یہی وہ مطلب ہے جس کے لیے قرآن کی آیات میں بارہا نصیحت و وصیت کی گئی ہے۔ اور وہ آیات جو نماز و زکوٰۃ کو یکے بعد دیگرے بیان کرتی ہیں اور ان دونوں پر تکیہ کرتی ہیں، ان میں اسی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ "نماز" خالق کے ساتھ تعلق کا، نمایاں ترین مظہر ہے، اور زکوٰۃ مخلوقِ خدا کے ساتھ تعلق کی واضح ترین راہ ہے۔

۲۔ شب خیز کہ عاشقان بہ شب راز کنند!

رات کو اُٹھ کیونکہ عشاق رات کے وقت راز و نیاز کرتے ہیں!

باوجود یکہ نمازِ شب نوافل اور مستحب نمازوں میں سے ہے، لیکن قرآن مجید میں بارہا اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اور یہ اس کی حد سے زیادہ اہمیت کی نشانی ہے، یہاں تک کہ قرآن اُسے "مقام محمود" تک پہنچنے کا وسیلہ (سورۂ اسراء۔ ۷۹) اور روشنی چشم کا سبب (جیسا کہ سُورۂ الم سجدہ کی آیہ ۱۷ میں آیا ہے) شمار کرتا ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس شبانہ راز و نیاز اور سحر گاہانہ بیداری پر حد سے زیادہ تکیہ ہوا ہے۔

ایک جگہ پیغمبر اکرمؐ اسے گناہوں کا کفارہ شمار کرتے ہُوئے فرماتے ہیں:

"یا علی ثلاث کفارات، منها التهجد باللیل والناس نیام"

"تین چیزیں گناہوں کا کفارہ ہیں ان میں سے ایک رات کو تہجد پڑھنا ہے۔ جبکہ لوگ سوئے ہُوئے ہوں۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں رسُولِ خدا سے منقول ہے:

"اشراف امتی حملة القرآن واصحاب اللیل"

"میری اُمت میں زیادہ شریف حاملین قرآن اور رات کے وقت عبادت کرنے والے ہیں۔"[2]

ایک اور حدیث میں بھی آنحضرتؐ کی علیؑ کے وصایا میں آیا ہے کہ آپ نے چار مرتبہ تکرار فرمایا ہے:

"علیك بصلوٰة اللیل"

"نماز تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا"[3]

اور امام صادقؑ سے زیر بحث آیت (کانوا قلیلاً من اللیل ما یهجعون) کی تفسیر میں اس طرح نقل ہوا ہے:

"کانوا اقل اللیالی تفوتهم لا یقومون فیها"

"بہت کم راتیں ایسی گزرتی ہیں کہ وہ بیدار نہ ہوں اور عبادت نہ کریں۔"[4]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"الرکعتان فی جوف اللیل احب الی من الدنیا وما فیها"

"دو رکعت نماز جو رات کی تاریکی میں پڑھی جائے میرے نزدیک دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔"[5]

نیز ایک حدیث میں منقول ہے کہ امام صادقؑ نے (اپنے ایک صحابی) "سلیمان دیلمی" سے فرمایا:

"لا تدع قیام اللیل فان المغبون من حرم قیام اللیل"

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۳ ص ۲۱۳۔

[2] "وسائل الشیعہ" جلد ۳ ص ۲۱۵۔

[3] "وسائل الشیعہ" جلد ۳ ص ۲۲۷۔

[4] "وسائل الشیعہ" جلد ۳ ص ۲۱۹۔

[5] "بحار الانوار" جلد ۸۰ ص ۱۴۵۔

"عبادت کے لیے قیام شب کو فراموش نہ کرو، وہ شخص خسارے میں ہے جو رات کے قیام سے محروم ہے۔"[1]

البتہ اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات ہیں اور ان میں حد سے زیادہ تعبیریں نظر آتی ہیں، خاص طور سے نمازِ شب گناہوں کی بخشش، فکر و نظر کی بیداری، دل کی روشنی، جلب رزق فراواں روزی اور تندرستی کے لیے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر متعارف ہوئی ہے اگر ان روایات کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جاتی ہے۔[2]

اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ صفحہ ۲۱۱ (سورۂ اسراء کی آیہ ۹، کے ذیل میں) اور جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۰ (سورۂ الم سجدہ کی آیت ۱۷ کے ذیل میں) اور دوسرے مباحث بھی ہم نے پیش کئے ہیں۔

۳۔ سائل و محروم کا حق

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمیشہ نیکوکاروں کے اموال میں سائل و محروم کے لیے حق ہے یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حاجت مندوں اور محروم افراد کے لیے دیندار سمجھتے ہیں اور انھیں حق دار اور طلب گار جانتے ہیں، ایسا حق جسے ہر حالت میں ادا ہونا چاہیئے اور اس کے ادا کرنے میں کسی قسم کا کوئی احسان نہیں ہے، ٹھیک دوسرے طلب گاروں کی طلب کے مانند۔

اور جیسا ہم بیان کر چکے ہیں، کہ مختلف قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تعبیر زکوٰۃ واجب ہے اور اس قسم کے امور سے مربوط نہیں ہے، بلکہ مستحب قسم کے انفاقات سے مربوط ہے، جنہیں پرہیزگار اپنے اوپر دین اور قرض سمجھتے ہیں،[3]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۸۰ صفحہ ۱۴۶

[2] ان روایات سے آگاہی کے لیے "وسائل الشیعہ" کی جلد ۵ اور "مستدرک الوسائل" کی جلد اوّل، اور "بحار الانوار" کی جلد ۸۰ کی طرف رجوع کریں۔

[3] ان آیات کا مکہ میں نزول، اور اس حکم کا خصوصیت کے ساتھ جنتی نیکوکاروں کے بارے میں ورود، اور ائمہ اہل بیتؑ کی روایات ایسے قرائن ہیں جو ان آیات کی زکوٰۃ کے علاوہ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

۲۰۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ
۲۱۔ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ
۲۲۔ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ
۲۳۔ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ ع

ترجمہ

۲۰۔ اور زمین میں طالبانِ حق کے لیے نشانیاں ہیں۔
۲۱۔ اور خود تمھارے وجود کے اندر (بھی آیات ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں؟!
۲۲۔ تمھاری روزی آسمان میں ہے، اور وہ جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے۔
۲۳۔ قسم ہے آسمان و زمین کے پروردگار کی کہ یہ مطلب حق ہے، جیسا کہ تم گفتگو کرتے ہو۔

تفسیر

خدا کی نشانیاں تمھارے وجود کے اندر ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں معاد اور دوزخیوں اور جنتیوں کے صفات کے بارے میں بیان ہوا تھا، زیر بحث آیات میں ان نشانیوں کے بارے میں جو زمین اور خود انسان کے وجود کے اندر ہیں گفتگو ہو رہی ہے، تاکہ ایک طرف تو مسئلہ توحید، خدا کی معرفت، اور اس کی صفات کی پہچان سے، جو تمام خیرات کی طرف مبدأ حرکت ہے، وہ آشنا ہوں اور دوسری طرف مسئلہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر اس کی قدرت کا انھیں پتہ چلے۔ کیونکہ جو روئے زمین میں ان تمام عجائبات میں حیات کا خالق ہے، وہ تجدید حیات پر بھی قادر ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "زمین میں ان لوگوں کے لیے جو اہلِ حق ہیں اور حق کے طلب گار ہیں، اہم نشانیاں ہیں" (وفی الارض

آیات للموقنین)۔

واقعاً اس کرّہ خاکی میں خدا کے غیر محدود علم و حکمت اور حق و قدرت کی بے پایاں نشانیاں اس قدر فراواں ہیں کہ کسی بھی انسان کی عمر ان سب کو پہچاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔

زمین کا حجم، اس کا سورج سے فاصلہ، اس کی اپنے گرد حرکت اور اس کی سورج کے گرد حرکت، اور وہ قوت جاذبہ و دافعہ جو اس حجم اور اس حرکت سے وجود میں آتی ہے، اور کامل طور سے ایک دوسرے کے برابر اور یکساں ہے، اور پھر ان سب کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی تاکہ صفحہ زمین پر حیات اور زندگی کے لیے ماحول فراہم کرے، یہ سب چیزیں خدا کی عظیم آیات میں سے ہیں

درحالیکہ اگر ان حرکات و روابط اور خصوصیات میں سے کوئی ایک چیز بھی کم سے کم تغیر پیدا کرے تو صفحہ زمین پر حیات و زندگی کے حالات درہم برہم ہو جائیں۔

وہ مواد جن سے زمین بنی ہے اور مختلف منابع جو سطح زمین اور زیر زمین حیات و زندگی کے لیے آمادہ ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

پہاڑ اور صحرا، درّے اور جنگل، دریا اور چشمے جن میں سے ہر ایک حیات کو جاری رکھنے اور اس کے حالات کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک نقش مؤثر رکھتے ہیں، دوسری نشانیاں ہیں۔

لاکھوں قسم کی نباتات و حشرات و حیوانات (جی ہاں لاکھوں قسم کے) ہر ایک اپنے خصوصیات اور عجائبات کے ساتھ جو زمین شناسی نباتات شناسی اور حیوان شناسی کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت انسان کو حیرت میں ڈبو دیتی ہے، دوسری نشانیاں ہیں۔

اس کرّہ خاکی کے گوشہ و کنار میں ایسے ایسے عمدہ اسرار ہیں۔ کہ شاید بہت ہی کم افراد ان کی طرف توجہ کرتے ہیں، لیکن ماہرین کی محققانہ نظروں نے اُن سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور آفریدگار کی عظمت کو واضح و آشکار کر دیا ہے۔

ہم یہاں اگر دنیا کے ایک مشہور ماہر فن کی باتوں کے ایک گوشہ کی طرف، جس نے اس سلسلے میں کافی مطالعہ کیا ہے، ذرا توجہ دیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

"کرسی مورلیسین" کہتا ہے، : "عوامل طبیعی کی تنظیم میں انتہائی دقت اور باریک بینی سے کام لیا گیا ہے، مثلاً اگر کرّہ زمین کا خارجی قشر، اس سے کہ جو اب ہے، دس حصہ زیادہ ضخیم ہوتا، تو آکسیجن — یعنی زندگی کا اصل مادہ۔ وجود میں نہ آتا، یا اگر سمندروں کی گہرائی موجودہ گہرائی سے کچھ حصہ زیادہ ہوتی تو اس وقت زمین کا سارا آکسیجن اور کاربن جذب ہو جاتا، اور پھر سطح زمین پر نباتی یا حیوانی زندگی کا کسی قسم کا امکان باقی نہ رہتا۔

ایک دوسری جگہ قشر ہوائی کے بارے میں، جو اطراف زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، کہتا ہے: "اگر اطراف زمین کی ہوا موجودہ حالت سے تھوڑی سی پتلی اور رقیق ہوتی، تو وہ شہاب ثاقب جو ہر روز لاکھوں کی تعداد میں زمین کی طرف جذب ہوتے ہیں، اور زمین سے باہر کی اسی فضا میں (قشر ہوا سے ٹکرانے کی وجہ سے) نابود ہو جاتے ہیں، ہمیشہ سطح زمین تک پہنچتے اور اس کے ہر گوشہ کو نقصان پہنچاتے۔

اور یا اگر شہابوں کی حرکت کی سرعت جتنی ہے اس سے کم تر ہوتی، (تو ہرگز ہوا کے ساتھ ٹکرانے سے نہ پھٹنے) وہ سب کے سب سطح زمین پر آکر گرتے، اور ان کی تباہ کاری کا نتیجہ معلوم تھا۔

ایک اور دوسری جگہ کہتا ہے: "اطراف زمین کی ہوا میں صرف اکیس فی صد آکسیجن ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ہوا میں موجودہ آکسیجن کی مقدار اکیس فی صد کی بجائے پچاس فی صد ہوتی، تو اس عالم کے تمام جلنے والے مواد جل کر خاکستر ہو جاتے اور اگر کوئی چنگاری جنگل کے کسی درخت تک پہنچ جاتی تو تمام جنگل مکمل طور پر راکھ ہو جاتے۔"

زمین پر محیط ہوا کی موٹائی اس قدر ہے کہ سورج کی شعاعوں کو اتنی مقدار میں زمین کی طرف عبور کرنے دیتی ہے کہ جتنی مقدار نباتات کی رشد اور نشو و نما کے لیے ضروری ہے اور تمام مضر جراثیم کو فضاء میں ہی معدوم کر دیتی ہے، اور مفید ویٹامنون کو ایجاد کرتی ہے۔

یا مختلف بخارات کا وجود جو طویل زمانوں کے عرصہ میں زمین کی گہرائیوں سے باہر نکلا ہے، اور ہوا میں پھیل گیا ہے۔ اور ان میں زیادہ تر ہیں بھی زہریلی گیسیں، لیکن اس کے باوجود زمین کے محیط ہوا میں آلودگی پیدا نہیں ہوئی، اور ہمیشہ سے اسی یکساں حالت میں جو حیات انسانی کو جاری رکھنے کے لیے مناسب ہے، باقی ہے۔

وہ عظیم دستگاہ جو اس عجیب توازن کو ایجاد کرتی ہے اور یکسانیت کی حفاظت کرتی ہے، وہی بڑے بڑے دریا اور سمندر ہیں، جن کے وجود کے فیض سے، مواد حیاتی و غذائی، بارش و اعتدال ہوا و نباتات اور آخر میں خود انسان، زندگی حاصل کرتے ہیں، جو شخص حقیقت کا ادراک رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ سمندر کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے (اور سمندروں کے پیدا کرنے والے) اور اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو۔[1]

* * *

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "خود تمہارے وجود میں بھی خدا کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں" (وفی انفسکم)۔ "کیا تم آنکھیں نہیں کھولتے، اور حق کی ان تمام آیات اور ظاہر نشانیوں کو نہیں دیکھتے"؟! (افلا تبصرون)۔

بلاشک انسان عالم ہستی کا ایک عجوبہ ہے، اور جو کچھ عالم کبیر میں ہے وہ سب کچھ اس عالم صغیر میں بھی موجود ہے۔ بلکہ اس میں ایسے عجائبات ہیں جو دنیا میں کسی جگہ بھی نہیں ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ انسان اس ہوش و عقل و علم کے ہوتے ہوئے، اور اس تمام خلاقیت و ابتکارات اور عجیب و غریب صنائع کے باوجود، پہلے دن ایک چھوٹے سے بے قدر و قیمت نطفہ کی صورت میں تھا، لیکن جونہی کہ وہ عالم رحم میں قرار پاتا ہے تو عجیب سرعت کے ساتھ تکامل و ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے، روز بروز شکل تبدیل کرتا ہے۔ اور لمحہ بہ لمحہ دگرگوں ہوتا ہے، اور وہ نطفۂ ناچیز مختصر سی مدت میں انسانِ کامل میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

ایک خلیہ جو اس کے اجزاء و بدن کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، تہ بہ تہ اور عجیب و غریب ساخت رکھتا ہے، اور

---

[1] "راز آفرینش انسان"، تالیف "کرسی موریس"، ترجمہ محمد سعیدی، از ص ۳۳ تا ص ۳۶۔

ماہرین کے قول کے مطابق ایک صنعتی شہر کے برابر تشکیلات اس میں موجود ہیں۔

علم الحیات کا ایک ماہر کہتا ہے: "یہ عظیم شہر، ہزارہا عجیب وغریب عمدہ دروازوں، ہزارہا کارخانوں، سڑکوں، آب رسانی کے جال، فرمانروائی کا مرکز اس کی فراواں تاسیسات، عمارتوں بہت سے رابطوں اور دوسرے حیاتی کاموں کے ساتھ، وہ بھی ایک چھوٹے سے خلیے ہیں، پیچیدہ ترین اور عجیب ترین شہروں میں سے ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ایسی عمارتیں بنائیں، جو وہی اعمال انجام دیں — اور ہم ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہیں — تو ہمیں دسیوں ہزار ایکڑ زمین کو تاسیسات، مختلف عمارتوں اور پیچیدہ آلات والی مشینوں کے نیچے لے جانا پڑے گا، تاکہ وہ اس قسم کے پروگرام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ دستگاہ آفرینش نے ان سب کو "پندرہ میلیونیم ملی میٹر" کے برابر رقبہ میں قرار دیا ہے۔ [1]

وہ کارخانے جو انسان کے بدن میں ہیں۔ مثلاً دل، گردے، پھیپھڑے، اور خاص طور سے دسیوں ہزار کلومیٹر کی موٹی اور پتلی رگیں، یہاں تک کہ وہ بال جیسی باریک رگیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں اور وہ پانی، غذا اور ہوا پہنچانے کا کام انجام دیتی ہیں، (دس ملیون ملیارد) بدن انسانی کے خلیے ہیں، اور مختلف حواس، جیسے بینائی، شنوائی اور دوسرے حواس میں سے ہر ایک اس کی عظیم آیات میں سے ہر ایک آیت ہے۔

اور سب سے زیادہ "حیات وزندگی" کا معما ہے، جس کے اسرار اسی طرح سے غیر شناختہ رہے ہوئے ہیں اور انسان کی روح وعقل کی عمارت ہے، جس کے ادراک سے تمام انسانوں کی عقلیں عاجز ہیں اور یہ وہ منزل ہے کہ انسان بے اختیار خدا کی تسبیح اور حمد وثنا کے لیے بول اٹھتا ہے۔ اور اس کی بارگاہِ عظمت میں سر تعظیم جھکا دیتا ہے، اور ان اشعار کے ساتھ ترنم کرتا ہے:

فیک یا اعجوبۃ الکون غدا الفکر کلیلا

انت حیرت ذوی اللب وبلبلت العقولا

کلما قدم فکری فیک شبرًا فر میلا

ناکصًا یخبط فی عمیاء لا یھدی سبیلا

"اے عالم ہستی کے اعجوبہ (اے خدائے بزرگ) تجھ میں فکر خستہ ومانندہ ہو کر رہ گئی ہے"

"تو نے صاحبان فکر ودماغ کو حیران کر دیا ہے اور عقلوں کو مضطرب بنا دیا ہے"

"جس وقت میری فکر تجھ سے ایک بالشت قریب ہوتی ہے، تو ایک میل فرار کر جاتی ہے"

"ہاں وہ پیچھے کی طرف پلٹ جاتی ہے اور تاریکیوں میں غرق ہو جاتی ہے، اور اُسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے"

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

"جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے گا وہ اپنے خدا کو پہچان لے گا" [2]

---

[1] "سفری بہ اعماق وجود انسانی" (انجمن سلولھا)

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۶۰۳ مادہ "نفس"۔

ہاں! "خودشناسی" تمام مراحل میں "خداشناسی" کی راہ ہے۔

"افلا تبصرون" (کیا تم نہیں دیکھتے) کی تعبیر ایک لطیف تعبیر ہے، یعنی یہ آیاتِ الٰہی تمہارے گرداگرد، تمہاری جان کے اندر، تمہارے سارے پیکر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر تم تھوڑی سی آنکھ کھولو تو انہیں دیکھ لو گے اور تمہاری رُوح اس کی عظمت کے ادراک سے سیراب ہو جائے گی۔

تیسری زیرِ بحث آیت میں عظمت پروردگار کی نشانیوں کے تیسرے حصے، اور معاد پر اس کی قدرت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تمہاری روزی آسمان میں ہے اور اس چیز کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے" (وفی السماء رزقکم وما توعدون)۔

اگرچہ بعض اسلامی روایات میں "رزق" کی اس آیت میں بارش کے حیات بخش قطرات سے تفسیر ہوئی ہے، جو زمین میں ہر خیر و برکت کا منبع ہے، اور سورۂ جاثیہ کی آیہ ۵ بھی اس کے موافق ہے:

وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا:

"جو کچھ خدا نے آسمان سے رزق نازل کیا ہے تو اس کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ فرمایا ہے۔ لیکن یہ معنی ہو سکتا ہے کہ آیت کے واضح مصادیق میں سے ایک ہو، جبکہ مفہوم رزق کی وسعت بارش کو بھی شامل ہے، اور سورج کی روشنی کو بھی جو آسمان سے ہماری طرف آتی ہے اور اس کا نقش و اثر پوری زندگی میں حد سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اور اس طرح ہوا کو بھی جو تمام زندہ موجودات کے لیے سببِ حیات ہے، رزق میں شامل سمجھیے۔

یہ سب اس صورت میں ہے کہ ہم "سماء" کی اسی ظاہری آسمان کے ساتھ تفسیر کریں، لیکن بعض مفسرین نے "سماء" کو عالم الغیب، ماورا طبیعت اور لوحِ محفوظ کے معنی میں لیا ہے، کہ انسانوں کے ارزاق کی تقدیر وہاں سے ہوتی ہے۔

البتہ دونوں معانی میں جمع ممکن ہے، اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ واضح اور روشن نظر آتی ہے۔

باقی رہا "ما توعدون" (جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے) کا جملہ، تو ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ رزق اور اس سلسلے میں وعدۂ الٰہی پر ایک تاکید ہو، یا بہشت موعود کے معنی میں ہو، کیونکہ "والنجم" کی آیہ ۱۵ میں یہ آیا ہے کہ: عندھا جنۃ المأوی: "بہشت موعود سدرۃ المنتہیٰ کے پاس آسمانوں میں ہے"، اور یا ہر قسم کی خیر و برکت یا اس عذاب کی طرف اشارہ ہے، جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اور یا ان تمام مفاہیم کی طرف ناظر ہے، کیونکہ "ما توعدون" کے جملہ کا مفہوم وسیع اور کشادہ ہے۔

بہرحال ان تینوں آیات میں ایک لطیف ترتیب پائی جاتی ہے: پہلی آیت کرۂ زمین میں انسان کے عوامل وجود کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، اور دوسری آیت خود انسان کے وجود کے بارے میں، اور تیسری آیت اس کے دوام و بقاء کے عوامل کے بارے میں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ: وہ چیز، جو انسان کی بصیرت میں مانع ہے، اور اس کو اسرارِ آفرینش کے مطالعہ، یعنی اسرارِ زمین اور خود اس کے وجود کے عجائب سے آگاہ ہونے سے باز رکھتی ہے، وہ روزی کی حرص ہے، خدا آیت کے آخر میں اطمینان دلاتا ہے کہ اس کی روزی کی ضمانت دی جا چکی ہے، تاکہ وہ راحت و آرام کے ساتھ عالمِ ہستی کے عجائبات میں غور و

فکر کرسکے، اور "افلا تبصرون" کا جملہ اس کے حق میں پورا ہو۔

لہٰذا اس مطلب کی تاکید کے لیے آخری زیر بحث آیت میں قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے: "آسمان وزمین کے خدا کی قسم یہ مطلب حق ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے تم بات کرتے ہو" (فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون)۔

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ خدا اپنی عظمت و قدرت کے باوجود، بہت شک کرنے والوں، دیر سے یقین کرنے والوں ضعیف النفس اور حریص بندوں کو اطمینان دلانے کے لیے قسم کھا رہا ہے، کہ رزق و روزی اور قیامت کے ثواب و عقاب کے وعدوں کے بارے میں جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے، وہ سب حق ہے، اور اس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں ہے۔[1]

"مثل ما انکم تنطقون" (جس طرح تم بات کرتے ہو) کی تعبیر ایک لطیف اور بھی تلی تعبیر ہے۔ ایک محسوس ترین چیز کے بارے میں کیونکہ بعض اوقات انسان کے دیکھنے اور سننے میں تو خطا اور غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن بات کرنے میں اس قسم کی کوئی خطا اور غلطی نہیں ہوتی کہ انسان یہ احساس کرے کہ اس نے بات کی ہے، حالانکہ اس نے بات نہ کی ہو، لہٰذا قرآن کہتا ہے: جس قدر تمہارا بات کرنا تمہارے لیے ایک محسوس حقیقت ہے اور واقعیت رکھتا ہے، رزق اور خدائی وعدے بھی اسی طرح ہیں۔

اس سے قطع نظر، بات کرنے کا مسئلہ، خود پروردگار کی ایک عظیم ترین روزی اور نعمتوں میں سے ہے، کیونکہ انسان کے سوا کسی بھی زندہ موجود کو یہ نعمت نہیں ملی، اور انسانوں کی اجتماعی زندگی، تعلیم و تربیت، علوم و دانش کے انتقال، اور زندگی کے مشکلات کے حل کے بارے میں بات کرنے کا اثر و نفوذ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

* * *

چند نکات

۱۔ اصمعی کی لرزا دینے والی داستان

"زمخشری" تفسیر کشاف میں اصمعی[2] سے نقل کرتا ہے کہ میں بصرہ کی مسجد سے باہر آیا تو اچانک میری نگاہ ایک بیابانی عرب پر پڑی جو اپنی سواری پر سوار تھا، وہ میرے سامنے آیا تو مجھ سے پوچھا: تم کس قبیلہ سے ہو؟ میں نے کہا "بنی اصمع" سے اس نے کہا: کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا وہاں سے جہاں خداوند رحمٰن کا کلام پڑھتے ہیں، اس نے کہا میرے لیے بھی پڑھو۔!

---

[1] "انہ" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے "رزق" کی طرف، بعض "ما توعدون" کی طرف اور بعض اس کو پیغمبر اور قرآن کی طرف راجع قرار دیتے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

[2] اس کا نام "عبدالملک ابن قریب" تھا ہارون الرشید کے زمانہ میں ہوا ہے، اس کا حافظہ عجیب و غریب تھا اور اس کے معلومات تاریخ و ادب اور اشعار عرب سے بہت زیادہ تھے اور اس نے ۲۱۶ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (الکنی والالقاب ج ۲ ص ۲۷)

میں نے اس کے لیے سورۂ "الذاریات" کی کچھ آیات پڑھیں، یہاں تک کہ میں آیہ "وفی السماء رزقکم" تک پہنچا، اس نے کہا، بس کافی ہے، وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہ اونٹ جو اس کے ساتھ تھا اُسے نحر کر ڈالا، اور اس کا گوشت، ان ضرورت مندوں میں جو آجا رہے تھے، تقسیم کر دیا۔ اس نے اپنی تلوار اور کمان بھی توڑ ڈالی اور ایک طرف پھینک دی اور پشت پھیر کر چلتا بنا، یہ واقعہ گزر گیا۔

جس وقت میں ہارون الرشید کے ساتھ خانہ خدا کی زیارت کے لیے گیا تو میں طواف میں مشغول ہو گیا، اچانک میں نے دیکھا کہ کوئی آہستہ آواز کے ساتھ مجھے پکار رہا ہے، میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ وہی مردِ عرب ہے، لاغر اور کمزور ہو چکا ہے، اس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا ہے، (صاف ظاہر تھا کہ آتشِ عشق کا اس پر غلبہ ہو گیا ہے جس نے اس کو بے قرار کر دیا ہے) اس نے مجھ پر سلام کیا، اور دوبارہ مجھ سے خواہش کی کہ اُسی سورۂ "ذاریات" کو اس کے لیے پڑھوں جب میں اس آیت پر پہنچا، تو اس نے چلا کر کہا، ہم نے اپنے خدا کے وعدہ کو اچھی طرح پا لیا ہے، اس کے بعد اس نے کہا کیا اس کے بعد بھی کوئی آیت ہے تو میں نے بعد والی آیت کو پڑھا: فورب السماء والارض انہ لحق، تو اس نے دوبارہ چیخ مار کر کہا،:

"یاسبحان اللہ من ذاالذی اغضب الجلیل حتی حلف لیصدقوہ بقولہ حتی الجئوہ الی الیمین ؟!"

"یہ کتنی عجیب بات ہے، کون تھا وہ جس نے خداوند جلیل کو غضبناک کیا، اور اُسے اس طرح قسم کھانی پڑی، کیا انھوں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، کہ وہ قسم کھانے کے لیے نا چار ہوا"؟! اس نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا، اور زمین پر گر پڑا، اور اس کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کر گئی، [1]

∴ ∴ ∴

۲۔ بہشت کہاں ہے؟

جیسا کہ ہم آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض نے "وما توعدون" کے جملہ کی بہشت کے ساتھ تفسیر کی ہے انھوں نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت آسمانوں میں ہے، لیکن ان کی یہ بات اس چیز سے جو سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۳۳ میں آئی ہے، جو کہتی ہے کہ "بہشت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ سازگار نظر نہیں آتی۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ تفسیر "جملہ ماتوعدون" کے لیے مسلم نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ یہ وعدہ رزق یا آسمانی عذابوں کی طرف اشارہ ہو۔

اور اگر سورۂ نجم کی آیہ ۱۵ میں یہ آیا ہے کہ "جنۃ المأوٰی" آسمانوں میں "سدرۃ المنتہیٰ" کے پاس ہے، تو یہ اس معنیٰ پر دلیل نہیں ہو گی، کیونکہ "جنۃ المأوٰی" بہشت کے باغات کا ایک حصہ ہے نہ کہ تمام بہشت (غور کیجئے گا)

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ۴ ص ۴۰۰۔

۳۔ حق تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آمادگی ضروری ہے

جس وقت قرآن کی آیات، عالم ہستی میں خدا کی نشانیوں اور اسرار آفرینش کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، تو کبھی فرماتا ہے "یہ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کان دھر کے سنتے ہیں" (لقوم یسمعون) (یونس۔ ۶۷)

کبھی کہتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں" (لقوم یتفکرون) (رعد۔ ۳)

کبھی فرماتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو تعقل کرتے ہیں" (لقوم یعقلون) (رعد۔ ۴)

کبھی کہتا ہے: ان لوگوں کے لیے جو بہت زیادہ صبر کرنے والے اور بہت زیادہ شکر گزار ہیں۔ (لکل صبار شکور) (ابراھیم۔ ۵)

کبھی کہتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں" (لقوم یؤمنون) (نحل۔ ۷۹)

کبھی کہتا ہے: "صاحبان دماغ کے لیے نشانیاں ہیں" (لآیات لاولی النھٰی) (طٰہٰ۔ ۵۴)

کبھی فرماتا ہے: "جو ہوش میں سرشار ہیں" (لآیات للمتوسمین) (حجر۔ ۷۵)

اور بالآخر کبھی یہ کہتا ہے: صاحبان علم کے لیے نشانیاں ہیں (لآیات للعالمین) (روم۔ ۲۲)

زیر بحث آیات میں کہتا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں؟ کہ خدا کی آیتیں، زمین میں اور تمھارے وجود کے اندر، ان لوگوں کے لیے جو چشم بینا رکھتے ہیں، واضح و آشکار ہیں۔

یہ سب تعبیریں اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بے شمار آیات اور بہت سی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیئے جو اس کے وجود پاک کے لیے، سارے عالم آفرینش میں موجود ہیں۔ ایک آمادہ زمین کی ضرورت ہے، ایک بینا آنکھ، ایک سننے والا کان، ایک بیدار فکر اور ایک باہوش دل، اور ایک ایسی روح جو حقائق کی پیاسی اور اُسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، ضروری ہے، ورنہ ممکن ہے کہ انسان سالہا سال ان آیات کے درمیان زندگی بسر کرتا رہے لیکن جانوروں کی طرح اصطبل اور گھاس کے علاوہ کسی چیز کو نہ پہچانے۔

۴۔ رزق حق ہے

منجملہ ان امور کے جن پر ایک دقیق نظام حاکم ہے، یہی روزی کا مسئلہ ہے، جس کی طرف زیر بحث آیت میں واضح اشارے ہوئے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تلاش و کوشش شرط ہے، اور کاہلی و سستی محرومیت اور درماندگی کا سبب بنتی ہے، لیکن یہ گمان کر لینا بھی اشتباہ اور غلط ہے کہ حرص و طمع اور نامناسب کاموں سے انسان کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے، اور عفت و صیانت اور خودداری سے روزی کم ہو جائے گی۔

اسلامی احادیث میں اس سلسلے میں عمدہ تعبیریں نظر آتی ہیں۔ ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

ان الرزق لا یجرہ حرص حریص ، ولا یصرفہ کرہ کارہ :

" روزی خدا کی طرف سے مقدر شدہ ہے ، حریص کا حرص اُسے جلب نہیں کرتا ، اور نہ ہی لوگوں کی ناپسندیدگی اُسے روکتی ہے " [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے اس شخص کے جواب میں جس نے موعظہ کا تقاضا کیا تھا فرمایا

" وان کان الرزق مقسوماً فالحرص لماذا ؟ ..... "

" جب رزق تقسیم شدہ ہے تو پھر حرص و لالچ کس بنا پر ... " ؟ [2]

ان بیانات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی کوشش ہی نہ کی جائے ، بلکہ حریص اور لالچی لوگوں کو رزق کے مقدر ہونے کی وجہ سے ان کے حرص سے روکا گیا ہے ۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ احادیث اسلامی میں جلب رزق یا اس کے موانع کے عنوان سے بہت سے امور بیان کیے گئے ہیں ۔ جن میں سے ہر ایک اپنی نوعیت میں کارآمد ہے ۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے ۔

والذی بعث جدی بالحق نبیاً ان اللہ تبارک و تعالیٰ یرزق العبد علی قدر المروۃ ، وان المعونۃ تنزل علی قدر شدۃ البلاء :

" اس ذات کی قسم جس نے میرے جد کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو اس کی مروت و شخصیت کے مطابق روزی دیتا ہے ، اور پروردگار کی کمک اور مدد شدت بلا اور حادثہ کی مناسبت سے ہوتی ہے ۔ [3]

ایک اور دوسری حدیث میں انہی حضرت سے منقول ہے :

کف الاذی وقلۃ الصخب یزیدان فی الرزق :

" لوگوں کو تکلیف و آزار پہنچانے سے رُکنا اور شور شرابہ اور جھگڑے کو ختم کرنے سے ، روزی میں اضافہ ہوتا ہے " [4]

پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" التوحید نصف الدین واستنزال الرزق بالصدقۃ :

" توحید نصف دین ہے اور روزی کو راہ خدا میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے نازل کرو " [5]

اس طرح کچھ اور امور جیسے گھر کے اطراف کو صاف ستھرا رکھنا اور برتنوں کو دھونا روزی کی زیادتی کے اسباب میں سے بیان کیے گئے ہیں ۔

---

[1] و [2] " نور الثقلین " جلد ۵ ص ۱۲۶

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۲۵ (حدیث ۳۱)

[4] و [5] وہی مدرک جلد ۵ ص ۱۳۶ (حدیث ۲۵ و ۲۷)

۲۴۔ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝
۲۵۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝
۲۶۔ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝
۲۷۔ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝
۲۸۔ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝
۲۹۔ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِىْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝
۳۰۔ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝

ترجمہ

۲۴۔ کیا تمہارے پاس ابراہیم کے محترم مہمانوں کی خبر آئی ہے؟
۲۵۔ جس وقت وہ ان کے پاس پہنچے تو کہا: تجھ پر سلام! اس نے کہا: تم پر بھی سلام، تمہیں پہچانا نہیں!
۲۶۔ اس کے بعد چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا، اور ایک موٹا تازہ بچھڑا (اور بھنا ہوا ان کے لیے) لایا۔
۲۷۔ اور اس کو ان کے پاس رکھ دیا (لیکن تعجب سے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ غذا کی طرف نہیں بڑھاتے) کہا! کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟

۲۸۔ اور اس کام سے وحشت محسوس کی، انہوں نے کہا: ڈرو نہیں (ہم تو تیرے پروردگار کے رسول ہیں) اور اُسے ایک عالم و دانا بیٹے کے تولد کی بشارت دی۔

۲۹۔ اسی اثنا میں اس کی بیوی آگے بڑھی در حالیکہ (خوشی اور تعجب سے) چلّا رہی تھی، اور اپنے مُنہ پر ہاتھ مارا اور کہا (کیا میرے بیٹا ہوگا حالانکہ میں) ایک بانجھ بڑھیا ہوں۔

۳۰۔ انھوں نے کہا تیرے پروردگار نے اسی طرح کہا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔

تفسیر

ابراہیمؑ کے مہمان

ان آیات سے آگے گزشتہ مطالب کی تاکید و تائید کے لیے، گزشتہ انبیاء اور گزشتہ اقوام کی سرگزشت کا ایک گوشہ پیش کیا جارہا ہے اور اس کا پہلا حصّہ ان فرشتوں کی سرگزشت ہے، جو قوم لوطؑ کو عذاب کرنے کے لیے آدمیوں کی شکل میں ابراہیمؑ پر ظاہر ہوئے اور ایک بیٹے کے تولد کی بشارت دی، جبکہ ابراہیمؑ بھی بڑھاپے کے سن کو پہنچے ہوئے تھے اور ان کی بیوی بھی سن رسیدہ اور بانجھ تھی۔

اس باعزت بیٹے کا اس سن و سال میں بوڑھے ماں باپ کو عطا کرنا، ایک طرف تو، اس چیز کے لیے، جو ہر قسم کی روزیوں کے مقدر ہونے کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آئی تھی، ایک تاکید ہے۔

اور دوسری طرف حق تعالیٰ کی قدرت و توانائی پر ایک دلیل اور خداشناسی کی آیات میں سے ایک آیت ہے، جسے کے بارے میں گذشتہ آیات میں بحث ہوئی ہے۔

اور تیسری طرف صاحب ایمان اقوام کے لیے جو حمایت حق کے مشمول ہیں، ایک بشارت ہے، جیسا کہ بعد والی آیات جو قوم لوطؑ کے ہولناک عذاب کی بات کرتی ہیں۔ بے ایمان مجرموں کے لیے ایک تہدید اور تنبیہ ہے۔

پہلے رُوئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا ابراہیم کے محترم مہمانوں کی خبر تجھ تک پہنچی ہے" (ھل اتاک حدیث ضیف ابراھیم المکرمین)۔[1]

---

[1] "ضیف" وصفی معنی رکھتا ہے اور مفرد و جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا "مکرمین" کے ساتھ جو جمع ہے (بقیہ صفحہ پر آئندہ پر)

"مکرمین" (اکرام کئے گئے) کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ یہ فرشتے حق تعالیٰ کے مامور تھے، اور سورۂ انبیاء کی آیہ ۲۶ میں بھی فرشتوں کے بارے میں یہ آیا ہے: بل عباد مکرمون: "وہ مکرم و محترم بندے ہیں" یا ان احترامات کی وجہ سے ہے جو ابراہیم ان کے لیے بجالائے" اور یا دونوں جہات سے۔

اس کے بعد ان کے حالات کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: "جس وقت وہ ابراہیمؑ پر وارد ہوئے اور کہا: تجھ پر سلام! تو اس نے کہا: تم پر بھی سلام ہو، تمھیں پہچانا نہیں" (اذ دخلوا علیہ فقالوا سلاما قال سلام قوم منکرون)۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے ناشناختہ ہونے کی بات اپنے دل میں کی نہ کہ آشکارا صورت میں (کیونکہ یہ بات مہمان کے مسئلہ احترام کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔)

لیکن یہ بات معمول کے مطابق ہے، کہ بعض اوقات میزبان مہمان کے احترام کے باوجود کہتا ہے: معلوم نہیں میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟ اور میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا نہیں ہوں۔ اس بنا پر ظاہر آیہ کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے، کہ ابراہیم نے یہ بات ان کے سامنے ہی کی ہو، اگرچہ پہلا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، خاص طور سے جبکہ مہمانوں کی طرف سے اپنے تعارف کے سلسلے میں یہاں کوئی جواب بھی نظر نہیں آتا، اور اگر ابراہیم نے اس قسم کی کوئی بات آشکارا کی تھی، تو ضرور وہ اس کا جواب دیتے۔

بہرحال ابراہیمؑ جیسے مہمان نواز اور سخی نے اپنے مہمانوں کی پذیرائی کے لیے فوراً کام شروع کردیا: "پوشیدہ طور پر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اور ایک موٹا تازہ بھنا ہوا بچھڑا ان کے لیے لے آئے" (فراغ الیٰ اھلہ فجاء بعجل سمین)۔

"راغ" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے "روغ" (بروزن شوق) ایک پوشیدہ منصوبے کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس کی توصیف ہوئی ہے، اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ وہ مصدر ہے اور اس کا تثنیہ اور جمع نہیں ہے۔ ٹھیک نظر نہیں آتا۔ لیکن "کشاف" میں "زمخشری" کے قول کے مطابق چونکہ اصل میں وہ مصدر تھا، جب اس نے اپنے آپ میں وصفی معنی لے لیا تو مفرد و جمع دونوں میں استعمال ہونے لگا۔

[1] "سلاما" ایک فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے: "نسلم علیکم سلاما" اور سلام مبتداء ہے، اور اس کی خبر محذوف ہے اور اصل میں "علیکم سلام" یا "سلام علیکم" تھا، گویا ابراہیم چاہتے تھے کہ ان کے سلام سے بالاتر سلام اور تحیت کہیں، کیونکہ "جملہ اسمیہ" اثبات دوام پر دلالت کرتا ہے (تفسیر کشاف ج ۴ ص ۴۰۱)

ابراہیمؑ نے ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ ممکن تھا، کہ اگر مہمان متوجہ ہو جائیں، تو اس قسم کی پُرخرچ میزبانی سے منع کر دیں۔

لیکن ابراہیمؑ نے معدودے چند مہمانوں کے لیے، جو بعض کے قول کے مطابق تین افراد اور زیادہ سے زیادہ بارہ افراد تھے[1] اتنا فراواں اور بافراغت کھانا کیوں تیار کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر سخی افراد ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی مہمان آجائے تو وہ صرف مہمانوں کے اندازے کے مطابق کھانا تیار نہیں کرتے، بلکہ وہ اتنی غذا تیار کرتے ہیں کہ مہمانوں کے علاوہ وہ تمام لوگ جو ان کے لیے کام کرتے ہیں اس میں شریک ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ ہمسایوں قرابت داروں اور دوسرے گرد و پیش کے لوگوں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ اس بنا پر ہرگز اس قسم کی اضافی غذا اسراف اور فضول خرچی میں شمار نہیں ہوتی، اور یہ چیز موجودہ زمانہ میں بہت سے قبیلوں اور ان لوگوں میں جو سابقہ طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، نظر آتی ہے۔

"عجل" (بروزن طفل) بچھڑے کے معنی میں ہے، (اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ گوسفند کے معنی میں ہے وہ متونِ لغت کے مطابق نہیں ہے) یہ لفظ اصل میں "عجلہ" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ جانور اس سن و سال میں عجولانہ حرکات کرتا ہے اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو انھیں کلی طور پر چھوڑ دیتا ہے۔

"سمین" موٹے تازے کے معنی میں ہے اور اس قسم کے بچھڑے کا انتخاب مہمانوں کے احترام اور آس پاس کے اشخاص کے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے تھا۔

سورۂ ہود کی آیت ۶۹ میں آیا ہے کہ یہ بچھڑا بھنا ہوا تھا، : (بعجل حنیذ) اگرچہ زیر بحث آیت اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتی، لیکن اس کے منافی بھی نہیں ہے۔

"ابراہیمؑ خود یہ کھانا مہمانوں کے لیے لے کر آئے، اور ان کے نزدیک رکھ دیا" (فقربہ الیھم)۔ لیکن انتہائی تعجب کے ساتھ مشاہدہ کیا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو ابراہیمؑ نے کہا: کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟ (قال الا تأکلون)۔

ابراہیمؑ خیال کرتے تھے کہ وہ جنس بشر میں سے ہیں، : "جب انھوں نے دیکھا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو دل میں وحشت محسوس کی" (فاوجس منھم خیفۃ)۔

کیونکہ اس زمانہ میں۔ اور اس زمانہ میں بھی بہت سی اقوام ہیں جو سنتی اخلاق کے پابند ہیں۔ جب کوئی کسی کے دسترخوان پر کھانا کھا لیتا تھا تو پھر اس کو تکلیف و آزار نہیں پہنچاتا تھا، اور کوئی خیانت نہیں کرتا تھا، اور جہاں نمک کھاتے ہیں وہاں نمکدان کو نہیں توڑتے (نمک حرامی نہیں کرتے)، لہٰذا اگر مہمان غذا کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاتا، تو یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی خطرناک کام کے لیے آیا ہے، یہ ضرب المثل بھی عربوں میں مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں: "من لم یأکل طعامک لم یحفظ ذمامک":

---

[1] اقتباس از "روح البیان" اور "حاشیہ تفسیر صافی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

"جو شخص تیرا کھانا نہیں کھاتا وہ تیرے عہد و پیمان کی وفا نہیں کرے گا۔"

"ایجاس" "وجس" (بروزن مکث) کے مادہ سے اصل میں مخفی آواز کے معنی میں ہے، اسی بنا پر "ایجاس" پنہانی اور اندرونی احساس کے معنی میں آیا ہے، گویا انسان اپنے اندر سے آواز سنتا ہے اور جب "خیفۃ" کے ہمراہ ہو، تو احساس خوف کے معنی میں ہے۔

یہاں پر مہمانوں نے۔ جیسا کہ سورۂ ہود آیت ۷۰ میں آیا ہے۔ "اس سے کہا کہ ڈرو نہیں" اور اس کو تسلی دی، : (قالوا لا تخف)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انھوں نے اُسے ایک دانا اور عالم بیٹے کی بشارت دی" (و بشروہ بغلام علیم)۔

واضح رہے کہ بیٹا تولد کے وقت تو "عالم" نہیں ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ اس میں استعداد ہو کہ وہ آئندہ عالم اور عظیم دانشمند بنے اور یہاں یہی مراد ہے۔

اس بارے میں کہ یہ بیٹا "اسمٰعیل" تھا "یا" اسحٰق"؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ مشہور یہی ہے کہ وہ حضرت "اسحٰق" تھے۔

لیکن یہ احتمال کہ اسماعیل تھا، سورۂ ہود کی آیہ ۷۱ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو کہتی ہے، : فبشرناھا باسحٰق، درست نظر نہیں آتا اس بنا پر کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عورت جس کے بارے میں بعد کی آیات میں گفتگو آئی ہے، وہ ابراہیم کی بیوی سارہ ہے اور یہ بیٹا "اسحٰق" ہے۔

"اس وقت ابراہیم کی بیوی آگے آئی، درحالیکہ وہ خوشی اور تعجب سے بلند آواز میں بول رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ مارا اور کہا: کیا میرے فرزند ہوگا؟ حالانکہ میں ایک بانجھ بڑھیا ہوں" (فاقبلت امرأتہ فی صرۃ فصکت وجھھا وقالت عجوز عقیم)۔

سورۂ ہود کی آیت ۷۲ میں بھی یہ آیا ہے: قالت یا ویلتٰی ءالد وانا عجوز وھٰذا بعلی شیخًا: اس نے کہا: وائے ہو مجھ پر کیا میں اب بچہ جنوں گی، جب کہ میں بانجھ بڑھیا ہوں، اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو واقعاً ایک عجیب چیز ہے۔

اس بنا پر اس کا چیخنا تعجب اور خوشی کی وجہ سے چیخنا تھا۔ (یعنی بلند آواز میں اظہارِ مسرت و حیرت)

لفظ "صرۃ" "صر" (بروزن شر) کے مادہ سے دراصل باندھنے اور وابستگی کے معنی میں ہے، اور شدت سے چیخنے اور اسی طرح پے در پے جمعیت پر بھی بولا جاتا ہے، چونکہ اس میں شدت اور ایک دوسرے سے پیوستگی ہوتی ہے، شدید اور سرد ہواؤں کو بھی "صرصر" کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانوں کو لپیٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور "صرورۃ" اس عورت یا مرد کو کہتے ہیں۔ جس نے ابھی تک حج نہ کیا ہو، یا شادی کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان میں ایک قسم کی بستگی اور امتناع ہے اور زیر بحث آیت میں اسی شدت کے ساتھ چلانے کے معنی میں ہے۔

"صکت" "صک" (بروزن شک) کے مادہ سے شدت سے مارنے یا چہرے پر مارنے کے معنی میں ہے، اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ ابراہیم کی بیوی نے جس وقت بیٹے کے تولد کی بشارت سنی ــــ تو جیسا کہ عورتوں

کی عادت ہے۔ شدت تعجب اور شرم و حیا سے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر مارے۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق اور اسی طرح تورات کے سفر تکوین کے مطابق، ابراہیم کی بیوی نوّے سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھی، اور خود ابراہیم تقریباً سو سال یا اس سے زیادہ تھے۔

لیکن قرآن بعد والی آیت میں، فرشتوں کے جواب کو، جو انھوں نے اُسے دیا۔ نقل کرتا ہے: "انھوں نے کہا کہ تیرے پروردگار نے اسی طرح کہا ہے، اور وہ حکیم و دانا ہے" (قالوا کذالک قال ربک انہ ھو الحکیم العلیم)۔

اگرچہ تو بڑھیا ہے اور تیرا شوہر بھی اس طرح ہے، لیکن جب تیرے پروردگار کا فرمان صادر ہو اور اس کا ارادہ کسی چیز سے متعلق ہو جائے تو بلاشک و شبہ وہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہاں تک کہ اسی جہان جیسا ایک اور عظیم جہان امر "کن" (ہو جا) کے ساتھ پیدا کر دینا اس کے لیے سہل اور آسان ہے۔

"حکیم" اور "علیم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تو اپنے بڑھاپے اور بانجھ ہونے اور اپنے شوہر کے کہن سال ہونے کی خبر دے، خدا ان سب باتوں کو جانتا ہے اور اگر ابھی تک اس نے تمھیں بیٹا نہیں دیا اور اب آخر عمر میں مرحمت کر رہا ہے تو اس میں بھی حکمت ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سُورۂ ہود کی آیہ ۷۳ میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے اس سے کہا: اتعجبین من امر اللہ رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت انہ حمید مجید: "کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کر رہی ہے، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکات تمھارے گھرانے پر ہیں اور وہ حمید و مجید ہے۔"

ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بنا پر ہے، کہ فرشتوں نے یہ سب باتیں سارہ سے کہی تھیں، فرق یہ ہے کہ سُورۂ ہُود میں اس کے ایک حصہ کی طرف اور یہاں دوسرے حصہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ وہاں خدا کی رحمت اور برکات کی گفتگو ہے اور وہ حمید و مجید ہونے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ (وہ ذات جس کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس کی حمد و تمجید کرتے ہیں۔

لیکن یہاں ان دونوں میاں بیوی کے بچہ جننے کے لیے عدم آمادگی کی نسبت خدا کی آگاہی، اور اس خاتون کے ظاہری اسباب کی بنا پر عقیم ہونے کے سلسلہ میں گفتگو ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ کہا جائے۔ خدا ان سب چیزوں سے آگاہ ہے، اور اگر یہ سوال ہو کہ جوانی میں یہ نعمت انھیں کیوں نہیں دی؟ تو کہا جائے گا: اس میں کوئی حکمت ہوگی، کیونکہ وہ حکیم ہے۔

ایک نکتہ

پیغمبروں کی سخاوت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض خشک قسم کے افراد سخاوت اور بلند نظری کا اسراف اور فضول خرچی سے اشتباہ کر لیتے ہیں اور بخیل ہونے اور تنگ نظری کو زہد و پارسائی کے مسئلہ سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

قرآن اُوپر والی آیات اور سُورۂ ہود کی آیات میں اس حقیقت کو کھول کر بیان کر رہا ہے کہ مہمان کی پذیرائی کھلے دل سے اور معقول طریقے سے کرنا ہرگز مخالف شریعت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر کہ ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے، لہٰذا یہ اس کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے، لیکن وہ ایسی پذیرائی ہو جس کی شعاع دوسروں کو بھی بہرہ ور کرے، جیسا کہ شریف اور سخی افراد کی رسم ہے۔

خدا نے کبھی بھی زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کو حرام نہیں کیا، اور اموال حلال اپنے پاس رکھنا، جیسا کہ ابراہیم کے پاس تھے، جن سے دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے تھے، اُسے کبھی عیب شمار نہیں کیا۔

ابراہیمؑ اتنا بہت سارا مال ہونے کے باوجود کبھی بھی یادِ خدا سے غافل نہیں ہوئے، اور کبھی اس سے خواہ مخواہ کی دلبستگی نہ رکھی اور کسی زمانہ میں بھی اس کے منافع کو اپنے تک منحصر نہیں رکھا۔

قرآن سورۂ اعراف کی آیہ ۳۲ میں کہتا ہے: قل من حرم زینة الله التی اخرج لعباده والطیبات من الرزق قل هی للذین امنوا فی الحیوة الدنیا خالصة یوم القیامة کذالك نفصل الآیات لقوم یعلمون، کہہ دے خدا کی زینتوں کو جو اس نے بندوں کے لیے خلق کی ہیں، اور پاکیزہ روزیوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ کہہ دے: یہ دنیا کی زندگی میں انھیں لوگوں کے لیے تو ہیں جو ایمان لائے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شریک ہیں لیکن) قیامت میں تو یہ خالصتاً مؤمنین کے لیے ہی ہوں گی، ہم اسی طرح سے اپنی آیات کی ایسے لوگوں کے لیے جو آگاہ ہیں، تشریح و تفصیل کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم تفصیلی بحث چھٹی جلد سورۂ اعراف کی آیہ ۳۲ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

۳۱۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○
۳۲۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ
۳۳۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۙ
۳۴۔ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ○
۳۵۔ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
۳۶۔ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۚ
۳۷۔ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ؕ

ترجمہ

۳۱۔ (ابراہیم نے) کہا: اے خدا کے فرشتو! پھر تم کس لیے بھیجے گئے ہو؟
۳۲۔ انھوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔
۳۳۔ تاکہ ان پر "مٹی کے پتھروں" کی بارش کریں۔
۳۴۔ ایسے پتھر جن پر تیرے پروردگار کی طرف سے، اسراف کرنے والوں کے لیے نشان لگے ہوئے ہیں۔
۳۵۔ ہم نے ان تمام مومنین کو جو (قوم لوط) کے ان شہروں میں زندگی بسر کرتے تھے، (عذاب کے نازل ہونے سے پہلے) باہر نکال لیا۔
۳۶۔ اور ہم نے اس میں ایک گھرانے کے سوا کوئی باایمان گھرانا پایا ہی نہیں۔

۳۷۔ اور ہم نے ان (بلا دیدہ شہروں) میں، ایسے لوگوں کے لیے، جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں، ایک واضح نشانی چھوڑی ہے۔

تفسیر

قوم لوط کے بلا دیدہ شہر ایک آیت اور عبرت ہیں

فرشتوں کے ابراہیم کے پاس آنے، اور انہیں اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دینے کے واقعہ کے بعد، اس گفتگو کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، جو "ابراہیم" اور "فرشتوں" کے درمیان قوم "لوط" کے سلسلہ میں ہوئی۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ابراہیم شام کی طرف جلاوطن ہونے کے بعد لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے اور ہر قسم کے شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کرنے میں مصروف تھے، حضرت "لوط" جو ایک عظیم پیغمبر تھے، ان ہی کے زمانہ میں ہوئے ہیں اور احتمال یہ ہے کہ آپ ہی کی طرف سے مامور ہوئے تھے، کہ گمراہوں کو تبلیغ و ہدایت کرنے کے لیے شام کے ایک علاقہ (یعنی سدوم کے شہروں کی طرف) سفر کریں۔ وہ ایک ایسی گناہگار قوم کے درمیان آئے جو شرک اور سبب سے گناہوں میں آلودہ تھی، اور سب سے قبیح گناہ اغلام اور لواطت تھی، آخر کار فرشتوں کا ایک گروہ، اس قوم کی ہلاکت پر مامور ہوا، لیکن وہ پہلے ابراہیمؑ کے پاس آئے۔

ابراہیم مہمانوں کی وضع قطع سے سمجھ گئے کہ یہ کسی اہم کام کے لیے جا رہے ہیں؛ اور صرف بیٹے کی ولادت کی بشارت کے لیے نہیں آئے، کیونکہ اس قسم کی بشارت کے لیے تو ایک ہی شخص کافی تھا، یا اس عجلت کی وجہ ہے جو وہ چلنے کے لیے کر رہے تھے، اس سے محسوس کیا کہ کوئی اہم ڈیوٹی رکھتے ہیں۔

لہٰذا پہلی آیت میں کہتا ہے: "اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کونسے اہم کام کے لیے مامور ہوئے ہو"؟

(قال فما خطبکم ایها المرسلون)۔[1]

فرشتوں نے اپنی ڈیوٹی بیان کی، اور ابراہیم سے "کہا ہم ایک مجرم اور تباہ کار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں" (قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین)۔

---

[1] توجہ رکھنی چاہیئے کہ "خطب" ہر قسم کے کام کو نہیں کہتے، بلکہ یہ اہم کاموں کے معنی میں ہے، جبکہ شغل، امر، فعل اور اس قسم کے الفاظ ایک عام مفہوم رکھتے ہیں۔

ایسی قوم جو عقیدہ کے فساد اور خرابی کے علاوہ انواع و اقسام کی آلودگیوں، اور مختلف گناہوں میں جو قبیح اور شرمناک ہیں. گرفتار ہیں۔[1]

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا،: "ہم اس بات کے لیے مامور ہوئے ہیں کہ ان پر "سنگ۔ گل" کی بارش کریں، اور انہیں اس کے ذریعہ تہ و بالا کر کے ہلاک کر دیں" (لنرسل علیھم حجارۃ من طین)۔

"حجارۃ من طین" (مٹی کے پتھر) کی تعبیر، وہی چیز ہے، جسے سورۂ ہود کی آیہ ۸۲ میں، اس کی بجائے "سجیل" کہا ہے، اور "سجیل" اصل میں ایک فارسی لفظ ہے، جو "سنگ" و "گل" سے لیا گیا ہے، اور عربی زبان میں "سجیل" کی صورت اختیار کر لی ہے، تو اس بنا پر یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ پتھر کی طرح سخت ہے اور نہ مٹی کی طرح نرم اور مجموعی طور پر شاید اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ اس مجرم قوم کو نابود کرنے کے لیے آسمان سے بڑے بڑے پتھروں کے نازل کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، بلکہ چھوٹے چھوٹے ریت کے ذرات کی بارش جو زیادہ محکم نہیں تھے، بارش کے قطرات کی مانند ان پر برسے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "یہ پتھر تیرے پروردگار کی طرف سے اسراف کرنے والوں کے لیے نشان لگائے ہوئے تھے" (مسومۃ عند ربک للمسرفین)۔

"مسومۃ" اس چیز کو کہتے ہیں، جس پر کوئی علامت اور نشانی ہو، اور اس بارے میں کہ وہ کس طرح کے نشانات تھے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: ان کی ایک مخصوص شکل تھی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ یہ عام پتھر نہیں ہیں، بلکہ عذاب کا ذریعہ ہیں۔

اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے: ہر ایک پر ایک علیحدہ نشانی تھی اور ایک معین فرد اور ایک خاص نقطہ کے لیے نشانہ بنایا گیا تھا تاکہ لوگ جان لیں کہ خدا کے عذاب ایسے حساب شدہ ہوتے ہیں کہ یہ تک معلوم ہے، کہ کون سا مجرم شخص کس پتھر کے ساتھ ہلاک ہوگا!

"مسرفین" کی تعبیر ان کے گناہوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، اس طرح سے کہ وہ حد سے گزر گئے تھے اور حیا و شرم کا پردہ چاک کر چکے تھے، اگر کوئی شخص قوم لوط کے حالات اور ان کے گناہوں کے اقسام میں غور کرے

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورۂ ہود میں اس واقعہ کو ذکر کرتے وقت کہتا ہے: "انا ارسلنا الی قوم لوط"، "ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں"، تعبیر کا یہ فرق جو زیر بحث آیات اور سورۂ ہود کی آیات کے درمیان ہے اس بنا پر ہے کہ ان میں سے ہر ایک واقعہ کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں دوسرے لفظوں میں یہ تمام مسائل واقع ہوئے ہیں البتہ ان میں سے بعض زیر بحث آیات کے ضمن میں آئے ہیں اور بعض دوسرے، دوسری سورتوں میں ہیں۔

تو وہ دیکھ لے گا کہ ان کے بارے میں یہ تعبیر بہت ہی پُر معنی ہے [1]

ہر انسان ممکن ہے کبھی کبھی کسی گناہ سے آلودہ ہو جائے، لیکن اگر وہ جلدی بیدار ہو جائے اور اس کی تلافی اور اصلاح کرلے۔ تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کام اسراف کی حد تک پہنچ جائے۔

یہ تعبیر اس کے ساتھ ہی ایک اور مطلب کو بھی واضح کرتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ آسمانی پتھر قوم لوط کے لیے نشان لگائے گئے بلکہ یہ تمام اسراف کرنے والے گنہگاروں کے انتظار میں ہیں۔

٭ ٭ ٭

قرآن نے یہاں پروردگار کے ان فرشتوں کے بعد کے واقعہ کو۔ کہ وہ لوط کے پاس آئے، اور مہمانوں کے عنوان سے وارد ہوئے، اور وہ بے شرم قوم، اس خیال سے کہ وہ نوع بشر کے خوبصورت جوان ہیں، ان کی طرف آئی۔ لیکن بہت جلد ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور ان سب کی آنکھیں اندھی ہو گئیں ـــــ چھوڑ دیا ہے، اور خدا کی گفتگو کے آخری حصہ کو بیان کرتا ہے، [2]

فرماتا ہے، "ہم نے ان تمام مؤمنین کو جو قوم لوط کے شہروں میں رہتے تھے، بلا کے نازل ہونے سے پہلے ہی نکال دیا" (فاخرجنا من کان فیھا من المؤمنین)۔

لیکن ان تمام علاقوں میں ہمیں ایک گھرانے کے سوا اور کوئی صاحب ایمان نہ ملا"! (فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین)۔

ہاں! ہم ہرگز خشک و تر کو ملا کر نہیں جلاتے، اور ہماری عدالت اجازت نہیں دیتی کہ مومن کو کافر کی سزا میں گرفتار کریں یہاں تک کہ اگر لکھو کھا بے ایمان اور مجرم لوگوں میں ایک فرد بھی با ایمان اور پاک ہو تو ہم اسے بھی نجات دیتے ہیں،

یہ وہی مطلب ہے جو سورۂ حجر کی آیت ۵۹، ۶۰ میں اس صورت میں آیا ہے،: "اِلَّا اٰلَ لُوطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا امْرَأَتَہٗ قَدَّرْنَا اِنَّھَا لَمِنَ الْغَابِرِیْنَ" مگر لوط کا خاندان کہ ہم ان سب کو نجات دیں گے سوائے اس کی بیوی کے، جس کے لیے ہم نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ وہ شہر میں رہے اور ہلاک ہو جائے۔

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۹ ص ۱۸۳ کی طرف رجوع کریں (سورۂ ہود کی آیت ۸۱ کے ذیل میں)۔

[2] یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ ماجرا سورۂ ہود کی آیات میں نقل ہوا ہے، لیکن اس کی تعبیریں اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ ابراہیم سے ان فرشتوں کی ملاقات قوم لوط کے عذاب سے پہلے تھی، جب کہ زیر بحث آیات میں کچھ تعبیریں یہ بتاتی ہیں کہ یہ ملاقات بعد میں ہوئی، اس مسئلہ کے حل کا راستہ یہ ہے کہ "مسوّمۃ عند ربک للمسرفین" تک فرشتوں کی گفتگو ہے۔ اور بعد کی تین آیات جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں، خدا کا کلام ہے، اور اس کے مخاطب پیغمبر اسلام اور مسلمان ہوں، اور وہ اسے ایک واقعہ کے عنوان سے جو گزشتہ زمانہ میں صورت پذیر ہوا بیان کر رہا ہے۔

(غور کیجئے)

اور سورۂ ہود کی آیت ۸۱ میں آیا ہے: " فاسر باھلك بقطع من اللیل ولا یلتفت منکم احد الّا امرأتك انّہٗ مصیبھا ما اصابھم" رات کے وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ روانہ ہو جا، اور تم میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر نہ دیکھے، سوائے تیری بیوی کے کہ وہ بھی اسی عذاب میں جس میں وہ گرفتار ہوں گے، گرفتار ہوگی۔

اور سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۲ میں یہی واقعہ اس صورت میں بیان کیا گیا ہے:

قال انّ فیھا لوطًا قالوا نحن اعلم بمن فیھا لننجینہ واھلہ الا امرأتہ کانت من الغابرین"۔ "ابراہیم نے کہا: اس شہر اور آبادی میں تم جسے نابود کرنے کا (تم اے فرشتو!) ارادہ رکھتے ہو، لوط بھی رہتا ہے، انہوں نے کہا، : ہم ان لوگوں سے جو اس میں ہیں بخوبی آگاہ ہیں، ہم اس کو اور اس کے گھر والوں کو تو نجات عطا کریں گے، مگر اس کی بیوی شہر کے لوگوں کے درمیان ہی رہ جائے گی۔"

پھر یہی موضوع سورۂ اعراف کی آیت ۸۳ میں اس طرح بیان ہوا ہے: فانجیناہ واھلہ الا امرأتہ کانت من الغابرین" ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات بخشی، مگر اس کی بیوی جو شہر میں رہ جانے والوں میں سے تھی (اور انہی کے انجام کو پہنچی)"

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں قوم لوط کے ماجرے کا یہ حصہ قرآن کی ان پانچ سورتوں میں مختلف عبارتوں میں بیان ہوا ہے۔ جو سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں، لیکن چونکہ ایک حادثہ کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے، اور ہر نگاہ میں اس کے کسی ایک پہلو کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس لیے قرآن مجید میں بھی تاریخی حوادث عام طور پر اسی طرح پیش ہوئے ہیں، اور دہرائے گئے ہیں، اور اوپر والی آیات کی مختلف تعبیریں بھی اسی معنی کی گواہ ہیں، علاوہ ازیں چونکہ قرآن ایک تربیتی اور انسان سازی کی کتاب ہے، اور مقام تربیت گاہ میں ضروری ہے کہ ایک اہم مسئلہ پر بارہا تامل کیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں گہرا اثر چھوڑے، البتہ ضروری ہے کہ یہ تکرار عمدہ، دلنشین اور گوناں گوں تعبیروں کے ساتھ صورت پذیر ہو، تاکہ دل کو ملال حاصل نہ ہو اور فصیح و بلیغ ہو، (ابراہیم کے مہمانوں کے واقعہ اور ابراہیم کی اُن سے گفتگو، اور پھر قوم لوط کے دردناک اور عبرت انگیز انجام، کی مزید وضاحت کے لیے، تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۲۱۲ سے آگے اور جلد ۹ ص ۱۸۳ اور جلد ۱۱ ص ۱۰۲ اور جلد ۱۶ ص ۲۲۴ سورۂ اعراف، ہود، حجر اور عنکبوت کی آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں)

بہر حال خداوند عالم نے اس آلودہ قوم کو زمین کے ایک سخت اور ویران کرنے والے زلزلہ سے تہ و بالا کر دیا، اس کے بعد آسمانی پتھروں کی بارش برسائی اور ان کا نام و نشان مٹا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پلید بدن بھی آسمانی گرد و غبار اور پتھروں کے نیچے دفن ہو گئے، تاکہ وہ آئندہ آنے والوں، اور تمام بے ایمان مجرم اور آلودہ افراد کے لیے، ایک عبرت ہوں۔

اسی لیے آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے،: " ہم نے ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں، اس سرزمین میں ایک واضح نشانی رکھ چھوڑی ہے" (وترکنا فیھا آیۃ للذین یخافون العذاب الالیم)۔

یہ تعبیر اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان آیات اور خدا کی نشانیوں سے وہی لوگ پند و نصیحت حاصل کرتے ہیں، جن میں قبول کرنے کے لیے آمادگی ہو۔ اور جو مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس کریں۔

ایک نکتہ

قوم لوط کے شہر کہاں تھے؟

یہ بات مسلمہ ہے کہ ابراہیم عراق اور سرزمین بابل سے ہجرت کرنے کے بعد شامات کی طرف گئے، کہتے ہیں کہ لوط بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد (توحید کی طرف دعوت دینے اور فتنہ و فساد سے مبارزہ کے لیے) شہر "سدوم" کی طرف گئے۔

"سدوم" قوم لوط کے ایک شہر اور آبادی کا نام تھا جو شامات (ملک اردن میں) بحر المیت کے قریب واقع تھا جو آباد اور درختوں اور سبزہ زار سے بھرا تھا، لیکن اس بدکار و بے غیرت قوم پر عذاب الٰہی کے نازل ہونے کے بعد، ان کے شہر مسمار اور تہ و بالا ہو گئے، چنانچہ انہیں "مدائن مؤتفکات" (تہ و بالا ہونے والے شہر) کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ، یہ ہے کہ ان شہروں کے ویرانے زیر آب آگئے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بحر المیت کے ایک گوشہ میں کچھ ستون اور دوسرے آثار۔ جو ان شہروں کے خرابوں پر دلالت کرتے ہیں دیکھتے ہیں۔

اور یہ جو بعض اسلامی تفاسیر میں آیا ہے کہ "وترکنا فیھا اٰیۃ" کے جملہ سے مراد وہی گندے پانی ہیں جنہوں نے ان شہروں کی جگہ کو ڈبو دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہو کہ شدید زلزلوں اور زمین کے شگافتہ ہونے کے بعد بحر المیت سے ایک راستہ اس سرزمین بلا دیدہ کی طرف کھل گیا ہو اور یہ سب شہر زیر آب آگئے ہوں۔

جب کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ قوم لوط کے شہر زیر آب نہیں آئے اور اب بھی بحر المیت کے قریب ایک علاقہ ہے جو سیاہ پتھروں کے نیچے ڈھکا ہوا ہے، احتمال ہے کہ قوم لوط کے شہروں کی یہی جگہ ہے۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ ابراہیم کا مرکز شہر "حبرون" میں تھا، جو شہر "سدوم" سے چنداں دور فاصلہ پر نہیں تھا، اور جس وقت زلزلہ یا صاعقہ کے زیر اثر ان کے شہروں کو آگ لگی تو اس وقت ابراہیم حبرون کے قریب کھڑے ہوئے تھے، اور شہر سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اُسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے [1]

اس گفتگو کے مجموعہ سے ان شہروں کے قریباً قریباً حدود واضح ہو گئے، اگرچہ ان کے جزئیات ابھی تک پردہ ابہام میں ہیں۔

---

[1] اقتباس از کتاب "قاموس مقدس" "دائرۃ المعارف وجدی" اور "النجد" حصہ اعلام۔

۳۸۔ وَفِی مُوسٰٓی اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ○
۳۹۔ فَتَوَلّٰی بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ○
۴۰۔ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ ○
۴۱۔ وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ○
۴۲۔ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ ○
۴۳۔ وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ○
۴۴۔ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ ○
۴۵۔ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ○
۴۶۔ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ○

ترجمہ

۳۸۔ موسیٰ (کی زندگی) میں بھی ایک نشانی اور درس عبرت تھا جب ہم نے اسے واضح و آشکار دلیل کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا۔
۳۹۔ لیکن اس نے اپنے تمام وجود کے ساتھ اس سے منہ پھیر لیا اور کہا: یہ آدمی یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔
۴۰۔ ہم نے اسے بھی اور اس کے لشکروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا اور انہیں دریا میں پھینک دیا درآنحالیکہ وہ قابل ملامت تھا۔

۴۱۔ اسی طرح عاد کی سرگذشت میں بھی ایک آیت ہے، جب کہ ایک تند و تیز آندھی، بارش کے بغیر ان کے اوپر بھیجی۔

۴۲۔ وہ جس چیز کے اوپر سے گذرتی تھی اسے چھوڑتی نہیں تھی، یہاں تک کہ اسے بوسیدہ ہڈیوں کی طرح کر دے۔

۴۳۔ قوم ثمود کی سرگذشت میں بھی ایک عبرت ہے، جب کہ ان سے یہ کہا گیا: تھوڑی سی دیر کے لئے تم بھی فائدہ اٹھالو، (اور اس کے بعد عذاب کے منتظر رہو)

۴۴۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی، تو انہیں صاعقہ نے پکڑ لیا، حالانکہ وہ (حیرانگی کے ساتھ) دیکھ رہے تھے (مگر ان میں دفاع کی کوئی قدرت نہیں تھی)

۴۵۔ وہ اس طرح سے زمین پر گرے کہ ان میں اٹھنے کی طاقت ہی نہ رہی اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکے۔

۴۶۔ اسی طرح ہم نے ان سے پہلے قوم نوح کو ہلاک کیا تھا۔ کیونکہ وہ فاسق قوم تھی۔

تفسیر

گذشتہ لوگوں کی تاریخ میں یہ سب عبرت کے درس ہیں

قرآن ان آیات میں، قوم لوط کی داستان اور اس دردناک انجام کو، جو انہوں نے قبیح اور شرمناک گناہوں کی وجہ سے پایا تھا، بیان کرنے کے بعد، گذشتہ اقوام میں سے چند قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "موسیٰ اور اس کی زندگی کی تاریخ میں بھی ایک نشانی اور درس عبرت تھا، جب ہم نے اسے فرعون کی طرف واضح اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا" (و فی موسیٰ اذ ارسلناہ الیٰ فرعون بسلطان مبین)۔

"سلطان" اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلط کا سبب بنے، اور یہاں معجزہ یا عقلی قوی دلیل و منطق ہے، یا دونوں ہیں، کہ موسیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں ان سے فائدہ اٹھایا۔

"سلطان مبین" کی تعبیر قرآن کی مختلف آیات میں بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے، اور عام طور پر واضح و آشکار منطقی دلیل کے معنی میں ہے۔

لیکن فرعون نے نہ تو موسیٰؑ کے عظیم معجزات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ جو ان کے خدا سے ارتباط کے گواہ تھے۔ اور نہ ہی ان کے منطقی دلائل کے آگے سرِ تعظیم جھکایا، بلکہ اس غرور و تکبر کی وجہ سے جو وہ رکھتا تھا "اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے پھر گیا اور کہا: یہ شخص یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے" (فتولّی برکنہ و قال ساحر او مجنون)۔

"رکن" اصل میں ستون اور پایۂ اصلی اور ہر چیز کے اہم حصہ کے معنی میں ہے۔ اور یہاں ممکن ہے بدن کے تمام ارکان کی طرف اشارہ ہو، یعنی فرعون نے مکمل طور پر اور اپنے تمام ارکان بدن کے ساتھ موسیٰؑ کی طرف پشت کی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے، کہ یہاں اس کا لشکر مراد ہے، یعنی اس نے اپنے ارکانِ لشکر پر تکیہ کیا، اور پیام حق سے روگردانی اختیار کی۔

یا یہ کہ اس نے خود بھی فرمان خدا سے منہ پھیرا، اور اپنے ارکانِ حکومت اور لشکر کو بھی منحرف کیا۔[1]

قابل توجہ بات یہ ہے، کہ جھوٹے جبار اور سرکش لوگ ان تہمتوں اور جھوٹی نسبتوں میں، جو وہ عظیم پیغمبروں کی طرف دیتے تھے، ایک عجیب حیرانی، تناقض، اور پریشان گوئی میں گرفتار تھے، کبھی انہیں ساحر و جادوگر کہتے اور کبھی مجنون و دیوانہ، حالانکہ ساحر و جادوگر ایک ہوشیار آدمی ہونا چاہیئے، جو باریک کام کرنے، اور نفسیاتی مسائل اور مختلف چیزوں کے خواص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیرت انگیز کام کرے، اور لوگوں کو غفلت میں رکھے، جب کہ مجنون اس کا نقطۂ مقابل ہے۔

لیکن قرآن فرعون اور اس کے ساتھیوں کے انجام کے بارے میں اس طرح خبر دیتا ہے، "ہم نے اُسے اور اس کے لشکر کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور اسے دریا میں پھینک دیا، کیونکہ وہ ایسے اعمال کا مرتکب ہوا تھا جو سرزنش اور ملامت کے قابل تھے" (فاخذناہ وجنودہ فنبذناھم فی الیم وھو ملیم)۔[2]

"یم" جیسا کہ لغت اور کتب حدیث سے معلوم ہوتا ہے، "سمندر" کے معنی میں ہے، اور نیل جیسے عظیم دریاؤں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔[3]

"نبذناھم" (ہم نے ان کو پھینک دیا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ نہ صرف خدا کا عذاب نے اس قوم کو محو کر دیا، بلکہ ان کی وہ تاریخ جو باقی رہ گئی ہے۔ ان کے لیے باعث ننگ و نام ہے اور ان کے شرم آور اعمال

---

[1] توجہ کرنا چاہیے کہ "برکنہ" میں "باء" پہلی تفسیر کے مطابق "باء مصاحبہ" ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "باء سببیت ہے" اور تیسری تفسیر کے مطابق "باء تعدیہ" ہے۔

[2] "ملیم" اسم فاعل ہے باب "افعال" سے، مادہ لوم سے سرزنش کے معنی میں ہے۔ اور ایسے موقعوں میں اس شخص کے معنی میں ہے، جو قابل ملامت کام کا مرتکب ہوا ہو، جیسا کہ "مغرب" اس شخص کے معنی میں ہے جو عجیب و غریب کام انجام دیتا ہے۔

[3] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے جلد ۷ ص ۔۔۔۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۶ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

کی بھی محافظ ہے، اور اس نے ان کے ظلم و جرم اور کبر و غرور سے اس طرح سے پردہ اٹھایا ہے کہ ہمیشہ کے لیے قابل مذمت بن گئے ہیں،

اس کے بعد ایک دوسری قوم یعنی "عاد" کی اجمالی سرنوشت پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے:

"قوم عاد کی سرگذشت میں بھی ایک آیت و عبرت ہے، جبکہ ہم نے ان پر ایک عقیم اور بغیر بارش کا طوفان بھیجا" (و فی عاد اذ ارسلنا علیھم الریح العقیم)۔

ہواؤں کا عقیم اور بانجھ ہونا اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ بارش برسانے والے بادل اپنے ساتھ لے کر نہ چلیں، گیاہ و نباتات میں اپنے عمدہ اثرات نہ چھوڑیں، اور ان میں کوئی فائدہ اور برکت نہ ہو، اور ہلاکت و نابودی کے سوا کوئی چیز ہمراہ نہ لائیں۔

اس کے بعد اس سخت آندھی کی خصوصیت۔ جو قوم عاد پر مسلط ہوئی تھی۔ بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، : "وہ جس چیز کے پاس سے گزرتی تھی اس کو نابود کیے بغیر نہ چھوڑتی تھی، اور خشک کٹی پھٹی گھاس یا بوسیدہ ہڈیوں کی صورت میں لے آتی تھی، : (ما تذر من شیء اتت علیہ الا جعلتہ کالرمیم)۔

"رمیم" "رمۃ" (بروزن منۃ) کے مادہ سے بوسیدہ ہڈیوں کے معنی میں ہے۔ اور "رمہ" (بروزن قبہ) بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے" اور "رم" (بروزن جن) ان چھوٹے چھوٹے اجزاء کو کہا جاتا ہے جو لکڑی یا گھاس میں سے زمین پر گر پڑتے ہیں[1] "رم" اور "ترمیم" پرانی اور بوسیدہ اشیاء کی اصلاح کے معنی میں آتا ہے[2]

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قوم عاد کی تیز آندھی ایک عام تیز آندھی نہیں تھی، بلکہ انہیں تباہ کرنے اور کوٹنے پھینکنے کے علاوہ اور اصطلاح کے مطابق۔ فزیکل دباؤ سے، جلانے اور زہریلا بنانے کی خاصیت رکھتی تھی، جو طرح طرح کی اشیاء کو بوسیدہ اور کہنہ بنا دیتی تھی۔

ہاں! خدا کی قدرت ایسی ہے، جو "نسیم" کی ایک حرکت سریع کے ذریعہ طاقتور اور مشہور و معروف اقوام کو اس طرح سے درہم برہم کر دیتی ہے، کہ صرف ان کے بوسیدہ جسم ہی باقی رہ جاتے ہیں، یہ طاقتور اور ثروتمند قوم عاد کی سرنوشت کی طرف جو سرزمین احقاف (عمان اور حضرموت کے درمیان کا علاقہ) میں رہتے تھے ـــــ ایک مختصر سا اشارہ تھا۔

اس کے بعد قوم "ثمود" کی نوبت آتی ہے۔ اور ان کے بارے میں فرماتا ہے، : قوم ثمود میں بھی ایک آیت اور عبرت ہے، جبکہ ان سے کہا گیا: تم زندگی کی تھوڑی سی مدت کے لیے فائدہ اٹھالو۔ (اور پھر عذاب الٰہی کے منتظر رہو) (و فی ثمود اذ قیل لھم تمتعوا حتی حین)۔

"حتی حین" سے مراد وہی مہلت کے تین دن ہیں جن کی طرف سورۂ ہود کی آیت ۶۵ میں اشارہ ہوا ہے:

---

[1] مفردات راغب (مادہ۔ رم)۔

[2] "لسان العرب" و مفردات (مادہ۔ رم)۔

فعقروها فقال تمتعوا فی داركم ثلاثة ايام ذالك وعد غير مكذوب:

"انہوں نے اس اونٹنی کی جو بطور اعجاز آئی تھی، کونچیں کاٹ دیں، اور ان کے پیغمبر صالح نے ان سے کہا، بس تین دن اپنے گھروں میں مزے اڑالو، اور اس کے بعد عذاب الٰہی کے منتظر رہو، یہ نہ ٹلنے والی وعید ہے"

باوجود اس کے کہ خدا ان کے پیغمبر صالح کے ذریعہ انہیں بارہا انذار فرما چکا تھا، لیکن پھر بھی مزید اتمام حجت کے لیے انہیں تین دن کی مہلت اور دی گئی، تاکہ وہ اپنے تاریک ماضی کی تلافی کرلیں، اور گناہ کا زنگ توبہ کے پانی کے ساتھ دل و جان سے دھولیں، بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ان تین دنوں میں انکے بدن کی جلد میں کچھ تبدیلیاں ظاہر ہوئیں پہلے زرد ہوئیں پھر سرخ ہوئیں اور بعد میں سیاہ ہوگئیں، تاکہ اس مشرک سرکش قوم کے لیے تنبیہیں ہوں، لیکن افسوس ان امور میں سے کوئی چیز بھی فائدہ مند نہ ہوئی۔ اور وہ غرور کی سواری سے نیچے نہ اترے۔

ہاں! "انہوں نے اپنے پروردگار کے فرمان سے سرتابی کی، اور صاعقہ نے انہیں ناگہانی طور پر آگھیرا جب کہ وہ حیرانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے، اور ان میں اپنا دفاع کرنے کی کوئی قدرت نہ تھی" (فعتوا عن امر ربهم فاخذتهم الصاعقة وهم ينظرون)۔

"عتوا" "عتو" (بروزن غلو) کے مادہ سے، اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ جملہ ان تمام روگردانیوں کی طرف اشارہ ہے، جو وہ صالح کی دعوت کے سارے عرصہ میں کرتے رہے، مثلاً بت پرستی، ظلم و ستم اور صالح کی اونٹنی کی کونچوں کا کاٹنا جو ان کا ایک معجزہ تھا، نہ کہ صرف وہ روگردانیاں جو ان تین دنوں میں انہوں نے انجام دیں، اور بارگاہ خدا میں توبہ و انابہ کے بجائے غفلت اور غرور میں ڈوبے رہے۔

اس بات کی شاہد سورۂ اعراف کی آیت ۷۷ ہے جو یہ کہتی ہے: فعقروا الناقة وعتوا عن امر ربهم وقالوا يا صالح ائتنا بما تعدنا ان كنت من المرسلين:

پھر انہوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں، اور پروردگار کے فرمان سے سرپیچی کی اور کہا: اے صالح اگر تو خدا کا بھیجا ہوا ہے، تو جس چیز کی تو ہمیں دھمکی دے رہا ہے وہ لے آ۔"

"صاعقہ" اور "صاقعہ" دونوں قریب المعنی ہیں، اصل میں شدید آواز کے ساتھ نیچے گرانے کے معنی میں ہے، اس فرق کیساتھ کہ "صاعقہ" آسمانی اجسام میں کہا جاتا ہے اور "صاقعہ" زمینی اجسام میں اور بعض اہل لغت کے قول کے مطابق "صاعقہ" کبھی "موت" کے معنی میں کبھی "عذاب" کے معنی میں، اور کبھی "آگ" کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ عام طور پر اس شدید آواز پر بولا جاتا ہے، جو آسمان سے مرگ بار آگ کے ساتھ بلند ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں (موت و عذاب اور آگ) تینوں ہی معنی جمع ہیں۔

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ جس وقت وہ بادل جن میں مثبت بجلی ہوتی ہے، ایسی زمین کے نزدیک ہوجائیں، جو منفی بجلی کی حامل ہے، تو ان دونوں کے درمیان سے بجلی کا ایک عظیم شعلہ نکلتا ہے، جس کے ساتھ ایک وحشتناک آواز اور جلانے والی آگ ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے واقع ہونے کے مقام کو لرزا کر رکھ دیتی ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹ میں اس معنی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ بادل و بارش اور رعد

وبرق کی گفتگو کرنے کے بعد مزید کہتا ہے :

یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم من الصواعق حذر الموت :

منافقین ان راستہ چلنے والے لوگوں کے مانند ہیں جو اندھیری رات میں ـــ جس میں رعد کڑک رہی ہو اور بجلی چمک رہی ہو ـــ بیابان سے گذرتے ہیں، اور مرنے کے خوف سے (اور اس لیے کہ صاعقہ آواز کو نہ سنیں) اپنے کان میں انگلی رکھ لیتے ہیں۔

انجام کار آخری جملہ جو اس سرکش قوم کے بارے میں فرماتا ہے یہ ہے کہ "وہ اس طرح سے زمین پر گر پڑے کہ ان میں کھڑے ہونے کی بھی قدرت نہ تھی، اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکتے تھے" (فما استطاعوا من قیام وما کانوا منتصرین)۔

ہاں! صاعقہ نے انہیں اس طرح غفلت میں پکڑ کر زمین پر دے پٹکا کہ نہ تو ان میں کھڑے ہونے کی طاقت تھی نہ اپنا دفاع کرنے کی قدرت اور نہ ہی نالہ و فریاد اور مدد طلب کرنے کی قوت، اور انہوں نے اسی حالت میں جان دے دی، اور ان کی سرگذشت دوسروں کے لیے ایک درس عبرت بن گئی۔

ہاں! قوم ثمود جو عرب کے معروف قبیلوں میں سے تھی، اور سرزمین "حجر" میں (جو حجاز کے شمال میں ایک علاقہ ہے) امکانات و وسائل، فراواں ثروت، طولانی عمر، اور محکم عمارتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، فرمان خدا سے روگردانی، سرکشی، طغیان، شرک اور ظلم و ستم کی بنا پر نابود ہو گئے اور ان کے آثار دوسروں کے لیے ایک درس گویا منہ بولتا سبق بن گئے۔

آخری زیر بحث آیت میں پانچویں قوم یعنی قوم نوح کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور ہم نے قوم نوح کو ان سے پہلے ہلاک کیا تھا، کیونکہ وہ ایک فاسق قوم تھی" (وقوم نوح من قبل انھم کانوا قومًا فاسقین)[1]

"فاسق" اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کے فرمان کی حدود سے باہر قدم نکالے اور کفر و ظلم یا دوسرے تمام گناہوں میں آلودہ ہو۔

"من قبل" (ان سے پہلے) کی تعبیر، شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قوم فرعون، لوط، عاد و ثمود نے قوم نوح کی افسوسناک سرگذشت ـــ جو ان سے پہلے تھی ـــ سن رکھی تھی، لیکن افسوس کہ اس نے انہیں بیدار نہ کیا، اور خود اس سے مشابہ سرنوشت میں گرفتار ہو گئے۔

---

[1] اس جملہ میں ایک محذوف ہے اور "کشاف" میں "زمخشری" کے قول کے مطابق تقدیر میں اس طرح ہے "واھلکنا قوم نوح" اگرچہ پہلی آیات میں "اھلکنا" نہیں تھا، لیکن ان کے مضمون سے اس کا اچھی طرح سے استفادہ ہوتا ہے۔

چند نکات

۱۔ عذاب الٰہی کی مختلف صورتیں

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات اور گزشتہ آیات میں گزشتہ اقوام میں سے پانچ قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ ہوا ہے، (قوم لوط، فرعون، عاد، ثمود اور قوم نوح) جن میں سے پہلی چار قوموں کے عذاب کا بیان تو ہوا ہے، لیکن قوم نوح کے عذاب کی طرف اشارہ نہیں ہوا، اور جس وقت ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی چار اقوام میں سے ہر ایک کو چار مشہور عناصر میں سے کسی ایک کے ساتھ سزا ملی ہے، قوم "لوط" زلزلہ اور آسمانی پتھروں سے تباہ ہوئی یعنی "مٹی" کے ساتھ، قوم "فرعون" "پانی" کے ساتھ، قوم "عاد" تیز آندھی اور ہوا کے ساتھ، اور قوم "ثمود" "صاعقہ اور آگ" کے ساتھ۔

یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ زمانہ میں یہ چاروں چیزیں ایک "عنصر" یعنی جسم بسیط کے عنوان سے نہیں پہچانی جاتیں (کیونکہ ہر ایک دوسرے اجسام کے ساتھ مرکب ہے) لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ چاروں اہم ارکان انسانوں کی زندگی کو برقرار رکھتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی انسان کی زندگی سے کلی طور پر حذف ہو جائے تو زندگی کا برقرار رہنا ناممکن ہو جائے گا، چہ جائیکہ یہ سب کے سب۔

ہاں! خدا نے ان اقوام کی موت اور نابودی ایسی چیزیں قرار دی، جو ان کی زندگی کا عامل اصلی تھی، جس کے بغیر وہ اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے، اور یہ ایک عجیب قدرت نمائی ہے۔ اب اگر قوم نوحؑ کے عذاب کے عامل کو بیان نہیں کیا تو شاید وہ اسی بنا پر ہے کہ ان کا عذاب بھی قوم فرعون کی طرح پانی سے تھا، اور یہاں اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ تولید کرنے والی اور بانجھ ہوائیں

اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے کہ خدا نے قوم عاد کو تیز اور بانجھ ہوا کے ذریعہ سزا دی، اور سورۂ "حجر" کی آیہ ۲۲ میں یہ آیا ہے:

وارسلنا الریاح لواقح فانزلنا من السماء ماء

"ہم نے ہواؤں کو تلقیح اور بارور کرنے کے لیے بھیجا، اور آسمان سے پانی نازل کیا"

اگرچہ یہ آیت زیادہ تر بادلوں کی تلقیح اور بارش کے نزول کے لیے ایک دوسرے سے ملنے کی طرف ناظر ہے۔ لیکن یہ کلی طور پر انسانوں کی زندگی میں ہواؤں کے نقش و اثر کو واضح کرتی ہے، ہاں! ان کا کام بارور کرنا ہے۔ بادلوں کو بارور کرنا گیاہ و نباتات کو بارور کرنا، یہاں تک کہ مختلف جانوروں کے اجناس و انواع کو "بارور ہونے" کے لیے آمادہ کرنے کے لیے بھی مؤثر ہے۔

لیکن یہی ہوا جب عذاب کے فرمان کی حامل ہو، تو وہ حیات و زندگی پیدا کرنے کی بجائے، موت اور نابودی کا عامل

بن جاتی ہے۔ اور سورۂ قمر آیت ۲۰ میں۔ قرآن کے قول کے مطابق ـــــ جس میں قوم عاد کے بارے میں گفتگو ہے یہ کہا ہے: تنزع الناس کانھم اعجاز نخل منقعر، "انہیں (جو قد آور سخت و مضبوط جسم رکھتے تھے) وہ زمین سے اکھاڑ پھینکتی تھی اور سر کے بل زمین پر پٹک دیتی تھی اس طرح سے کہ ان کے سر تن سے جدا ہو جاتے تھے، جیسے کہ کسی کھجور کا درخت ہے جو بڑے سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہو۔

۴۷۔ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○

۴۸۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ○

۴۹۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

۵۰۔ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ ○

۵۱۔ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ ○

ترجمہ

۴۷۔ ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا ہے، اور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔

۴۸۔ اور ہم ہی نے زمین کو پھیلایا ہے، اور ہم کیا ہی اچھے پھیلانے والے ہیں۔

۴۹۔ اور ہم نے ہر ہر چیز کے جوڑے جوڑے خلق کئے ہیں۔ تاکہ شاید تم متذکر ہوں۔

۵۰۔ پس تم خدا ہی کی طرف دوڑو، کیونکہ میں اس کی طرف سے تمہارے لئے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۵۱۔ اور خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار نہ دو بے شک میں اس کی طرف سے ایک آشکار ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر

ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے رہتے ہیں

یہ آیات ایک مرتبہ پھر عالم آفرینش میں آیات خدا کی عظمت کے مسئلہ کو پیش کرتی ہیں، اور حقیقت میں ان مباحث کو ــــ جو اسی سورہ کی آیت ۲۰ و ۲۱ میں، زمین اور انسانی وجود میں اس کی نشانیوں کے بارے میں، گذر چکی ہیں ــــ تکمیل کرتی ہیں، اور ضمنی طور پر مسئلہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر خدا کی قدرت کی ایک دلیل ہے پہلے فرماتا ہے: "ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا، اور ہم ہمیشہ اُسے وسعت دیتے رہتے ہیں": (والسماء بنیناھا بایدو انا لموسعون)۔

"اور ہم نے زمین کو بچھایا، اور ہم کیا ہی اچھا بچھانے والے ہیں" (والارض فرشناھا فنعم الماھدون)

"ایدٍ" (بروزن صید) قدرت و قوت کے معنی میں ہے، اور قرآن مجید کی آیات میں بارہا اس معنی میں آیا ہے، اور یہاں آسمانوں کی خلقت کے بارے میں خدائے عظیم کی قدرت کاملہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس عظیم قدرت کی نشانیاں آسمانوں کی عظمت میں بھی اور اس خاص نظام میں بھی، جو ان میں کارفرما ہے، اچھی طرح سے واضح ہے،[1]

اس بارے میں کہ "انا لموسعون" (ہم ہمیشہ وسعت دیتے رہتے ہیں) سے یہاں کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے بندوں پر بارش کے نزول کے ذریعہ خدا کی جانب سے وسعت رزق کے معنی میں سمجھا ہے، اور بعض اسے ہر لحاظ سے وسعت رزق کے معنی میں سمجھتے ہیں، اور بعض نے اس کی، خدا کے غنی

---

[1] یہاں ان چند اشتباہات کا ذکر جو بعض مفسرین یا غیر مفسرین کو ہوئے ضروری ہے۔

۱۔ بعض مفسرین نے "ایدٍ" کی دو معانی میں تفسیر کی ہے، "قدرت" و "نعمت" جب کہ لغت کے لحاظ سے "ایدٍ" قدرت کے معنی میں ہے، لیکن "یدٍ" جس کی جمع "ایدی" اور جمع الجمع "ایادی" بنتی ہے، وہ قدرت و نعمت دونوں معنی میں آیا ہے، (ہم نے بھی سورۂ ص کی آیت ۱۷ کی تفسیر میں طبرسی کی مجمع البیان کی پیروی کرتے ہوئے "ایدٍ" کے لیے دو معانی ذکر کئے ہیں جس کی اب اصلاح کر رہے ہیں)۔

۲۔ المعجم المفہرس (محمد فواد عبدالباقی) میں زیر بحث آیت "ایید" کے مادہ (ایاد و ئیار) کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور اس کو "ایدٍ" کے مادہ سے الگ کیا ہے یہ اشتباہ ظاہراً بعض قرآنوں کے رسم الخط سے پیدا ہوا ہے۔ ورنہ سب مفسرین نے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ زیر بحث آیت میں وہی "ایدٍ" قدرت کے معنی میں ہے۔

اور بے نیاز ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ اس کے خزانے اس قدر وسیع ہیں کہ مخلوقات کو رزق عطا کرنے سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتے، اور نہ ان میں کوئی کمی ہوتی ہے۔

لیکن اس سے پہلے جملہ میں آسمانوں کی خلقت کے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اور ماہرین کے آخری انکشافات کو مدنظر رکھتے ہوئے ـــــ جو انہوں نے جہان اور عالم ہستی کے پھیلاؤ اور وسعت کے سلسلے میں کئے ہیں، اور حسی مشاہدات کے طریقہ سے بھی جس کی تائید ہوتی ہے ـــــ آیت کا ایک اور زیادہ لطیف معنی حاصل کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا نے آسمانوں کو پیدا کیا اور ہمیشہ انہیں وسعت دیتا رہتا ہے۔

موجودہ علم یہ بتاتا ہے: نہ صرف کرہ زمین آسمانی مادوں کو جذب کرتے کرتے بتدریج موٹی اور وزنی ہوتی جارہی ہے بلکہ آسمان بھی وسیع، اور پھیلتے جارہے ہیں، یعنی وہ ستارے جو ایک کہکشاں میں ہیں، بڑی تیزی کے ساتھ کہکشاں کے مرکز سے دور ہوتے جارہے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے موقعوں پر اس پھیلاؤ کی سرعت کا اندازہ بھی لگایا ہے۔

کتاب "مرزہای نجوم" "تالیف فرد ھویل" میں یہ بیان کیا گیا ہے، کروں کے پھیلنے کی زیادہ سے زیادہ سرعت کا اب تک جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ تقریباً ۶۶ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے! زیادہ دوری پر واقع کہکشائیں میں ہماری نگاہ کے آگے اتنی کم نور ہیں کہ کافی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سرعت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ آسمان سے جو تصویریں حاصل کی گئی ہیں، وہ اس اہم انکشاف کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں، کہ: ان کہکشاؤں کا فاصلہ نزدیک کی کہکشاؤں کی نسبت بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

مؤلف مذکور نے اس کے بعد "ابرسنبلہ" و "اکلیل" اور "شجاع" وغیرہ نام کی کہکشاؤں کی سرعت کی تحقیق پیش کی ہے، اور حساب لگانے کے بعد اس سلسلہ میں بہت سی حیران کن اور عجیب وغریب سرعتوں کو بیان کیا ہے[1]

اس سلسلہ میں چند باتیں آقائے "جان الدر" کی بھی سن لیں وہ کہتا ہے، : ستاروں سے جو موجیں نکلتی ہیں، وہ جدید ترین اور دقیق ترین اندازوں کے مطابق ایک عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھاتی ہیں، یعنی اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس سے مل کر یہ جہان بنا ہے، ہمیشہ زیادہ سرعت اور تیزی کے ساتھ ایک مرکز سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اور ان کا فاصلہ اس مرکز سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ان کی رفتار کی تیزی بڑھتی جارہی ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ ایک وقت یہ سب ستارے اس مرکز میں جمع تھے۔ اور اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہو گئے، اور بڑے ستاروں کا مجموعہ ان سے الگ ہو کر تیزی اور سرعت کے ساتھ ہر طرف کو روانہ ہو گیا۔

ماہرین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ جہان ایک نقطۂ آغاز کا حامل تھا[2]

---

[1] "مرزہای نجوم" ترجمہ "رضا اقصی" ص ۳۳۸ تا ۳۴۲۔

[2] "آغاز وانجام جہان" صفحات ۴۷، ۷۷ (تلخیص کے ساتھ)

"ژرژ گاموف" "کتاب" آفرینش جہان" میں اس بارے میں اس طرح لکھتا ہے: عالم کی فضا جو اربوں کہکشاؤں سے مل کر بنی ہے ایک ایسی حالت میں ہے جو تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ جہان حالت سکون میں نہیں ہے، بلکہ اس کا پھیلتے جانا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

اس بات کی حقیقت کو معلوم کرنے، اور تہ تک پہنچنے سے: کہ ہمارا جہان مسلسل پھیل رہا ہے، اور حالت انبساط میں ہے، جہاں شناسی کے معموں کے خزانوں کی اصلی کلید معلوم ہو جاتی ہے کیونکہ اگر اس وقت جہاں حالت انبساط میں ہو تو یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ کسی وقت میں بہت شدید حالت انقباض میں تھا[1]

صرف مذکورہ ماہرین ہی نے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ دوسرے افراد نے بھی اس معنی کو اپنی تحریروں میں نقل کیا ہے جن کے کلمات کے نقل کرنے سے عبارت طویل ہو جائے گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "انا لموسعون" (ہم وسعت دینے والے ہیں) کی تعبیر جملہ اسمیہ اور اسم فاعل کے جملہ سے استفادہ کرتے ہوئے، اس موضوع کے ہمیشہ ہمیشہ ہوتے رہنے کی دلیل ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ یہ ہمیشہ سے تھی اور اسی طرح جاری رہے گی۔ اور یہ ٹھیک وہی چیز ہے، جس تک موجودہ زمانے میں پہنچے ہیں کہ تمام کرات آسمانی اور کہکشائیں ابتداء میں ایک ہی مرکز میں جمع تھیں (ایک خاص وزن کے ساتھ جو حد سے زیادہ بوجھل تھا) اس کے بعد ایک انتہائی وحشتناک اور عظیم انفجار واقع ہوا (یعنی یہ مرکز پھٹ پڑا) اور اس کے ساتھ ہی اس جہان کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو کر بکھر گئے۔ اور انہوں نے کروں کی صورت اختیار کر لی، اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔

لیکن زمین کی خلقت کے بارے میں "ماھدون" کی تعبیر ایک لطیف تعبیر ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ خدا نے انسانوں کی زندگی کے لیے تمام آرام و آسائش کے وسائل اور ذرائع کے ساتھ (ایک گہوارے کے طور پر) آمادہ اور تیار کیا ہے، کیونکہ "ماھد" "مھد" کے مادہ سے گہوارہ کے معنی میں ہے۔ یا ہر اس جگہ کے معنی میں ہے جسے راحت و آرام کے لیے آمادہ اور تیار کرتے ہیں اس قسم کی جگہ راحت و آرام مطمئن محفوظ اور گرم و نرم ہونی چاہیئے اور یہ تمام چیزیں کرہ زمین میں حاصل ہیں۔

فرمان الٰہی سے ایک طرف تو پتھر نرم اور مٹی میں تبدیل ہو گئے اور دوسری طرف سے پہاڑوں کی سختی اور زمین کی سخت جلد نے اسے مدد بزرگ کے دباؤ سے بچایا، اور تیسری طرف سے وہ قشر ہوائی جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، سورج کی روشنی کو حسب ضرورت پہنچنے دیتا ہے اور ایک عظیم لحاف کی طرح اس کو وسیع بستر پر ڈالتا ہے اور ان آسمانی پتھروں کے حملہ کے مقابلہ میں، جنہیں وہ تمرہ زمین میں داخل ہوتے ہی آگ لگا کر خاکستر کر دیتا ہے، ایک مضبوط اور قوی ڈھال بھی ہے۔

اور اس طرح انسان کی پذیرائی اور مہمانی کے لیے خدا کی طرف سے (جو اس کرہ خاکی میں خدا کا مہمان ہے) آرام و

---

[1] "آغاز و انجام جہان" صفحات ۴۰۰، ۴۰۱، تلخیص کے ساتھ۔

آسائش کے تمام اسباب فراہم ہوئے ہیں۔

آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بعد آسمان اور زمین کے مختلف موجودات اور انواع و اقسام کے نباتات و حیوانات کی نوبت آتی ہے اور اس سلسلے میں بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "ہم نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم غور کرو سمجھو" (ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون)۔

بہت سے مفسرین نے یہاں "زوج" کو مختلف اصناف کے معنی میں سمجھا ہے، اور اوپر والی آیت کو اس جہان کے موجودات کے مختلف اصناف کی طرف اشارہ لیا ہے۔ جو "زوج" "زوج" کی صورت میں آئے ہیں، مثلاً "رات اور دن" "نور اور ظلمت" "دریا اور صحرا" "سورج اور چاند" "نر اور مادہ" وغیرہ۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی مشابہ آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے اس قسم کی آیات میں ایک زیادہ دقیق معنی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر لفظ "زوج" نر و مادہ کی دو جنسوں کو کہتے ہیں چاہے وہ عالم حیوانات میں ہو یا عالم نباتات میں، اور اگر ہم اسے تھوڑی سی وسعت اور دیں، تو یہ معنی تمام مثبت و منفی قوی کو شامل ہو گا۔

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ قرآن اوپر والی آیت میں کہتا ہے: (من کل شیء) (تمام موجودات میں سے) نہ صرف موجودات زندہ، بلکہ ممکن ہے کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو، کہ مثبت و منفی ذرات سے بنی ہوئی تمام اشیاء عالم، اور آج کے علمی نکتہ نظر سے یہ بات مسلم ہے کہ "ایٹم" مختلف اجزاء سے مل کر بنے ہیں منجملہ ان کے وہ اجزاء جو منفی برقی بار کے حامل ہیں۔ اور انہیں "الکٹرون" کہا جاتا ہے اور وہ اجزاء جو مثبت برقی بار کے حامل ہوتے ہیں جو "پروٹون" کہلاتے ہیں۔

اس بنا پر "شیء" کی حتمی طور پر حیوان یا نبات کے معنی میں تفسیر کرنا لازمی اور ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی زوج کو جنس یا صنف کے معنی میں سمجھنا، (اس سلسلہ میں ہم دوسری توضیحات جلد ۵ تفسیر نمونہ سورۂ شعراء کی آیت ۷ کے ذیل میں اور دسویں جلد ص ۱۱۱ اور اٹھارہویں جلد ص ۳۵۱ میں بیان کر چکے ہیں) توجہ رکھنا چاہیے کہ اس کے باوجود دونوں تفاسیر قابل جمع ہیں۔

ضمنی طور پر "لعلکم تذکرون" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ تمام اشیاء جہان میں زوجیت و کثرت اور دوگانگی، انسان کو اس مطلب سے آگاہ کرتی ہے، کہ جہان کا خالق واحد و یگانہ ہے کیونکہ دوگانگی مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسی الرضاؑ سے بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے، جہاں آپؑ فرماتے ہیں:

"بمضادته بین الاشیاء عرف ان لا ضد له، بمقارنته بین الاشیاء عرف ان لا قرین له، ضاد النور بالظلمة والیبس بالبلل، والخشن باللین، والصرد بالحرور، مؤلفا بین متعادیاتها، مفرقا بین متدانیاتها، دالة بتفریقها علی مفرقها، و بتالیفها علی مؤلفها، و ذالك قوله "ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون"

"اس نے دنیا جہان کی چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد پیدا کیا ہے۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ اس کے لیے کوئی ضد نہیں ہے، اور انہیں ایک دوسرے کا قرین قرار دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کا کوئی قرین نہیں ہے، نور کو ظلمت کی ضد، خشکی کو تری کی ضد، سختی کو نرمی کی ضد اور سردی کو گرمی کی ضد قرار دیا، اس کے باوجود ان اشیاء کو جو ایک دوسرے کی ضد ہیں جمع کر دیا، تاکہ یہ جدائی جدا کرنے والے پر دلیل ہو اور یہ پیوستگی ملانے والے پر دلیل ہو، اور یہ ہے معنی (ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون)"[1]

بعد والی آیت میں گزشتہ توحیدی مباحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے مزید کہتا ہے، "اس بنا پر تم خدا کی طرف دوڑو کیونکہ میں اس کی طرف سے تمہارے لیے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں" (ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین)۔

یہاں "فرار" کی تعبیر ایک عمدہ اور لطیف تعبیر ہے۔ عام طور پر فرار ایسی جگہ کہا جاتا ہے جہاں انسان ایک طرف سے کسی موجود یا وحشتناک حادثہ سے روبرو ہو گیا ہو، اور دوسری طرف سے کسی جگہ کوئی پناہ گاہ رکھتا ہو، لہٰذا پوری تیزی کے ساتھ جائے حادثہ سے دور ہو جاتا ہے اور امن و امان کے نقطہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ تم بھی شرک و بت پرستی سے، جو ایک وحشتناک عقیدہ ہے گریز کرو، اور توحید خالص کی طرف جو واقعی امن و امان کا علاقہ ہے تیزی سے رخ کرو۔

عذاب خدا سے گریز کرو اس کی رحمت کی طرف جاؤ۔

اس کی نافرمانیوں اور عصیاں سے فرار کرو اور توبہ و انابہ سے توسل اختیار کرو۔

خلاصہ یہ کہ قباحتوں، برائیوں، بے ایمانی، جہالت کی تاریکی اور عذاب جاودانی سے بھاگو اور رحمت حق کی آغوش اور جاودانی سعادت میں داخل ہو جاؤ۔

❊ ❊ ❊

پھر مزید تاکید کے لیے وحدت پرستی کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار نہ دو، کہ میں تمہارے لیے اس کی طرف سے واضح ڈرانے والا ہوں" (ولا تجعلوا مع اللہ الٰھا آخر انی لکم منہ نذیر مبین)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ گزشتہ آیت اصل ایمان باللہ کی طرف دعوت کرتی ہو، اور یہ آیت اس کی ذات پاک کی یکانگت کی طرف دعوت ہو، لہٰذا "انی لکم منہ نذیر مبین" ایک موقع پر ایمان باللہ کے ترک کرنے پر ڈرانے کے عنوان سے ہو، اور دوسرے موقع پر شرک اور دوئی کے مقابلہ میں انذار ہو، تو اس طرح سے ہر ایک الگ

---

[1] "توحید صدوق" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۳۰۔

الگ مطلب کی طرف اشارہ ہو۔

بعض روایات میں جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں "خدا کی طرف فرار" سے مراد حج اور اس کے گھر کی زیارت ہے[1] یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے مراد، خدا کی طرف فرار کے ایک واضح مصادیق میں سے ہوتا ہے، کیونکہ حج انسان کو حقیقت توحید، اور توبہ و انابہ سے آشنا کرتا ہے، اور الطاف خداوندی کی پناہ میں جگہ دیتا ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے چند احادیث تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۳۰ و ۱۳۱ پر نقل ہوئی ہیں۔

۵۲۔ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۚ

۵۳۔ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۚ

۵۴۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۘ

۵۵۔ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۲۔ اسی طرح ہے کہ کوئی پیغمبر ان سے پہلے کسی قوم کی طرف نہیں بھیجا مگر یہ کہ انہوں نے کہا وہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔

۵۳۔ کیا وہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے تھے (کہ عموماً اس قسم کی تہمتیں لگائیں) نہیں! بلکہ وہ ایک سرکش اور طوفان اٹھانے والی قوم تھی۔

۵۴۔ اب جب کہ ایسا ہے تو ان سے منہ پھیر لے۔ اور تو ہرگز لائق ملامت نہیں ہے۔

۵۵۔ اور ہمیشہ نصیحت کرتا رہ کیونکہ نصیحت مؤمنین کے لیے فائدہ مند ہے۔

تفسیر

نصیحت کر کیونکہ نصیحت و تذکر فائدہ مند ہے

اسی سورہ کی آیت ۳۹ میں یہ آیا ہے کہ فرعون نے، موسیٰؑ کی طرف سے خداوند یکتا اور ظلم و بیدادگری کے ترک کرنے

کی دعوت کے مقابلہ میں، موسیٰ کو متہم کیا کہ وہ "ساحر" یا "مجنون" ہے، یہ نسبت مشرکین کی طرف سے پیغمبر اسلام کو بھی دی جاتی تھی، یہ بات ابتدائی دور کے تھوڑے سے مومنین کے لیے بہت گراں تھی، اور پیغمبر کی روح کو آزردہ کرتی تھی، زیر بحث آیات میں پیغمبر اور مومنین کی دلداری کے لیے کہتا ہے، : صرف تو ہی نہیں ہے جو ان زہر آلود تہمت کے تیروں کا ھدف قرار پایا ہے، : "اسی طرح ہے کہ ان سے پہلے کی کسی قوم کی طرف کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا، مگر یہ کہ انہوں نے کہا، وہ جادوگر یا دیوانہ ہے، (کذالک ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون)[1]

وہ انہیں اس لیے "ساحر" کہتے تھے، کیونکہ ان کے پاس ان کے عینی معجزات کا کوئی منطقی جواب نہیں تھا، اور "مجنون" کہہ کر اس لیے خطاب کرتے تھے کیونکہ وہ محیط اور ماحول کے ساتھ ہم رنگ نہیں تھے، اور مادی امتیازات کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے۔

اس بنا پر تم پریشان نہ ہو اور غم و اندوہ نہ کرو اور اپنی استقامت و پائیداری اور صبر و شکیبائی میں اضافہ کرو، کیونکہ اس قسم کی بے بنیاد باتیں اور نسبتیں ہمیشہ مردان حق کے مقابلہ میں کہی جاتی رہی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "کیا یہ کافر اور عناد رکھنے والی اقوام ایک دوسرے کو وصیت کیا کرتی تھیں" کہ تمام انبیاء پر یہ تہمتیں لگائیں؟ (اتواصوا بہ)۔

اس طرح سے ہم آہنگی کے ساتھ اور ایک ہی طرز پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے ماوراء تاریخ میں کوئی مجلس تشکیل دی ہو، اور مشورہ کے لیے بیٹھے ہوں، اور ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرتے رہے ہوں، کہ انبیاء کو عموماً سحر و جنوں کے ساتھ متہم کرتے رہنا، تاکہ عوام میں ان کے اعتبار کا نفوذ کم ہو جائے۔

اور شاید ان میں سے ہر ایک جب اس دنیا سے جانا چاہتا تھا، تو اپنی اولاد اور دوستوں سے یہ بات کہتے تھے اور وصیت کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، : "بلکہ وہ ایک سرکش اور طوفان اٹھانے والی قوم ہے" (بل ھم قوم طاغون)[2]۔

یہ سرکشی اور شر انگیزی کا ہی اثر ہے کہ مردان حق کو میدان سے نکالنے کے لیے ہر قسم کے جھوٹ اور تہمت سے متوسل ہوتے تھے، اور چونکہ انبیاء معجزات اور نئے احکام کے ساتھ قوموں کے درمیان آتے تھے، تو وہ ان کے لیے بہترین لیبل یہ سمجھتے تھے کہ انہیں "جادو اور جنون" سے متہم کریں۔ اس بنا بران کے "وحدت عمل" کا عامل سرکشی و شر انگیزی کی وہی مشترکہ روح تھی۔

پھر دوبارہ تسلی خاطر اور زیادہ سے زیادہ دلداری کے لیے پیغمبر سے فرماتا ہے، : "اب جب کہ یہ طاغی و سرکش قوم حق بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ان سے منہ پھیر لے" (فتول عنھم)۔

---

[1] "کذالک" ایک محذوف مبتدا کی خبر ہے، اور تقدیر میں (الامر کذالک) (معاملہ یوں ہی ہے) ہے۔

[2] اوپر والی آیت میں "بل" اضرابیہ ہے۔

اور تو مطمئن رہ کہ تو نے اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کو کامل طور سے انجام دے دیا ہے، اور تو "ہرگز سرزنش اور ملامت کے لائق نہیں ہے" (فما انت بملوم)۔

اگر وہ حق کو قبول نہ کریں تو غم نہ کھاؤ، کیونکہ شائستہ اور صلاحیت رکھنے والے دل اس کو قبول کرلیں گے۔

یہ جملہ حقیقت میں دوسری آیات کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اس قدر دلسوز تھے، کہ بعض اوقات ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا ہو جائیں، جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۶ میں آیا ہے:

فلعلك باخع نفسك على آثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث اسفًا

"گویا تو چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے اعمال پر غم واندوہ کی بنا پر ہلاک کر دے، کیونکہ وہ اس قرآن پر ایمان نہیں لائے ہیں"۔

یقیناً ایک سچے رہبر کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبرؐ اور مؤمنین اندوہگین ہوئے اور خیال کیا کہ مشرکین کے مقابلہ میں یہ آخری بات ہے، اور وحی آسمانی قطع ہوگئی ہے، اور جلدی ہی عذاب الٰہی نازل ہوگا، لیکن زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ بعد والی آیت نازل ہوئی۔ اور پیغمبرؐ کو حکم دیا: "تم ہمیشہ پند ونصیحت کرتے رہو، کیونکہ پند ونصیحت سے مومنین کو فائدہ پہنچتا ہے" (وذكر فان الذكرى تنفع المؤمنين)۔

یہ وہ منزل تھی کہ سب نے اطمینان وسکون کا سانس لیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آمادہ وتیار دل گوشہ وکنار میں تیری باتوں کے انتظار میں ہیں، اگر ایک گروہ حق کے مقابلہ میں مخالفت کے لیے کھڑا ہے تو دوسرا گروہ دل وجان سے اس کا مشتاق ہے اور تیری دل نشین گفتگو ان کے نفوس میں اپنی تاثیر چھوڑتی ہے۔

ایک نکتہ

حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دلوں کی ضرورت ہے

کسی کسان کو نظر میں رکھو جو بیج بکھیرنے میں مشغول ہے، ممکن ہے وہ ان بیجوں کے ایک حصہ کو پتھر پر ڈال دے یقینی طور پر وہ کبھی بھی بار آور نہیں ہوگا۔

دوسرے حصہ کو مٹی کی ان باریک تہوں پر گراتا ہے جنہوں نے سخت پتھروں کو ڈھانپ رکھا ہے، یہاں بیج کونپل تو نکالے گا۔ لیکن چونکہ اس کی جڑوں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے تو وہ بہت جلد خشک ہو جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔

ایک دوسرے حصہ کو ایسی مٹی کے اوپر ڈالتا ہے جو زیادہ گہری ہے، لیکن اس بیج کے درمیان مٹی میں فضول قسم کی گھاس بھی رکاوٹ کرنے والی موجود ہے، تو یہ بیج نمو بھی کرے گا، جڑیں بھی پکڑے گا، لیکن بہت جلد کانٹے

اور فضول گھاس اس سے لپٹ جائیں گے اور اس کا گلا دبا دیں گے۔

ان تمام بیجوں میں سے زیادہ خوش نصیب بیج وہ ہے جو گہری مٹی کے درمیان بغیر کسی مزاحمت و رکاوٹ کے قرار پائے۔ کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ کونپل نکالتا ہے شاخیں اور پتے نکالتا ہے اور تناور ہو کر پھلتا پھولتا ہے۔

وہ حق کی باتیں جو انبیاء اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور ان کے معصوم جانشینوں کے دہن مبارک سے نکلتی ہیں انہیں بیجوں کی طرح ہیں، وہ دل جو سخت پتھر کے مانند ہے وہ انہیں ہرگز قبول نہیں کرتے، اور وہ دل جن میں کمزور سی اور تھوڑی سی بھی نرمی ہے وہ وقتی طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں اس کے بعد اسے باہر نکال پھینکتے ہیں، اور وہ دل جو قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار تو ہیں، لیکن ہوا و ہوس اور صفات رذیلہ اور شہوات کے کانٹے ان میں اُگے ہوئے ہیں، وہ ان کے اثر کو ختم کر دیتے ہیں۔

صرف وہی دل ان عظیم پیشواؤں کی باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ اور ان کی پرورش کر کے انہیں بارور کرتے ہیں، جو حق جوئی اور حق طلبی کی روح کے حامل ہیں اور وہ ان صفات سے بھی خالی ہیں۔ اور وہ مؤمنین کے دل ہیں، ہاں! (و ذکر فان الذکری تنفع المؤمنین)۔ پند و نصیحت کرتے رہو کیونکہ یہ مومنین کو فائدہ دیتی ہے۔

۵۶۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ○
۵۷۔ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ○
۵۸۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ○

ترجمہ

۵۶۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں (اور اس طرح سے تکامل وارتقاء حاصل کریں اور مجھ سے نزدیک ہوں)۔
۵۷۔ میں ہرگز ان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے روزی دیں، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔
۵۸۔ خدا ہی روزی دینے والا اور صاحبِ قوت وقدرت ہے۔

تفسیر

قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت کا مقصد

اہم ترین سوالات میں سے وہ سوال جو ہر شخص اپنے آپ سے کرتا ہے یہ ہے کہ: "ہم کس لیے پیدا کیے گئے ہیں" اور انسان کی خلقت اور اس جہان میں آنے کا مقصد کیا ہے؟

اوپر والی آیات، اس اہم اور ہمیشہ کے سوال کا مختصر اور پر معنی تعبیروں کے ساتھ جواب دے رہی ہیں، اور اس بحث کی، جو گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں قیامت کی یاد آوری کے سلسلہ میں بیان ہوئی تھی، تکمیل کر رہی ہیں، کیونکہ یہ ایک اہم ترین اصول ہے کہ جس کی پیغمبر کو پیروی کرنی چاہیئے، معنی طور پر خدا کی طرف فرار کا مطلب بھی جو گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا واضح ہو جاتا ہے۔

فرماتا ہے: "میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں": (وما خلقت الجن

والانس الا لیعبدون)۔

میری ان سے کوئی حاجت نہیں ہے: "اور میں ہرگز ان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں" (ما ارید منھم من رزق و ما ارید ان یطعمون)۔

"خدا ہی ہے جو کل بندوں کو روزی دیتا ہے اور وہ صاحب قدرت و قوت ہے" (ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین)۔

یہ چند آیات جو انتہائی مختصر اور جامع ہیں، اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہیں، کہ جس سے آگاہی کے تمام خواہاں ہیں، اور ہمیں ایک عظیم مقصد سے روشناس کرا رہی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: بلاشک و شبہ ہر دانش مند اور عاقل جو کام بھی انجام دیتا ہے، کوئی نہ کوئی مقصد اس کے پیش نظر ہوتا ہے، اور چونکہ خدا ہر ایک سے زیادہ عالم اور حکیم ہے، بلکہ کسی شخص کے ساتھ اس کا قیاس کیا ہی نہیں جا سکتا، یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ کیا کوئی کمی تھی جو انسان کی خلقت سے پوری ہو جاتی؟

یا اسے کوئی حاجت اور ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے اس نے ہمیں پیدا کیا ہے؟

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا وجود ہر جہت سے کامل اور انتہائی لامتناہی ہے اور وہ غنی بالذات ہے۔

پس پہلے مقدمہ کے مطابق تو ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا، اور دوسرے مقدمہ کے مطابق ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ انسان کی پیدائش سے اس کا کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جو اس کی پاک ذات کے لیے ہو۔

نتیجتاً اس مقصد کو اسکی ذات سے باہر تلاش کرنا پڑے گا۔ ایسا مقصد جو خود مخلوقات کی طرف لوٹتا ہے اور انہیں کے کمال کا سبب ہے۔

اور دوسری طرف قرآن کی آیات میں انسان کی پیدائش کے مقصد کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی گئی ہیں۔

ایک جگہ بیان ہوا ہے: الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً "وہی ہے کہ جس نے موت اور زندگی کو خلق کیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے"۔ (ملک۔ ۲) یہاں انسانوں کی آزمائش اور امتحان کا مسئلہ "حسن عمل" کے لحاظ سے ایک ہدف اور مقصد کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں آیا ہے: اللہ الذی خلق سبع سماوات و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیء قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیء علماً: "خدا وہ ہے جس نے سات آسمان اور اتنی ہی زمینیں خلق فرمائی ہیں اس کا فرمان ان کے درمیان نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اور اس کا علم تمام موجودات پر احاطہ رکھتا ہے"۔ (طلاق۔ ۱۲)۔

یہاں "خدا کی قدرت اور علم سے علم و آگاہی" آسمانوں اور زمین (اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) کی خلقت کے لیے ایک ہدف اور مقصد کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں۔

ایک دوسری آیت میں بیان ہوا ہے: ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك و لذالك خلقهم: "اگر تیرا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو (بغیر کسی اختلاف کے) امت واحدہ قرار دے دیتا، لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، سوائے ان کے جن پر تیرا پروردگار رحم کرے، اور اسی "رحمت" کے لیے انہیں پیدا کیا ہے۔" (ھود - ۱۱۸ و ۱۱۹)۔

اس آیت کے مطابق رحمت الٰہی انسان کی خلقت کا اصلی ہدف ہے،

لیکن زیر بحث آیات صرف عبودیت اور بندگی کے مسئلہ پر تکیہ کرتی ہیں، اور پوری صراحت کے ساتھ اس کو جن وانس کی خلقت کے اصلی ھدف اور مقصد کے عنوان سے تعارف کراتی ہیں۔

ان آیات اور ان سے مشابہ آیات میں تھوڑا سا تامل اور غور وفکر یہ نشاندہی کر دیتا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ فی الحقیقت ان میں سے بعض ھدف اور مقصد تو مقدمہ کے طور پر بیان ہوئے ہیں بعض وسطی اور بعض آخری، اور بعض ان کا نتیجہ ہیں۔

اصلی ھدف وہی "عبودیت" ہے، جس کی طرف زیر بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور مسئلہ "علم ودانش" اور "امتحان وآزمائش" ایسے اھداف ومقاصد ہیں جو عبودیت کی منزلیں طے کرتے ہوئے راستہ میں آتے ہیں۔ اور رحمتِ خداوندی اس عبودیت کا نتیجہ ہے۔

اس طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم سب پروردگار کی عبادت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ "عبادت" کی حقیقت کیا ہے؟

کیا صرف رکوع وسجود، قیام وقعود اور نماز وروزہ جیسے مراسم کا انجام دینا مراد ہے، یا ان کے علاوہ کوئی اور حقیقت ہے؟ اگرچہ رسمی عبادات بھی سب کی سب اہمیت کی حامل ہیں۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے "عبد" وعبودیت" کے الفاظ پر غور کرنا ہوگا، اور ان کی تحلیل وتجزیہ کرنا پڑے گا۔

"عبد" لغت کے لحاظ سے اس انسان کو کہتے ہیں جو سرتاپا اپنے مولا اور آقا ومالک سے تعلق رکھتا ہے، اس کا ارادہ اس کے ارادہ کے تابع، اور اس کی خواہش اس کی خواہش اور مرضی کے تابع ہے یہ اس کے مقابلہ میں کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی کوتاہی اور سستی نہیں کرتا۔

دوسرے لفظوں میں "عبودیت" جیسا کہ متون لغت میں آیا ہے۔ معبود کے سامنے آخری درجہ کے خضوع کا اظہار ہے اور اسی بنا پر صرف وہی ذات معبود ہو سکتی ہے جس نے انتہائی انعام واکرام کیا ہو، اور وہ خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے،

اس بنا پر "عبودیت"، ایک انسان کے ارتقاء وتکامل کی انتہائی معراج اور خدا سے اس کا قرب ہے۔

"عبودیت اس کی ذات پاک کے آگے انتہائی تسلیم ہے، عبودیت، بلا قید وشرط اطاعت اور تمام مراحل میں فرمانبرداری کرنا ہے۔"

اور آخر میں عبودیت کامل یہ ہے کہ انسان سوائے معبود حقیقی یعنی کمال مطلق کے کسی کا بھی تصور اور خیال نہ کرے، اس کی راہ کے علاوہ اور کسی راہ پر قدم نہ اٹھائے، اس کے سوا ہر چیز کو بھول جائے، یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو بھی۔

اور خلقتِ بشر کا ہدف اصلی یہی ہے، جس تک پہنچنے کے لیے خدا نے آزمائش کا میدان فراہم کیا ہے، اور انسان کو علم و آگاہی عطا فرمائی ہے۔ اور اس کا اصلی اور واقعی و حقیقی نتیجہ بھی اس کی "رحمت" کے سمندر میں خود کو سونا ہے۔

چند نکات

۱۔ خدا غنی مطلق ہے

"ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون" کا جملہ حقیقت میں پروردگار کی ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیازی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اگر اس نے اپنے بندوں کو اپنی عبودیت کی دعوت دی ہے۔ تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے، بلکہ وہ تو انسانوں کے درمیان مسئلہ عبودیت کے برعکس، یہ چاہتا ہے کہ ان پر "سخاوت اور بخشش" کرے، کیونکہ لوگ غلاموں کو اس لیے انتخاب کرتے تھے تاکہ وہ ان کے لیے آمدنی کے حصول اور رزق و روزی کے لیے کام کریں، یا گھر کا کام کاج کریں، اور کھلانا کھلانے اور پذیرائی کرنے میں مشغول رہیں، اور دونوں حالتوں میں اس کا فائدہ مالکوں کو ہی ہوتا ہے، اور یہ چیز انسان کی نیاز اور احتیاج سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں خدا کے بارے میں بے معنی ہیں، کیونکہ نہ صرف یہ کہ وہ سب سے بے نیاز ہے، بلکہ سب کی نیاز اور حاجت کو اپنے لطف و کرم سے پورا کرتا ہے، اور سب کا رزاق وہی ہے

۲۔ وہ صاحب "قوت" اور "متین" ہے۔

"متین" "تن" کے مادہ سے اصل میں اس قوی پٹھے کے معنی میں ہے، جو پیٹھ کے مہروں کے ستون کے دونوں طرف ہوتا ہے۔ اور انسان کی پشت کو مضبوط بناتا ہے، اور اسے بھاری دباؤ کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے، اور اسی مناسبت سے کامل قدرت و قوت کے معنی میں آیا ہے، اس بنا پر "ذوالقوہ" کے لفظ کے بعد اس کا بیان تاکید کے عنوان سے ہے، کیونکہ "ذوالقوہ" پروردگار کی اصل قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور "متین" اس کے کمال قدرت کی طرف، اور جس وقت وہ "رزاق" کے لفظ کے ہمراہ ہو کہ وہ بھی ایک مبالغہ کا صیغہ ہے تو اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ خدا بندوں کو روزی دینے کے سلسلے میں انتہائی قدرت و طاقت اور تسلط رکھتا ہے، چاہے وہ اس وسیع جہان کے جس کونے میں ہوں۔ سمندروں کی گہرائیوں میں ہوں، دروں کے درمیان ہوں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہوں، پتھروں کے اندر ہوں، اور آسمانی کروں کے جس مقام میں ہوں، ان کی ضرورت کے مطابق روزی انہیں پہنچاتا ہے۔ اور سب کے سب اسی کے خوان احسان پر جمع ہیں پس اگر انہیں پیدا کیا ہے تو کسی ضرورت و حاجت کی بنا پر نہیں، بلکہ ایک لطف خاص اور فیض پہنچانے کی بنا پر۔

۳۔ جنوں کا ذکر پہلے کیوں؟

باوجود اس کے کہ قرآنی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان گروہ جن سے افضل و برتر ہیں، لیکن اس کے باوجود اوپر والی آیت میں ان کا نام مقدم رکھا ہے۔ ظاہراً یہ اس بنا پر ہے کہ ان کی خلقت انسان کی خلقت سے پہلے ہوئی تھی،

جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۲۷ میں بیان ہوا ہے، : والجانّ خلقناہ من قبل من نار السموم ؛ اور ہم نے جنوں کو پہلے (انسان کی خلقت سے پہلے) جلانے والی آگ سے پیدا کیا تھا"

۴۔ فلسفہ کی نظر سے خلقت کا فلسفہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے یہ سوال اپنے آپ سے یا دوسروں سے نہ کیا ہوگا، کہ ہماری خلقت کا ہدف اور مقصد کیا ہے؟ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں، کچھ اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں، اس آمد و رفت کا مقصد کیا ہے؟

واقعاً اگر ہم انسان اس کرۂ خاکی پر زندگی نہ گذارتے، تو اس عالم میں کون سی خرابی آجاتی؟ اور کیا مشکل پڑ جاتی؟ کیا ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہم کیوں آئے ہیں، اور کیوں چلے جاتے ہیں؟ اور اگر ہم اس چیز سے آگاہ ہونا چاہیں تو کیا ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں، اور اس سوال کے پیچھے بہت سے دوسرے سوالات فکر انسانی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

یہ سوال اگر مادہ پرستوں کی طرف سے پیش ہو تو ظاہراً اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ مادہ اور طبیعت اصلاً کوئی عقل و شعور نہیں رکھتے، کہ ان کا کوئی ہدف ہو۔ اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے آپ کو اس لحاظ سے آسودہ کر لیا ہے، اور انہوں نے یہ عقیدہ اپنا لیا ہے کہ خلقت بے مقصد اور فضول ہے! اور کتنی قابل مذمت اور تکلیف دہ بات ہے یہ کہ انسان اپنی زندگی کے جزئیات کے لیے چاہے وہ تحصیل علم ہو یا کسب کار کے لیے یا بیماری و صحت ہو یا ورزش کے لیے، تو دقیق مقاصد اہداف اور منظم پروگرام نظر میں رکھتا ہے۔ لیکن مجموعہ زندگی کو فضول، بے ہدف اور بے مقصد سمجھتا ہے؟

اس کے لیے تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ ان میں سے ایک گروہ جب ان مسائل میں غور و فکر کرتا ہے تو اس فضول اور بے مقصد زندگی سے سیر ہو جاتا ہے، اور خودکشی پر تیار ہو جاتا ہے۔

لیکن یہی سوال جب ایک خدا پرست اپنے آپ سے کرتا ہے تو وہ کسی قسم کی الجھن اور تنگی سے دوچار نہیں ہوتا، کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ جانتا ہے کہ اس جہان کا خالق حکیم ہے، حتمی و یقینی طور پر اس کی خلقت میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے، چاہے ہم اس حکمت سے بے خبر ہوں، اور دوسری طرف اپنے اعضاء کے ایک ایک جز پر نظر ڈالتا ہے، تو اسے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد اور فلسفہ نظر آتا ہے، نہ صرف دل و دماغ اور عروق و اعصاب جیسے اعضاء کے لیے، بلکہ ناخنوں، پلکوں، انگلیوں کی لکیروں، ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلوے کے نشیب میں سے ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی فلسفہ ہے، جو موجودہ زمانے میں سب کے سب معلوم کر لیے گئے ہیں۔

کس قدر کوتاہ فہمی کی بات ہے کہ ہم ان سب کے لیے تو ہدف اور مقصد کے قائل ہوں، لیکن مجموعی زندگی کو بے مقصد سمجھیں۔

یہ کیسی سادہ لوحی کا فیصلہ ہے کہ ہم شہر کی ہر ہر منزل و مکان کے لیے تو فلسفہ کے قائل ہوں، لیکن مجموعہ شہر کے لیے کسی فلسفہ کے قائل نہ ہوں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انجینئر ایک عظیم عمارت تعمیر کرے، اور کمرے، صحن، کھڑکیاں، دروازے، حوض، باغیچے اور آرائشیں

تو ہر ایک حساب و کتاب اور خاص مقصد کے لیے بنائے، لیکن اس نے اس عظیم عمارت کے مجموعہ کو بغیر کسی مقصد کے بنا دیا ہو۔

یہی باتیں ہیں جو ایک خدا پرست مومن انسان کو اطمینان دلاتی ہیں، کہ اس کی خلقت ایک ہی عظیم مقصد رکھتی ہے، لہٰذا اس کو کوشش کرنی چاہیئے، اور عقل و علم کی قوت سے اسے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہیئے۔

تعجب کی بات ہے کہ یہ خلقت کو فضول جاننے والے، اور اس کے بے مقصد ہونے کے طرفدار، علوم طبیعی کے جس سلسلہ میں بھی داخل ہوتے ہیں، تو مختلف انکشافات کی تفسیر کے لیے، کسی نہ کسی مقصد اور ھدف کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، اور جب تک اس کا ھدف اور مقصد دریافت نہ کرلیں چین سے نہیں بیٹھتے، یہاں تک کہ وہ ایک چھوٹی سی طبیعی گلٹی (غدود) کو، جو بدن کے کسی کونہ میں واقع ہوتی ہے، بیکار سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور ممکن ہے کہ اس کے وجود کا فلسفہ معلوم کرنے کے لیے سالہا سال مطالعہ اور آزمائش کرتے رہیں۔ لیکن جب وہ انسان کی اصل آفرینش و خلقت پر پہنچتے ہیں تو صراحت کے ساتھ کہتے ہیں، کہ اس کا کوئی ھدف اور مقصد نہیں ہے۔

کتنا حیرت انگیز اور تعجب خیز تناقض ہے؟

بہرحال ایک طرف خدا کی حکمت پر ایمان، اور دوسری طرف انسان کے وجود کے اعضاء کا معنی خیز ہونا، اس بات پر ہمارا ایمان پختہ کر دیتا ہے، کہ انسان کی آفرینش و خلقت میں ایک عظیم مقصد ہے۔

اب ہمیں اس ھدف اور مقصد کو تلاش کرنا چاہیئے اور حتی المقدور اسے معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے، اور اس راہ میں قدم اٹھانا چاہیئے۔

چند مقدمات کی طرف توجہ ایسے چراغ اور روشنی ڈالنے والی چیزیں مہیا کرسکتی ہے جو اس تاریک راستہ کو ہمارے لیے روشن کردے گی۔

(۱) ہم اپنے کاموں میں کوئی نہ کوئی ھدف رکھتے ہیں، اور یہ ھدف عام طور پر ہماری کسی کمی یا حاجتوں کو دفع کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر ہم کسی دوسرے کی خدمت کرتے ہیں، یا کسی مصیبت میں گرفتار شخص کی دست گیری کرتے ہیں، اور اسے مصیبت سے نجات دلاتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی ایثار و قربانی بھی کرتے ہیں تو یہ بھی ہماری کسی معنوی کمی کو دُور کرتا ہے اور ہماری مقدس حاجات و ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

اور چونکہ ہم صفات و افعال خدا کے بارے میں اکثر اپنے پر قیاس کرنے اور موازنہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کبھی یہ تصور کرلیا جائے کہ خدا میں وہ کونسی کمی تھی جو ہماری خلقت سے دور ہوتی تھی؟ اور یا اگر ہم اوپر والی آیات میں یہ پڑھتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا ھدف عبادت ہے، تو ہم کہتے ہیں، اسے ہماری عبادت کی کیا حاجت اور ضرورت ہے۔

حالانکہ یہ طرز فکر خالق و مخلوق اور واجب و ممکن کی صفات میں قیاس اور موازنہ کی پیداوار ہے۔

اس بنا پر کہ ہمارا وجود محدود ہے ہم اپنی کمیوں اور نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارے سب اعمال اسی سلسلہ میں ہوتے ہیں، لیکن ایک غیر محدود موجود کے بارے میں یہ معنی امکان پذیر نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے افعال کے

ھدف کو ہمیں اس کے وجود کے علاوہ دوسرے موجودات میں تلاش کرنا چاہیئے۔

وہ تو ایک فیض بخش چشمہ ہے۔ اور ایک نعمت آفرین مبدء ہے، جو موجودات کو اپنی حمایت کے سائے میں لے لیتا ہے اور ان کی پرورش کر کے نقص سے کمال کی طرف لے جاتا ہے، اور ہماری عبودیت و بندگی کا حقیقی و واقعی ھدف یہی ہے، اور ہماری عبادات اور بندگیوں کا فلسفہ بھی یہی ہے، جو سب کی سب ہمارے تکامل و ارتقاء کے درجات ہیں۔

اس طرح ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری آفرینش و خلقت کا ھدف و مقصد ہماری ہستی کی پیش رفت اور تکامل و ارتقاء ہے۔

بنیادی طور پر اصل آفرینش و خلقت ہی تکامل کی طرف ایک عظیم قدم ہے۔ یعنی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اور نیست سے ہست کرنا اور صفر سے عدد کے مرحلہ میں لانا۔

اس عظیم تکاملی قدم کے بعد تکامل و ارتقاء کے دوسرے مراحل شروع ہوتے ہیں، اور تمام دینی اور خدائی پروگرام اسی طریقہ سے وقوع میں آتے ہیں۔

(۲) یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ کہ اگر خلقت کا ھدف و مقصد بندوں پر سخاوت و بخشش کرنا ہے۔ اور اس میں پیدا کرنے والے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہ سخاوت انسانوں کے ارتقاء کے طریقہ سے ہے، تو پھر اس جواد و کریم خدا نے ابتدا سے ہی بندوں کو کامل پیدا کیوں نہ کیا؟ تاکہ سب ہی اس کے جوار قرب میں جگہ حاصل کرتے، اور اس کی پاک ذات کی قربت کے برکات سے بہرہ ور ہوتے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ انسان کا تکامل و ارتقاء کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کو "جبر" کے ساتھ پیدا کیا جا سکے۔ بلکہ ایک ایسا طولانی اور دور و دراز راستہ ہے جسے انسانوں کو خود اپنے پاؤں سے چل کر ہی طے کرنا چاہیئے، اور تصمیم و ارادہ اور اختیاری افعال کے ساتھ اس کی بنیاد ڈالنی چاہیئے۔

اگر کسی شخص سے ایک ہسپتال بنانے کے لیے بہت زیادہ رقم، زبردستی، جبری طور سے، نوک نیزہ کے زور پر، وصول کر لی جائے۔ تو کیا اس کے لیے اس عمل کا کوئی اثر اخلاقی و روحانی ارتقاء پر مرتب ہوگا؟ یقیناً نہیں، لیکن اگر وہ اپنے ارادہ اور خوشی سے ایک آنہ یا دس پیسے کے ساتھ بھی اس مقدس ھدف اور مقصد کے لیے مدد کرے تو اس نے اسی نسبت سے اخلاقی کمال کی راہ طے کر لی ہے۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ خدا کے لیے لازم ہے کہ وہ اوامر و نواہی اور تربیتی پروگراموں کے ساتھ، جو قوت عقل کے وسیلہ سے اور اس کے پیغمبروں کے ذریعہ پہنچائے جاتے ہیں —— اس راہ کو ہمارے لیے واضح و روشن کر دے۔ اور ہم اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ اس راستے کو طے کریں۔

(۳) پھر یہاں ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ جس وقت بعض لوگ اوپر والی توضیحات کو سنتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں: بہت خوب، مانا کہ خلقت کا ھدف اور مقصد تو تکامل انسانی ہے، یا دوسرے لفظوں میں پروردگار کا قرب، اور ایک ناقص وجود کی ایک لامتناہی کامل وجود کی طرف حرکت ہے، لیکن اس تکامل و ارتقاء کا بذاتِ خود ھدف کیا ہے؟

اس سوال کا جواب بھی اس جملہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ تکامل و ارتقاء ہی اصلی ھدف اور آخری مقصد ہے، یا دوسرے

لفظوں میں " غایۃ الغایات " ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ : اگر ہم کسی طالب علم سے یہ سوال کریں کہ تم سبق کیوں پڑھتے ہو ؟ تو وہ کہے گا ، تاکہ میں یونیورسٹی تک پہنچ سکوں۔

اگر ہم پھر سوال کریں کہ تم یونیورسٹی کیوں جانا چاہتے ہو ؟ ؛ تو وہ جواب دے گا : اس لیے کہ مثلاً ڈاکٹر یا ایک لائق انجینئر بنوں۔

ہم اس سے پھر پوچھتے ہیں کہ تم ڈاکٹری اور انجینئری کا علم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو ؟ تو وہ جواب دے گا : اس لیے کہ کچھ اچھے کام سرانجام دوں اور اچھی آمدنی پیدا کروں۔

ہم پھر کہتے ہیں : تم اچھی آمدنی کس لیے چاہتے ہو ؟ تو وہ جواب دے گا : اس لیے کہ آبرومندانہ اور خوشحال زندگی بسر کرسکوں۔

آخر میں ہم پوچھتے ہیں کہ تم خوشحال اور آبرومندانہ زندگی کس لیے چاہتے ہو ؟

اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گفتگو کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے ، اور کہتا ہے : بس میں چاہتا ہوں کہ خوشحال اور آبرومندانہ زندگی بسر کروں ، یعنی پھر اسی پہلے جواب کو دہرا دیتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آخری جواب ، اور اصطلاح کے مطابق " غایۃ الغایات " تک پہنچ گیا ہے جس کے بعد کوئی اور جواب نہیں ہے۔ اور وہی اس کا آخری ھدف اور مقصد ہے ، یہ بات تو مادی زندگی کے مسائل میں سے ہے ، معنوی زندگی میں بھی مطلب اسی طرح کا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کا آنا ، آسمانی کتابوں کا نازل ہونا ، اور اوامر و نواہی کی ذمہ داریاں اور سارے تربیتی پروگرام کس لیے ہیں ؟ تو ہم کہتے ہیں : انسانی تکامل و ارتقاء اور قرب خدا کے لیے۔

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ تکامل و ارتقاء اور قرب پروردگار کس مقصد کے لیے ہے ، تو ہم جواب دیں گے کہ قرب پروردگار کے لیے : یعنی یہ اصلی اور آخری مقصد ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں ہم ہر چیز تو تکامل اور قرب خدا کے لیے چاہتے ہیں ، لیکن قرب خدا کو خود اسی کے لیے چاہتے ہیں (یعنی قرب پروردگار کے لیے)

(۴) یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے ، خداوند فرماتا ہے : کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف و خلقت الخلق لکی اعرف " میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں ، تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا ، تاکہ میں پہچانا جاؤں "

تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے یہ حدیث کیا مناسبت رکھتی ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں : قطع نظر اس سے کہ یہ حدیث ایک خبر واحد ہے ، اور اعتقادی مسائل میں خبر واحد کام نہیں دیتی ، حدیث کا مفہوم یہ ہے ، مخلوق کے لیے خدا کی پہچان ان کے تکامل کا ذریعہ ہے ، یعنی میں نے یہ چاہا کہ میری رحمت کا فیض ہر جگہ کو گھیر لے ، پس اسی بنا پر میں نے مخلوق کو پیدا کیا ، اور ان کی سیر کمالی کے لیے اپنی معرفت کے راہ و رسم اسے سکھائے ، کیونکہ میری معرفت و شناخت ہی ان کے تکامل کی رمز ہے۔

ہاں ! بندوں کو چاہیے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو۔ جو تمام کمالات کا منبع ہے ـــــ پہچانیں، اپنے آپ کو اس کے کمالات کے مطابق ڈھالیں، اور اس کا سایہ اپنے وجود پر ڈالیں (اس کے رنگ میں خود فروزاں کو رنگ لیں) تاکہ ان صفات کمال و جمال کا نوران کے وجود میں ہو، کیونکہ تکامل وارتقا اور قرب خدا، اس کے اخلاق کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے، اور اس کے اخلاق کو اپنانا اس کی معرفت وشناخت کی فرع ہے، (غور کیجئے)

(۵) جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم آخری نتیجہ سے قریب ہوتے جارہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت اور عبودیت یعنی اس کی مشیت کی راہ میں قدم اٹھانا، اور روح اور جان کو اس کے سپرد کر دینا، اور اس کے عشق کو اپنے دل میں جگہ دینا، اور اپنے آپ کو اس کے اخلاق سے آراستہ کرنا۔

اور اگر اوپر والی آیات میں عبادت کو خلقت کا آخری ھدف اور مقصد بیان کیا گیا ہے۔ تو اس کا مفہوم یہی ہے۔ کہ اس کو دوسرے لفظوں میں "تکامل انسانی" کے عنوان سے یاد کیا جائے۔

ہاں ! انسان کامل ہی خدا کا سچا بندہ ہے۔

۵۔ انسان کی خلقت کے فلسفہ کے سلسلہ میں اسلامی روایات پر ایک نظر

ہم نے اوپر دو طریقوں سے انسان کی خلقت کے ھدف کا تعاقب کیا ہے۔ ایک آیات قرآنی کی تفسیر کے طریقہ سے اور دوسرے فلسفہ کے طریقہ سے اور دونوں نے ہمیں ایک ہی نقطہ تک پہنچایا ہے۔

اب تیسری راہ سے، یعنی اسلامی روایات کے طریقہ سے، اس نصیب ساز مسئلہ کو بیان کرنے کی باری ہے۔

ذیل کی روایات میں غور وفکر جوان روایات کا حصہ ہے۔ اس مسئلہ میں ایک زیادہ عمیق اور گہری بصیرت عطا کرتا ہے

ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفرؑ سے آیا ہے کہ آنحضرت سے لوگوں نے سوال کیا کہ پیغمبر کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے:

اعملوا فکل میسر لما خلق له

"جہاں تک ہو سکے عمل کرو کیونکہ تمام انسان جس مقصد کے لیے خلق کیے گئے ہیں اس کے لیے آمادگی رکھتے ہیں؟

امامؑ نے فرمایا:

ان الله عز وجل خلق الجن والانس لیعبدو ه ولم یخلقهم لیعصوه و ذالك قوله عز وجل وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون فیسر کلا لما خلق له، فویل لمن استحب العمی علی الهدی

"خداوند تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت اور اطاعت کریں، اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ اس کی نافرمانی کریں، اور یہ وہی چیز ہے کہ جو فرماتا ہے: "وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون"، اور چونکہ انہیں اطاعت کے لیے پیدا

کیا ہے، لہٰذا اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ان کے لیے راستہ کو آسان اور ہموار کر دیا ہے پس وائے ہے اس شخص کے لیے جو آنکھ بند کر کے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دے۔"[1]

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف ایک پر معنی اشارہ ہے کہ چونکہ خدا نے انسانوں کو تکامل و ارتقاء کے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، لہٰذا اس نے تکوین و تشریع کے لحاظ سے اس کے وسائل و ذرائع فراہم کئے ہیں اور اس کے اختیار میں دے دیئے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ امام حسینؑ اپنے اصحاب کے سامنے آئے اور اس طرح فرمایا:

ان اللہ عز وجل ما خلق العباد الا لیعرفوہ، فاذا عرفوہ عبدوہ ،
فاذا عبدوہ استغنوا بعبادتہ عن عبادۃ من سواہ۔

"خدائے عزوجل نے بندوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ اس کو پہچانیں، جب اس کو پہچان لیں تو اس کی عبادت کریں، اور جب وہ اس کی عبادت کریں گے تو اس کے غیر کی عبادت و بندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔"[2]

۶۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک اور سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اگر خدا نے بندوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ تو پھر ایک گروہ کفر کی راہ کیوں اختیار کر لیتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے ہدف کے خلاف ہو؟

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، انہوں نے ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی میں اشتباہ کیا ہے، اور انہیں ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ ہدفِ عبادت جبری نہیں تھا بلکہ یہ عبادت و بندگی ارادہ و اختیار کے ساتھ تھی، اور ایسے حالات میں ہدف حالات کو آمادہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے یہ مسجد نماز پڑھنے کے لیے بنائی ہے، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اسے اس کام کے لیے آمادہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ میں لوگوں کو جبراً نماز پڑھواؤں گا، اسی طرح دوسرے موقعوں میں جیسے تحصیل علم کے لیے مدرسہ بنانا، اور علاج کے لیے ہسپتال بنانا، اور مطالعہ کے لیے کتاب خانہ بنانا۔

اس طرح سے خدا نے انسان کو اطاعت و بندگی کے لیے آمادہ کیا ہے۔ اور ہر قسم کے وسائل و ذرائع جیسے عقل اور دوسرے عواطف اور قوی اندرونی طور سے۔ اور پیغمبر، آسمانی کتابیں اور تشریعی پروگرام باہر سے اس کے لیے فراہم کئے ہیں۔

مسئلہ طور سے یہ بات مومن و کافر دونوں کے لیے یکساں ہے، اگرچہ مومن نے اپنے وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کافر نے یہ فائدہ نہیں اٹھایا۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے، کہ جس وقت آپ سے (وما خلقت الجن والانس

---

[1] توحید صدوق (مطابق نقل المیزان ج ۱۸ ص ۴۲۳۔

[2] "علل الشرائع" صدوق (مطابق نقل مدرک اول)۔

الّا لیعبدون) والی آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

خلقهم للعبادة: "انہیں عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا:

خاصة ام عامة؟ "کیا اس سے کوئی خاص گروہ مراد ہے یا سب لوگ"؟

امامؑ نے فرمایا:

عامة: "سب لوگ" [1]

ایک دوسری حدیث میں اسی امامؑ سے منقول ہوا ہے کہ جب آپؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا، تو آپؑ نے فرمایا:

خلقهم ليأمرهم بالعبادة

انہیں اس لیے خلق کیا ہے تاکہ انہیں عبادت کا حکم دے۔ [2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مقصد بندگی اور عبادت پر مجبور کرنا نہیں تھا، بلکہ اس کے لیے حالات کو سازگار بنانا تھا اور یہ بات سب لوگوں کے حق میں صادق آتی ہے۔ [3]

---

[1] بحار الانوار جلد ۵ ص ۲۱۴ حدیث ۷۔

[2] وہی مدرک حدیث ۵۔

[3] جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ الانس اور الجن میں الف ولام استغراق کے لیے ہے، اور اس میں تمام افراد شامل ہیں نہ کہ جنس کے لیے اس طور پر کہ صرف ایک ہی گروہ شامل ہو، جیسا کہ بعض تفاسیر میں آیا ہے۔

۵۹- فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا یَسْتَعْجِلُوْنِ ○

۶۰- فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ یَّوْمِهِمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۵۹- ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے، ایسے ہی ایک عظیم عذاب کا حصہ ہے، جیسا کہ ان کے ساتھیوں کے حصہ میں آیا تھا، (جنہوں نے گزشتہ اقوام سے ظلم کیا تھا) اس بنا پر جلدی نہ کریں۔

۶۰- وائے ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے۔ اس دن سے جس کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے۔

تفسیر

یہ بھی عذاب الٰہی میں حصہ دار ہیں

اوپر کی دو آیات جو سورۂ ذاریات کی آخری آیات ہیں، درحقیقت اس سورہ کی مختلف آیات سے ایک قسم کا نتیجہ پیش کرتی ہیں، خصوصاً وہ آیات جو گذشتہ اقوام جیسے قوم فرعون و قوم لوط و عاد و ثمود کی سرنوشت کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، اسی طرح وہ گذشتہ آیات جو ہدف آفرینش اور مقصد خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

فرماتا ہے: اب جبکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مشرک و گنہگار قوم آفرینش کے اصلی ہدف سے منحرف ہو چکی ہے۔ تو انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کے لیے بھی عذاب الٰہی کا ایک عظیم حصہ ہے، ایسا ہی حصہ جیسا کہ گذشتہ اقوام میں سے ان کے ساتھی رکھتے تھے: (فان للذین ظلموا ذنوبًا مثل ذنوب اصحابھم)۔

"اس بنا پر جلدی نہ کریں، اور بار بار یہ مطالبہ نہ کریں کہ اگر عذاب الٰہی حق ہے تو پھر وہ ہماری طرف کیوں نہیں

آتا"؟ (فلا یستعجلون)[1]

اس گروہ کے بارے میں ظلم کی تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ "شرک" اور کفر عظیم ترین ظلم ہے، ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے لائق جگہ میں نہ رکھا جائے، اور مسلمہ طور سے بت کو خدا کی جگہ قرار دینا ظلم کا اہم ترین مصداق شمار ہوتا ہے، اور اسی بنا پر وہ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، جس کی گزشتہ مشرک اقوام مستحق تھیں۔

"ذنوب" (بروزن قبول) اصل میں اس گھوڑے کے معنی میں ہے، جس کی دم لمبی ہو، اسی طرح وہ بڑے ڈول جو دنبالہ رکھتے ہوں۔

گزشتہ زمانے میں حیوانات کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے بڑے بڑے ڈول مہیا کئے جاتے تھے، جن کے ایک دنبالہ ہوتا تھا، اور ڈول کے دہانے کے علاوہ، اس کے دنبالہ کے ساتھ ایک رسی بھی متصل ہوتی تھی، جس سے اس بڑے ڈول کو خالی کرنے کے لیئے استفادہ کیا کرتے تھے۔

اور چونکہ بعض اوقات چند گروہوں کے درمیان پانی تقسیم کرنے کے لیے ان ڈولوں سے کام لیا جاتا تھا، اور ہر ایک کو ایک یا چند ڈول دیتے تھے، لہٰذا یہ لفظ حصّہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے زیر بحث آیت میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ یہاں بڑے حصّہ کی طرف اشارہ ہے[2]

کیا اس آیت میں دنیا کے عذاب کی دھمکی مراد ہے یا آخرت کے عذاب کی؟ مفسرین کے ایک گروہ نے دوسرے معنی کو قبول کیا ہے، جب کہ بعض نے پہلے معنی کا احتمال دیا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرائن عذاب دنیا کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اولاً وہ عجلت جو بعض کفار رکھتے تھے زیادہ تر اسی لیے تھی، کہ وہ پیغمبر سے کہا کرتے تھے: اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر ہم پر عذاب الٰہی کیوں نازل نہیں ہوتا اور یہ مسلمہ طور سے عذابِ دنیا کی طرف اشارہ ہے[3]

دوسرے یہ کہ "مثل ذنوب اصحابھم" کی تعبیر ظاہراً ایسی اقوام کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہے، جن کا اسی سورہ میں ذکر آیا ہے، مثلاً قوم لوط و قوم فرعون و عاد و ثمود، جن میں سے ہر ایک دنیا کے کسی نوع کے عذاب میں گرفتار ہوئی ہے اور تباہ و برباد ہوئی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا کے ساتھ مربوط ہے، تو پھر یہ خدائی وعدہ ان کے بارے

---

[1] توجہ کرنا چاہیے کہ "یستعجلون" کی نون مکسور ہے، حالانکہ جمع کی نون کو مفتوح ہونا چاہیے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں "یستعجلونی" (مجھ سے جلدی نہ کریں) تھا۔

[2] ایک عرب شاعر کہتا ہے: لنا ذنوب ولکم ذنوب ؛ فان ابیتم فلنا القلیب
ہمارے لیے بڑا ڈول ہے اور تمہارے لیے بھی بڑا ڈول ہے - اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو تمام کنواں ہمارا ہے۔

[3] سورۂ انعام کی آیت ۵۷، ۵۸ اور سورۂ نمل کی آیت ۷۲ اور اسی قسم کی دوسری آیات کی طرف رجوع کریں۔
البتہ یہ تعبیرات قرآنی آیات میں بعض اوقات قیامت کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔

میں کیوں پورا نہ ہوا۔؟

اس سوال کے دو جواب ہیں :

۱۔ یہ وعدہ ان میں سے بہت سوں کے لیے، مثلاً ابوجہل اور ایک اور جماعت کے بارے میں جنگ بدر وغیرہ میں پورا ہوگیا۔

۲۔ ان سب کے لیے اس عذاب کا نزول خدا کی طرف بازگشت نہ کرنے، اور شرک سے توبہ نہ کرنے کے ساتھ مشروط تھا، لیکن جب ان میں سے اکثر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوگئے تو یہ شرط دور ہوگئی اور عذاب الٰہی برطرف ہوگیا۔

اور آخری آیت میں دنیا کے عذاب کی تہدید کی، آخرت کے عذاب کی تہدید کے ساتھ تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے :

"ان لوگوں پر وائے ہے جو کافر ہوگئے، اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ دیا گیا ہے" (فویل للذین کفروا من یومھم الذی یوعدون)۔

جس طرح سے یہ سورہ مسئلہ معاد و قیامت کے ساتھ شروع ہوا تھا، اسی مسئلہ پر تاکید کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔[1]

"ویل" لغتِ عرب میں ان موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں ایک فرد یا کئی افراد ہلاکت میں جا پڑیں، اور یہ عذاب و بدبختی کا معنی دیتا ہے، اور بعض کے قول کے مطابق عذاب سے بھی زیادہ شدید مفہوم رکھتا ہے۔

"ویل" و "ویس" و "ویح" کے الفاظ لغت عرب میں ان موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں، جہاں ایک شخص دوسرے کی حالت پر افسوس کرے، البتہ "ویل" بُرے اور قبیح کاموں کے موقعوں پر بولا جاتا ہے اور "ویس" حقیر سمجھنے کے موقعوں پر اور "ویح" رحم کھانے کے مقام پر۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ "ویل" دوزخ میں ایک کنواں یا درہ ہے، لیکن یہ کہنے والوں کی مراد یہ نہیں ہے کہ لغت میں اس معنی میں آیا ہے، بلکہ حقیقت میں ایک قسم کے مصداق کا بیان ہے۔

یہ تعبیر قرآن مجید میں بہت سے موقعوں پر، جیسے کفار، مشرکین، دروغ گوئی کرنے والوں، تکذیب کرنے والوں، گنہگاروں کم فروشی کرنے والوں اور بے خبر نماز گذاروں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے، لیکن اس کا زیادہ تر استعمال قرآن مجید میں تکذیب کرنے والوں کے لیے ہوا ہے، منجملہ ان کے سورۂ مرسلات میں اس جملہ کا دس مرتبہ تکرار ہوا ہے، ویل یومئذ للمکذبین "قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے وائے ہے جنہوں نے پیغمبروں اور آیات الٰہی کی تکذیب کی"۔

خداوندا! ہمیں اس عظیم دن کے عذاب اور وحشتناک رسوائی سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھ۔

بارالٰہا! ہمیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہونے، اور اپنی عبودیت اور بندگی کے افتخار کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمیں ان اقوام کی دردناک سرنوشت میں جنہوں نے تیرے پیغمبروں اور آیات کی تکذیب کی ہے یا

---

[1] بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ممکن ہے یہ آیت بھی عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو، حالانکہ اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں عام طور پر قیامت کے لیے ہوتی ہے۔

انہیں پس پشت ڈالا ہے، مبتلا نہ کر، اور وقت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کر دے۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ ذاریات

جمعہ ۱۰ر صفر ۱۴۰۶ ہجری قمری

مطابق ۳ر آبان ماہ ۱۳۶۴ ہجری شمسی

اختتام ترجمہ بوقت پونے پانچ بجے صبح بروز اتوار

بتاریخ ۱۸ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ بر مکان حقیر

واقع محل سلطان محمد شریف کوئی جمشیدی بلاک ۱۱

قم المقدسہ ایران

سُورۂ طُور

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اور
اس کی ۴۹ آیات ہیں

آغاز
جمعہ ۱۰ صفر ۱۴۰۶ھ
۱۳۶۴/۸/۳

سُورۂ طُور
کے
مطالب

یہ سورہ بھی انہی سورتوں میں سے ہے جس کے مباحث کا زیادہ زور، ایک طرف تو معاد اور نیک اور پاک لوگوں کی تقدیر کے مسئلہ پر ہے، اور دوسری طرف اس عظیم دن مجرموں اور بدی کرنے والوں سے متعلق ہے، اگرچہ کچھ دوسرے مطالب بھی اس میں مختلف اعتقادی سلسلوں میں نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مضامین کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اس سورہ کی پہلی آیات، جو پے در پے قسموں سے شروع ہوتی ہیں۔ عذاب الٰہی، قیامت کی نشانیوں، جہنم کی آگ اور کفار کی سزاؤں کے بارے میں بحث کرتی ہیں، (آیت ا تا آیت ۱۶)۔

۲۔ اس سورہ کا ایک دوسرا حصہ بہشت کی نعمتوں اور قیامت میں مواہب الٰہی جو پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں انہیں تفصیل سے بیان کرتا ہے، اور یکے بعد دیگرے ان کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور حقیقت میں بہشت کی اکثر نعمتوں کا سورہ کے اسی حصہ میں اشارہ ہوا ہے، (آیت ۱۷ تا ۲۸)۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان اتہامات کو جو دشمنوں نے ان پر لگائے تھے بیان کرتا ہے، اور مختصر طور پر ان کا جواب دیتا ہے (آیت ۲۹ تا ۳۴)۔

۴۔ چوتھے حصہ میں توحید کے سلسلہ میں گفتگو ہے اور اس مسئلہ کو واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ (آیت ۳۵ تا ۴۳)

۵۔ سورہ کے اس حصہ میں پھر مسئلہ معاد، اور روز قیامت کی کچھ مخصوص باتوں کی طرف لوٹتا ہے (آیت ۴۴ تا ۴۷)

۶۔ آخر میں، سورہ کے آخری حصہ میں، جو دو سے زیادہ آیات نہیں ہیں، پیغمبر گرامی اسلامؐ کو، صبر و استقامت اور پروردگار کی تسبیح و حمد کے احکام، اور خدا کی طرف سے حمایت کے وعدے کے ساتھ، گذشتہ مباحث کو ختم کرتا ہے، اور اس طرح سے ایک منظم، جاذب، منطقی اور عاطفی مجموعہ کو تیار کرتا ہے جو سننے والوں کے دلوں کو اپنا مسخر کرتا ہے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کا نام "طور" کے ساتھ، اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

اس سُورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"من قرأ سورة الطور کان حقًا علی اللہ ان یؤمنہ من عذابہ و ان ینعمہ فی جنتہ"

"جو شخص سورہ طور کی تلاوت کرے تو خدا پر لازم ہے کہ اسے اپنے عذاب سے مامون قرار دے،
اور اسے اپنی بہشت کی نعمتوں سے بہرہ ور کرے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

من قرأ سورة الطور جمع الله له خير الدنيا والآخرة

"جو شخص سورہ طور کی تلاوت کرے خدا دنیا و آخرت کی بھلائی اس کے لیے جمع کر دے گا"۔[2]

واضح ہے کہ یہ سب اجر اور عظیم پاداش دنیا و آخرت میں ان لوگوں کے لیے ہے، جو اس "تلاوت کو غور و فکر کا وسیلہ اور اس (غور و فکر) کو راہ "عمل" کے لیے آمادگی کا وسیلہ قرار دے۔

---

[1] و [2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۷۲ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۴۰۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ وَالطُّوۡرِ ۙ○
۲۔ وَکِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ○
۳۔ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ○
۴۔ وَّالۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ○
۵۔ وَالسَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ○
۶۔ وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ○
۷۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ○
۸۔ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے "کوہ" طور کی۔
۲۔ اور اس کتاب کی جو لکھی گئی ہے۔
۳۔ وسیع صفحہ پر۔
۴۔ اور بیت المعمور کی قسم۔
۵۔ اور بلند کی ہوئی چھت کی۔
۶۔ اور بھڑکتے ہوئے لبریز سمندر کی۔

۷۔ کہ تیرے پروردگار کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔
۸۔ اور کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوگی۔

تفسیر

بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم

یہ سورہ ان سورتوں میں سے ایک اور سورہ ہے جو قسم سے شروع ہوتے ہیں، ایسی قسمیں جو ایک اہم واقعیت کو بیان کرتی ہیں یعنی مسئلہ معاد و قیامت، قبروں سے اٹھنا اور انسانوں کے اعمال کا محاسبہ۔

اس مسئلہ کی اہمیت اس قدر ہے، کہ خدا نے قرآن کی مختلف آیات میں بہت سے مقدسات کے حصوں کی قسم کھائی ہے تاکہ اس دن کی عظمت اور اس کے حتمی طور پر واقع ہونے کو واضح کرے۔

وہ پانچ قسمیں، جو اس سورہ کے آغاز میں نظر آتی ہیں، ایسے سربستہ اور فکر انگیز معانی رکھتی ہیں کہ مفسرین نے ان کی تفسیر میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔

فرماتا ہے: "کوہ طور کی قسم" (والطور)۔

"اور قسم ہے اس کتاب کی جو لکھی گئی ہے" (وکتاب مسطور)۔

"وسیع اور کشادہ صفحہ پر" (فی رق منشور)۔

"اور بیت المعمور کی قسم" (والبیت المعمور)۔

"اور بلند چھت کی قسم" (والسقف المرفوع)۔

"اور بھڑکتے ہوئے لبریز سمندر کی قسم" (والبحر المسجور)۔

"کہ تیرے پروردگار کا عذاب حتمی طور پر واقع ہو کر رہے گا" (ان عذاب ربك لواقع)۔

"اور کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوگی" (مالہ من دافع)۔

"طور" لغت میں "پہاڑ" کے معنی میں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ لفظ قرآن مجید کی ۱۰ آیات میں بیان ہوا ہے، جن میں سے ۹ مواقع پر "طور سینا" —— وہی پہاڑ جہاں موسیٰ پر وحی نازل ہوئی تھی —— سے متعلق گفتگو ہے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں (خصوصاً الف ولام عہد کی طرف توجہ کرتے ہوئے) یہاں بھی اسی معنی میں ہے۔

اس بنا پر خدا نے پہلے مرحلہ میں روئے زمین کے مقدس مقامات میں سے ایک مقدس مقام کی —— جس میں وحی الٰہی نازل ہوئی تھی —— قسم کھائی ہے۔

"کتاب مسطور" کی تفسیر میں بھی طرح طرح کے احتمال دیئے گئے ہیں۔

بعض نے اسے لوح محفوظ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور بعض نے قرآن مجید کی طرف، اور بعض نے نامۂ اعمال کی طرف، اور بعض نے اس تورات کی طرف جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔

لیکن اس قسم کی مناسبت سے جو اس سے پہلے آئی ہے یہ تعبیر یا تو تورات کی طرف اشارہ ہے یا سب کتب آسمانی کی طرف۔

"رق" کا لفظ "رقت" کے مادہ سے اصل میں نازک اور لطیف ہونے کے معنی میں ہے۔ اور کاغذ یا اس باریک چمڑے کو بھی کہا جاتا ہے، جس پر کوئی مطلب لکھا جائے۔ اور "منشور" پھیلے ہوئے کے معنی میں ہے (بعض کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ درخشندگی اور لمعان کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے)۔

اس بنا پر یہ قسم ایسی کتاب کی کھائی گئی ہے جو بہترین صفحات میں سے ایک بہترین صفحہ پر لکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کھلی ہوئی اور کشادہ ہے نہ کہ لپٹی ہوئی۔

"بیت المعمور" کے بارے میں بھی گوناں گوں تفاسیر ہوئی ہیں، بعض نے تو اسے ایسے گھر کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو آسمانوں میں خانہ کعبہ کے عین اوپر ہے۔ اور فرشتوں کی عبادت کے ساتھ معمور و آباد ہے، یہ معنی ان متعدد روایات میں۔ جو مختلف اسلامی منابع میں آئی ہیں ــــ نظر آتا ہے[1]

ایک روایت کے مطابق ہر روز ستر ہزار فرشتے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں، اور دوبارہ کبھی بھی اس کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔

بعض نے اس کی کعبہ اور زمین میں خانہ خدا سے تفسیر کی ہے جو زوار اور حاجیوں کے ساتھ ہمیشہ معمور اور آباد رہتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو روئے زمین پر عبادت کے لیے بنایا گیا ہے اور آباد ہوا ہے۔

لیکن آیت کا ظاہر پہلے دو معانی میں سے کوئی ایک ہے اور مختلف تعبیروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو قرآن میں "کعبہ" کے سلسلہ میں "بیت" کے عنوان سے آئی ہیں، دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

باقی رہا "سقف مرفوع" تو اس سے مراد آسمان ہے۔ کیونکہ سورۂ انبیاء کی آیت ۳۲ میں آیا ہے کہ: وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا ہے، اور سورۂ نازعات کی آیت ۲۷ اور ۲۸ میں آیا ہے کہ: ءانتم اشد خلقاً ام السماء بناھا: کیا تمہاری نئے سرے سے خلقت زیادہ اہم ہے یا آسمان کی خلقت کہ جسے خدا نے برپا کیا ہے۔ اس کی چھت کو بلند کیا ہے اور اسے منظم و مرتب بنایا ہے۔

"سقف" کی تعبیر ممکن ہے اس لحاظ سے ہو، کہ ستاروں اور آسمانی کرات نے اس طرح سے سارے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے، کہ وہ چھت کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اطراف زمین کی فضا کی طرف اشارہ ہو، کہ ہوا کے پھیلے ہوئے

---

[1] بحار الانوار میں دس سے زیادہ روایات اس سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں (جلد ۵۸ ص ۵۵ کے بعد)۔

قشر نے ایک مضبوط چھت کی طرح اس کے اطراف کو گھیرا ہوا ہے۔ اور اس کی آسمانی پتھروں کے حملوں اور نقصان دہ کیہانی شعاعوں سے اچھی طرح حفاظت کرتی ہے۔

"مسجور" کے لیے لغت میں دو معانی ذکر ہوئے ہیں، ایک "بھڑکنے والا" اور دوسرا "پُر"۔ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "سجر" (بروزن فجر) آگ کے شعلہ ور ہونے کے معنی میں ہے، اور اوپر والی آیت کو بھی اسی معنی میں سمجھتا ہے، وہ دوسرے معنی کی بات درمیان میں نہیں لایا۔ لیکن مرحوم "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں پہلا معنی یہی ذکر کیا ہے، اور بعض کتب لغت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، قرآن کی دوسری آیات بھی پہلے معنی کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۷۱، ۷۲ میں آیا ہے کہ: یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون: انہیں جلانے والے پانی میں کھینچیں گے، پھر وہ شعلہ ور آگ میں ہوں گے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ارشادات میں "حدیدہ محماۃ" کی داستان میں جو ان کے بھائی عقیل کے ساتھ تھی، یہ بیان ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اتأن من حدیدۃ احماھا انسانھا للعبہ و تجرنی الی نار سجرھا جبارھا لغضبہ؛

"کیا اس لوہے سے جسے ایک انسان نے مذاق کے طور پر گرم کیا ہے، تم نالہ و فریاد کر رہے ہو۔ لیکن مجھے ایسی آگ کی طرف کھینچتے ہو، جسے پروردگار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے"؟[1]

لیکن یہ "بحر مسجور" اور بھڑکتا ہوا سمندر کہاں ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ہمارے کرۂ زمین کے سمندر بھی مراد ہیں، جو قیامت کے قریب بھڑک اٹھیں گے اور پھٹ جائیں گے، جیسا کہ سورۂ تکویر کی آیت ۶ میں آیا ہے: واذا البحار سجرت: "جب دریا بھڑک اٹھیں گے"۔ اور سورۂ انفطار آیہ ۳ میں پڑھتے ہیں واذا البحار فجرت: جب دریا پھٹ جائیں گے

لیکن بعض نے اس کی ان معدنی مادوں کے ساتھ تفسیر کی ہے جو کرۂ زمین کے اندر ہیں۔ ایک حدیث بھی جو تفسیر عیاشی میں امام باقرؑ سے نقل ہوئی ہے اس معنی پر شاہد ہے، اس حدیث میں آیا ہے کہ "قارون" کو "بحر مسجور" میں عذاب ہو رہا ہے[2] حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ: "قارون اور اس کا گھر اور خزانہ زمین کی گہرائیوں میں دھنس گیا"۔ "فخسفنا بہ و بدارہ الارض" (قصص۔ ۸۱)۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور ممکن ہے کہ اوپر والی آیت میں دونوں کی قسم کھائی گئی ہو کیونکہ دونوں خدا کی آیات اور اس جہان کے عظیم عجائبات میں سے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مفسرین نے ان پانچوں قسموں کے مفہوم کی، ایک دوسرے کے ساتھ ربط کی کیفیت کے بارے

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۲۴۔

[2] "نور الثقلین" جلد ۵ صفحہ ۱۲۸۔

میں کوئی خاص بحث نہیں کی ہے، لیکن نظر یہ آتا ہے کہ پہلی تین قسمیں تو ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ربط رکھتی ہیں، کیونکہ وہ سب وحی اور اس کے خصوصیات کی بات کرتی ہیں "کوہ طور" محلِ نزولِ وحی تھا، اور "کتاب مسطور" بھی آسمانی کتاب کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ تورات ہو یا قرآن، اور "بیت المعمور" فرشتوں اور خدا کے پیکِ وحی کے آنے جانے کا محل ہے۔

لیکن دوسری دو قسمیں آیات "تکوینی" کی بات کرتی ہیں، (پہلی تین قسموں کے مقابلہ میں جو "تشریعی آیات" کی باتیں کرتی ہیں) ان دو قسموں میں سے ایک توحید کی اہم ترین نشانی یعنی باعظمت آسمان کی طرف اشارہ ہے۔ اور دوسری معاد و قیامت کی ایک اہم نشانی ہے جو قربِ قیامت میں قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کے وقت رونما ہوگی۔

اس بنا پر ان پانچوں قسموں میں "توحید" "نبوت" اور "معاد" جمع ہے۔

بعض مفسرین جو ان تمام آیات کو "موسیٰؑ" اور ان کی سرگذشت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، ان آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اس طرح سے بیان کیا ہے، : طور تو وہی پہاڑ ہے جس میں موسیٰؑ پر وحی نازل ہوتی تھی، اور "کتاب مسطور" تورات ہے۔ بیت المعمور فرشتہ وحی کی آمد و رفت کا مرکز ہے (اور احتمال ہے کہ مراد بیت المقدس ہو) اور سقف مرفوع وہی ہے جو بنی اسرائیل کی داستان میں آیا ہے: واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة، اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سر پر بلند کر دیا" (اعراف۔ ۱۷۱)۔

اور "بحر مسجور" آگ کا وہ سمندر ہے جس میں قارون کو دین موسیٰؑ کی مخالفت کی بنا پر عذاب ہو رہا ہے"۔

لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، اور ان روایات کے ساتھ بھی، جو منابع اسلامی میں آئی ہیں، سازگار نہیں ہے، اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، سقف مرفوع قرآن کی دوسری آیات اور ان روایات کی گواہی سے جو آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں، آسمان کی طرف اشارہ ہے۔

جو نکتہ یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان قسموں کا اس موضوع کے ساتھ جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں کیا ربط ہے؟

اس سوال کا جواب ان مطالب کی طرف توجہ کرنے سے جو اوپر بیان ہوئے ہیں واضح ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی قسمیں، جو عالم "تکوین و تشریع" میں خدا کی قدرت کے محور پر گردش کر رہی ہیں، اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کہ ایسی ذات اس بات پر اچھی طرح سے قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے، اور قیامت برپا کرے، یہ وہی چیز ہے کہ جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، جیسا کہ ان آیات کے آخر میں بیان ہوا ہے، "ان عذاب ربك لواقع مالہ من دافع"

۹۔ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ
۱۰۔ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ
۱۱۔ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ
۱۲۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ
۱۳۔ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ
۱۴۔ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝
۱۵۔ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ
۱۶۔ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۔ (یہ عذاب الٰہی) اس دن آئے گا جب آسمان شدت کے ساتھ ہل رہا ہوگا۔
۱۰۔ اور پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر حرکت کر رہے ہوں گے۔
۱۱۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۱۲۔ وہی لوگ جو باطل باتوں میں لہو ولعب کر رہے ہیں۔
۱۳۔ وہ دن جس میں انہیں زبردستی جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔
۱۴۔ (اور ان سے کہا جائے گا) یہی ہے وہ آگ جس کا تم انکار کیا کرتے تھے۔

۱۵۔ کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں ہو؟

۱۶۔ اس میں داخل ہو جاؤ، اور جلتے رہو، چاہے صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ تمہیں صرف تمہارے اعمال کی ہی جزا ملے گی۔

تفسیر

تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں

گذشتہ آیات میں، قیامت میں عذاب الٰہی کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوا تھا، زیر بحث آیات اس معنی کی توضیح و تفسیر ہے، پہلے تو قیامت کی بعض خصوصیات کو بیان کرتا ہے اور پھر تکذیب کرنے اور جھٹلانے والوں کے عذاب کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "یہ عذاب الٰہی اس دن آئے گا جب آسمان (آسمانی کرات) شدت کے ساتھ حرکت کر رہے ہوں گے، اور ہر طرف آ جا رہے ہوں گے، (یوم تمور السماء موراً)۔

"مور" (بروزن قول) لغت میں مختلف معانی میں آیا ہے "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "مور" تیزی کے ساتھ رواں دواں ہونے کے معنی میں ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس گرد و غبار کو بھی جسے ہوا ہر طرف لے جاتی ہے "مور" کہتے ہیں۔

"لسان العرب" میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "مور" حرکت اور آنے جانے کے معنی میں ہے، لہروں اور تیزی کے معنی میں بھی آیا ہے، اور بعض نے "مور" کی دورانی حرکت سے بھی تفسیر کی ہے۔

ان تفاسیر کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "مور" اسی حرکت سریع اور دورانی کو کہتے ہیں جو آمد و رفت اور اضطراب و تموج کے ساتھ ہوتی ہے۔

اس طرح سے کرات آسمانی پر حکمران نظام، قیامت کے قریب درہم برہم ہو جائے گا، وہ اپنے مداروں سے منحرف ہو جائیں گے، اور ہر طرف آمد و رفت کریں گے، اور پھر انہیں لپیٹ کر تہ کر دیا جائے گا، اور ان کی جگہ خدا کے حکم سے ایک نیا آسمان برپا ہوگا جیسا کہ سورۂ انبیاء کی آیت ۱۰۴ میں کہتا ہے: یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب: وہ دن جس میں آسمان کو طومار کی طرح لپیٹ دیں گے۔

اور سورۂ ابراہیم کی آیت ۴۸ میں یہ آیا ہے: یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات:

لہ "یوم" منصوب ہے ظرفیت کے عنوان سے اور "واقع" سے متعلق ہے جو گذشتہ آیات میں آیا ہے۔

"وہ دن جس میں یہ زمین دوسری زمین سے، اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں سے بدل جائیں گے"۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو کرات آسمانی کے شگافتہ ہونے کی خبر دیتی ہیں۔ (انفطار۔ ۱) اور ان کے اپنی جگہ سے اکھڑ جانے کی (تکویر۔ ۱۱) اور ان کے درمیان فاصلہ پڑنے کی (مرسلات۔ ۹) حکایت کرتی ہیں۔ ہم انشاء اللہ ان آیات کے ذیل میں بھی اس سلسلہ میں بحث کریں گے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور وہ دن کہ جس میں پہاڑ حرکت میں آجائیں گے" (و تسیر الجبال سیرًا)۔

ہاں پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور حرکت کرنے لگیں گے، اور اس کے بعد قرآن کی دوسری آیات کی شہادت کی بنا پر بکھر جائیں گے "کعهن المنفوش" (دھنکی ہوئی روئی) کی طرح ہو جائیں گے۔ (قارعہ۔ ۵) اور اس کی جگہ ایک صاف اور ہموار بے آب و گیاہ زمین ظاہر ہوگی، فیذرها قاعًا صفصفًا۔ (طٰہٰ۔ ۱۰۶)[1]

یہ سب اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی تمام پناہ گاہیں درہم برہم ہو جائیں گی، اور ایک نیا جہان نئے نظاموں کے ساتھ اس کی جگہ لے لے گا، اور انسان اپنے اعمال کے نتائج کے روبرو ہوگا۔

لہٰذا اس کے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جب ایسا ہے تو پھر اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے وائے ہے"! (فویل یومئذ للمکذبین)۔[2]

ہاں! جب عالم کی دگرگونی سے پیدا ہونے والے اضطراب اور وحشت نے سب کو گھیر رکھا ہوگا، اس وقت ایک عظیم وحشت، مکذبین کو لاحق ہوگی، جو کہ عذاب الٰہی ہے۔ چونکہ "ویل" ایک نامطلوب حادثہ کے وقوع پر تأسف واندوہ کا اظہار ہے۔

اس کے بعد ان مکذبین کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی لوگ جو باطل باتوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہیں" (الذین هم فی خوض یلعبون)۔

یہ آیات قرآن کو "جھوٹ" اور پیغمبرؐ کے معجزات کو "جادو" کہتے ہیں، اور ان کے لانے والے کو "مجنون" شمار کرتے ہیں، تمام حقائق کو کھیل تماشا قرار دیتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔

باطل اور بے دلیل باتوں کے ساتھ حق سے جنگ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کسی تہمت اور جھوٹ سے انکار نہیں کرتے۔

"خوض" (بروزن حوض) باطل اور غلط باتوں میں وارد ہونے کے معنی میں ہے، اور اصل میں پانی میں وارد ہونے اور اس سے عبور کرنے کے معنی میں ہے۔

دوبارہ اس دن کا تعارف اور ان مکذبین کی سرگذشت کے بیان کے لیے ایک دوسری وضاحت کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۲ ص..... (سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۰۵ کے ذیل میں) رجوع کریں۔

[2] "فویل" میں "فا" تفریع کا ہے، یعنی چونکہ اس دن کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لہٰذا ان تکذیب کرنے والوں پر وائے ہے۔

"وہ دن جس میں وہ خشونت اور سختی کے ساتھ جہنم کی آگ کی طرف ہانکے جائیں گے" (یوم یدعون الی نار جھنم دعّا)۔[1]

"ان سے کہا جائے گا یہ وہی آگ ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے (ھٰذہ النار التی کنتم بھا تکذبون)۔

اور ان سے یہ بھی کہا جائے گا: "کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے نہیں ہو"؟ (افسحر ھٰذا ام انتم لا تبصرون)۔

تم ہمیشہ دنیا میں یہ کہا کرتے تھے، محمدؐ جو کچھ لایا ہے وہ جادو ہے، اس نے جادوگری کے ذریعہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تاکہ ہم حقائق کو نہ دیکھیں، ہماری عقل کو ختم کر دیا ہے، اور کچھ امور کو "معجزہ" کے نام سے تعارف کراتا ہے، اور کچھ باتیں "وحی الٰہی" کے عنوان سے ہمارے سامنے پڑھتا ہے، لیکن یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، اور جادو کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

لہٰذا قیامت کے دن سرزنش اور توبیخ کے عنوان سے — جب کہ وہ جہنم کی آگ کو دیکھیں گے اور اس کی حرارت کو محسوس کریں گے — ان سے کہا جائے گا، "کیا یہ جادو ہے"؟ کیا تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈالا گیا ہے"؟

اسی طرح ان سے کہا جائے گا: "اس آگ میں داخل ہو جاؤ، اور اس میں جلتے رہو، چاہے صبر و شکیبائی کرو یا بیتابی اور گڑگڑاؤ، تمہارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" (اصلوھا فاصبروا او لا تصبروا سواء علیکم)۔

"کیونکہ تمہارے اعمال کا بدلہ صرف تمہارے اپنے ہی اعمال ہیں" (انما تجزون ما کنتم تعملون)۔

ہاں! یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جو تمہاری طرف پلٹے ہیں، اور تمہارے پاؤں کی زنجیر بن گئے ہیں، اس بنا پر گڑگڑانا اور آہ و نالہ اور اضطراب و بے تابی کوئی اثر نہیں رکھتی۔

یہ آیت "تجسم اعمال" کے مسئلہ اور ان کی انسان کی طرف بازگشت پر ایک جدید تاکید ہے، اور یہ پروردگار کی عدالت کے مسئلہ پر بھی ایک تاکید مجدد ہے۔ چونکہ جہنم کی آگ چاہے جتنی بھی جلانے والی ہو، اور اس کا عذاب چاہے جتنا دردناک ہو وہ خود انسانوں کے اعمال کے نتیجے اور ان کی تبدیل شدہ شکلوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

چند نکات

۱۔ مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائیں گے۔

اس میں تو شک نہیں کہ انھیں جہنم کی طرف حقارت کے ساتھ، ذلیل کرتے ہوئے، جھڑکتے ہوئے، اور عذاب کرتے ہوئے لے جائیں گے، لیکن قرآن کی مختلف آیات میں اس سلسلہ میں گوناں گوں تعبیریں نظر آتی ہیں۔

سورہ "حاقہ" کی آیت ۳۰ و ۳۱ میں آیا ہے کہ: خذوہ فغلّوہ ثم الجحیم صلّوہ: اس کو پکڑ لو، اور طوق و زنجیر میں جکڑ لو اور اس کے بعد جہنم کی آگ میں ڈال دو۔"

اور سورہ "دخان" کی آیت ۴۷ میں اس طرح آیا ہے کہ: خذوہ فاعتلوہ الی سواء الجحیم: اس کو

---

[1] "دع" (بروزن جد) شدت کے ساتھ دھکیلنے اور خشونت و سختی کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے "یوم" ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے یا قبل کی آیت کے لفظ "یوم تمور" کا بدل ہے۔

پکڑلو، اور سختی کے ساتھ اسے جہنم میں دھکیل دو۔

متعدد آیات میں "سوق" اور ہانکنے کی تعبیر آئی ہے مثلاً سورۂ مریم کی آیت ۸۶، ونسوق المجرمین الی جھنم وردًا: ہم مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جنہیں پانی کی جگہ کی طرف لے جایا جاتا ہے) جہنم کی طرف ہانکیں گے۔

اس کے برعکس پرہیزگاروں اور متقیوں کو انتہائی احترام و اکرام کے ساتھ بہشت کی طرف لے جائیں گے، اور خدا کے فرشتے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھیں گے، بہشت کے دروازوں کو ان کے لیے کھول دیا جائے گا، اور خازنان جنت انہیں سلام اور خوش آمدید کہیں گے، اور انہیں بہشت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سکونت کی بشارت دیں گے، (زمر۔ ۷۳)۔

اس طرح سے "بہشت" اور "دوزخ" نہ صرف خدا کی "مہر" اور "قہر" کا مرکز ہے، بلکہ اُن میں سے ہر ایک میں داخلہ کے لیے پذیرائی بھی اسی مفہوم کو بیان کرنے والی ہے۔

۲۔ وہ لوگ جو باطل باتوں میں غوطہ زن ہیں

اگرچہ اوپر والی آیات میں، قرآن کا ہدف کلام زمانہ پیغمبر کے مشرکین ہیں، لیکن بلاشک یہ آیات عمومیت رکھتی ہیں۔ اور تمام مکذبین ان میں شامل ہیں، یہاں تک کہ مادی فلاسفہ (سائنس دان) جو مٹھی بھر ناقص خیالات وافکار میں غوطہ زن ہیں، عالم ہستی کے حقائق کو کھیل بنائے ہوئے ہیں، اور سوائے اس چیز کے جسے وہ اپنی قاصر عقل سے دریافت کرتے ہیں، کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، وہ اسی بات کی توقع رکھتے ہیں کہ تمام چیزوں کو اپنی آزمائش گاہ میں دوربین کے ذریعہ دیکھیں، یہاں تک کہ خدا کی پاک ذات کو بھی، ورنہ اس کے وجود کو رسمی طور پر قبول نہیں کرتے۔

یہ بھی "فی خوض یلعبون" کے مصداق ہیں، اور باطل خیالات ونظریات کے ایک انبوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

انسانی عقل اپنے تمام تر فروغ کے باوجود نور وحی کے مقابلہ میں ایک شمع کے مانند ہے جو آفتاب عالم تاب کے سامنے روشن ہو۔ یہ شمع اس کو اجازت دیتی ہے کہ جہان مادہ کے تاریک ماحول سے نکل کر اور ماوراء طبیعت عالم کی طرف دروازہ کھولے، اور پھر آفتاب وحی کے نور میں ہر طرف پرواز کرے، اور بے کراں جہان کو دیکھے اور پہچانے۔

۱۷۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ ۙ

۱۸۔ فٰکِهِیْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ

۱۹۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا ۢ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۙ

۲۰۔ مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ

۲۱۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ

ترجمہ

۱۷۔ لیکن پرہیزگار جنت کے باغوں اور فراواں نعمتوں میں ہوں گے۔

۱۸۔ اور جو کچھ ان کے پروردگار نے انہیں دیا ہے اس پر شاد و مسرور ہوں گے۔ اور ان کا پروردگار انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔

۱۹۔ (انہیں کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو اور خوش رہو یہ سب کچھ ان اعمال کی وجہ سے ہے جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے۔

۲۰۔ ان کی حالت یہ ہوگی کہ وہ قطاروں میں بچھائے گئے تختوں کے اوپر پہلو بہ پہلو تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، اور ہم ان کی حورالعین کے ساتھ تزویج کریں گے۔

۲۱۔ اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی پیروی میں ایمان قبول کیا، تو ہم ان کی اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے، اور ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔

تفسیر

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ میں گروی ہے

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں مجرمین کی سزاؤں اور ان کے دردناک عذاب کے بارے میں گزرے ہیں۔ زیر بحث آیات میں ان کے نقطۂ مقابل یعنی فراواں نعمتوں اور بیکراں صلوں کے لیے جو مومنین اور پروردگاروں کو عطا کئے جائیں گے اشارہ کرتا ہے، تاکہ ایک واضح موازنہ میں ہر ایک کی حیثیت واضح ہو جائے۔

پہلے کہتا ہے: "پرہیزگار جنت کے باغات میں فراواں نعمتوں میں مقیم ہوں گے" (ان المتقین فی جنات و نعیم)۔

"مؤمنین" کی بجائے "متقین" کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ لفظ ایمان کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اور عمل صالح کے پہلوؤں کو بھی، جیسا کہ قرآن سورۂ بقرہ کی آیت ۲ میں کہتا ہے: ذالك الكتٰب لا ریب فیه هدًی للمتقین: اس آسمانی کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

کیونکہ اگر انسان ذمہ داری قبول کرنے، احساس مسئولیت اور روح حق جوئی وحق طلبی کا حامل نہ ہو، جو تقویٰ کا ایک مرحلہ ہے، تو وہ کبھی بھی دین حق کی تحقیق کی کوشش نہیں کرتا، اور قرآنی ہدایت کو قبول نہیں کرتا۔

"جنات" اور "نعیم" صیغۂ جمع (باغات اور نعمتیں) کی صورت میں اور وہ بھی "نکرہ" کی صورت میں، ان باغات اور نعمتوں کے تنوع اور عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد بہشتوں کی روح پرور عظیم نعمتوں کے اثر انداز ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اس چیز سے جو ان کے پروردگار نے انہیں دی ہے شاد و مسرور ہیں، اور اس سلسلہ میں دلپذیر باتیں کرتے ہیں" (فاکهین بما اٰتاهم ربهم)۔[1]

---

[1] "فاکهین" "فکہ" (بروزن نظر) کے مادہ سے اور "فکاهه" (بروزن شباهه) مسرور اور ہنسی خوشی رہنے اور دوسروں کو شیریں باتوں اور مزاح سے مسرور کرنے کے معنی میں ہے، "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "فاکهه" ہر قسم کے پھل کے معنی میں ہے اور "فکاهت" صاحبان انس کی باتوں کے معنی میں ہے، بعض نے اوپر والی آیت میں یہ احتمال دیا ہے کہ "فاکهین بما اٰتاهم ربهم" کا جملہ انواع واقسام کے پھل کھانے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

ہاں! وہ خوشی سے اپنے جامہ میں پھولے نہ سمائیں گے ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے مزاح کرتے رہیں گے، اور ان کے دل ہر قسم کے غم واندوہ سے خالی ہوں گے، اور وہ حد سے زیادہ آرام وسکون محسوس کریں گے۔

خاص طور سے یہ بات کہ: خدا نے انہیں عذاب وسزا کی طرف سے مطمئن کر دیا ہے، "اور ان کے پروردگار نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالیا ہے" (ووقاھم ربھم عذاب الجحیم)۔

اس جملہ کے دو معانی ہو سکتے ہیں، پہلا پروردگار کی دوسری نعمتوں کے مقابلہ میں کسی مستقل نعمت کا بیان، دوسرے یہ کہ یہ سابقہ کلام کا پچھلا حصہ ہو، یعنی جنتی دو چیزوں سے سرور ہوں گے، ایک ان نعمتوں کی وجہ سے جو خدا نے انہیں دی ہیں، اور دوسرے ان عذابوں کی بنا پر جنہیں ان سے دور کر دیا ہے۔

ضمنی طور پر "ربھم" (ان کا پروردگار) کی تعبیر دونوں جملوں میں، خدا کے انتہائی لطف وکرم کی طرف، اور عالم میں اس کی ربوبیت کے جاری وساری ہونے کی طرف، ایک اشارہ ہے۔

اس اجمالی اور سربستہ اشارے کے بعد جنت میں پرہیزگاروں کی نعمتوں، اور سرور وشادمانی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے، "انہیں کہا جائے گا، مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو" (کلوا واشربوا ھنیئًا)۔

"یہ سب چیز ان اعمال کی وجہ سے ہیں جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے" (بما کنتم تعملون)۔

"ھنیئًا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشت کی کھانے اور پینے کی چیزوں سے کسی قسم کے نامطلوب عوارض پیدا نہیں ہوتے، اور وہ اس جہان کی نعمتوں کے مانند نہیں ہیں، جو بعض اوقات مختصر طور پر کم یا زیادہ بیماری اور تکلیف پیدا کر دیتی ہیں۔

علاوہ ازیں ان کے حاصل کرنے کے لیے نہ تو کوئی مشقت کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ ہی ان کے ختم ہونے اور تمام ہو جانے کا کوئی خوف ہے، اور اسی بنا پر یہ نعمتیں کامل طور پر گوارا اور مزہ دینے والی ہیں[1]

مسلمہ طور پر بہشت کی نعمتیں اپنے طور پر گوارا پر لطف اور مزیدار ہوں گی، لیکن یہ بات کہ فرشتے جنتیوں سے یہ کہیں گے، مزے لو اور لطف اٹھاؤ، یہ خود ایک دوسرا لطف اور مزیدار بات ہے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ وہ "قطاروں میں بچھے ہوئے تختوں کے اوپر ایک دوسرے کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے" (متکئین علی سرر مصفوفۃ)۔

اور وہ دوسرے دوستوں اور مومنوں کے انس کی لذت سے بہت زیادہ بہرہ ور ہوں گے، کیونکہ یہ ایک معنوی لذت ہے جو بہت سی لذتوں سے ماقوق ہے۔

"سرر" جمع ہے "سریر" کی "سرور" کے مادہ سے اصل میں ان تختوں کو کہا جاتا ہے جنہیں انس وسرور کی محافل کے لیے ترتیب دیتے ہیں، اور ان پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔

---

[1] راغب "مفردات" میں کہتا ہے: الھنیء کل مالا یلحق فیہ المشقۃ ولا یعقبہ وخامۃ: ھنی وایسی چیز ہے جس کے پیچھے مشقت اور دشواری نہ ہو۔

"مصفوفة" "صف" کے مادہ سے اس معنی میں ہے کہ یہ تخت ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے بچھائے گئے ہیں اور ایک عظیم محفلِ انس برپا کرتے ہیں۔

قرآن کی متعدد آیات میں یہ آیا ہے کہ بہشتی تختوں کے اوپر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے، "علی سرر متقابلین" (حجر ۴۷۔ صافات ۴۴)۔

یہ تعبیر اس چیز سے برعکس نہیں جو زیرِ بحث آیت میں آئی ہے، کیونکہ مجالسِ انس و سرور، جن میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا، وہاں کرسیاں ایک دوسری کے ساتھ ساتھ بھی رکھتے ہیں اور مجلس کے گرداگرد بھی، جو ایک دوسری سے پیوستہ صفوں میں بھی ہوتی ہیں اور ایک دوسری کے آمنے سامنے بھی۔

"متکئین" کی تعبیر ان کے انتہائی سکون و آرام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ انسان عام طور پر آرام و سکون کی حالت میں تکیہ کی ٹیک لگاتا ہے، اور وہ لوگ جو پریشان اور بے آرام ہوں وہ عام طور پر اس طرح نہیں ہوتے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "گوری گوری، سفید رخ، خوبصورت اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتوں سے ہم ان کی تزویج کریں گے" (وزوجناهم بحور عين)۔[1]

یہ سب کچھ بہشتیوں کی "مادی" اور "معنوی" نعمتوں کا ایک حصہ ہیں، لیکن خدا صرف انہیں پر اکتفا نہیں کرے گا، بلکہ معنوی اور مادی نعمتوں کے ایک اور دوسرے حصہ کا بھی اس پر اضافہ کرے گا، : "جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور ان کی اولاد نے ان کی پیروی میں ایمان اختیار کیا ہے، ہم ان کی اولاد کو بھی جنت میں ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے اور ہم ان کے عمل میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے" (والذين آمنوا واتبعتهم ذريتهم بايمان الحقنا بهم ذريتهم وما التناهم من عملهم من شيء)۔

یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان اپنی صاحبِ ایمان اولاد اور اپنے متعلقین کو جنت میں اپنے پاس دیکھے، اور ان سے انس کی بنا پر اُن سے لذت حاصل کرے، اور ان کے اعمال میں سے بھی کسی چیز کی کمی نہ کی جائے۔

آیت کی تعبیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ بالغ اولاد ہے جو ماں باپ کے راستے میں قدم اٹھاتی ہے اور ایمان میں ان کی پیروی کرتی ہے اور دین و مذہب کے لحاظ سے ان سے ملحق ہوتی ہے۔

ایسے افراد اگر عمل کے لحاظ سے کچھ کوتاہی اور تقصیرات بھی رکھتے ہوں تو خدا ان کے صالح آباؤ اجداد کے احترام میں انہیں بخش دیگا۔

---

[1] "حور" جمع "حوراء" و "احور" اسے کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سیاہی کامل درپر مشکی اور اس کی سفیدی پورے طور پر شفاف ہو۔ یا یہ کلی طور سے کامل جمال اور خوبصورتی سے کنایہ ہے۔ کیونکہ خوبصورتی ہر چیز سے زیادہ آنکھوں میں تجلی کرتی ہے اور "عین" جمع "اعین" اور "عیناء" کی موٹی آنکھ کے معنی میں ہے اور اس طرح سے لفظ "حور" اور "عین" کا مذکر و مؤنث دونوں پر اطلاق ہوتا ہے، اور اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ جو جنت کی تمام بیویوں کو شامل ہے، با ایمان مردوں کی ازواج اور بیویاں اور مومن عورتوں کے ازواج اور شوہر۔

(غور کیجئے)

اوران کے مقام کو بلند کرے گا، اورانہیں بھی ان کے درجہ تک پہنچا دے گا، اور یہ والدین اور اولاد کے لیے ایک عظیم نعمت ہے[1]

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں " ذریہ " کو ایک عام معنی میں تفسیر کیا ہے، اس طرح سے یہ خورد سال بچوں کو بھی شامل ہے حالانکہ یہ تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ ایمان میں پیروی بلوغ کے مرحلہ تک یا اس کے نزدیک پہنچنے کی دلیل ہے۔

مگر اس صورت میں کہ یہ کہا جائے کہ خورد سال بچے قیامت میں مرحلۂ بلوغ کو پہنچ جائیں گے، اوران کی آزمائش ہوگی، جب وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو جائیں گے تو وہ اپنے والدین سے ملحق ہو جائیں گے، جیسا کہ کتاب کافی میں یہ معنی ایک حدیث میں منقول ہوا ہے کہ لوگوں نے امامؑ سے مومنین کے اطفال کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا :

" جب قیامت کا دن ہوگا تو خدا ان سب کو جمع کرے گا ایک آگ روشن کرے گا، اور انہیں حکم دے گا کہ وہ اپنے آپ کو آگ میں گرا دیں، جو اس حکم پر عمل کریں گے آگ ان کے لیے سرد اور سالم ہو جائے گی، اور وہ سعادت مند ہیں، اور جو روگردانی کریں گے تو وہ لطف خدا سے محروم ہو جائیں گے "[2]

لیکن یہ حدیث علاوہ اس کے کہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے دوسرے اعتراضات بھی اس کے متن پر وارد ہوتے ہیں جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

البتہ اس میں کوئی بات مانع نہیں ہے کہ چھوٹے بچے بھی والدین کے احترام میں جنت میں جائیں اور ان کے پاس قرار پائیں، گفتگو اس پر ہے کہ اوپر والی آیت اس مطلب کی طرف ناظر ہے یا نہیں ؟ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایمان میں والدین کی پیروی کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس سے مراد بالغ اولاد ہے۔

بہرحال چونکہ اس اولاد کا ارتقاء والدین کے درجہ تک ممکن ہے۔ تو اس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ ماں باپ کے اعمال اولاد کو دے دیئے جائیں گے۔ لہٰذا اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ : "وما التناهم من عملهم من شیء" "ہم ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں کریں گے "

ابن عباس پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا :

اذا دخل الرجل الجنة سأل عن ابويه وزوجته وولده فيقال له انهم لم يبلغوا درجتك وعملك، فيقول رب قد عملت لی ولهم فيؤمر بالحاقهم به :

" جس وقت انسان جنت میں داخل ہوگا، تو وہ اپنے ماں باپ بیوی اور اولاد کے بارے میں پوچھ گچھ

---

[1] ظاہر یہ ہے کہ والذین آمنوا ..... کا جملہ ایک مستقل جملہ ہے اور " واؤ " استیناف کے لیے ہے، مفسرین کی ایک جماعت (مثلاً علامہ طباطبائی، مراغی، اور مؤلف فی ظلال) نے یہی معنی اختیار کیا ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ زمخشری نے "کشاف" میں "حور العین" پر اس کا عطف سمجھا ہے، حالانکہ یہ کوئی ایسا مناسب معنی نہیں رکھتا جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ، مطابقت رکھتا ہو۔

[2] نور الثقلین ج ۵ ص ۱۲۹ (تلخیص کے ساتھ)۔

کرے گا، تو اسے کہیں گے کہ: وہ تیرے درجہ و مقام اور عمل تک نہیں پہنچے ہیں، تو وہ عرض کرے گا، پروردگارا! میں نے اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی عمل کیا تھا، تو اس وقت حکم دیا جائے گا کہ انہیں بھی اس کے ساتھ ملحق کر دو۔"[1][2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ، آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "ہر شخص اپنے اعمال میں گروی اور ان کے ہمراہ ہے" (کل امرئ بما کسب رھین)۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پرہیزگاروں کے اعمال اور ان کے صلوں میں سے کسی چیز کی کمی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ اعمال ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوں گے۔ اور اگر خدا متقین کی اولاد کے بارے میں کوئی لطف اور مہر کرے گا، اور انہیں جنت میں پرہیزگاروں کے ساتھ ملحق کرے گا، تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کے اعمال کے بدلے سے کسی چیز کی کمی کر لی جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہاں "رھین" کو مطلق طور سے "گروی رکھے ہوئے افراد" کے معنی میں لیا ہے، اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے بدلے گروی رکھا ہوا ہے، چاہے اچھے ہوں یا برے اور ان کے مطابق ہی جزا و سزا پائے گا۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ تعبیر نیک اعمال کے بارے میں چنداں مناسبت نہیں رکھتی، بعض مفسرین نے یہاں "کل نفس" کو صرف بدکاروں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہر انسان اپنے غلط اور شرک آلود اعمال کے بدلے میں "گروی" ہے، اور حقیقت میں ان کا اسیر اور محبوس ہے۔

اور بعض اوقات سورۂ مدثر کی آیہ ۳۸، ۳۹ سے بھی استدلال کیا ہے:

کل نفس بما کسبت رھینۃ الا اصحاب الیمین:

"ہر شخص ان اعمال کے بدلے گروی ہے جو اس نے انجام دیئے تھے سوائے اصحاب یمین کے:

(وہ لوگ جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اہل نجات ہیں)

لیکن یہ تفسیر بھی اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ قبل و بعد کی سب آیتیں متقین اور پرہیزگاروں کے بارے میں ہیں، اور ان میں شرک، مشرکین اور مجرموں کے بارے میں گفتگو موجود ہی نہیں ہے، مناسب نظر نہیں آتی۔

ان دونوں تفاسیر کے مقابلہ میں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی جہت سے نامناسب ہے۔ ایک تیسری تفسیر بھی ہے، جو صدر آیت کے ساتھ بھی اور ماقبل و مابعد کی آیات سے بھی مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ "رھن" کے معانی میں سے ایک معنی، لغت میں کسی چیز کی ملازمت اور اس کے ہمراہ ہونا بھی ہے، اگرچہ "رھن" کا مشہور معنی "وثیقہ" ہی ہے جو قرض کے مقابلہ میں ہوتا ہے، لیکن اصل لغت کے کلمات سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی میں سے ایک ہمیشگی اور خدمت

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۲۶۔

[2] "الناقص" "الت" (بروزن شرط) کے مادہ سے کم کرنے کے معنی میں ہے۔

گزاری بھی ہے۔[1]

بلکہ ان میں سے بعض تو اس کا اصلی معنی صراحت کے ساتھ دوام و ثبوت ہی سمجھتے ہیں، اور انہوں نے "رھن بمعنی" وثیقہ" کو فقہا کی اصطلاحات میں سے شمار کیا ہے لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ "نعمۃ راھنۃ" تو اس کا معنی پائیدار اور برقرار نعمت ہے۔[2]

امیر المومنین علی علیہ السلام گزشتہ اقوام کے بارے میں فرماتے ہیں:

ھامھم رھائن القبور ومضامین اللحود

"وہ قبروں کے رہین اور لحدوں میں سونے والے ہیں۔"[3]

اس طرح سے "کل امرئ بما کسب رھین" کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کے اعمال اس کے ساتھ اور ہمراہ ہوں گے، اور کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوں گے، چاہے نیک عمل ہوں یا بد؟ اور اسی بنا پر "متقین" جنت میں اپنے اعمال کے ساتھ ہیں، اور اگر ان کی اولاد ان کے پاس قرار پائے گی تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کے اعمال میں سے کچھ کمی کر لی جائے گی۔

سورہ "مدثر" کی آیت کے بارے میں جس نے "اصحاب الیمین" کو اس معنی سے استثنا کیا ہے ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ایسے الطاف کے مشمول ہیں جو بے حساب ہے۔ اس طرح سے کہ ان کے اعمال ان الطاف الٰہی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔[4]

بہر حال یہ جملہ اس واقعیت کی تاکید ہے کہ انسان کے اعمال کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوں گے۔ اور ہمیشہ تمام اعمال اور مواقف میں اس کے ہمراہ ہوں گے۔

---

[1] "لسان العرب" مادہ "رھن"۔

[2] "مجمع البحرین" مادہ رھن۔

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۵۔

[4] سورۂ مدثر میں "اصحاب الیمین" کے استثنا کے بارے میں دوسری تفاسیر بھی موجود ہیں ہو سکتا ہے اشارہ اسی آیت کے ذیل میں آئے گی۔

۲۲۔ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ○
۲۳۔ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ○
۲۴۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ○
۲۵۔ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○
۲۶۔ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○
۲۷۔ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ○
۲۸۔ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ع ○

ترجمہ

۲۲۔ ہمیشہ انواع واقسام کے پھل اور گوشت جن کی وہ خواہش کریں گے ہم ان کے اختیار میں دے دیں گے۔
۲۳۔ وہ جنت میں شراب طہور سے پر جام، جن میں نہ بیہودگی ہے اور نہ گناہ، ایک دوسرے سے لیں گے۔
۲۴۔ اور ہمیشہ ان کے گرداگرد نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے، جو ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے صدف میں مروارید ہوں۔
۲۵۔ اس وقت ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے (ماضی کے بارے میں) سوال کریں گے۔
۲۶۔ کہیں گے کہ ہم اپنے گھر والوں کے درمیان خوف وہراس میں تھے۔
۲۷۔ لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا اور ہلاک کرنے والے عذاب سے ہمیں محفوظ رکھا۔

۲۸۔ ہم پہلے سے خدا کو نیکو کار اور رحیم کے القاب سے پکارتے تھے (اور پہچانتے تھے)۔

تفسیر

ہم اس دن خوف زدہ تھے اور آج انتہائی امن میں ہیں

گذشتہ آیات میں جنت کی نعمتوں میں سے نو حصوں کی طرف اشارہ ہوا تھا، اور زیر بحث آیات میں ان کو جاری رکھتے ہوئے، دوسرے پانچ حصوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس طرح ان سب کے مجموعہ سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ آرام و آسائش و لذت و سرور و شادی کے لیے جو کچھ لازم و ضروری ہے وہ سب کچھ ان کے لیے جنت میں فراہم ہوگا۔

پہلے بہشتیوں کی غذاؤں میں سے دو حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، : "ہمیشہ انواع و اقسام کے پھلوں اور گوشت میں سے جس نوع کی طرف وہ مائل ہوں گے ہم اسے ان کے اختیار میں دے دیں گے" (وامددناهم بفاكهة ولحم مما يشتهون)۔

"امددناهم" "امداد" کے مادہ سے اضافہ و افزائش اور عطا کرنے کے معنی میں ہے، یعنی جنت کے پھل اور کھانے اس قسم کے نہیں ہیں کہ وہ کھانے سے کم ہو جائیں، یا وہ دنیا کے پھلوں کے مانند نہیں ہیں۔ جو سال کی فصلوں میں بہت سی تبدیلیاں رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ ان میں ہمیشگی، جاودانی اور استمرار اور تسلسل ہے۔

"مما يشتهون (وہ جس میں سے چاہیں گے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشتی ان پھلوں اور غذاؤں کی نوع مقدار اور کیفیت کے انتخاب میں کامل طور سے آزاد ہوں گے وہ جو بھی چاہیں ان کے اختیار میں ہے۔

البتہ جنت کے کھانے صرف انہیں دو میں منحصر نہیں ہیں، لیکن یہ دو اہم غذائیں ہیں، "فاكهة" کو "لحم" پر مقدم رکھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "پھلوں" کو "گوشتوں" پر برتری حاصل ہے۔

اس کے بعد بہشتیوں کے خوشگوار اور مزیدار مشروبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، : "وہ بہشت میں شراب طہور سے پر جام —— جن میں نہ تو مستی ہوگی، اور نہ ہی بیہودہ گوئی اور نہ کوئی گناہ —— ایک دوسرے سے لیں گے" (يتنازعون فيها كأسا لا لغو فيها ولا تأثيم)۔

بلکہ وہ ایسی شراب ہے جو خوشگوار و لذت بخش ہے، نشاط آفرین اور روح پرور ہے، اور اس میں کسی قسم کا نشہ اور عقل کا فساد اور خرابی نہیں ہے، اور اس کے پینے سے کسی قسم کی بیہودہ گوئی اور گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس میں سراسر ہوش اور جسمانی و روحانی لذت ہے۔

"يتنازعون" "تنازع" کے مادہ سے ایک دوسرے سے لینے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات کھینچا تانی اور لڑائی جھگڑے کے معنی میں بھی آتا ہے، لہٰذا بعض مفسرین نے کہا ہے : یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشتی شوخی و مزاح اور سرور

دانبساط کی فراوانی کے باعث شراب طہور کے جام ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھین چھین کر پئیں گے۔

لیکن جیسا کہ بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ: "تنازع" جب کسی موقع پر "کأس" (جام) کے لیے استعمال ہوتا ہے تو ایک دوسرے سے لینے کے معنی میں ہوتا ہے، کشمکش اور کھینچا تانی کے معنی میں نہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "کأس" اس جام کو کہتے ہیں جو شراب سے پر ہو، اور خالی برتن کو "کأس" نہیں کہتے[1]

بہرحال چونکہ کأس کی تعبیر بعض اوقات دنیا کی نشہ دینے والی شرابوں کے معنی کی یاد دلاتی ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے: اس شراب میں نہ تو لغو اور بے ہودہ گوئی ہے اور نہ ہی گناہ، کیونکہ وہ ہرگز انسان کی عقل و ہوش کو زائل نہیں کرے گی، اس بنا پر وہ غیر موزوں باتیں اور قبیح اعمال جو مستوں سے سرزد ہوتے ہیں، ہرگز ان سے سرزد نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس بنا پر کہ وہ شراب طہور ہے، انہیں زیادہ خالص، زیادہ پاک اور زیادہ ہوشیار کر دے گی۔

اس کے بعد چوتھی نعمت کو —— جو بہشت میں خدمت گذاروں کے ہونے کی نعمت ہے —— پیش کرتے ہوئے کہتا ہے، "ہمیشہ ان کے گرداگرد نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے، جوان موتیوں کی طرح ہوں گے جو صدف میں ہوتے ہیں" (او یطوف علیھم غلمان لھم کانھم لؤلؤ مکنون)۔

"مروارید صدف کے اندر" اس قدر تازہ صاف شفاف اور خوبصورت ہوتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں ہے، اگرچہ صدف کے باہر بھی ان کی خوبصورتی جوں کی توں باقی رہتی ہے لیکن ہوا کا گرد و غبار، اور ہاتھوں کی آلودگی، کچھ نہ کچھ اس کی صفائی میں کمی کر دیتی ہے جنت کے خدمت گزار اس قدر خوبصورت، سفید چہرہ اور باصفا ہوں گے جیسا کہ صدف کے اندر مروارید ہوتے ہیں۔

"یطوف علیھم" (ان کے گرد طواف کریں گے) کی تعبیر خدمت کے لیے ان کی دائمی آمادگی کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ بہشت میں خدمت گار کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی اور وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے اختیار میں ہوگا، لیکن یہ خود بہشتیوں کے زیادہ سے زیادہ احترام کے لیے ہوگا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اکرمؐ سے لوگوں نے سوال کیا کہ اگر خدمت گذار صدف میں موجود مروارید کی طرح ہوں گے تو پھر مخدوم یعنی جنت کے مؤمنین کس طرح کے ہوں گے تو آپؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ فضل المخدوم علی الخادم کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب

"مخدوم کی وہاں پر خادم پر برتری ایسی ہوگی جیسی کہ چودہویں کے چاند کو باقی ستاروں پر برتری ہے"[2]

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے: الکأس الاناء بمافیہ من الشراب؛ "مجمع البحرین" میں بھی یہی تفسیر کأس کے بارے میں آئی ہے اور اگر شراب سے خالی ہو تو اسے "قدح" کہا جاتا ہے۔

[2] "روح البیان" "کشاف" "قرطبی" "روح البیان" و "ابوالفتوح رازی"۔

"لھم" کی تعبیر اس بات کی نشاندھی کرتی ہے کہ مومنین میں سے ہر ایک کے لیے کچھ مخصوص خدمت گذار ہوں گے، اور چونکہ جنت غم و اندوہ کی جگہ نہیں ہے اس لیے وہ خدمت گذار بھی مومنین کی خدمت سے لذت حاصل کریں گے۔

اور اس سلسلہ کی آخری نعمت وہی مکمل سکون و آرام اور ہر قسم کے عذاب و سزا سے دلی اطمینان ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "اس حالت میں جب کہ وہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے ہوں گے، تو گذرے ہوئے دنوں کے حالات کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے" اور اس کا جنت کے حالات سے موازنہ کرتے ہوئے لذت حاصل کریں گے (و اقبل بعضھم علیٰ بعض یتساءلون)۔

"وہ کہیں گے ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں خائف و ترساں رہتے تھے" (قالوا انا کنا قبل فی اھلنا مشفقین)۔

باوجود اس کے کہ ہم اپنے گھر والوں کے درمیان رہتے تھے لہذا ہمیں تو امن و امان کا احساس کرنا چاہیئے تھا مگر پھر بھی ہم خائف ہی تھے، ہمیں اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ ناگوار حوادث اور عذاب الٰہی کسی بھی لمحہ آن پہنچے گا، اور ہمیں پکڑ لے گا۔

ہم اس بات سے ڈرتے تھے کہ ہماری اولاد اور گھر والے غلط راستے پر چل پڑیں گے، اور وادیِ ضلالت میں گمراہ و سرگرداں پھریں گے۔

اور ہمیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ سنگدل دشمن ہمیں غفلت میں رکھ کر ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔

"لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا، اور اس کی رحمت واسعہ ہمارے شامل حال ہوئی، اور ہمیں ہلاک کرنے والے عذاب سے محفوظ رکھا" (فمن اللہ علینا و وقانا عذاب السموم)۔

ہاں! مہربان پروردگار نے ہمیں دنیا کے زندان سے اس کی تمام وحشتوں کے ساتھ نجات بخشی، اور اپنی نعمتوں کے مرکز یعنی جنت میں ہمیں جگہ دی۔

وہ جب اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں، اور اس کے جزئیات اپنے حافظہ میں لاتے ہیں، اور موجودہ حالات کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہیں تو خدا کی عظیم نعمتوں اور اس کے مواہب کی قدر و قیمت کو زیادہ سے زیادہ پاتے ہیں، اور یہ بات ان کے لیے اور بھی زیادہ لذت بخش اور دلچسپ ہو جاتی ہے، کیونکہ اس موازنہ کے ذریعہ ان کی قدر و قیمت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

اہلِ جنت اس آخری گفتگو میں جو ان کی طرف سے یہاں نقل ہوئی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں، کہ وہ خدا کے رحیم ہونے کو، وہاں ہر زمانہ سے زیادہ محسوس کرتے ہیں، وہ کہیں گے، : "ہم پہلے سے خدا کو پکارتے تھے اور اُس کو نیک مطلوب اور رحیم کہہ کر تعریف کرتے تھے" (انا کنا من قبل ندعوہ انہ ھو البر الرحیم)۔

لیکن ہم یہاں ان صفات کی حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے، کہ اس نے ہمارے حقیر اعمال کے مقابلہ میں کتنی نیکیاں کی ہیں، اور ہماری اس قدر لغزشوں کے باوجود ہمیں اپنی رحمت کا مشمول کیا ہے۔

ہاں! قیامت کا منظر اور جنت کی نعمتیں خدا کے اسماء و صفات کی تجلی گاہ ہیں اور مومنین ان مناظر کا مشاہدہ کر کے ہر زمانہ سے زیادہ ان اسماء و صفات کی حقیقت سے آشنا ہوں گے، یہاں تک کہ دوزخ بھی اس کے صفات کو ہی بیان کرتی ہے، اور اس

کی حکمت، عدالت اور قدرت کی نشاندہی کرتی ہے۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ "یتساءلون" "سوال" کے مادہ سے، ایک دوسرے سے سوال کرنے کے معنی میں ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل جنت میں سے تمام اپنے دوستوں سے سوال کریں گے، اور ان کے ماضی کے حالات ان سے دریافت کریں گے، کیونکہ ان مسائل کو یاد کرنا، اور ان تمام مصائب وآلام سے نجات پانا، اور ان تمام نعمتوں کا حصول، خود بھی ایک لذت ہے، ٹھیک اسی طرح سے کہ جب انسان کسی خطرناک سفر سے لوٹتا ہے، اور امن وامان کے ماحول میں بیٹھتا ہے، تو اپنے ساتھیوں سے ان کے گذرے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان کے نجات پانے سے اظہار خوشی کرتا ہے۔

۲۔ "مشفقین" "اشفاق" کے مادہ سے، جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "خوف سے ملی ہوئی توجہ" کے معنی میں ہے اور جب وہ "من" کے لفظ سے متعدی ہو جائے تو "خوف" کا مفہوم اس میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ اور جس وقت "فی" کے لفظ سے متعدی ہو تو "توجہ اور عنایت" کا مفہوم اس میں زیادہ ظاہر ہوگا۔

یہ لفظ اصل میں "شفق" کے مادہ سے لیا گیا ہے یہ وہی روشنی ہے جو تاریکی کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔

اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ دنیا میں کس چیز کا خوف رکھتے تھے، اور کس چیز کی طرف توجہ اور عنایت رکھتے تھے۔

یہاں تین احتمال ہیں، جن کو ہم نے آیت کی تفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے (خدا کا خوف اور اپنی نجات کی طرف توجہ، گھر والوں کے انحراف کا خوف اور ان کی تربیت کے معاملہ پر توجہ، دشمنوں کا خوف اور ان کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کی طرف توجہ) اگرچہ بعد والی آیات کی طرف توجہ خصوصاً جملہ "فمن اللہ علینا ووقانا عذاب السموم" "خدا نے ہم پر احسان کیا، اور مار ڈالنے والے عذاب سے ہمیں بچا لیا"، سے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۳۔ "فی اھلنا" کی تعبیر یہاں ایک وسیع معنی رکھتی ہے۔ اور سب اولاد وازواج اور احباب کو شامل ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اصولی طور پر اس قسم کی جمعیت کے درمیان ہر جگہ سے زیادہ امنیت کا احساس کرتا ہے۔ جب انہی کے درمیان خوف زدہ اور بیناک ہو، تو دوسرے حالات میں تو اس کی وضع وکیفیت معلوم ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تعبیر ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ جو غیر مومن گھرانوں میں گرفتار تھے، یہاں تک کہ وہ خود ان سے ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ڈٹے رہے۔ اور لطف الٰہی پر بھروسہ کرتے ہوئے استقلال دکھایا اور ان جیسے نہ بنے۔

۴۔ "سموم" اس حرارت کے معنی میں ہے جو "مسام" بدن (وہ چھوٹے چھوٹے سوراخ جو جلد کی سطح پر ہوتے ہیں) میں داخل ہو جاتی ہے، اور انسان کو تکلیف پہنچاتی ہے یا اسے ہلاک کر دیتی ہے، اور باد سموم بھی ایسی ہی ہوا کو کہتے ہیں، اور "عذاب سموم" بھی اسی قسم کا عذاب ہے، "سم" کے لفظ کا ہلاک کرنے والے مواد پر اطلاق بھی، تمام بدن میں ان کے نفوذ کی بنا پر ہے۔

۵۔ "بر" جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے اصل میں خشکی کے معنی میں ہے (سمندر اور دریا کے مقابلہ میں)

اس کے بعد ان افراد پر جن کے نیک اعمال بہت زیادہ اور وسیع ہوں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے، اور اس پاک نام کے لیے زیادہ شائستہ اور لائق خدا کی پاک ذات ہے، جس کی نیکی اور احسان نے تمام جہان والوں کو گھیر رکھا ہے۔

۲۔ "آیات کی جمع بندی"، ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اور گذشتہ آیات میں حقیقت میں جنت کی نعمتوں کے چودہ حصے بیان کئے گئے ہیں۔

جنت کے باغات (جنات) ـــ اس کی گوناں گون نعمتیں (نعیم) ـــ سرور و شادمانی ـــ عذاب جہنم سے امن و امان ـــ بہشت کے ماکولات و مشروبات میں سے گوارا طور پر کھانا پینا ـــ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنا ـــ حور العین میں سے بیویاں ـــ مومن اولاد کا ان کے ساتھ ملحق ہونا ـــ انواع و اقسام کے لذت بخش پھل ـــ انواع و اقسام کے گوشت ـــ جو کچھ وہ چاہیں گے ـــ شراب طہور سے پر جام ـــ مرد و ارید جیسے خدمت گذار ـــ اور آخر میں مجلس انس برپا کر کے ماضی کو یاد کرنا اور موجودہ حالت سے لذت حاصل کرنا!

ان نعمتوں کا ایک حصہ تو مادی پہلو رکھتا ہے، اور دوسرے حصہ میں معنوی پہلو غالب ہے، ان سب چیزوں کے باوجود پھر بھی جنت کی مادی اور معنوی نعمتیں انہیں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ صرف ان کا ایک گوشہ ہے۔

۲۹- فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝
۳۰- اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝
۳۱- قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝
۳۲- اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝
۳۳- اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝
۳۴- فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۹- اب جبکہ ایسا ہے تو تم نصیحت کرتے رہو، کیونکہ تم اپنے پروردگار کے لطف سے کاہن و مجنون نہیں ہو۔
۳۰- بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے، جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔
۳۱- کہہ دو! کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں (تم میری موت کا انتظار کرو اور میں اپنی کامیابی اور تمہاری نابودی کا انتظار کرتا ہوں)۔
۳۲- کیا ان کی عقلیں انہیں ان کاموں کا حکم دیتی ہیں؟ یا وہ سرکش قوم ہیں۔
۳۳- وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا اس نے خدا پر افتراء باندھا ہے، لیکن وہی ایمان نہیں رکھتے۔
۳۴- اگر وہ سچ کہتے ہیں تو وہ بھی اسی قسم کا کلام لے آئیں۔

شانِ نزول

ایک روایت میں آیا ہے کہ قریش "دارالندوہ"[1] میں جمع ہوئے، تاکہ پیغمبر اسلام کی دعوت کو رد کرنے کے لیے — جو ان کے نامشروع منافع کے لیے ایک عظیم خطرہ سمجھی جاتی تھی — غور و فکر کریں۔

"بنی عبدالدار" کے قبیلہ کے ایک شخص نے کہا: ہمیں اس کے مرنے کا انتظار کرنا چاہیئے، کیونکہ بہرحال وہ ایک شاعر ہے اور عنقریب دنیا سے چل بسے گا، جیسا کہ "زہیر" "نابغہ" اور "اعشیٰ" (زمانۂ جاہلیت کے تین شاعر) دنیا سے چلے گئے (جن کی بساط پلٹ گئی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بساط بھی اس کی موت کے ساتھ ہی پلٹ جائے گی) یہ کہہ کر وہ پراگندہ ہو گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں، اور انہیں جواب دیا۔[2]

تفسیر

اگر سچ کہتے ہیں تو اس کے مانند کلام لے آئیں

گزشتہ آیات میں جنت کی نعمتوں اور پرہیزگاروں کی پاداشوں کے ایک قابل توجہ حصہ کو بیان کیا گیا تھا، اور ان سے پہلے کی آیات میں بھی دوزخیوں کے دردناک عذاب کا ایک حصہ آیا تھا۔

پہلی زیر بحث آیت میں گزشتہ آیات سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتا ہے، "اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم نصیحت کرتے رہو اور یاد دلاتے رہو" (فذکر)۔

کیونکہ حق طلب لوگوں کے دل ان باتوں کے سننے سے زیادہ آمادہ ہوں گے، اور اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ تو ان کے لیے حق باتیں بیان کرے۔

یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے، کہ ان دونوں گروہوں کی سزاؤں اور نعمتوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد، نئے حقائق کو قبول کرنے کے لیے روحانی طور پر آمادہ کرتا ہے اور حقیقت میں ہر بات کرنے والے کو اپنے کلام کے نفوذ اور بات کی تاثیر کے لیے اس روش سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

---

[1] "دارالندوہ" قصی بن کلاب عربوں کے مشہور جد اعلیٰ کا گھر جس میں اہم امور کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے، اور مشورے کرتے تھے، یہ گھر خانہ خدا کے قریب تھا، اور اس کا دروازہ کعبہ کی جانب کھلتا تھا، اور اس کی مرکزیت مجالس مشورت کے لیے خود قصی بن کلاب کے زمانہ سے تھی (سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۲ و جلد اول ص ۱۲۲)۔

[2] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۳۱۔

اس کے بعد ان اتہامات اور نارو انسبتوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے افراد پیغمبر کو دیا کرتے تھے، فرماتا ہے، "اپنے پروردگار کے لطف وکرم اور اس کی نعمتوں کی برکت سے تو کاہن ومجنون نہیں ہے" (فما انت بنعمة ربك بكاهن ولا مجنون)۔

"کاھن" اس کو کہا جاتا تھا جو اسرار غیبی کی خبر دیتا تھا اور غالباً اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ جنات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے، اور ان سے غیب کی خبریں حاصل کرتا ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت میں کاہن بہت تھے، منجملہ ان کے دو مشہور کاہن "شق" اور "سطیح" تھے، حقیقت میں وہ ایسے ہوشیار لوگ تھے جو اپنی ہوش وخرد سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دعووں کے ذریعہ لوگوں کو سرمست رکھتے تھے، کہانت اسلام میں حرام وممنوع ہے۔ اور کاہنوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ اسرار غیب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اس کے بعد انبیاء اور ائمہ میں سے جس کے متعلق مصلحت سمجھتا ہے وہ انہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔

بہر حال قریش لوگوں کو پیغمبر اسلام کے پاس سے ہٹانے کے لیے یہ تہمتیں ان پر لگاتے تھے، کبھی تو انہیں کاہن اور کبھی مجنون، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان دونوں صفات کے تضاد سے بھی واقف نہیں تھے، کیونکہ کاہن تو ہوشیار لوگ تھے، جو مجنون ہونے کے برعکس بات ہے۔ اور اوپر والی آیت میں ان دونوں افتراؤں کو جمع کرنا شاید ان کی اسی پراگندہ گوئی کی طرف اشارہ ہو۔

اس کے بعد تیسرے اتہام کو پیش کرتا ہے کہ وہ بھی گزشتہ صفات سے تضاد رکھتا ہے، فرماتا ہے: "بلکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں" (ام یقولون شاعر نتربص به ریب المنون)۔

جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک اس کے اشعار کی رونق رہے گی اور وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا رہے گا تھوڑی سی دیر کے لیے صبر کرو، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔

اور اس کے اشعار کا دفتر اس کی عمر کے طومار کی طرح لپیٹ دیا جائے، اور طاق نسیاں کے سپرد ہو جائے، اس دن ہمیں راحت وآرام نصیب ہو جائے گا۔

جیسا کہ کتب لغت وتفسیر سے معلوم ہوتا ہے، "منون" "من" کے مادہ سے اصل میں دو معنی کے لیے آیا ہے "نقصان" اور "قطع وبرید کرنا" اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے قریبی مفہوم رکھتے ہیں۔

اس کے بعد لفظ "منون" موت کے بارے میں بھی اطلاق ہونے لگا، کیونکہ وہ "ینقص العدد و یقطع المدد" (افراد کو کم اور امداد کو منقطع کر دیتی ہے)

بعض اوقات "منون" زمانہ کے گذر جانے کو بھی کہا جاتا ہے، اس مناسبت سے کہ وہ بھی موت اور مرنے کا سبب، تعلقات کے ٹوٹنے اور افراد کی کمی کا باعث ہوتا ہے، اور بعض اوقات رات اور دن کو بھی "منون" کہتے ہیں اور وہ بھی ظاہراً اسی مناسبت کی وجہ سے ہے[1]

باقی رہا لفظ "ریب" اصل میں شک وتردد اور اس چیز کے توہم کے معنی میں ہے کہ جس کے اوپر سے بعد میں پردہ اٹھ جائے

---

[1] "لسان العرب"، "مفردات راغب"، "المنجد" اور "تفسیر قرطبی" کی طرف رجوع کیا جائے۔

گا اور حقیقت واضح و آشکار ہو جائے گی۔

یہ تعبیر جب موت کے بارے میں استعمال ہو، اور "ریب المنون" کہا جائے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ اس کے آنے کا وقت معلوم نہیں ہے، نہ کہ اس کا حقیقت میں واقع ہونا[1]

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے "ریب المنون" کی، زیر بحث آیت میں "حوادث روزگار" کے معنی میں تفسیر کی ہے، یہاں تک کہ ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ لفظ "ریب" قرآن میں ہر جگہ "شک و تردد" کے معنی میں ہے، سوائے سورۂ طور کی اس آیت کے کہ جہاں "حوادث کے معنی میں ہے[2]

بعض مفسرین نے اس کی "اضطراب اور پریشانی کی حالت کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے، اس بنا پر "ریب المنون" وہ اضطرابی حالت ہے جو موت سے پہلے اکثر افراد کو عارض ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہ تفسیر اوپر والے معنی کی طرف ہی لوٹے، کیونکہ عام طور پر شک و تردید کی حالت اضطراب و پریشانی کا سرچشمہ بنتی ہے، اسی طرح ایسے حوادث بھی جن کی پیش بینی نہ ہو ایک قسم کا اضطراب اور شک و تردید اپنے ہمراہ لاتے ہیں، اس طرح سے یہ سب کے سب مفاہیم "شک و تردید" کی جڑ کی طرف ہی، جو اصل میں اس لفظ کا معنی ہے، منتہی ہوتے ہیں۔

اور دوسرے لفظوں میں "ریب" کے لیے تین معنی بیان ہوئے ہیں، شک، اضطراب، حوادث، اور یہ سب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

بہر حال وہ اس چیز سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے کہ کوئی حادثہ پیش آئے اور پیغمبرؐ کی عمر کا دفتر لپٹ جائے، اور ان کے گمان کے مطابق، اس عظیم مشکل سے — جو آنحضرت کی دعوت نے ان کے سارے معاشرے میں پیدا کر دی تھی — انہیں رہائی مل جائے۔

قرآن ایک پر معنی اور تہدید آمیز جملہ سے، ان دل کے اندھے اور عناد رکھنے والے افراد کو جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں" (قل تربصوا فانی معکم من المتربصین)۔

تم اپنی خام خیالی کے پورا ہونے کے انتظار میں رہو، اور میں تمہارے لیے عذاب الٰہی کے انتظار میں ہوں۔

تم اس انتظار میں رہو کہ میری موت کی وجہ سے اسلام کی بساط لپیٹ دی جائے، اور میں بھی پروردگار کی مدد سے اس انتظار میں ہوں کہ میری زندگی ہی میں دین اسلام عالمگیر ہو جائے، اور میرے بعد بھی اپنے راستے کو جاری و ساری رکھے اور آفاقی و جاودانی ہو جائے۔

ہاں! تم تو اپنے خیالات و تصورات پر تکیہ کئے ہوئے ہو، اور میں پروردگار کے لطف خاص پر تکیہ کئے ہوں۔

اس کے بعد انہیں شدید ترین طریقہ سے سرزنش و ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا ان کی عقلوں نے انہیں ان اعمال کا

---

[1] "راغب" (در مفردات)۔

[2] "قرطبی" جلد ۹ صفحہ ۶۲۳۲۔

حکم دیا ہے ؟ یا وہ ایک سرکش قوم ہیں ؟ (ام تأمرھم احلامھم بھٰذا ام ھم قوم طاغون)۔[1]

سرداران قریش اپنی قوم میں " ذوی الاحلام " (صاحبان عقل) کے لقب سے پہچانے جاتے تھے ! قرآن کہتا ہے : یہ کون سی عقل ہے جو اس وحی آسمانی کو، جس کے تمام مضامین و مطالب سے حقانیت کی نشانیاں واضح ہیں، شعر و کہانت کا نام دیتی ہے ؟ اور اس کے لانے والے کو — جو ایک زمانہ دراز سے امانت و عقل میں شہرت کا مالک ہے — کاہن و مجنون اور شاعر کہتی ہے ؟

اس بنا پر اس قسم کی تہمتوں اور الزامات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ان کی عقل کا فرمان نہیں ہے، بلکہ ان سب کا سرچشمہ روح عصیان و سرکشی ہے، جو ان افراد پر غالب ہے، جونہی کہ وہ اپنے نامشروع منافع کو خطرے میں دیکھتے ہیں، تو عقل کو الوداع کہہ دیتے ہیں اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مقابلہ میں طغیان و سرکشی پر اتر آتے ہیں۔

" احلام " جمع " حلم " (بروزن فہم) " عقل " کے معنی میں ہے۔ لیکن " راغب " کے قول کے مطابق " حلم " حقیقت میں " ہیجان و غضب کے وقت اپنے اوپر کنٹرول کرنے " کے معنی میں ہے، جو عقل و درایت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی شمار ہوتا ہے، اور حلم (بروزن علم) کے ساتھ ایک مشترک تعلق رکھتا ہے) یہ لفظ (حلم) بعض اوقات " خواب و رؤیا " کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اور زیر بحث آیت میں بھی اس قسم کی تفسیر بعید نہیں ہے یعنی ان کی باتیں پریشان خوابوں کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

پھر ایک اور دوسری تہمت کی طرف — جو درحقیقت ان اتہامات کے سلسلہ کی چوتھی تہمت شمار ہوتی ہے۔ اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، : " وہ کہتے ہیں : اس نے اس قرآن کا خدا پر افترا باندھا ہے۔ لیکن وہ ایمان نہیں رکھتے " (ام یقولون تقولہ بل لایؤمنون)۔

" تقولہ " " تقول " (بروزن تکلف) کے مادہ سے، اس گفتگو کے معنی میں ہے جسے انسان اپنی طرف سے گھڑ لیتا ہے درحالیکہ اس میں کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہوتی۔[2]

مشرکین اور ہٹ دھرم کافروں کا قرآن مجید اور پیغمبر کی دعوت کو تسلیم نہ کرنے کا یہ ایک اور بہانہ تھا، جس کی طرف قرآن کی آیات میں بارہا اشارہ ہوا ہے۔

لیکن قرآن مجید انہیں ایک دندان شکن جواب دیتا ہے : فرماتا ہے " اگر وہ سچ کہتے ہیں کہ یہ بشر کا کلام ہے، اور فکر انسانی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ تو پھر وہ بھی اس قسم کی بات بنا کر لے آئیں " (فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین)۔

---

[1] اس بارے میں کہ یہاں " ام " استفہامیہ ہے یا " منقطعہ " اور " بل " کے معنی میں مفسرین میں سے ہر ایک نے ایک جدا احتمال دیا ہے اگرچہ اکثر نے دوسرے کو ترجیح دی ہے، لیکن آیات کا سیاق پہلے معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن توجہ رکھنا چاہیے کہ " ام " اس قسم کے مواقع پر حتمی طور سے ہمزہ استفہام کے بعد ہونا چاہیئے، اسی لیے فخر رازی نے اس کے لیے ایک تقدیر بیان کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ " ام انزل علیھم ذکر ام تأمرھم احلامھم بھٰذا " کیا ان پر خدا کی طرف سے کوئی بات نازل ہوئی ہے یا ان کی عقلیں اس قسم کا حکم کرتی ہیں ؟ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو یا تو دلیل منقول کا تابع ہونا چاہیئے یا دلیل عقل کا۔

[2] " مجمع البیان " میں آیا ہے : التقول : تکلف القول ولا یقال ذلک الا فی الکذب۔

تم بھی انسان ہو، اور خود اپنے قول کے مطابق تم مکمل ہوش، بیان کی استطاعت اور انواع واقسام کی گفتگو سے آگاہی اور اس پر قدرت رکھتے ہو، تو تمہارے خطیب اور مفکرین اس جیسی بات بنا کر لانے کی طاقت کیوں نہیں رکھتے ؟

"فلیأتوا" (پس لے آئیں) کا جملہ اصطلاح کے مطابق امر تعجیزی ہے، اور اس کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کے عجز وناتوانی کو مقابلہ بالمثل سے ثابت کرے، اور یہ وہی چیز ہے جسے علم کلام میں "تحدی" اور چیلنج سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی مخالفین کو معجزات کے مقابلہ میں معارضہ اور مقابلہ بالمثل کی دعوت۔

بہرحال یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے، جو وضاحت کے ساتھ قرآن کے اعجاز کو روشن وآشکار کرتی ہیں، اور اس کا مفہوم پیغمبر کے زمانہ کے لوگوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام ایسے لوگ جو کسی بھی قرن اور زمانہ میں یہ کہتے ہوں کہ قرآن انسان کا کلام ہے، اور خدا پر افترا باندھا گیا ہے، وہ بھی اس خطاب کے مخاطب ہیں، کہ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اس جیسا کلام لے آئیں۔

اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، قرآن کی یہ ندا، اس آیت میں بھی، اور اس کے مشابہ دوسری آیات میں بھی، ہمیشہ سے بلند ہے، اور چودہ صدیوں کے اندر، جو بعثت پیغمبرؐ کے بعد سے گذر چکی ہیں، کوئی بھی اس کا مثبت جواب نہیں دے سکا، حالانکہ مسلمہ طور سے دشمنانِ اسلام خصوصاً ارباب کلیسا (عیسائی) اور یہودی، اربوں ڈالر سالانہ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈے پر صرف کر رہے ہیں، ان کے لیے کوئی بات مانع نہیں تھی کہ ان کا ایک حصہ مخالف دانشمندوں ادیبوں اور سخن وروں کے کسی گروہ کو دے دیتے تاکہ وہ قرآن کے مقابلہ میں معارضہ ومقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اور "فلیأتوا بحدیث مثلہ" کا مصداق بنیں، اور یہ عمومی عجز، اس وحی آسمانی کی اصالت کا ایک زندہ گواہ ہے۔

ایک مفسر نے یہاں ایک نکتہ پیش کیا ہے جو قابل توجہ ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ اس قرآن میں ایک مخصوص راز ہے، اور جو شخص بھی اس کی آیات کے مقابل آتا ہے، وہ اسے محسوس کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ اسرار اعجاز کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

وہ اس قرآن کی عبارتوں میں ایک خاص نفوذ وغلبہ کو محسوس کرتا ہے۔ اور ان معانی کے ماوراء ایک اور چیز عقل انسانی میں منعکس ہوتی ہے۔ اس کی عبارتوں کے اندر ایک ایسا عنصر پوشیدہ ہے۔ جو سننے کے ساتھ ہی انسان کے وجود میں سما جاتا ہے، بعض اس کا آشکارا طور پر اور بعض پنہاں طور سے ادراک کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ غلبہ اور نفوذ موجود ہے، ایسا اسرار آمیز نفوذ جس کے ظہور کو اچھی طرح مشخص نہیں کیا جاسکتا۔

کیا یہ قرآن کے کلمات اور عبارتیں ہیں جو اس قسم کا انداز رکھتی ہیں ؟

یا اس کے معانی کے عمق اور گہرائی میں کوئی راز چھپا ہوا ہے،

یا وہ عکس ہیں جو اس کے انوار سے چمکتے ہیں،

یا یہ سب ملے جلے امور ہیں ؟

غرض وہ جو کچھ بھی ہے، ان سب کلمات ومفاہیم سے۔ جو لغات کے قالب میں ڈھالے جاتے ہیں مختلف ہے۔

یہ وہ راز ہے جو قرآن کی آیات میں چھپا ہوا ہے، اور ہر شخص پہلی ہی مرتبہ جب اس کے سامنے ہوتا ہے تو اسے محسوس کرلیتا ہے اور اس کے بعد دوسرے اسرار کی تلاش میں لگ جاتا ہے، جو غور وفکر کے ذریعہ سارے قرآن سے حاصل ہوتے ہیں۔[1]

اعجاز قرآن کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد (سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳ کے ذیل میں) کی طرف رجوع کریں، وہاں ایک تفصیلی بحث اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہے، اسی طرح جلد ۱۲ (سورۂ اسراء کی آیت ۸۸ کے ذیل میں)۔

[1] "فی ظلال القرآن" جلد ۷، صفحہ ۶۰۵۔

۳۵- اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝
۳۶- اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝
۳۷- اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝
۳۸- اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝
۳۹- اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ۝
۴۰- اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝
۴۱- اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝
۴۲- اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝
۴۳- اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۵۔ کیا وہ کسی چیز (سبب) کے بغیر پیدا کئے گئے ہیں یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں ؟
۳۶۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ؟ بلکہ وہ یقین کے طلبگار ہی نہیں ہیں۔
۳۷۔ کیا ان کے پاس پروردگار کے خزانے ہیں ؟ یا وہ عالم کی تمام چیزوں پر غلبہ و تسلط رکھتے ہیں ؟
۳۸۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس کے ذریعہ وہ آسمان کے اوپر چڑھ جاتے ہیں) اور اس کے ذریعہ اسرار وحی کو سنتے ہیں ؟ ان میں سے جو بھی کوئی یہ دعویٰ رکھتا ہو تو وہ کوئی واضح دلیل پیش

کرے!

۲۹۔ کیا خدا کے حصہ میں تو لڑکیاں ہیں اور تمہارے حصہ میں لڑکے؟ (کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہو)۔

۴۰۔ کیا تو ان سے اجر اور مزدوری کا مطالبہ کرتا ہے جس کے بھاری بوجھ کے نیچے وہ دب گئے ہیں؟

۴۱۔ کیا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں جسے وہ لکھ لیتے ہیں؟

۴۲۔ کیا وہ تیرے لیے کوئی شیطانی منصوبہ بنانا چاہتے ہیں؟ لیکن وہ جان لیں کہ ان شیطانی منصوبوں کے جال میں خود کافر ہی گرفتار ہوں گے۔

۴۳۔ یا وہ خدا کے علاوہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں (جس نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے) جسے وہ خدا کا شریک بناتے ہیں خدا کی ذات اس سے پاک اور منزہ ہے۔

تفسیر

سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کونسی ہے؟!

یہ آیات، قرآن، نبوت اور پروردگار کی قدرت کے منکرین کے مقابلہ میں اسی طرح سے گزشتہ استدلالی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ ایسی آیات ہیں، جو سب کی سب "ام" کے ساتھ، جو یہاں استفہام کے لیے ہے، شروع ہوئی ہیں، اور "گیارہ پے در پے سوالوں کی" ایک عمدہ لڑی کو (استفہام انکاری کی صورت میں) ایک استدلال کے طور پر بیان کرتی ہیں۔ اور زیادہ واضح تعبیر میں —— مخالفین کے سامنے فرار کے تمام راستوں کو بند کر رہی ہیں —— اور ان مختصر اور پر نفوذ عبارتوں میں گھیر کر انہیں اس طرح سے ایک تنگ جگہ میں لے آئی ہیں، کہ انسان اس کی عظمت اور انتظام کے سامنے بے اختیار سر تعظیم جھکاتے ہوئے، اقرار و اعتراف کرتا ہے۔

پہلے مسئلہ خلقت و آفرینش سے شروع کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا بغیر کسی سبب کے پیدا ہوئے ہیں، یا خود ہی اپنے خالق ہیں" (ام خلقوا من غیر شیء ام هم الخالقون)۔[1]

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ آیت کا مفاد یہ ہے کہ "کیا وہ بلا مقصد (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

یہ کوتاہ اور مختصر عبارت حقیقت میں "علیت کی معروف دلیل" کی طرف اشارہ ہے۔ جو فلسفہ وکلام میں خدا کے وجود کے اثبات کے لیے بیان کی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں بلاشک وشبہ حادث ہے (کیونکہ وہ ہمیشہ تغیر وتبدیلی کی حالت میں ہے، اور جو چیز تغیر اور دگرگونی کی حالت میں ہو وہ حادث ہوتی ہے، اور جو چیز حادث ہو اس کے لیے محال ہے کہ وہ قدیم وازلی ہو)۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر عالم حادث ہے تو وہ پانچ حالتوں سے خالی نہیں ہے۔

۱۔ وہ بغیر کسی علت وسبب کے وجود میں آیا ہے۔

۲۔ وہ خود اپنے وجود کی علت ہے۔

۳۔ عالم کے معلولات اس کے وجود کی علت ہیں۔

۴۔ یہ جہان ایک ایسی علت کا معلول ہے کہ وہ بھی اپنی نوبت میں ایک دوسری علت کی معلول ہے، اور غیر متناہی سلسلہ تک معاملہ آگے جاتا ہے۔

۵۔ یہ جہان خداوند واجب الوجود کی مخلوق ہے جس کی ہستی اور وجود خود اسی کی ذات پاک سے ہے۔

پہلے چار احتمالوں کا باطل ہونا معلوم ہے، کیونکہ:

معلول کا وجود علت کے بغیر محال ہے، ورنہ ہر چیز ہر طرح کے حالات میں وجود میں آسکتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔

دوسرا احتمال کہ کوئی چیز خود اپنے آپ کو وجود میں لے آئے، یہ بھی محال ہے، کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے وجود سے پہلے موجود ہو، اور یہ اجتماع نقیضین ہے (غور کیجئے)

اسی طرح تیسرا احتمال بھی، کہ انسان کی مخلوقات ومعلول اس کی خالق وعلت ہو، واضح طور پر باطل ہے (کیونکہ اس سے دور لازم آتا ہے)۔

اور چوتھا احتمال بھی، یعنی علل واسباب کا تسلسل اور اس سلسلہ کا غیر متناہی حد تک کھنچ جانا بھی ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ غیر متناہی معلول ومخلوق آخر مخلوق ہے، اور وہ ایک خالق کی محتاج ہے، جس نے اس کو ایجاد کیا ہے، کیا غیر متناہی صفر کوئی عدد بن سکتا ہے؟ یا غیر متناہی ظلمت سے نور پھوٹ سکتا ہے؟ یا غیر متناہی فقر ونیاز سے بے نیازی وجود میں آسکتی ہے؟

اس بنا پر پانچویں احتمال یعنی واجب الوجود کے خالق ہونے کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، (پھر بھی غور کیجئے)۔

اور چونکہ اس برہان کا اصلی رکن، پہلے اور دوسرے احتمال کی نفی ہی ہے، لہٰذا قرآن نے اسی پر قناعت کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) اور ہدف کے پیدا کئے گئے ہیں، اور وہ کوئی پروگرام اور مسئولیت نہیں رکھتے؟ اگرچہ اس معنی کو مفسرین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ لیکن دوسرے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے (ام هم الخالقون) سے واضح ہو جاتا ہے، کہ اس سے مراد وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے یعنی "کیا وہ بغیر کسی علت اور سبب کے پیدا کئے گئے یا وہ خود اپنی علت آپ ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں کیا استدلال چھپا ہوا ہے۔

بعد والی آیت، ایک اور سوال کو بیان کرتے ہوئے — جو پچھلے مرحلہ کے دعویٰ کے بارے میں ہے — کہتی ہے: کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے" (ام خلقوا السماوات والارض)۔

اگر وہ کسی علت کے بغیر وجود میں نہیں آئے، اور وہ خود اپنے وجود کی علت بھی نہیں ہیں تو کیا وہ واجب الوجود اور آسمانوں اور زمین کے خالق ہیں، اور اگر عالم ہستی کا مبدء نہیں ہیں، تو کیا خدا نے آسمان وزمین کی خلقت کا معاملہ ان کے سپرد کر رکھا ہے؟ اور اس طرح سے وہ ایک ایسی مخلوق ہیں جو خود فرمان خلقت رکھتی ہو؟

مسلّمہ طور سے وہ ہرگز اس قسم کا باطل دعویٰ نہیں کر سکتے لہٰذا اس بات کے آخر میں مزید کہتا ہے،: "بلکہ وہ ہٹ دھرم ہیں اور یقین وایمان لانا ہی نہیں چاہتے" (بل لا یوقنون)۔

ہاں! وہ ایمان سے فرار کرنے کے لیے کسی بہانہ کی تلاش میں ہیں۔

اور اگر وہ ان امور کے مدعی نہیں ہیں، اور امر خلقت میں وہ کوئی حصہ نہیں رکھتے تو: "کیا تیرے پروردگار کے خزانے ان کے پاس ہیں"؟ (ام عندھم خزائن ربک)۔

تاکہ وہ جسے چاہیں نبوت وعلم ودانش کی نعمت یا دوسرے رزق بخشیں، اور جس سے چاہیں روک لیں۔

یا پھر یہ بات ہے کہ عالم کی تدبیر کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور وہ ہر چیز پر تسلط واقتدار رکھتے ہیں"؟ (ام ھم المصیطرون)۔

وہ ہرگز بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ پروردگار کے خزانہ دار ہیں، اور نہ ہی وہ اس جہاں کی تدبیر کے معاملہ میں کوئی تسلط رکھتے ہیں، چونکہ ایک حادثہ، ایک بیماری یا کسی حقیر سے موذی جانور کے مقابلہ میں ان کا ضعف وناتوانی، اور اسی طرح زندگی کے بالکل ابتدائی وسائل کے لیے ان کی ضرورت واحتیاج، ان قدرتوں کی ان سے نفی کی بہترین دلیل ہے۔ صرف ہوائے نفس، جاہ طلبی، خود خواہی، تعصب اور ہٹ دھرمی ہے جس نے انہیں حقائق سے انکار پر آمادہ کیا ہے۔

"مصیطرون" "ارباب انواع" کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ لوگوں کی خرافات اور بے ہودہ باتوں کا ایک حصہ ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کی انواع میں سے ہر نوع کا، چاہے وہ انسان ہوں یا حیوانات یا نباتات وغیرہ انواع، ایک خاص مدبر ومربی ہوتا ہے جسے وہ اس نوع کا رب النوع کہتے تھے۔ اور خدا کو "رب الارباب" کا خطاب دیتے تھے۔ یہ شرک آمیز عقیدہ اسلام کی نظر میں مردود ہے۔ اور قرآن کی آیات میں تمام جہان کی تدبیر خدا ہی کے ساتھ مخصوص کی گئی ہے، اور اس کو ہم "رب العالمین" کہہ کر پکارتے ہیں۔

لہ - خزائن" جمع ہے "خزینہ" کی جو کسی چیز کے منبع اور مرکز کے معنی میں ہے، جس کی حفاظت اور دوسروں کی رسائی سے بچانے کے لیے اُسے وہاں جمع اور ذخیرہ کیا گیا ہو، قرآن مجید کہتا ہے: وان من شیء الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم، "ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معلوم اندازے کے مطابق ہی اُسے نازل کرتے ہیں"۔ (حجر - ۲۱)۔

یہ لفظ اصل میں "سطر" سے لیا گیا ہے، جو لکھنے کے وقت کلمات کی صفوں کے معنی میں ہے اور "مسیطر" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کام پر تسلط رکھتا ہو اور اسے خط اور لائن دے، جیسا کہ لکھنے والا اپنے کلام کی سطور پر تسلط رکھتا ہے، (یہ بات دھیان میں رہے کہ یہ لفظ "صاد" کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے اور "سین" کے ساتھ بھی) اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے اگرچہ قرآن کا مشہور رسم الخط "صاد" کے ساتھ ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ پیغمبرؐ کی نبوت کے منکر اور زمانۂ جاہلیت کے مشرکین اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے کوئی بھی اوپر والے پانچ امور کا مدعی نہیں تھا۔ اس لیے بعد والی آیت میں ایک دوسرے مرحلہ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، یا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس سے وہ آسمان کے اوپر چڑھ جائیں، اور وحی کے اسرار اس ذریعہ سے سن لیں"؟ (ام لھم سلّم یستمعون فیہ)۔

اور چونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ اسرار آسمانی سے آگاہی کا دعویٰ کر دیں، لہٰذا قرآن بلا فاصلہ ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتا ہے، "جو شخص ان میں سے اس قسم کا دعویٰ رکھے اور یہ کہے کہ: میں آسمان پر چڑھ کر اسرار الٰہی کو سنتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوے کے لیے کوئی واضح دلیل پیش کرے" (فلیأت مستمعھم بسلطان مبین)۔

یقیناً اگر وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے تو ایک بھی بات نہ کر سکتے، اور اس مطلب پر ہرگز کوئی دلیل پیش نہ کرتے[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: کیا یہ نارو انسبت جو وہ فرشتوں کی طرف دیتے ہیں کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں قابل قبول ہے؟ "کیا خدا کے حصہ میں بیٹیاں اور تمہارے حصہ میں بیٹے ہیں؟" (ام لہ البنات ولکم البنون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے باطل عقائد و افکار میں سے ایک یہ تھا کہ وہ بیٹیوں سے شدید نفرت کرتے تھے، اور اگر انہیں خبر ملتی تھی کہ ان کی بیوی نے بیٹی جنی ہے، تو ان کا چہرہ غم واندوہ اور شرم وحیا کی شدت سے سیاہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

اگر ان کا عالم بالا کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ اور وہ اسرار وحی سے آشنا ہیں، تو کیا ان کی وحی کا نمونہ یہی مضحکہ خیز خرافات اور ننگین و شرم آگیں عقائد ہیں؟

یہ بات واضح ہے کہ لڑکی اور لڑکا انسانی قدر و قیمت کے لحاظ سے آپس میں کوئی فرق نہیں رکھتے، اور اوپر والی آیت کی تعبیر حقیقت میں طرف مقابل کے باطل عقیدے کے برخلاف استدلال کے قبیل سے ہے۔

قرآن نے متعدد آیات میں اس یہودہ عقیدہ کی نفی پر تکیہ کیا ہے، اور انہیں اس سلسلہ میں محاکمہ میں لے جا کر رسوا کرتا ہے[2]

---

[1] "سلّم" (بروزن خرم) سیڑھی کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات ہر قسم کے وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں آیا ہے، اس بارے میں کہ وہ کس چیز کے سننے کے مدعی تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اس کی وحی کے ساتھ تفسیر کی ہے، اور بعض نے ان نسبتوں کے لیے جو وہ پیغمبر کو دیتے تھے، جیسے شاعر و مجنون، یا وہ شریک جنہیں وہ خدا کے لیے خیال کرتے تھے، اور بعض نے پیغمبر سے نبوت کی نفی کے معنی میں تفسیر کی ہے (ان معانی میں جمع کرنا بھی بعید نہیں ہے اگرچہ پہلا معنی سب سے زیادہ واضح ہے۔

[2] اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے تھے؟ جب کہ بیٹی سے متنفر اور بیزار تھے؟ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر اس مرحلہ سے ایک منزل اور نیچے اترا ہے، اور ایک دوسری بات کی طرف جو ان کی بہانہ جوئی کا وسیلہ ہو سکتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا تو تبلیغ رسالت کے مقابلہ میں ان سے کسی اجر و صلہ کا مطالبہ کرتا ہے، جو ایک بھاری بوجھ کی طرح ان کے دوش پر رکھا ہے"؟ (ام تسئلھم اجرًا فھم من مغرم مثقلون)۔

"مغرم" (بروزن مکتب) "غرم" کے مادہ سے، اس نقصان کے معنی میں ہے جو بلا سبب انسان کے دامنگیر ہو جاتا ہے اور "غریم" طلب گار اور مقروض دونوں پر بولا جاتا ہے۔

"مثقل" "اثقال" کے مادہ سے، تحمیل، مشقت، اور بھاری بوجھ کے معنی میں ہے، اس بنا پر جملہ کا معنی اس طرح ہوگا: "کیا تو تبلیغ رسالت کے لیے ان سے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے جس کو ادا کرنے سے وہ ناتواں ہیں اور اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے"؟

یہ معنی قرآن مجید میں ـــ نہ صرف پیغمبر اسلام کے بارے میں بلکہ بہت سے پیغمبروں کے بارے میں ـــ بار ہا تکرار سے آئے ہیں کہ انبیاء کی سب سے پہلی باتوں میں سے یہ ہوتی تھی کہ وہ یہ کہتے تھے: "ہم تم سے دعوت الٰہی کی تبلیغ کے مقابلہ میں کسی قسم کے اجر و صلہ کا مطالبہ نہیں کرتے" تاکہ ان کی بے مثالی بھی ثابت ہو اور کسی طمع و لالچ کا نہ ہونا بھی۔ اور بہانہ تلاش کرنے والوں کے لیے کوئی بہانہ بھی باقی نہ رہے۔

ان سے دوبارہ سوال کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا غیب کے اسرار ان کے پاس ہیں۔ اور وہ اس سے لکھ لیتے ہیں"؟ (ام عندھم الغیب فھم یکتبون)۔

یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر ایک شاعر ہے، اور ہم اس کی موت اور شیرازۂ زندگی کے بکھر جانے کی انتظار میں ہیں اور اس کی موت سے تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی اور اس کی دعوت نسیان کے سپرد ہو جائے گی، (جیسا کہ گزشتہ چند آیات میں مشرکین کا یہ قول بیان ہوا ہے: "نتربص بہ ریب المنون"

انہیں یہ کہاں سے پتہ چل گیا کہ وہ پیغمبر کی وفات کے بعد زندہ رہیں گے؟ یہ غیب انہیں کس نے بتایا ہے؟

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ: اگر تم اس بات کے مدعی ہو کہ تمہیں غیب کا علم ہے، اور تم احکام خداوندی کا علم رکھتے ہو، اور تم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے بے نیاز ہو، تو یہ ایک عظیم جھوٹ ہے [1]

اس کے بعد ایک دوسرے احتمال کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اگر ان امور میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے، تو پھر انہوں نے شیطانی منصوبے بنائے ہیں، تاکہ پیغمبر کو درمیان سے ہٹا دیں یا اس کے دین سے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) اور قرآن نے جو عمدہ دلائل ان کے برخلاف قائم کئے ہیں زیادہ تر جلد ۱۱ ص ۲۲۰ سے آگے (آیہ ۵۷ سورہ نحل کے ذیل میں) اور جلد ۱۹ ص ۵۴۱ سے آگے سورہ صافات کی آیت ۱۴۹ کے ذیل میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں غیب کی "لوح محفوظ" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان دعووں کی طرف اشارہ ہے جو بعض مشرکین رکھتے تھے اور کہتے تھے: اگر کوئی قیامت ہونی ہوگی تو ہمارے لیے خدا کے ہاں بلند مرتبہ ہوگا۔ لیکن یہ تفاسیر اوپر والی آیات کے مفہوم اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط سے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں۔

انہیں جان لینا چاہیے کہ کفار خدائی منصوبوں کے مقابلے میں مغلوب ہوں گے اور خدا کا منصوبہ ان کے منصوبے سے کہیں بلند ہے (ام یریدون کیدًا فالذین کفروا ھم المکیدون)۔[1]

اوپر والی آیت اس تفسیر کے مطابق سورۂ آل عمران کی آیت ۵۴ کی مانند ہے جو کہتی ہے: ومکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین:

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "ان کی سازشیں انجام کار انہی کے برخلاف تمام ہوں گی، جیسا کہ سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ میں آیا ہے، ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ: بُرے منصوبے صرف اپنے بنانے والوں کے ہی دامن گیر ہوتے ہیں"۔

دونوں تفسیروں کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے ساتھ ایک دوسرا تعلق رکھتی ہو، اور وہ یہ ہے کہ دشمنان اسلام کہتے تھے کہ: ہم محمدؐ کی موت کے انتظار میں ہیں، قرآن کہتا ہے کہ معاملہ دو حال سے خارج نہیں ہے، یا تو تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تم سے پہلے طبیعی موت سے مر جائے گا، تو اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ تم اسرار غیب سے آگاہ ہو، اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری سازشوں کے ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ تو یہ جان لو کہ خدا کے منصوبے تمہارے منصوبوں سے کہیں بالا ہیں اور تمہاری سازشیں خود تمہیں دامنگیر ہو جائیں گی۔

اور اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ "دار الندوہ" میں جمع ہو کر اور پیغمبر پر "کہانت"، "جنون"، "شاعری" جیسی تہمتیں لگانے سے، اس پر کامیاب ہونے میں قادر ہو جاؤ گے۔ تو یہ تمہارا خیال خام ہے، کیونکہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے برتر ہے۔ اور اس نے اس عالمی دعوت کی تبلیغ کے لیے، اپنے پیغمبر کی سلامتی، نجات اور کامیابی کی ضمانت کر لی ہے۔

آخر میں آخری سوال میں ان سے پوچھتا ہے: کیا اُن کا خیال یہ ہے کہ وہ کوئی حامی اور مددگار رکھتے ہیں؟ "کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی اور معبود ہے"؟ (ام لھم الٰہ غیر اللہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ پاک اور منزہ ہے اس سے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں" (سبحان اللہ عما یشرکون)۔

اس بنا پر کوئی شخص ان کی حمایت پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح سے وہ ان سے گیارہ عجیب و غریب مسلسل اور پے در پے سوالات کے ذریعہ باز پرس کرتا ہے، اور انہیں مرحلہ بہ مرحلہ ان کے دعووں سے پیچھے ہٹاتا اور نیچے اتارتا چلا جاتا ہے، اور اس کے بعد فرار کے تمام راستے ان کے سامنے بند کر دیتا ہے، اور انہیں مکمل طور پر محصور کر دیتا ہے۔

---

[1] "کید" (بروزن صید) ایک قسم کی چارہ جوئی کو کہتے ہیں جو بعض اوقات اچھی چارہ جوئیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر بُرے مقام پر استعمال ہوتا ہے، یہ لفظ مکر و فریب، سعی و کوشش اور جنگ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

قرآن کے استدلالات کتنے دلنشین ہیں، اور اس کے سوالات اور طرز بازپرس کتنی عمدہ ہے، کہ اگر کسی میں حق جوئی اور حق طلبی کی روح موجود ہو، تو وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرلے گا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آخری آیت میں دوسرے معبودوں کی نفی کے لیے کوئی دلیل بیان نہیں کی ہے اور صرف "سبحان اللہ عما یشرکون" کے جملہ پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ ان بتوں کی الوہیت کے دعوے کا بطلان — جو پتھر اور لکڑی سے بنائے گئے ہیں، یا کوئی بھی دوسری مخلوق، ان حاجات وضروریات اور کمزوریوں کے ساتھ، جو اُن میں پائی جاتی ہیں — اس سے کہیں زیادہ واضح وروشن ہے کہ اس کی تشریح کی جائے اور اس پر گفتگو کی جائے۔ علاوہ ازیں دوسری آیات میں بارہا اس موضوع کے ابطال کے لیے استدلال ہوا ہے۔

۴۴۔ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝
۴۵۔ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝
۴۶۔ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝
۴۷۔ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
۴۸۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝
۴۹۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۝

ترجمہ

۴۴۔ (ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ) اگر وہ یہ دیکھ لیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آسمان سے (ان کے عذاب کے لیے) گر رہا ہے تو وہ یہ کہیں گے یہ تو ایک تہ بہ تہ بادل ہے۔

۴۵۔ یہ بات ہے تو انہیں چھوڑ دے۔ یہاں تک کہ ان کی اپنی موت کے دن سے ملاقات ہو جائے۔

۴۶۔ وہ دن جس میں ان کے منصوبے ان کی حالت کے لیے کچھ بھی مفید نہیں ہوں گے، اور کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

۴۷۔ اور ظالموں کے لیے اس سے پہلے بھی ایک عذاب ہے (جو اسی جہان میں ہوگا) لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔

۴۸۔ اپنے پروردگار کے حکم کی تبلیغ کے راستہ میں صبر و استقامت سے کام لے۔ کیونکہ تو مکمل طور سے

ہماری حفاظت میں ہے، اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد و ثنا بیان کر۔

۴۹۔ (اسی طرح) اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پشت پھیرنے اور طلوع صبح کے وقت۔

تفسیر

تو ہماری مکمل حفاظت میں ہے

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں مشرکین اور ہٹ دھرم منکرین کے بارے میں آئی ہے، جو ایک ایسی بحث تھی کہ ہر حق طلب انسان کے لیے حقیقت کو واضح کرتی تھی، ان آیات میں ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: "وہ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ اگر وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ ایک ٹکڑا آسمانی پتھروں کا عذابِ الٰہی کے طور پر نیچے گر رہا ہے تو وہ یہ کہیں گے: "تمہیں مغالطہ ہوا ہے، یہ پتھر نہیں ہے، یہ تو تہ بہ تہ بادل ہے۔ جو زمین پر برسنے والا ہے" (وان یروا کسفاً من السماء ساقطاً یقولوا سحاب مرکوم)[1]۔

جو لوگ اس قدر ہٹ دھرم ہوں کہ محسوس حقائق کا بھی انکار کر دیں اور آسمانی پتھروں کو تہ بہ تہ بادل کہنے لگیں، حالانکہ تمام لوگوں نے بادل کو ـــــ جب وہ زمین کے قریب ہوتا ہے ـــــ دیکھا ہے کہ وہ بخارات کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہ لطیف بخارات تہ بہ تہ ہو کر پتھر میں کیسے تبدیل ہو سکتے ہیں؟

ان افراد کی حقائق معنوی کے مقابلہ میں تکلیف و ذمہ داری واضح ہے۔

ہاں! گناہ، ہوا پرستی، عناد اور ہٹ دھرمی کی تاریکی انسان کی نگاہ کے افق کو اس طرح سے تیرہ و تاریک کر دیتی ہے کہ آخرکار وہ محسوسات کا بھی انکار کرنے لگ جاتا ہے، اور اس حالت میں اس کی ہدایت کی کوئی امید نہیں رہتی۔

"مرکوم" "متراکم" کے معنی میں ہے اور وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ پر قرار پایا ہو۔

لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو ان کو چھوڑ دے اور اس ہٹ دھرم گروہ کی ہدایت کے لیے زور نہ دے، تاکہ وہ اپنے موت کے دن کی ملاقات کرتے ہوئے خدا کے عذابوں کو ـــــ جو ان کے انتظار میں ہیں۔

---

[1] "کسف" (بر وزن فلس) کسی بھی چیز کے ٹکڑے کے معنی میں ہے اور من السماء کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہاں آسمانی پتھر کا ٹکڑا مراد ہے بعض کتب لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کسفہ کی جمع ہے (جیسا کہ کسف بروزن پدر بھی جمع ہے) لیکن اکثر مفسرین نے اسے مفرد کے معنی میں لیا ہے۔ زیر بحث آیت سے ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ مفرد ہے کیونکہ اس کی صفت کو مفرد کی صورت میں لایا ہے۔

اپنی آنکھ سے دیکھ لیں" (فذرهم حتّٰی یلاقوا یومهم الذی فیه یصعقون)۔

"یصعقون" "صعق" اور "اصعاق" کے مادہ سے مار ڈالنے کے معنی میں ہے۔ اور اصل میں "صاعقہ" سے لیا گیا ہے، اور چونکہ صاعقہ لوگوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ ہلاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے اس جملہ کی، اختتام جہاں پر انسانوں کی عمومی موت سے، جو قیامت کا مقدمہ ہے، تفسیر کی ہے، لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ تک باقی نہیں رہیں گے، بلکہ وہی پہلا معنی ہے۔ یعنی ان کو موت کے دن تک کے لیے ـــ جو آخر دی سزاؤں اور عذابوں کا سرآغاز ہے، چھوڑ دے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ "ذرهم" (انہیں چھوڑ دے) کا جملہ ایک تہدید آمیز امر ہے، اور اس سے مراد ایسے ناقابل ہدایت افراد کی تبلیغ پر اصرار کو ترک کر دینا ہے۔ اس بنا پر نہ تو پیغمبرؐ کی طرف سے عمومی سطح پر تبلیغ کو جاری رکھنے کے ساتھ منافات رکھتا ہے اور نہ ہی فرمان جہاد کے ساتھ۔

اس بنا پر بعض کا یہ کہنا کہ: یہ آیت آیات جہاد کے ساتھ نسخ ہو گئی ہے، کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہے۔

اس کے بعد اس دن کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے: "وہی دن، جس میں ان کی چارہ جوئی اور منصوبے انہیں کوئی فائدہ نہیں دیں گے، اور فرار کے تمام راستے ان کے سامنے بند ہو جائیں گے، اور کسی طرف سے ان کی مدد نہ کی جائے گی" (یوم لا یغنی عنهم کیدهم شیئًا ولا هم ینصرون)۔

ہاں جو شخص مر جاتا ہے اس کی قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے (من مات قامت قیامته) اور وہ جزاؤں اور سزاؤں کے لیے ابتدا ہوتی ہے، جن میں سے بعض تو برزخی پہلو رکھتی ہیں، اور بعض دوسری قیامت کبریٰ میں، یعنی انسانوں کی عمومی قیامت میں انہیں دامنگیر ہوں گی، اور ان دونوں مراحل میں نہ تو چارہ جوئیاں مؤثر ہوں گی اور نہ ہی ارادہ الٰہی کے مقابلہ میں کوئی ناصر و مددگار ہو گا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ صرف برزخ اور قیامت کا عذاب ہی ہو گا، بلکہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم و ستم کیا ہے اور کفر و شرک اختیار کیا ہے، اس سے پہلے بھی اس دنیا میں ان کے لیے سزا و عذاب ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے" (وان للذین ظلموا عذابًا دون ذالك ولكن اكثرهم لا یعلمون)۔

ہاں! انہیں اس دنیا میں بھی ان عذابوں کے انتظار میں رہنا چاہیئے، جیسا کہ گزشتہ اقوام پر ہوئے، مثلاً صاعقے، زلزلے، آسمانی پتھر، خشک سالی، قحط یا سپاہ توحید کے مجاہدین کے توانا ہاتھوں سے قتل ہونا، جیسا کہ جنگ بدر میں سرداران شرک کے ایک گروہ کے لیے اتفاق ہوا، مگر یہ کہ وہ بیدار ہو جائیں، توبہ کر لیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

یقیناً ان میں سے ایک گروہ تو قحط اور خشک سالی میں گرفتار ہوا، اور ایک گروہ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ـــ جنگ بدر میں قتل کر دیا گیا، لیکن ایک عظیم گروہ نے توبہ بھی کر لی، اور ایمان لے آئے، اور سچے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے، اور خدا نے انہیں اپنی عفو و بخشش میں شامل قرار دیا[1]

---

[1] وہ لوگ جو "فیه یصعقون" کو روز قیامت اور ابتدا قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، انہوں نے زیر بحث (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"ولکن اکثرھم لا یعلمون" (لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ عام طور پر اس عذاب سے، جو دنیا و آخرت میں ان پر آنے والا ہے، بے خبر ہیں، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی اقلیت اس معنی سے آگاہ ہے لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے اپنی مخالفت پر اصرار کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کو ان تمام کارشکنیوں، تہمتوں اور ناسزا باتوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے، : "اپنے پروردگار کے حکم کی تبلیغ کی راہ میں صبر و استقامت و شکیبائی اختیار کر" (واصبر لحکم ربک)[1]

اگر وہ تجھے کاہن، مجنون اور شاعر کہتے ہیں تو تُو صبر کر، اسی طرح اگر وہ آیات قرآنی کو افترا خیال کرتے ہیں جو خدا پر باندھے گئے ہیں تو تُو صبر و شکیبائی اختیار کر، اور اگر وہ ان تمام منطقی دلیلوں کے مقابلہ میں پھر بھی ہٹ دھرمی اور عناد کو جاری رکھتے ہیں، تو، تو استقامت اختیار کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو مایوس اور ضعیف و ناتواں ہو جائے۔

"کیونکہ تو ہمارے علم کی نگاہوں کے سامنے ہے اور ہماری مکمل حفاظت میں ہے" (فانک باعیننا)۔

ہم ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں اور ہر چیز سے باخبر ہیں، اور ہم تجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

"فانک باعیننا" کا جملہ بہت لطیف تعبیر ہے، جو پروردگار کے علم و آگاہی کو بھی بتاتا ہے، اور اس کی کامل حمایت اور لطف کو بھی بیان کرتا ہے۔

ہاں! انسان جب یہ احساس کرلے کہ کوئی بزرگ ہستی حاضر و ناظر ہے، اور وہ اس کی تمام کوششوں اور جدوجہد کو دیکھ رہی ہے، اور وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتی ہے، تو اس موضوع کا ادراک اسے طاقت و توانائی بخشتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ مسئولیت کا احساس بھی۔

اور چونکہ خدا سے راز و نیاز اور اس کی عبادت و بندگی اور اس کی ذات پاک کی تسبیح و تقدیس انسان کو آرام و سکون اور قوت و طاقت بخشتی ہے۔ لہٰذا صبر کا حکم دینے کے بعد فرماتا ہے: "جس وقت تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا" (وسبح بحمد ربک حین تقوم)۔

جس وقت تو سحر کے وقت عبادت اور نماز شب کے لیے اٹھے۔

جس وقت تو نیند سے واجب نماز کے لیے اٹھے۔

اور جب بھی تو کسی مجلس و محفل سے کھڑا ہو تو اس کی حمد و تسبیح کر۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) آیت میں عذاب قبر اور عذاب برزخ کے معنی میں لیا ہے، لیکن چونکہ وہ تفسیر ضعیف ہے لہٰذا یہ احتمال بھی ضعیف ہے۔

[1] "حکم ربک" سے مراد ممکن ہے وہی احکام الٰہی کی تبلیغ ہو کہ پیغمبر اس کی راہ میں صبر و شکیبائی کرنے پر مامور ہے، یا خدا کا عذاب ہے جس کا دشمنوں کو وعدہ دیا گیا ہے، یعنی انتظار کر یہاں تک کہ عذاب الٰہی انہیں پکڑ لے۔ یا اوامر الٰہی اور فرمان خدا کے معنی میں ہے، یعنی چونکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ صبر و استقامت کر، اگرچہ تینوں تفاسیر کا جمع کرنا بھی ممکن ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، خصوصاً "انک باعیننا" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔

مفسرین نے اس آیت کی گوناں گوں تفسیریں کی ہیں لیکن ان سب کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے، چاہے وہ سحر کے وقت نماز تہجد کے لیے ہو، چاہے نیند کے بعد نماز فریضہ کے ادا کرنے کے لیے ہو، اور چاہے وہ ہر مجلس سے قیام کے بعد ہو۔

ہاں! اپنی روح اور جان کو خدا کی حمد و تسبیح کے ساتھ نور و صفا بخش، اور اپنی زبان کو اس کے ذکر سے معطر بنا، اس کی یاد سے مدد لے، اور دشمن کی کارشکنیوں سے مبارزہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جا!

متعدد روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ جس وقت کسی مجلس سے اٹھتے تھے تو خدا کی تسبیح اور حمد بجالاتے تھے اور فرماتے تھے:

"انه کفارة المجلس" یہ حمد و تسبیح مجلس کا کفارہ ہے۔[1]

منجملہ ان کے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ جس وقت کسی مجلس سے اٹھتے تو فرماتے:

سبحانك اللّٰهم وبحمدك اشهد ان لا اله الّا انت، استغفرك و اتوب اليك

بعض لوگوں نے عرض کیا: اے رسول خدا یہ کیا کلمات ہیں جو آپ نے کہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

هن كلمات علمنيهن جبرئيل، كفارات لما يكون فى المجلس

"یہ وہ کلمات ہیں جن کی جبرئیل نے (خدا کی طرف سے) مجھے تعلیم دی ہے، اور یہ اس چیز کا کفارہ ہے جو مجلس میں واقع ہوتی ہے"[2]

اس کے بعد آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "اسی طرح رات میں اس کی تسبیح کر، اور ستاروں کے پشت پھیرنے کے وقت اور طلوع صبح کے وقت" (ومن الليل فسبّحه وادبار النجوم)۔

بہت سے مفسرین نے "ومن الليل فسبّحه" کے جملہ کی نماز شب کے ساتھ تفسیر کی ہے "وادبار النجوم" کی صبح کی دو رکعت نافلہ کے ساتھ، جو طلوع فجر کے آغاز اور نور صبح میں ستاروں کے پنہاں ہونے کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے بھی آیا ہے کہ "ادبار النجوم" صبح کی دو رکعت نافلہ ہے جو نماز صبح سے پہلے اور ستاروں کے غروب کے وقت بجالاتے ہیں۔

باقی رہا "ادبار السجود" (جو سورۂ ق کی آیت ۴۰ میں آیا ہے) تو اس سے مراد وہ دو رکعت نافلہ ہیں، جو نماز مغرب کے بعد پڑھی جاتی ہیں (لیکن مغرب کے نوافل چار رکعتیں ہیں جن میں سے اس حدیث میں صرف دو رکعت کی طرف اشارہ ہوا ہے[3]

بہرحال، عبادت اور تسبیح و حمد خدا رات کے اندر اور طلوع فجر کے آغاز میں ایک اور ہی دوسرا لطف و صفا رکھتی ہیں، اور دکھاوے اور ریاکاری سے بہت دور ہوتی ہے، اور اس کے لیے روح کی آمادگی اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ دن کی زندگی میں

---

[1] "تفسیر المیزان" جلد ۱۹ صفحہ ۲۴۔

[2] "در المنثور" جلد ۶ صفحہ ۱۲۰۔

[3] "مجمع البیان" سورہ ق کی آیت ۴۰ کے ذیل میں (جلد ۹ صفحہ ۱۵۰)۔

مشغول رکھنے والے کاموں سے فراغت ہوتی ہے، اور رات کی استراحت نے انسان کو آرام وسکون بخشا ہوا ہوتا ہے اور قیل وقال اور شور وغوغا نہیں ہوتا۔

حقیقت میں یہ وقت وہی وقت ہے جس میں پیغمبرؐ معراج پر گئے تھے۔ اور مقام "قاب قوسین" پر راز ونیاز کی خلوت گاہ میں پہنچے تھے، اور اپنے خدا کے ساتھ راز ونیاز کی باتیں کی تھیں۔

اسی بنا پر زیر بحث آیات میں ان دو اوقات پر تکیہ ہوا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہوا ہے:

رکعتا الفجر خیر من الدنیا وما فیھا

"تیرے لیے صبح کی نافلہ دو رکعت دنیا ومافیہا سے بہتر ہیں"[1]

خداوندا! مجھے عمر بھر سحر خیزی اور اپنی ذات سے راز ونیاز کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمارے قلب کو اپنے عشق سے مطمئن اور اپنی محبت سے نورانی، اور اپنے لطف وکرم کا امیدوار بنا دے۔

بارالہا! ہمیں شیطانی قوتوں اور اپنے دشمنوں کی کارشکنیوں کے مقابلہ میں صبر وشکیبائی اور استقامت وپامردی مرحمت فرما۔

تاکہ ہم تیرے پیغمبر کی پیروی کریں، ان کی سنت کے مطابق زندگی گذاریں، اور ان کی سنت پر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہیں۔

آمین یارب العالمین

اختتام ترجمہ
تیئیسویں شب رمضان المبارک
۹ بجے شب ۱۴۰۷ھ قم برمکان حقیر

سورۂ طور کا اختتام
۲۲ صفر ۱۴۰۶
۱۳۶۴/۸/۱۵

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۲۵۱ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

سُورۂ النجم

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۶۲ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ رصفر الخیر ۱۴۰۶

۱۵ — ۸ — ۱۳۶۴

سورۂ النجم
کے
مطالب و مضامین

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورہ وہ سب سے پہلا سورہ ہے جسے پیغمبرؐ نے اپنی دعوت کا اعلان کرنے کے بعد آشکارا اور بلند آواز سے حرم مکہ میں تلاوت کیا۔ اور مشرکین نے اُسے غور سے سنا، اور اس دن تمام مومنین کے ساتھ مشرکین تک نے بھی سجدہ کیا۔[1]

یہ سورہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق، بعثت کے پانچویں سال ماہِ مبارک رمضان میں نازل ہوا۔[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ پہلا سورہ ہے جس میں سجدۂ واجب کی آیت نازل ہوئی۔[3] لیکن اس بات کے پیشِ نظر کہ مشہور روایت کے مطابق، سورہ "اقرأ" اس سے پہلے نازل ہوا تھا، اور اس کے آخر میں آیت سجدہ ہے۔ یہ روایت بعید نظر آتی ہے۔

بہرحال اس سورہ میں "مکی" ہونے کی بنا پر اصول عقائد کے مباحث خصوصاً "نبوت" و "معاد" کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔ اور یہ سرکوبی کرنے والی تہدیدوں اور بار بار کے انذار اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے کے باعث کفار کو بیدار کرتی ہے۔

اس سورہ کے مضامین و مطالب کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سورہ کے آغاز میں قرآن ایک پُرمعنی قسم کے بعد وحی کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور پیغمبرؐ کے پیک وحی "جبرائیل" سے براہ راست رابطہ اور تعلق کو واضح و روشن کرتا ہے۔ اور پیغمبرؐ کی ذات اقدس کو اس بات سے کہ وہ وحی الٰہی کے علاوہ کوئی اور بات کرے مبرا قرار دیتا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصہ میں قرآن پیغمبرؐ کی معراج سے متعلق گفتگو کرتا ہے، اور اس کے کچھ گوشوں کو مختصر اور پُرمعنی عبارتوں کے ساتھ مجسم کرتا ہے، کہ وہ بھی وحی کے ساتھ ایک مستقیم رابطہ ہے۔

۳۔ اس کے بعد بتوں کے سلسلہ میں مشرکین کے خرافات، فرشتوں کی عبادت اور دوسرے امور جو ہوا و ہوس کے سوا اور کچھ نہ تھے، پیش کرتے ہوئے ان کی سخت مذمت کرتا ہے، اور ان کی پرستش سے ڈراتا ہے۔ اور ایک قوی منطق کے ساتھ اس معنی کو ثابت کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۹ ص ۲۰۸۔
[2] تفسیر روح البیان، جلد ۹ ص ۲۰۸۔
[3] تفسیر "مراغی" جلد ۲۷ ص ۴۱۔

۴۔ ایک دوسرے حصہ میں ان منحرفین اور عام گنہگاروں پر توبہ کی راہ کھولتے ہوئے انہیں حق تعالیٰ کی "مغفرت واسعہ" کی نوید سناتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے، اور کوئی بھی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔

۵۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اس سورہ کے ایک اور دوسرے حصہ میں "مسئلہ معاد" کے کچھ گوشوں کو قرآن منعکس کرتا ہے، اور اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ موجود ہے اس سے اس مسئلہ کے لیے ایک واضح دلیل قائم کرتا ہے۔

۶۔ حسب دستور گزشتہ اقوام کی دردناک سرنوشت کی طرف ـــــ جو حق سے دشمنی کے طریق میں اصرار، ہٹ دھرمی اور عناد رکھتے تھے، (جیسے قوم عاد، ثمود، نوح اور لوط) ـــــ کچھ اشارے کرتا ہے، تاکہ بے خبر غافلوں کو اس طریقہ سے بیدار کرے۔

۷۔ اور آخر میں پروردگار کی عبادت اور سجدہ کے امر کے ساتھ سورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کے امتیازات میں سے آیات کا مختصر ہونا، اور ان آیات کا ایک خاص آہنگ اور طرز پر ہونا ہے، جو اس کے مفاہیم کو ایک گہرا اور عمیق اثر بخشتا ہے، اور سوئے ہوئے لوگوں کے دل و روح کو بیدار کرتے ہوئے اپنے ساتھ آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کا نام "النجم" کے ساتھ اس سورہ کی پہلی آیت کی بنا پر ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

روایات میں اس سورہ کی تلاوت کے بارے میں کئی ایک اہم فضائل بیان ہوئے ہیں:

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

من قرأ سورة النجم اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدق بمحمد (ص) ومن جحد به

"جو شخص سورۂ النجم کو پڑھے گا خدا ان لوگوں کی تعداد کے مطابق جو پیغمبر پر ایمان لائے تھے اور ان لوگوں کی تعداد کے مطابق جنہوں نے آپ کا انکار کیا دس نیکیاں اُسے عطا کرے گا۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق جعفر بن محمدؑ سے منقول ہے:

من کان یدمن قرائة "والنجم" فی کل یوم، او فی کل لیلة، عاش محمودًا بین الناس وکان مغفورًا له وکان محببًا بین الناس

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۷۰۔

"جو شخص سورہ "النجم" کو ہر دن اور ہر رات تلاوت کرے گا، وہ لوگوں کے درمیان ایک قابلِ تعریف اور شائستہ شخص سمجھا جائے گا، خدا اس کو بخش دے گا۔ اور وہ لوگوں کے درمیان محبوب رہے گا"۔[1]

مسلمہ طور سے اتنی عظیم نعمتیں انہیں لوگوں کے لیے ہوں گی جو اس سورہ کی تلاوت کو غور و فکر، اور اس کے بعد عمل کا وسیلہ اور ذریعہ بنالیں، اور اس سورہ کی مختلف تعلیمات ان کی زندگی میں سایہ فگن ہوں۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۹۲ ص ۲۰۵۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ

۲۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ

۳۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ

۴۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ افول (غروب) کرے۔

۲۔ نہ تو تمہارا ساتھی (محمد) منحرف ہوا ہے اور نہ ہی اس نے مقصد کو گم کیا ہے۔

۳۔ اور وہ ہرگز بھی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا۔

۴۔ جو کچھ بھی وہ کہتا ہے اس وحی کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس کی طرف وحی ہوئی ہے۔

تفسیر

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ سورہ (سورۂ طور) "النجوم" (ستاروں) کے لفظ پر ختم ہوئی تھی اور یہ سورہ "النجم" (ستارہ) کے لفظ سے شروع ہو رہی ہے، جس کی خدا نے قسم کھائی ہے، فرماتا ہے،: "قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ غروب کرتا ہے" (والنجم اذا هوٰی)۔

اس بارے میں کہ یہاں "النجم" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے بہت سے آراء دیئے ہیں، اور ہر ایک نے ایک الگ تفسیر

پیش کی ہے۔

ایک جماعت اسے "قرآن مجید" کی طرف اشارہ سمجھتی ہے، چونکہ یہ بعد والی آیات کے مناسب ہے جو وحی کے بارے میں ہیں، اور "نجم" کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ عرب اس چیز کو جو تدریجاً اور مختلف وقفے سے انجام پائے، "نجوماً" سے تعبیر کرتے ہیں (قرضوں کی اقساط اور اس قسم کے دوسرے امور میں "نجوماً" کی تعبیر بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے) اور چونکہ قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اور مختلف ٹکڑوں اور حصوں میں پیغمبر اسلام پر نازل ہوا ہے، لہٰذا "نجم" کے عنوان سے اس کا ذکر ہوا ہے۔ اور "اذا ھوی" سے مراد اس کا رسول خدا کے قلب پاک پر نزول ہے۔

ایک دوسری جماعت نے اسے آسمان کے ایک ستارہ مثلاً "ثریا"[1] یا "شعریٰ"[2] کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ یہ ستارے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "النجم" سے مراد وہ شہاب ہیں جن کے ذریعہ شیاطین کو آسمان کے منظر سے بھگایا جاتا ہے اور عرب ان شہابوں کو "نجم" کہتے ہیں۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے کوئی ایک بھی واضح دلیل نہیں رکھتی، بلکہ آیت کا ظاہر۔ جیسا کہ لفظ "النجم" کے اطلاق کا تقاضا ہے۔ آسمان کے تمام ستاروں کی قسم ہے، جو خدا کی عظمت کی ظاہر و آشکار نشانیوں میں سے ہیں، اور عالم آفرینش کے عظیم اسرار میں سے ہیں، اور پروردگار کی حد سے زیادہ عظیم مخلوقات میں سے ہیں۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن جہانِ خلقت کے عظیم موجودات کی قسم کھا رہا ہے، دوسری آیات میں بھی سورج چاند اور اس قسم کی چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔

ان کے غروب پر تکیہ کرنا۔ حالانکہ ان کا طلوع زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہے کہ ستاروں کا غروب ان کے حدوث کی دلیل ہے، اور ستارہ پرستوں کے عقیدہ کی نفی کی دلیل بھی ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں آیا ہے: "فلما جن علیہ اللیل رای کوکبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین" "جس وقت رات کی تاریکی نے اسے چھپا لیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا: کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب اس نے غروب کیا تو کہا، میں غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" (سورہ انعام - ۷۶)

یہ معنی بھی قابل توجہ ہے۔ کہ مسئلہ "طلوع" "نجم" کے لفظ کے مادہ میں موجود ہے، کیونکہ "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق اصل "نجم" وہی "طلوع کرنے والا ستارہ ہے" اور یہی وجہ ہے کہ زمین میں گیاہ کے اُگنے، اور منہ میں دانت کے

---

[1] "ثریا" ایک سات ستاروں کا مجموعہ ہے جن میں چھ ظاہر ہیں اور ایک بہت ہی کم نور ہے، عام طور پر لوگوں کی نظر کی طاقت جانچنے کے لیے اس کے ذریعہ آزمائش کرتے ہیں اس ستارہ کی قسم ہو سکتا ہے اس کی ہم سے زیادہ مسافت کی بنا پر ہو۔

[2] "شعریٰ" آسمان کا ایک روشن ترین ستارہ ہے جس کے بارے میں ہم انشاء اللہ اسی سورہ کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں مزید تشریح کریں گے اس کی قسم کھانے کی رمز ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حد سے زیادہ روشن، درخشاں اور کئی خصوصیات کا حامل ہے۔

نکلنے، اور ذہن میں کسی نظریہ کے پیدا ہونے کو "نجم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس طرح سے خدا نے ستاروں کے طلوع ہونے کی بھی قسم کھائی ہے، اور ان کے غروب کی بھی، کیونکہ یہ ان کے حدوث اور قوانینِ خلقت کے پابند ہونے کی دلیل ہے۔[1]

لیکن آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ قسم کس لیے کھائی گئی ہے؟ بعد والی آیت اس طرح سے وضاحت کرتی ہے،: "ہرگز تمہارا ساتھی (اور دوست محمدؐ) منحرف نہیں ہوا ہے، اور اس نے اپنے مقصد کو کھویا نہیں ہے" (ما ضل صاحبکم وما غوٰی)۔

وہ ہمیشہ حق کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، اور اس کے گفتار و کردار میں معمولی سا بھی انحراف نہیں ہے۔

"صاحب" کی تعبیر جو دوست اور ہمنشین کے معنی میں ہے، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے تمہاری محبت اور بھلائی کی بنا پر ہے۔

بہت سے مفسرین نے "ضلّ" اور "غوٰی" کے درمیان کوئی فرق قرار نہیں دیا، اور وہ انہیں ایک دوسرے کی تاکید سمجھتے ہیں، لیکن بعض کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے، "ضلالت" یہ ہے کہ انسان کبھی مقصد کی طرف کوئی راہ ہی نہ پائے۔ لیکن "غوایت" یہ ہے کہ اس کی راہ مستقیم اور غلطی سے خالی نہ ہو، پہلی کفر کی مانند ہے، اور دوسری "فسق و گناہ" کی طرح۔

لیکن "راغب" "مفردات" میں "غی" کے معنی میں کہتا ہے کہ: "وہ ایک ایسی جہالت ہے جو اعتقاد فاسد کے ساتھ ہو"۔

اس بنا پر ضلالت تو مطلق جہالت، نادانی اور بے خبری ہے لیکن غوایت ایسی جہالت ہے جو باطل عقیدے کے ساتھ ہو، بہرحال خدا یہ چاہتا ہے کہ اس عبارت میں اپنے پیغمبر سے ہر قسم کے انحراف، جہالت، گمراہی اور غلطی کی نفی کرے، اور وہ تہمتیں جو اس سلسلہ میں دشمنوں کی طرف سے آپ پر لگائی جاتی تھیں انہیں بے معنی قرار دے۔

اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے، اور اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے، کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے، خدا کی طرف سے کہتا ہے،: وہ ہرگز بھی ہوائے نفس کی بنا پر بات نہیں کرتا" (وما ینطق عن الھوٰی)۔

یہ تعبیر اسی استدلال سے مشابہ ہے جو گزشتہ آیت میں ضلالت و غوایت کی نفی کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے، کیونکہ عام طور پر گمراہیوں کا سرچشمہ ہوائے نفس کی پیروی ہی ہے۔

سورۂ ص کی آیت ۲۶ میں آیا ہے: ولا تتبع الھوٰی فیضلک عن سبیل اللہ" ہوائے نفس کی پیروی نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے خدا کے راستہ سے بھٹکا دے گی"۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں بھی یہ آیا ہے کہ:

اما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق

---

[1] اگر بعض روایات میں "نجم" ذات پیغمبرؐ سے تفسیر ہوا ہے، اور ھوٰی ان کے شب معراج آسمان سے نزول ہے، تو وہ حقیقت میں آیت کے بطنوں میں سے ایک ہے، نہ کہ اس کا ظاہر۔

"باقی رہا ہوائے نفس کی پیروی کرنا تو وہ انسان کو راہ حق سے روک دیتی ہے"۔[1]

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "ماضل صاحبکم" کا جملہ پیغمبر سے جنون کی نفی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "وماغوٰی" کا جملہ شاعر ہونے کی نفی کو ظاہر کرتا ہے، یا شعر کے ساتھ ہر قسم کے ارتباط سے، کیونکہ سورۂ شعراء کی آیت ۲۲۴ میں آیا ہے کہ: والشعراء یتبعھم الغاوون "شعراء ہی تو ہیں جن کی گمراہ لوگ پیروی کرتے ہیں، (خیال پرداز اور بے مقصد شعر کہنے والے) اور "وما ینطق عن الھوٰی" کا جملہ کہانت کی نسبت کی نفی ہے۔ کیونکہ کاہن حرص پرست اور ہوس باز لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے: "وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ صرف وحی ہے جو خدا کی جانب سے اس کی طرف بھیجی گئی ہے" (ان ھوالا وحی یوحٰی)۔

وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا، اور قرآن اس کی فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل خود اسی میں چھپی ہوئی ہے، آیات قرآنی کا اچھی طرح مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے، کہ کوئی بھی انسان، چاہے وہ کتنا ہی عالم و مفکر ہو ـــــ کجا وہ انسان جس نے کچھ لکھا پڑھا نہ ہو، اور اس نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی ہو، جو جہالت و خرافات سے پُر ہو ـــــ ہرگز بھی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایسی مطالب سے بھرپور باتیں بیان کرے، جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی مفکرین کے دماغ کے لیے الہام بخش ہوں۔ اور وہ صالح، سالم، مومن اور پیش رفت کرنے والے معاشرے کے بنانے کی بنیاد بن سکیں۔

ضمنی طور پر اس بات پر توجہ رکھنا چاہیئے کہ یہ گفتگو صرف آیات قرآنی کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ گزشتہ آیات کے قرینہ سے سنت پیغمبرؐ بھی اس میں شامل ہے، کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی کے مطابق ہے، یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ ہوا و ہوس سے گفتگو نہیں کرتا، وہ جو کچھ بھی کہتا ہے وحی سے کہتا ہے۔

ذیل کی جالب حدیث اس مدعا کا دوسرا شاہد ہے۔

"سیوطی" جو اہل سنت کے مشہور علماء میں سے ہے، تفسیر "درالمنثور" میں اس طرح نقل کرتا ہے:

"ایک دن رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ تمام دروازے جو پیغمبرؐ کی مسجد کے اندر کھلتے تھے (علیؑ کے گھر کے دروازے کے سوا) بند کر دیئے جائیں۔ یہ امر مسلمانوں پر گراں گزرا، یہاں تک کہ رسولؐ کے چچا "حمزہ" نے اس بات کا گلہ کیا، کہ آپ نے اپنے چچا اور ابوبکر و عمر و عباس کے گھر کا دروازہ کس لیے بند کرایا اور اپنے چچازاد بھائی کے گھر کا دروازہ کھلا کیوں رکھا، (اور اس کو دوسروں پر ترجیح کیوں دی)"۔

جب پیغمبرؐ اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ بات ان پر گراں گزری ہے، تو آپ نے لوگوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی، اور خدا کی تمجید و توحید میں ایک بے نظیر خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے بعد مزید فرمایا:

ایھا الناس ما انا سددتھا، ولا انا فتحتھا، ولا انا اخرجتکم و

---

[1] نہج البلاغہ کلام ۴۲۔

اسکنتہ، ثم قرأ " والنجم اذا ھوٰی ما ضل صاحبکم وما غوٰی وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الّا وحی یوحٰی،

"اے لوگوں نہ تو میں نے دروازوں کو بند کیا ہے، اور نہ ہی کھولا ہے نہ ہی میں نے تمھیں مسجد سے نکالا ہے اور نہ ہی میں نے اُسے (علی کو) ساکن کیا ہے (جو کچھ ہوا وہ فرمان الٰہی تھا) پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت کی والنجم اذا ھوٰی ..... ان ھو الّا وحی یوحٰی"[1]

یہ حدیث جو پیغمبرؐ کے بعد امیر المؤمنین علیؑ کے تمام امت اسلامی کے درمیان مقام والا کو بیان کرتی ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نہ صرف پیغمبرؐ کے ارشادات اور اقوال ہی وحی کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ ان کے اعمال و کردار بھی اسی طرح کے ہیں۔

---

[1] تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۲۲ (کچھ تلخیص کے ساتھ)۔

۵۔ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۙ
۶۔ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰی ۙ
۷۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؕ
۸۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ
۹۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۚ
۱۰۔ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ؕ
۱۱۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۚ
۱۲۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۚ

ترجمہ

۵۔ اسے اس ہستی نے تعلیم دی ہے جو عظیم قدرت رکھتی ہے۔
۶۔ وہی ذات جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے۔
۷۔ جبکہ وہ افق اعلیٰ میں تھا۔
۸۔ پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور نزدیک ہوا۔
۹۔ یہاں تک کہ اس کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم ہو گیا۔
۱۰۔ یہاں خدا نے وحی کرنی تھی اپنے بندے کو وحی کی۔
۱۱۔ اُس کے دل نے جو کچھ دیکھا اس میں ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔

۱۲۔ کیا تم اُس سے اس چیز کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے مجادلہ کرتے ہو۔

تفسیر

دوست کا پہلا دیدار

گزشتہ آیات کے بعد، جو پیغمبر اسلام پر نزولِ وحی کی گفتگو کر رہی تھیں، ان آیات میں معلم وحی کے بارے میں گفتگو ہے۔

لیکن پہلے یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی نظر میں ان آیات کو ابہام کا ایک ہالہ گھیرے ہوئے ہے، لہٰذا ان ابہامات کو دور کرنے کے لیے پوری دقت کے ساتھ، ان پر غور و فکر اور تحقیق کرنی چاہیئے۔

پہلے ہم ان آیات کی اجمالی تفسیر پیش کرتے ہیں، پھر ان کی تفصیلی تحقیق پیش کریں گے۔

فرماتا ہے: "اسے اُس ہستی نے تعلیم دی ہے، جو عظیم قدرت رکھتی ہے" (علمہ شدید القوٰی)۔

پھر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "وہی ذات جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے" (ذومرۃ فاستوٰی)۔

(یہ تعلیم اسے اس وقت دی) "جب کہ وہ افق اعلیٰ میں تھا" (وھو بالافق الاعلی)۔

"پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور نزدیک ہوا" (ثم دنی فتدلّٰی)۔

"یہاں تک کہ اس کے اور اس کے معلم کے درمیان کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم ہو گیا" (فکان قاب قوسین او ادنٰی)۔

"اور یہاں خدا نے جس چیز کی وحی کرنی تھی وہ اپنے بندے کو وحی کی" (فاوحٰی الٰی عبدہ ما اوحٰی)۔

"پیغمبر کے دل نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا اور اس نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا" (ماکذب الفؤاد ما رأٰی)۔

"کیا تم اس سے اس چیز کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے، جھگڑتے ہو، اور یقین نہیں کرتے" (افتمارونہ علٰی ما یرٰی)۔

ان آیات کی تفسیر میں دو مختلف نظریے موجود ہیں، جن میں سے ایک مشہور اور دوسرا غیر مشہور ہے، لیکن پہلے ضروری ہے کہ آیت کے مفردات اور بعض الفاظ کے معنی بیان کریں اس کے بعد ان دونوں نظریوں کو پیش کریں۔

"مرۃ" جیسا کہ بہت سے ارباب لغت اور مفسرین نے لکھا ہے "لپٹے ہوئے" کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ رسی کو جتنا بہتر طریقہ سے بٹا جائے اتنی ہی زیادہ محکم ہوتی ہے، لہٰذا یہ لفظ قدرت، توانائی اور مادی یا معنوی استحکام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اسے "مرور" بمعنی عبور سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بات اس چیز سے جو اہل لغت نے لکھی ہے چنداں سازگار نہیں ہے۔

"تدلّی" مادۂ "تدلی" (بروزن تجلی) سے، "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق، نزدیک ہونے کے معنی میں ہے۔ تو اس بنا پر یہ جملہ "دنی" کی تاکید ہے جو اس سے پہلے آیا ہے، اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے، جبکہ بعض ان دونوں کے درمیان اختلاف کے قائل ہیں، انہوں نے یہ کہا ہے کہ "تدلی" وابستگی، تعلق اور آویزاں ہونے کے معنی میں ہے، جس طرح پھل درخت سے وابستگی رکھتا ہے، لہٰذا ان پھلوں کو جو ابھی درختوں کے ساتھ آویزاں ہیں (دوالی) کہتے ہیں[1]

"قاب" اندازہ کے معنی میں ہے اور "قوس" کمان کے معنی میں، اس بنا پر "قاب قوسین" یعنی دو کمانوں کے اندازے کے مطابق، (کمان قدیم زمانہ کے تیراندازی کے ہتھیاروں میں سے ہے)۔

بعض نے "قوس" کو "قیاس" کے مادہ سے "مقیاس" کے معنی میں سمجھا ہے۔ اور چونکہ عرب کی مقیاس ذراع کی مقدار تھا، (انگلیوں کے سر سے لے کر کہنی تک کا فاصلہ) اس بنا پر قاب قوسین دو ذراع کے معنی میں ہوگا۔

بعض لغت کی کتابوں میں "قاب" ایک دوسرے معنی میں ذکر ہوا ہے، اور وہ کمان کو درمیان سے پکڑنے کی جگہ سے کمان کی مڑی ہوئی نوک تک کا فاصلہ ہے (کمانیں قوسی شکل کی ہوتی تھیں جن کے دونوں آخری سرے مڑے ہوئے ہوتے تھے)

اس بنا پر "قاب قوسین" کمان کے ٹیڑھے حصوں کے مجموعہ کے معنی میں ہے، (غور کیجئے)[2]

اب ہم دونوں تفسیروں کے بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔

مفسرین کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کا معلم وہی "جبرئیل امین" پیک وحی خدا تھا، جو حد سے زیادہ قدرت رکھتا تھا۔

وہی جو عام طور پر ایک خوبصورت انسان کی صورت میں پیغمبرؐ کے سامنے ظاہر ہوا کرتا تھا، اور پیغام الٰہی پہنچاتا تھا، آنحضرتؐ کی پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ اپنے اصلی قیافہ اور چہرے کے ساتھ آنحضرتؐ کے سامنے ظاہر ہوا۔

پہلی مرتبہ تو وہی ہے جو اوپر والی آیات میں آیا ہے۔ کہ وہ افق اعلیٰ میں ظاہر ہوا۔ (اور وہ تمام مشرق و مغرب کو ڈھانپے ہوئے تھا، اور اس قدر باعظمت تھا کہ پیغمبرؐ ہیجان میں آگئے) اور وہ جبرئیل ہی تھا جو پیغمبر سے نزدیک ہوا تھا۔ انتہا نزدیک کہ ان کے درمیان چنداں فاصلہ باقی نہ رہا تھا، اور "قاب قوسین" کی تعبیر انتہائی قرب اور نزدیکی سے کنایہ ہے۔

دوسری مرتبہ پیغمبرؐ کے معراج کے واقعہ میں ہوا تھا، جس کے بارے میں آئندہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے۔ اور ہم انشاء اللہ اس سلسلہ میں مزید بیان کریں گے۔

بعض مفسرین جنہوں نے اس نظریہ کو انتخاب کیا ہے، تصریح کی ہے کہ پیغمبرؐ نے جبرئیل کا اصلی صورت میں پہلا دیدار غار "حرا" کے پاس "جبل النور" میں کیا تھا[3]

---

[1] "اقتباس" از "روح البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] بعض نے کہا ہے کہ اس صورت میں کلام میں "قلب" (الٹ پھیر) واقع ہوا ہے اور اصل میں "قابی قوس" تھا۔

[3] اس تفسیر کو کہ "شدید القوی" سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ ایک گروہ کثیر نے اختیار کیا ہے، منجملہ ان کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن یہ تفسیر اپنے تمام طرفداروں کے باوجود اشکالات سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ :

۱۔ "فاوحی الی عبدہ ما اوحی" (جو کچھ وحی کرنا تھی اپنے بندہ کی طرف وحی کی) کی آیت میں مسلمہ طور سے ضمیروں کا مرجع (خصوصاً عبدہ کی ضمیر کا مرجع) خدا ہے۔ لیکن اگر "شدید القوی" سے مراد جبرئیل ہو تو پھر تمام ضمیروں کو اس کی طرف لوٹنا چاہیئے، یہ ٹھیک ہے کہ خارجی قرائن سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس آیت کا معاملہ بقیہ آیات سے جدا ہے، لیکن آیات اور ضمیروں کے مرجع کی یکسانیت کا ٹکراؤ مسلمہ طور سے ظاہر کے خلاف ہے۔

۲۔ "شدید القوی" ایسی ذات کے معنی میں ہے جس کی تمام قدرتیں حد سے زیادہ ہوں، اور یہ صرف پروردگار کی ذات پاک کے ساتھ ہی مناسب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورۂ تکویر کی آیت ۲۰ میں جبرئیل کو "ذی قوۃ عند ذی العرش مکین" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، لیکن "شدید القوی" جو ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، اور "ذی قوۃ" کے درمیان جس میں "قوۃ" مفرد اور نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ بہت زیادہ فرق ہے۔

۳۔ بعد والی آیات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اسے "سدرۃ المنتہیٰ" کے نزدیک (آسمانوں کی بلندی پر دیکھا) اگر اس سے مراد جبرئیل ہو، تو وہ تو سفر معراج میں روئے زمین کے شروع سے ہی پیغمبر کے ساتھ تھا، اور اسے صرف آسمان کی بلندی پر ہی نہیں دیکھا تھا۔ سوائے اس صورت کے کہ یہ کہا جائے کہ ابتداء میں تو اسے انسانی صورت میں دیکھا تھا، اور آسمان میں اُسے اس کی اصلی صورت میں، حالانکہ آیات میں اس مطلب پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۴۔ "علّمہ" یا اس کے مانند تعبیر کبھی بھی قرآن مجید میں جبرئیل کے لیے استعمال نہیں ہوئی۔ جبکہ یہ تعبیر خدا کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے پیغمبروں کے لیے بہت زیادہ ہے، اور دوسرے لفظوں میں جبرئیل پیغمبرؐ کا معلم نہیں تھا، بلکہ وہ وحی کا واسطہ تھا اور ان کا معلم صرف خدا ہے۔

۵۔ یہ ٹھیک ہے کہ جبرئیل ایک بلند مرتبہ فرشتہ ہے لیکن مسلمہ طور سے پیغمبر اسلام اس سے بھی زیادہ والا تر مقام رکھتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کے واقعہ میں آیا ہے کہ جبرئیل معراج کی سیر صعودی میں پیغمبرؐ کے حضور میں حاضر تھے، ایک مقام پر پہنچ کر وہ رک گئے اور کہا: اگر میں ایک پور کے برابر بھی آگے بڑھوں تو میرے پر و بال جل جائیں، لیکن پیغمبر نے اسی طرح سے اپنی سیر کو جاری رکھا۔ ان حالات میں جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی کوئی ایسی اہمیت نہیں ہے جیسی کہ ان آیات میں دی گئی ہے۔ اور زیادہ سادہ لفظوں میں، پیغمبرؐ کے لیے اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی، کہ اس قسم کا دیدار انہیں حاصل ہو۔ حالانکہ یہ آیات اس دیدار کے لیے حد سے زیادہ اہمیت کی قائل ہوئی ہیں۔

۶۔ "ماکذب الفؤاد ما رأی" (پیغمبرؐ کے دل نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس کے برخلاف نہیں کہتا)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا) طبرسی نے "مجمع البیان" میں بیضاوی نے "انوار التنزیل" میں زمخشری نے "کشاف" میں "قرطبی" نے اپنی تفسیر "روح البیان" میں فخر رازی نے "تفسیر کبیر" میں سید قطب نے "فی ظلال القرآن" میں، اور مراغی نے اپنی تفسیر میں، علامہ طباطبائی کی تفسیر بھی المیزان میں زیادہ تر اسی طرف مائل ہیں۔

کا جملہ بھی ایک باطنی شہود کی دلیل ہے نہ کہ آنکھ کے ساتھ جبرئیل کا ایک حسی مشاہدہ ۔

۷۔ ان سب سے قطع نظر متعدد روایات میں جو منابع اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں ان آیات کی جبرئیل سے تفسیر نہیں ہوتی ، بلکہ روایات دوسری تفسیر کے مطابق ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ان آیات سے مراد خدا کی پاک ذات کا ایک خاص قسم کا باطنی شہود ہے ، جو اس منظر میں پیغمبر کو حاصل ہوا تھا ، اور معراج میں اس کا دوبارہ تکرار ہوا ، اور رسول اللہ نے اس دیدار سے ایک معنوی جذبہ کا اثر لیا[1]

مرحوم شیخ طوسی " امالی " میں ابن عباس کے واسطہ سے پیغمبر اسلام سے نقل کرتے ہیں :

لما عرج بی الی السماء دنوت من ربی عز وجل حتی کان بینی و بینہ قاب قوسین او ادنی

"جب میں آسمان پر معراج کے لیے گیا ، تو اپنے پروردگار کی ساحت قدس سے اتنا قریب ہوا کہ میرے اور اس کے درمیان دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا"[2]

مرحوم " صدوق " نے " علل الشرائع " میں اسی مضمون کو ہشام بن حکم کے واسطہ سے امام موسیٰ بن جعفرؑ سے نقل کیا ہے ۔ آپ ایک طولانی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں :

فلما اسری بالنبی (ص) و کان من ربہ کقاب قوسین او ادنی رفع لہ حجاب من حجبہ

"جس وقت پیغمبر کو معراج پر لے جایا گیا تو ان کا فاصلہ ان کے پروردگار کی ساحت قدس سے دو کمانوں یا اسے بھی کم کا رہ گیا تھا تو حجابوں میں سے ایک حجاب آپ کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا دیا گیا تھا"[3]

تفسیر علی بن ابراہیم " میں بھی آیا ہے :

ثم دنی یعنی رسول اللہ من ربہ عز وجل

---

[1] دعائے ندبہ میں ایک تعبیر نظر آتی ہے جو اسی معنی کے ساتھ مناسب ہے جہاں کہتا ہے :

یا ابن من دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی دنوا و اقترابا من العلی الاعلی

" اے اس کے فرزند جو قریب سے قریب تر ہوا ، یہاں تک کہ اس کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کم رہ گیا ، اور یہ نزدیکی خداوند علی اعلیٰ سے صورت پذیر ہوئی ، اسی دعا کے ذیل میں خدا کا ایک لقب " شدید القویٰ " بھی ذکر ہوا ہے جہاں آیا ہے " وارد سدہ یا شدید القویٰ "۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۹۔

[3] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۹۔

"پھر وہ قریب ہوئے یعنی رسول اللہ خداوند تعالیٰ سے"۔ [1]

یہ معنی دوسری متعدد روایات میں بھی آیا ہے، اور ان تمام روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

اہل سنت کی روایات میں بھی "درالمنثور" کی ایک روایت میں یہی معنی ابن عباس سے دو طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ [2]

یہ تمام قرائن سبب بنتے ہیں کہ ہم دوسری تفسیر کو —— جو یہ کہتی ہے کہ "شدید القوی" سے مراد خدا ہے، اور پیغمبر بھی اسی کی ذات پاک سے نزدیک ہوئے تھے —— انتخاب کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جو زیادہ تر مفسرین کی اس تفسیر سے روگردانی اور پہلی تفسیر کی طرف جانے کا سبب بنی۔ یہ ہے کہ اس تفسیر سے تجسم خدا اور اس کے لیے مکان کی بو آتی ہے، حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ نہ وہ مکان رکھتا ہے اور نہ ہی جسم، لاتدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار "آنکھیں اس کو نہیں دیکھتیں اور وہ تمام آنکھوں کو دیکھتا ہے" (انعام۔۱۰۳)؛ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ "تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں پر خدا ہے" (بقرہ ۱۱۵)؛ وھو معکم اینما کنتم "تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے" (حدید۔۴)

اور شاید ان مسائل کا مجموعہ ہی اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض مفسرین ان آیات کی تفسیر سے عجز و ناتوانی کا اظہار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اسرار غیب میں سے ہے جو ہم سب سے پوشیدہ و پنہاں ہیں۔

کہتے ہیں: ایک عالم سے ان آیات کی تفسیر پوچھی گئی تو اس نے کہا، وہ جگہ جہاں جبرئیل ناتواں ہو جائے۔ میں کون ہوں کہ اس معنی کے ادراک پر قادر ہوں۔ [3]

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اور انسانوں کے غور و فکر اور نصیحت کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس معنی کو قبول کرنا بھی مشکل ہے۔

لیکن اگر ہم آیات کی دوسرے معنی کے ساتھ، یعنی ایک قسم کے شہود اور ایک خاص معنوی قرب کے ساتھ، تفسیر کریں، تو یہ تمام مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: بلاشک و شبہ خدا کے لیے حسی رؤیت نہ تو دنیا میں امکان پذیر ہے اور نہ ہی آخرت میں، کیونکہ اس کا لازمہ جسمانیت اور مادی ہونا ہے، اور اسی طرح اس کا لازمہ تبدیلی، اور ایک حالت سے دوسری حالت میں آنا اور فساد پذیر ہونا ہے، اور زمان و مکان کی نیاز و احتیاج رکھنا ہے۔ اور ذات واجب الوجود ان تمام امور سے مبرا ہے۔

لیکن خدا کا مشاہدہ دل اور عقل کی نگاہ سے کیا جا سکتا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف امیرالمومنین علیؑ نے "ذعلب یمانی" کے جواب میں اشارہ فرمایا تھا:

"لاتدرکہ العیون بمشاھدۃ العیان ولکن تدرکہ القلوب بحقائق

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۸۔

[2] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۲۳۔

[3] "روح البیان" جلد ۹ ص ۲۱۹۔

الایمان"

"آنکھوں نے حسی مشاہدہ کے ذریعہ ہرگز اسے نہیں دیکھا، لیکن دلوں نے حقیقت ایمان کے ساتھ اسے پالیا ہے"[1]

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "باطنی نگاہ" دو قسم کی ہوتی ہے، ایک "نگاہ عقلانی" جو طریق استدلال سے حاصل ہوتی ہے، اور دوسری "شہود قلبی، جو ادراک عقلی سے مافوق ایک درک ہے اور اس کی نگاہ سے ماوراء ایک نگاہ ہے۔

یہ وہ مقام ہے جسے مقام "استدلال" کا نام نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ یہ مقام "مشاہدہ" ہے۔ لیکن ایک ایسا مشاہدہ جو دل کے ساتھ اور باطنی طریقے سے ہو، یہ وہ مقام ہے جو "اولیاء اللہ" کے لیے فرق مراتب کے ساتھ اور سلسلہ درجات سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ شہود باطنی بھی بہت سے مراتب و درجات رکھتا ہے، البتہ اس حقیقت کا ادراک ان لوگوں کے لیے جو اس تک نہیں پہنچے مشکل ہے۔

اوپر والی آیات سے ان قرائن کے ذریعہ اس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام مقام شہود پر فائز ہونے کے باوجود اپنی عمر مبارک کے دوران دو مرتبہ اتنی بلندی پر پہنچے کہ مقام "شہود کامل" پر سرفراز ہوئے۔

ایک احتمالاً آغاز بعثت میں ہوا تھا، اور دوسرا معراج کے موقع پر، اس طرح خدا کے قریب ہوئے، اور اس کے بساطِ قرب پر قدم رکھا، کہ بہت سے فاصلے اور حجاب ختم کر دیئے گئے۔ ایسا مقام جہاں جبرئیل امین یعنی خدا کا مقرب ترین فرشتہ تک پہنچنے سے عاجز تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ "فکان قاب قوسین او ادنیٰ" جیسی تعبیریں، سب کی سب کنایہ کی صورت میں، اور شدت قرب کے بیان میں ہیں۔ ورنہ وہ اپنے بندوں سے مکانی فاصلہ نہیں رکھتا، تاکہ اسے "قوس" اور "ذراع" کے ساتھ ناپا جائے اور "رؤیت" سے مراد بھی ان آیات میں آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے، بلکہ وہی شہود باطنی ہے۔

گزشتہ مباحث میں "لقاء اللہ" (پروردگار کی ملاقات) کی تفسیر میں، جو قرآن کی مختلف آیات میں روز قیامت کے مخصوصات میں سے ایک کے عنوان سے بارہا آیا ہے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ملاقات بھی —— اس کے برخلاف جو بعض کوتاہ فکر لوگوں نے سمجھ لیا ہے —— حسی ملاقات اور مادی مشاہدہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح کا شہود باطنی ہے اگرچہ وہ کئی مرحلہ نچلے درجہ میں ہے۔ اور وہ ہرگز بھی اولیاء و انبیاء کے مشاہدہ کے مرحلہ تک نہیں پہنچتا، چہ جائیکہ معراج کی شب پیغمبرؐ کے شہود کامل کے مرحلہ تک پہنچے۔

اس وضاحت کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہ اعتراضات جو اس تفسیر کے بارے میں نظر آتے تھے، برطرف ہو جائیں گے، اور اگر ان ماوراء مادی مسائل کی تشریح میں، ہمارے الفاظ و بیان کی تنگی کی بنا پر، کچھ خلاف ظاہر باتیں دکھائی دیتی ہوں، تو وہ ان اشکالات کے مقابلہ میں جو پہلی تفسیر پر ہیں، حقیر اور معمولی نظر آتی ہیں۔

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۷۹۔

جو کچھ یہاں تک بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیر بحث آیات پر اب نئے سرے سے ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اور آیات کے مضمون کا اس نئے زاویہ سے مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق، قرآن پیغمبرؐ پر نزول وحی کی اس طرح تشریح کرتا ہے: پر قدرت اور شدید القوٰی خدا نے اسے تعلیم دی، درحالیکہ وہ مکمل صورت اور حد اعتدال میں آگیا، اور افق اعلیٰ میں قرار پایا۔[1]

اس کے بعد وہ نزدیک ہوا، اور زیادہ نزدیک ہوا، اس طرح سے کہ اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان دو کمانوں سے زیادہ فاصلہ نہ رہا، اور یہ وہ منزل تھی، جہاں خدا نے جو وحی کرنی تھی وہ اپنے بندے پر وحی کی۔

اور چونکہ یہ شہود باطنی ایک جماعت پر گراں گزرا تھا۔ لہٰذا تاکید کرتا ہے کہ پیغمبرؐ کے دل نے جو کچھ دیکھا ہے حقیقتاً و واقعتاً دیکھا ہے، اور تمہیں اس بات کے خلاف اس سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان آیات کی تفسیر خدا کی نسبت پیغمبرؐ کے شہود باطنی کے ساتھ زیادہ صحیح اور روایات اسلامی کے ساتھ زیادہ موافق، اور پیغمبرؐ کے لیے ایک برتر فضیلت اور زیادہ لطیف مفہوم ہے۔ (واللہ اعلم بحقائق الامور)[2]

ہم اس بحث کو پیغمبرؐ کی ایک حدیث اور علیؑ کے ایک ارشاد پر ختم کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ سے لوگوں نے پوچھا: ھل رأیت ربک ؟: "کیا آپ نے کبھی اپنے پروردگار کو دیکھا ہے" ؟

آپؐ نے جواب میں فرمایا: رأیتہ بفؤادی: "میں نے اسے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے"[3]

اور نہج البلاغہ میں اسی "ذعلب یمانی" والے خطبہ کے درمیان آیا ہے کہ اس نے آنحضرت سے سوال کیا: ھل رأیت ربک یا امیر المؤمنین ؟!: "اے امیر المومنین کیا آپ نے کبھی اپنے خدا کو دیکھا ہے" ؟

آپ نے جواب میں فرمایا: افأعبد مالا اراہ ؟!: "تو کیا میں اس کی عبادت کرتا ہوں جسے میں نے دیکھا نہیں"۔

اس کے بعد آپ نے وحی تشریح پیش کی، جسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، کہ یہ شہود باطنی کی طرف اشارہ ہے[4]

---

[1] "فاستوٰی" کی ضمیر، اور اسی طرح "ھو بالافق الاعلیٰ" کی ضمیر ممکن ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف یا خدا کی ذات پاک کی طرف لوٹے۔

[2] یہاں اس نکتہ کو بھی اجمالی طور پر نظر میں رکھیں، کہ معراج کے بارے میں علماء کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ یہ پیغمبرؐ کی زندگی میں ایک مرتبہ ہوئی ہے یا دو مرتبہ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ آیات دونوں معراجوں میں دو شہود باطنی کی طرف اشارہ ہوں۔

[3] "بحار الانوار" جلد ۱۸ ص ۲۸۷ (ذیل مباحث معراج)۔

[4] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۹۔

۱۳۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ
۱۴۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝
۱۵۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ
۱۶۔ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ
۱۷۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝
۱۸۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

ترجمہ

۱۳۔ اور دوبارہ اس کا مشاہدہ کیا۔
۱۴۔ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک۔
۱۵۔ کہ جہاں جنت المأویٰ ہے
۱۶۔ اس وقت جب کہ ایک چیز (خیرہ کرنے والے نور) نے سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپ رکھا تھا۔
۱۷۔ نہ تو اس کی آنکھ نے انحراف کیا، اور نہ ہی سرکشی کی۔
۱۸۔ اس نے اپنے پروردگار کی چند عظیم آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔

تفسیر

دوسرا دیدار

یہ آیات، وحی اور پیغمبرؐ کے خدا سے ارتباط، اور اس کے شہود باطنی کے مسئلہ کے بارے میں، اسی طرح سے گزشتہ آیات کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

فرماتا ہے: "ایک مرتبہ پھر پیغمبر نے اس کا مشاہدہ کیا" (ولقد رآہ نزلۃ اخری)۔

"اور یہ شہود سدرہ المنتہیٰ کے پاس حاصل ہوا" (عند سدرۃ المنتھیٰ)۔

"وہی کہ جنت الماویٰ اور بہشت بریں اس کے پاس ہے" (عندھا جنۃ المأویٰ)۔

اس وقت جب کہ کسی چیز نے "سدرۃ المنتہیٰ کو گھیرا ہوا تھا اور ڈھانپ رکھا تھا" (اذ یغشی السدرۃ مایغشیٰ)۔

یہ وہ واقعات و حقائق تھے جن کا پیغمبر نے مشاہدہ کیا تھا، "اور اس کی آنکھ نے ہرگز انحراف نہیں کیا تھا، اور نہ ہی سرکشی کی تھی اور باطل تصورات کو حق کے لباس میں نہیں دیکھا تھا" (ما زاغ البصر وما طغیٰ)۔

"اس نے وہاں اپنے پروردگار کی عظیم اور بڑی آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا" (لقد رأیٰ من آیات ربہ الکبریٰ)۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں وہی ابہام، جس نے شروع شروع میں گزشتہ آیات کو گھیرا ہوا تھا، اسی نے ان آیات پر بھی جو انہیں مطالب کا دوسرا حصہ ہے سایہ ڈالا ہوا ہے۔ لہٰذا ان آیات کے مفاد کو واضح کرنے کے لیے ہر چیز سے پہلے ہم مفردات کو بیان کریں گے، اس کے بعد اس کے مجموعہ پر نظر ڈالیں گے۔

"نزلۃ" ایک مرتبہ نازل ہونے کے معنی میں ہے اس بنا پر "نزلۃ اخریٰ" یعنی ایک مرتبہ اور نازل ہونے میں[1] اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ "نزول" دو مرتبہ ہوا ہے، اور یہ ماجرا دوسرے نزول سے مربوط ہے۔

"سدرۃ" (بروزن حرفۃ) مفسرین اور علماء لغت کے عمومی قول کے مطابق، ایک درخت ہے جو گھنے پتوں والا اور سایہ دار ہوتا ہے (بیری) اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی تعبیر اس سایہ دار اور گھنے پتوں والے درخت کی طرف اشارہ ہے جو آسمان کی بلندی پر فرشتوں، ارواح شہداء، علوم انبیاء اور انسانوں کے اعمال کے بلند ہونے کی انتہا پر واقع ہے، وہ جگہ جس سے اوپر

---

[1] بعض ارباب لغت اور مفسرین نے "نزلۃ" کو "مرۃ" کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ اس بنا پر اس میں نزول کا معنی نہیں ہے۔ اور "نزلۃ اخریٰ" صرف دوسری مرتبہ کے معنی میں ہے، لیکن معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے "نزلۃ" کے اصلی مادہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ جب کہ دوسروں نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ اور ہمارے بیان کے مطابق تفسیر کی ہے (غور کیجئے)۔

پروردگار کے فرشتے نہیں جاتے۔ اور جبرئیل بھی سفر معراج میں جب اس جگہ پہنچے تو رک گئے۔

سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں اگرچہ قرآن مجید میں کوئی وضاحت نہیں آئی ہے، لیکن اسلامی روایات واخبار میں اس کے بارے میں گوناں گوں توصیفات بیان کی گئی ہیں۔ اور وہ سب کی سب اس واقعیت اور حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ اس تعبیر کا انتخاب ایک قسم کی تشبیہ کے عنوان سے ہے اور اس قسم کے بزرگ واقعات کے بیانات ہماری لغات اور زبانوں کی کوتاہی کی بنا پر ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

رأیت علی کل ورقۃ من اوراقھا ملکا قائما یسبح اللہ تعالیٰ

"میں نے اس کے ہر پتہ پر ایک فرشتہ کو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا تھا اور خدا کی تسبیح کرتا تھا۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

انتھیت الی سدرۃ المنتھیٰ، واذا الورقۃ منھا تظل امۃ من الامم

"میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا تو دیکھا کہ اس کے ہر پتہ کے سایہ میں ایک امت قرار پائی ہے۔"[2]

یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جیسے درخت ہم زمین پر دیکھتے ہیں ان کے مشابہ درخت ہرگز مراد نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عظیم سائبان کی طرف اشارہ ہے، جو رحمت حق کے قرب و جوار میں واقع ہے، جس کے پتوں پر فرشتے تسبیح کرتے ہیں، اور مختلف امتوں کے نیک اور پاک لوگ اس کے سایے میں قرار رکھتے ہیں۔

جنۃ المأوی" اس بہشت کے معنی میں ہے جو جائے سکونت ہے،[3] اور اس بارے میں کہ یہ کونسی بہشت ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے وہی بہشت جاودانی "جنۃ الخلد" سمجھا ہے، جو تمام اہل ایمان اور پرہیزگاروں کے انتظار میں ہے، اور وہ اس کی جگہ آسمان میں سمجھتے ہیں، اور سورۂ سجدہ کی آیت ۱۹ کو اس پر شاہد سمجھتے ہیں، فلھم جنات المأوی نزلاً بما کانوا یعملون" صالح عمل والے مؤمنین کے لیے جنت کے باغات ہیں جن میں وہ قیام کریں گے، اور یہ ان کے ان اعمال کے مقابلہ میں جنہیں وہ انجام دیا کرتے تھے، پذیرائی کا ایک ذریعہ ہے" کیونکہ یہ آیت بعد والی آیت کے قرینہ سے مسلمہ طور پر بہشت جاودانی کی بات کر رہی ہے۔

لیکن چونکہ ایک دوسری جگہ یہ بھی آیا ہے کہ "وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السماوات والارض" "پروردگار کی مغفرت میں اور اس جنت کی طرف، جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ (آل عمران-۱۳۳)۔ لہٰذا بعض نے اس معنی کو بعید شمار کیا ہے، کیونکہ زیر بحث آیات کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۵۵۔

[3] "مأوی" اصل میں محل انضام (ملنے) کے معنی میں ہے، اور چونکہ ایک مکان میں لوگوں کی سکونت ان کے ایک دوسرے سے انضام اور ملنے کا سبب ہے اس لیے یہ لفظ محل سکونت پر بولا گیا ہے۔

کہ " جنۃ المأوٰی " آسمان میں ہے اور یہ اس بہشت جاودانی کے علاوہ ہے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔
لہٰذا کبھی اس کی بہشت کی ایک مخصوص جگہ کے ساتھ تفسیر کی ہے جو " سدرۃ المنتہیٰ " کے پاس ہے اور جو خواص اور مخلصین کی جگہ ہے۔

اور بعض اوقات یہ کہا ہے کہ وہ برزخی جنت کے معنی میں ہے، جس میں شہداء اور مومنین کی ارواح وقتی طور پر جائے گی۔
آخری تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور وہ امور جو وضاحت کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں یہ ہے کہ معراج کی بہت سی روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس جنت میں ایک گروہ کو متنعم دیکھا، جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن سے پہلے بہشت جاوداں میں وارد نہیں ہوگا، کیونکہ قرآنی آیات بخوبی دلالت کرتی ہیں کہ پرہیزگار قیامت میں حساب کتاب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے نہ کہ موت کے بعد بلا فاصلہ، اور ارواح شہداء بھی برزخی جنت میں ہی قرار رکھتے ہیں، کیونکہ وہ بھی قیام قیامت سے پہلے بہشت جاوداں میں وارد نہیں ہوں گے۔

" مازاغ البصر وما طغٰی " کی آیہ اس معنی کی طرف اشارہ ہے، کہ پیغمبرؐ کی آنکھ اپنے مشاہدہ میں نہ تو دائیں بائیں ہوئی، اور نہ ہی حد اور مقصد سے تجاوز کیا، اور جو کچھ دیکھا ہے وہ عین واقعیت تھی، (کیونکہ " زاغ " " زیغ " کے مادہ سے، دائیں یا بائیں انحراف کے معنی میں ہے اور " طغٰی " " طغیان " کے مادہ سے حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کسی چیز کے مشاہدہ کے موقع پر جب خود اس چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا، یا دائیں بائیں یا اس سے ہٹ کر دیکھنے لگتا ہے تو اس وقت وہ غلطی میں پڑ جاتا ہے[1]

ہم آیات کے مفردات کی تفسیر سے فارغ ہو چکے تو اب آیات کی اجتماعی تفسیر پیش کرتے ہیں۔
یہاں پھر دو ہی نظریے، جو سابقہ آیات کی تفسیر میں تھے، بیان ہوئے ہیں۔
بہت سے مفسرین نے آیات کو، دوبارہ جبرئیل سے اس کی اصلی صورت میں، پیغمبرؐ کی ملاقات کی طرف واضح سمجھا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے معراج سے نزول کے وقت اسے " سدرۃ المنتہیٰ " کے پاس اس کی اصلی صورت میں دوبارہ دیکھا، اور آپ کی آنکھ اس منظر کے مشاہدہ سے کسی قسم کے اشتباہ اور غلطی میں گرفتار نہیں ہوئی، پیغمبرؐ نے وہاں حق تعالیٰ کی بعض عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ جس سے مراد یا تو وہی جبرئیل کی صورت واقعی ہے، یا آسمانوں کی عظمت کی آیات اور ان کے عجائبات، یا یہ دونوں۔

لیکن وہی اشکالات و اعتراف جو اس تفسیر کے لیے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ اسی طرح سے باقی ہیں۔ بلکہ کچھ اور اعتراضات کا ان پر اور اضافہ ہو گیا ہے، منجملہ۔

---

[1] تفسیر " المیزان " میں پہلا لفظ " کسی چیز کے مشاہدہ کی کیفیت میں خطا کرنے " کے معنی سے تفسیر ہوا ہے، اور دوسرا لفظ " اصل دیکھنے میں خطا کرنے " کے معنی میں، لیکن اس فرق کے لیے کوئی واضح دلیل بیان نہیں کی گئی، بلکہ لغت میں جو کچھ آیا ہے وہ وہی تفسیر ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

"نزلۃ اخریٰ" (ایک دوسرے نزول میں) کی تعبیر اس تفسیر کے مطابق کوئی واضح مفہوم نہیں رکھتی، لیکن دوسری تفسیر کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے ایک "دوسرے شہود باطنی" میں آسمانوں کے اوپر معراج کے موقع پر خدا کی ذات پاک کا مشاہدہ کیا، اور دوسرے لفظوں میں خدا نے ایک مرتبہ پھر ان کے پاک دل پر نزول فرمایا، (نزلۃ اخریٰ) اور شہود کامل حاصل ہوگیا، ایسے مقام پر جہاں بندوں کی طرف سے اللہ کی طرف قرب کی انتہا ہوتی ہے، سدرۃ المنتہیٰ کے قریب، جہاں جنت المأویٰ واقع ہے، ایسی حالت میں کہ سدرۃ المنتہیٰ کو نور کے حجابوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

پیغمبرؐ کے دل کی نگاہ، اس شہود میں ہرگز غیر حق پر نہیں پڑی، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، اور وہیں پر خدا کی عظمت کی نشانیاں آفاق وانفس میں بھی مشاہدہ کیں۔

شہود باطنی کا مسئلہ — جیسا کہ ہم پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں — ایک قسم کا ایسا ادراک اور دیکھنا ہے جو نہ تو ادراکاتِ عقلی سے مشابہت رکھتا ہے، اور نہ ہی ادراکات حسی کے ساتھ، کہ جنہیں انسان حواس ظاہر کے ذریعہ درک کرتا ہے اور اسے کئی جہات سے انسان کے اپنے وجود اور اپنے افکار وتصورات کے علم کے مشابہ سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ہم اپنے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اپنے افکار کا ادراک کرتے ہیں، اور اپنے ارادہ وخواہشات اور رجحانات سے باخبر ہیں، لیکن یہ آگاہی نہ تو طریق استدلال سے ہمیں حاصل ہوئی ہے، اور نہ ہی مشاہدہ ظاہری کے طریق سے، بلکہ یہ ہمارے لیے ایک قسم کا شہود باطنی ہے، کہ ہم اس طریقہ سے اپنے وجود اور اپنی نفسیات سے واقف ہیں۔

اسی علمی دلیل کی بنا پر — جو شہود باطنی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے — اس میں کسی قسم کی کوئی خطا واقع نہیں ہوتی، کیونکہ وہ نہ تو استدلال کے طریقے سے ہے، کہ جس کے مقدمات میں کوئی غلطی واقع ہوئی ہو، اور نہ ہی وہ حسی طریقہ سے ہے کہ حواس کے طریقہ سے اس میں کوئی خطا رونما ہو۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس شہود کی حقیقت کو، جو پیغمبرؐ نے معراج کی اس تاریخی رات میں خدا کی نسبت پیدا کی، نہیں پاسکتے، لیکن ہم نے ایک مناسب راہ سے نزدیک ہونے کے لیے ایک مثال دی ہے، اور اسلامی روایات بھی ہمارے راستہ کی راہ کشائی کر رہی ہیں۔

چند نکات

۱۔ معراج ایک مسلّمہ حقیقت ہے

علماء اسلام کے درمیان اصل مسئلہ معراج میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ قرآنی آیات بھی یہاں اور سورۂ اسراء کے آغاز میں اس پر گواہ ہیں، اور متواتر روایات بھی، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بعض لوگ پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں کی بنا پر اس بات کو قبول نہیں کرسکے کہ پیغمبرؐ نے اپنے جسم اور روح کے ساتھ پرواز کیا تھا، لہٰذا انہوں نے اس کی "معراج روحانی" اور حالت خواب سے مشابہ ایک چیز کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

حالانکہ پیغمبرؐ کی اس جسمانی پرواز میں نہ تو کوئی عقلی اشکال ہے۔ اور نہ ہی موجودہ زمانہ کے علوم کی طرف سے اس پر کوئی اعتراض

وارد ہوتا ہے، جس کی تفصیل ہم سورۂ اسراء کی تفسیر میں مبسوط طریقہ پر بیان کر چکے ہیں۔[1]

اس بنا پر استبعادات کی خاطر، ظاہر آیات اور صریح روایات کو ترک کرنے کے لیے کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر اوپر والی آیات کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایک گروہ اس مسئلہ کے خلاف لڑنے جھگڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، تاریخ بھی یہی کہتی ہے کہ مسئلہ معراج نے مخالفین کے درمیان ایک شور وغوغا کھڑا کر دیا تھا۔

اگر پیغمبر معراج روحانی اور خواب سے مشابہ کسی چیز کے مدعی ہوتے، تو اس کے استبعاد پر یہ شور وغوغا برپا نہ ہوتا۔

۲۔ معراج کا مقصد

پیغمبر کا شہود باطنی تک پہنچنا ایک طرف سے، اور آسمان کی وسعتوں میں اسی ظاہری آنکھ سے خدا کی عظمت کو دیکھنا دوسری طرف سے تھا، جس کی طرف یہاں بھی آخری زیر بحث آیت میں (لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ) اور سورۂ اسراء کی آیہ ایک میں بھی (لنریہ من آیاتنا) اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے دوسرے اہم مسائل ـــ فرشتوں، اہل جنت، دوزخیوں اور ارواح انبیاء ـــ سے متعلق آگاہی حاصل کی، جو آپ کی عمر مبارک کے سارے عرصہ میں خلق خدا کی تعلیم وتربیت میں آپ کے لیے الہام بخش تھی۔

۳۔ معراج اور بہشت

زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر شب معراج جنت کے قریب سے گزرے یا اس میں وارد ہوئے۔

یہ بہشت چاہے بہشت جاوداں اور "جنۃ الخلد" ہو ـــ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے ـــ یا وہ جنت برزخ ہو، جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ بہرصورت آپ نے اس بہشت میں انسانوں کے مستقبل کے بہت سے اہم مسائل مشاہدہ فرمائے ہیں، جن کی تشریح وتفصیل اسلامی روایات میں آئی ہے، اور ہم انشاء اللہ ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

۴۔ معراج اسلامی روایات میں

ان مسائل میں سے، جو روایات معراج، بلکہ اس سارے ہی مسئلہ کو بعض کی نظر میں قابل اعتراض بناتے ہیں، ان کے درمیان بعض ضعیف اور مجہول روایات کا وجود ہے، جب کہ "مجمع البیان" میں معروف مفسر مرحوم "طبرسی" کے قول کے مطابق، معراج کی روایات کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف : وہ روایات جو متواتر ہونے کی بنا پر قطعی ویقینی ہیں (مثلاً معراج کا اصل مسئلہ)

ب : وہ روایات جو (معتبر منابع سے نقل ہوئی ہیں) اور ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جن کے قبول کرنے میں کوئی عقل مانع نہیں ہے، مثلاً وہ روایات جو آسمانوں میں عظمت خدا کی بہت سی آیات کے مشاہدے کے بارے میں بات کرتی ہیں۔

ج : وہ روایات جن کا ظاہر ان اصولوں کے ساتھ جو آیاتِ قرآنی اور مسلم اسلامی روایات سے حاصل ہوئے ہیں منافات

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۲۔ صفحہ ۴۰ اور اس سے بعد

رکھتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ مثلاً وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر گرامیؐ نے جنتیوں کے ایک گروہ کو جنت میں اور دوزخیوں کے ایک گروہ کو دوزخ میں دیکھا۔ (تو اس کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد برزخی بہشت و دوزخ ہیں، ان میں سے ایک میں تو مؤمنین اور شہداء کی ارواح رہتی ہیں، اور دوسری میں کفار و مجرمین کی ارواح ٹھہرتی ہیں[1]

۵۔ وہ روایات جو ایسے باطل و بے بنیاد مطالب پر مشتمل ہیں۔ جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہیں، اور ان کے مطالب ہی ان کے مجعول ہونے پر گواہ ہیں، مثلاً وہ روایات جو کہتی ہیں کہ پیغمبرؐ نے خدا کو "ظاہری آنکھ" کے ساتھ دیکھا، یا اس سے گفتگو کی۔ اور اس کا مشاہدہ کیا، اس قسم کی روایات اور ان کی مانند قطعاً مجعول ہیں، (مگر یہ کہ شہود باطنی کے ساتھ ان کی تفسیر کی جائے)

اس تقسیم بندی کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم معراج کی روایات کا ایک اجمالی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے یہ آسمانی سفر چند مرحلوں میں کیا۔

پہلا مرحلہ، مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیانی فاصلہ کا مرحلہ تھا، جس کی طرف سورۂ اسراء کی پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ "منزہ ہے وہ خدا جو ایک رات میں اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا"

بعض معتبر روایات کے مطابق آپؐ نے اثناء راہ میں جبرئیل کی معیت میں سرزمین مدینہ میں نزول فرمایا اور وہاں نماز پڑھی[2]

اور مسجد الاقصیٰ میں بھی ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ جیسے عظیم انبیاء کی ارواح کی موجودگی میں نماز پڑھی، اور امام جماعت پیغمبرؐ تھے۔

اس کے بعد وہاں سے پیغمبرؐ کا آسمانی سفر شروع ہوا۔ اور آپؐ نے ساتوں آسمانوں[3] کو یکے بعد دیگرے عبور کیا، اور ہر آسمان میں ایک نیا ہی منظر دیکھا۔ بعض آسمانوں میں پیغمبروں اور فرشتوں سے۔ بعض آسمانوں میں دوزخ اور دوزخیوں سے اور بعض میں جنت اور جنتیوں سے ملاقات کی۔ اور پیغمبرؐ نے ان میں سے ہر ایک سے بہت سی تربیتی و اصلاحی قیمتی یادیں اپنی روح پاک میں ذخیرہ کیں، اور بہت سے عجائبات کا مشاہدہ کیا جن میں سے ہر ایک عالم ہستی کے اسرار میں سے ایک سر اور رمز تھا، اور واپس آنے کے بعد ان کو صراحت کے ساتھ اور بعض اوقات کنایہ اور مثال کی زبان میں اُمت کی آگاہی کے لیے مناسب فرصتوں میں بیان فرماتے تھے، اور تعلیم و تربیت کے لیے اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

---

[1] قرآن کی بعض آیات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پرہیزگار گروہ گروہ جنت میں داخل ہوں گے، اور کفار گروہ گروہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔ (سورۂ زمر آیات ۷۱ و ۷۳) دوسری آیات بھی اس معنی پر گواہی دیتی ہیں (مثلاً آیت ۷۰۔ زخرف، ۸۵ تا ۸۶ مریم، ۴۷ دخان)۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۸ صفحہ ۳۱۹۔

[3] قرآن کی بعض آیات کے مطابق مثلاً "انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب" ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے (صافات۔ ۶) ہم جو کچھ عالم بالا سے دیکھتے ہیں اور تمام ستارے اور کہکشائیں یہ سب پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ اس بنا پر چھ اور آسمان ان کے اوپر کے عوالم ہیں؟

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس آسمانی سفر کا ایک اہم مقصد، ان قیمتی مشاہدات کے تربیتی و عرفانی نتائج سے استفادہ کرنا تھا، اور زیر بحث آیات میں قرآن کی یہ پُرمعنی تعبیر " لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ " ان تمام امور کی طرف ایک اجمالی اور سربستہ اشارہ ہو سکتی ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ بہشت اور دوزخ جس کو پیغمبرؐ نے سفر معراج میں مشاہدہ کیا، اور کچھ لوگوں کو وہاں عیش میں اور عذاب میں دیکھا، وہ قیامت والی جنت اور دوزخ نہیں تھیں، بلکہ وہ برزخ والی جنت و دوزخ تھیں، کیونکہ ان آیات کے مطابق جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں قرآن مجید کہتا ہے کہ قیامت والی جنت و دوزخ قیام قیامت اور حساب و کتاب سے فراغت کے بعد نیکو کاروں اور بدکاروں کو نصیب ہو گی۔

آخر کار آپ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے، وہاں نُور کے بہت سے حجابوں کا مشاہدہ کیا، وہی جگہ جہاں پر " سدرۃ المنتہیٰ " اور " جنۃ المأویٰ " واقع تھی، اور پیغمبرؐ اس جہانِ سراسر نور و روشنی میں، شہود باطنی کی اوج، اور قربِ الی اللہ اور مقام " قاب قوسین اوادنیٰ " پر فائز ہوئے۔ اور خدا نے اس سفر میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت سے اہم احکام دیئے اور بہت سے ارشادات فرمائے جن کا ایک مجموعہ اس وقت اسلامی روایات میں " احادیث قدسی " کی صورت میں ہمارے لیے یادگار رہ گیا ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ فصل میں ہم اس کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کریں گے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات کی تصریح کے مطابق پیغمبرؐ نے اس عظیم سفر کے مختلف حصوں میں اچانک علیؑ کو اپنے پہلو میں دیکھا، اور ان روایات میں کچھ ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو پیغمبر اکرمؐ کے بعد علیؑ کے مقام کی حد سے زیادہ عظمت کی گواہ ہیں۔

معراج کی ان سب روایات کے باوجود کچھ ایسے پیچیدہ اور اسرار آمیز جملے ہیں جن کے مطالب کو کشف کرنا آسان نہیں ہے، اور اصطلاح کے مطابق روایات متشابہ کا حصہ ہیں۔ یعنی ایسی روایات جن کی تشریح کو خود معصومین کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

(روایات معراج کے سلسلہ میں مزید اطلاع کے لیے بحار الانوار کی جلد ۱۸ از ص ۲۸۲ تا ص ۴۱۰ رجوع فرمائیں)

ضمنی طور پر، معراج کی روایات اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی تفصیل سے آئی ہیں، اور ان کے راویوں میں سے تقریباً ۳۰ افراد نے حدیث معراج کو نقل کیا ہے[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے: یہ اتنا لمبا سفر طے کرنا اور یہ سب عجیب اور قسم قسم کے حادثات، اور یہ ساری لمبی چوڑی گفتگو میں، اور یہ سب کے سب مشاہدات ایک ہی رات میں یا ایک رات سے بھی کم وقت میں کس طرح سے انجام پا گئے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے، سفر معراج ہرگز ایک عام سفر نہیں تھا، کہ اسے عام معیاروں سے پرکھا جائے۔ نہ تو اصل سفر معمولی تھا اور نہ ہی آپ کی سواری، معمولی اور عام تھی، نہ آپ کے مشاہدات عام اور معمولی تھے اور نہ ہی آپ کی گفتگو میں، اور نہ ہی وہ پیمانے جو اس میں استعمال ہوئے ہمارے کرۂ خاکی کے محدود اور چھوٹے پیمانوں

---

[1] "تفسیر المیزان" جلد ۱۳ ص ۲۹ (سورۂ اسراء کی پہلی آیات کے ذیل میں۔ بحث روائی)

کے مانند تھے، اور نہ ہی وہ تشبیہات جو اس میں بیان ہوئی ہیں ان مناظر کی عظمت کو بیان کر سکتی ہیں جو پیغمبرؐ نے مشاہدہ کیے، تمام چیزیں خارق العادت صورت میں، اور اس مکان و زمان سے خارج کے پیمانوں میں —— جس سے ہم آشنا نہیں —— واقع ہوئیں۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ امور ہمارے کرۂ زمین کے زمانی پیمانوں کے ساتھ ایک رات یا ایک رات سے بھی کم وقت میں واقع ہوئے ہوں، (غور کیجئے)

۵۔ معراج کی رات خدا کی پیغمبر سے باتوں کا ایک گوشہ

کتب حدیث میں ایک روایت امیرالمؤمنین علیؑ کے واسطہ سے پیغمبر اسلامؐ سے اس سلسلہ میں آئی ہے جو بہت ہی شرح کے ساتھ ہے اور طولانی ہے، ہم اس کے کچھ گوشوں کو یہاں پیش کرتے ہیں، ایسے مطالب جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس تاریخی رات کی باتیں کس محور پر تھیں، اور انہوں نے آسمانوں کی بلندی کی طرح کس طرح سے بلندی حاصل کی۔

حدیث کے شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبرؐ نے شب معراج پروردگار سبحان سے اس طرح سوال کیا:

یارب ای الاعمال افضل؟

"پروردگارا! کونسا عمل افضل ہے؟"

خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

لیس شیء عندی افضل من التوکل علی، والرضا بما قسمت، یا محمد! وجبت محبتی للمتحابین فی، ووجبت محبتی للمتعاطفین فی، ووجبت محبتی للمتواصلین فی. ووجبت محبتی للمتوکلین علی ولیس لمحبتی علم ولا غایة ولا نهایة

"کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے، اور جو کچھ میں نے تقسیم کر کے دیا ہے، اس پر راضی ہونے سے، برتر نہیں ہے۔ اے محمدؐ! جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں، میری محبت ان کے شامل حال ہوگی، اور جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور میری خاطر دوستی کے تعلقات رکھتے ہیں، میں انہیں دوست رکھتا ہوں، علاوہ ازیں میری محبت ان لوگوں کے لیے جو مجھ پر توکل کرنے میں فرض اور لازم ہے، اور میری محبت کے لیے کوئی حد اور کنارہ اور انتہا نہیں ہے۔"

اس طرح سے محبت سے باتیں شروع ہوتی ہیں، ایسی محبت جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، جو کشادہ اور وسیع ہے، اور اصولی طور پر عالم ہستی اسی محور محبت پر گردش کر رہا ہے۔

ایک اور دوسرے حصہ میں یہ آیا ہے۔

"اے احمد! بچوں کی طرح نہ ہونا، جو سبز و زرد اور زرق و برق کو دوست رکھتے ہیں، اور جب انہیں کوئی عمدہ اور شیریں غذا دیتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کو

بھول جاتے ہیں"[1]

پیغمبرؐ نے اس موقع پر عرض کیا :

پروردگارا ! مجھے کسی ایسے عمل کی ہدایت فرما جو تیری بارگاہ میں قرب کا باعث ہو۔

فرمایا : "رات کو دن اور دن کو رات قرار دے" !

عرض کیا : کس طرح ؟ !

فرمایا : "اس طرح کہ تیرا سونا نماز ہو، اور ہرگز اپنے شکم کو پورے طور پر سیر نہ کرنا"

ایک اور حصہ میں آیا ہے :

اے احمد ! میری محبت فقیروں اور محروموں کی محبت ہے۔ ان کے قریب ہو، اور ان کی مجلس کے قریب بیٹھ، تاکہ میں تیرے نزدیک ہوں، اور دنیا پرست ثروت مندوں کو اپنے سے دور رکھ اور ان کی مجالس سے بچتا رہ"

ایک اور حصہ میں فرماتا ہے :

"اے احمد ! دنیا کے زرق و برق اور دنیا پرستوں کو مبغوض شمار کر، اور آخرت اور اہل آخرت کو محبوب رکھ، عرض کرتے ہیں، :

"پروردگارا ! اہل دنیا اور اہل آخرت کون ہیں" ؟

فرمایا : اہل دنیا تو وہ لوگ ہیں، جو زیادہ کھاتے ہیں، زیادہ ہنستے ہیں، زیادہ سوتے ہیں، اور غصہ کرتے ہیں، اور تھوڑا خوش ہوتے ہیں، نہ تو برائیوں کے مقابلہ میں کسی سے عذر چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی کسی عذر چاہنے والے سے اس کا عذر قبول کرتے ہیں، اطاعت خدا میں سست ہیں اور گناہ کرنے میں دلیر ہیں، لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے ہیں، حالانکہ ان کی اجل قریب آپہنچی ہے مگر وہ ہرگز اپنے اعمال کا حساب نہیں کرتے، اُن سے لوگوں کو بہت کم نفع ہوتا ہے۔ باتیں زیادہ کرتے ہیں، احساس مسئولیت نہیں رکھتے، کھانے پینے سے ہی غرض رکھتے ہیں۔

اہل دنیا نہ تو نعمت میں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ہی مصائب میں صبر کرتے ہیں۔ زیادہ خدمات بھی ان کی نظر میں تھوڑی ہیں (اور خود ان کی اپنی خدمات تھوڑی بھی زیادہ ہیں) اپنی اس کام کے انجام پانے پر، جو انہوں نے انجام نہیں دیا ہے، تعریف کرتے ہیں، اور ایسی چیز کا مطالبہ

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں ہر جگہ پیغمبرؐ کا نام "احمد" کے عنوان سے ذکر ہوا ہے، سوائے آغاز حدیث کے کہ وہاں "محمدؐ" ہے ہاں! "محمد" آپ کا زمینی نام تھا، اور "احمد" آسمانی نام، ایسا کیوں نہ ہوتا، "احمد" چونکہ "افعل تفضیل" کا صیغہ ہے، لہٰذا یہ زیادہ حمد و تعریف کو بیان کرتا ہے، اور پیغمبرؐ کو اس تاریخی رات میں، اور قرب خدا کے اس مرحلہ میں "محمدؐ" سے گزر کر "احمد" تک پہنچ جانا چاہیئے خصوصاً جبکہ احمد کا احد سے فاصلہ بہت کم ہے۔

کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں ہے۔

ہمیشہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بات کرتے ہیں، اور لوگوں کے عیوب تو یاد دلاتے رہتے ہیں لیکن ان کی نیکیوں کو چھپاتے ہیں عرض کیا: پروردگارا! کیا دنیا پرست اس کے علاوہ بھی کوئی عیب رکھتے ہیں؟

فرمایا: اے احمد! ان کا عیب یہ ہے کہ جہل اور حماقت ان میں بہت زیادہ ہے جس استاد سے انہوں نے علم سیکھا ہے وہ اس کی تواضع نہیں کرتے، اور اپنے آپ کو عاقل سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ صاحبان علم کے نزدیک نادان اور احمق ہیں"۔

اس کے بعد اہلِ آخرت اور بہشتیوں کے اوصاف کو یوں بیان کرتا ہے:

"وہ ایسے لوگ ہیں جو باحیا ہیں، ان کی جہالت کم ہے۔ ان کے منافع زیادہ ہیں۔ لوگ ان سے راحت و آرام میں ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے ہاتھوں تکلیف میں ہوتے ہیں، اور ان کی باتیں سنجیدہ ہوتی ہیں۔

وہ ہمیشہ اپنے اعمال کا حساب کرتے رہتے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ خود کو زحمت میں ڈالے رہتے ہیں، ان کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار ہوتے ہیں، ان کی آنکھ گریاں ہوتی ہے اور ان کا دل ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا ہے جس وقت لوگ غافلوں کے زمرہ میں لکھے جا رہے ہوں وہ اس وقت ذکر کرنے والوں میں لکھے جاتے ہیں۔

نعمتوں کے آغاز میں حمد خدا بجا لاتے ہیں اور ختم ہونے پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی دعائیں بارگاہ خدا میں قبول ہوتی ہیں، اور ان کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں، اور فرشتے ان کے وجود سے مسرور اور خوش ہیں۔۔۔۔۔۔۔ (غافل) لوگ ان کے نزدیک مردہ ہیں، اور خدا ان کے نزدیک حیّ و قیوم و کریم ہے۔ (ان کی ہمت اتنی بلند ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور پر نظر نہیں رکھتے)۔۔۔۔ لوگ تو اپنی عمر میں صرف ایک ہی دفعہ مرتے ہیں، لیکن وہ جہاد بالنفس، اور ہوا و ہوس کی مخالفت کی وجہ سے ہر روز ستر مرتبہ مرتے ہیں، (اور نئی زندگی پاتے ہیں)!۔۔۔۔۔۔

جس وقت عبادت کے لیے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک فولادی بند اور بنیان مرصوص کے مانند ہوتے ہیں، اور ان کے دل میں مخلوقات کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے کہ میں انہیں ایک پاکیزہ زندگی بخشوں گا۔ اور عمر کے اختتام پر میں خود ان کی روح کو قبض کروں گا اور ان کی روح کی پرواز کیلئے آسمان کے دروازوں کو کھول دوں گا، تمام حجابوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دوں گا، اور حکم دوں گا کہ بہشت خود کو ان کے لیے آراستہ کرے!۔۔۔۔۔۔

اے احمد! عبادت کے دس حصہ ہیں جن میں سے نو حصہ طلب حلال میں ہیں، جب تیرا کھانا اور

پینا حلال ہو گا تو تو میری حفظ و حمایت میں ہو گا، ۔۔۔۔۔۔"

ایک اور حصہ میں آیا ہے :

"اے احمد ! کیا تو جانتا ہے کہ کونسی زندگی زیادہ گوارا اور زیادہ دوام رکھتی ہے" ؟.

عرض کیا : خداوند ! نہیں !

فرمایا : گوارا زندگی وہ ہوتی ہے جس کا صاحب ایک لحہ کے لیے بھی میری یاد سے غافل نہ رہے۔ میری نعمت کو فراموش نہ کرے، میرے حق سے بے خبر نہ رہے۔ اور رات دن میری رضا کو طلب کرے۔

لیکن باقی رہنے والی زندگی وہ ہے جس میں اپنی نجات کے لیے عمل کرے، دنیا اس کی نظر میں حقیر ہو۔ اور آخرت بڑی اور بزرگ ہو، میری رضا کو اپنی رضا پر مقدم شمار کرے، اور ہمیشہ میری خوشنودی کو طلب کرے، میرے حق کو بڑا سمجھے۔ اور اپنی نسبت میری آگاہی کی طرف توجہ رکھے۔

ہر گناہ اور معصیت پر مجھے یاد کر لیا کرے، اور اپنے دل کو اس چیز سے جو مجھے پسند نہیں ہے پاک رکھے شیطان اور شیطانی وسوسوں کو مبغوض رکھے، اور ابلیس کو اپنے دل پر مسلط نہ کرے اور اُسے راہ نہ دے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو میں ایک خاص قسم کی محبت کو اس کے دل میں ڈال دوں گا۔ اس طرح سے کہ اس کا سارا دل میرے اختیار میں ہو گا۔ اس کی فرصت اور مشغولیت اس کا ہم و غم اور اس کی بات ان نعمتوں کے بارے میں ہو گی جو میں اہل محبت کو بخشتا ہوں۔

میں اس کی آنکھ اور دل کے کان کھول دیتا ہوں تاکہ وہ اپنے دل کے کان سے غیب کے حقائق کو سنے اور اپنے دل سے میرے جلال و عظمت کو دیکھے"!

اور آخر میں یہ نورانی حدیث ان بیدار کرنے والے جملوں پر ختم ہو جاتی ہے :

"اے احمد ! اگر کوئی بندہ تمام اہل آسمان اور تمام اہل زمین کے برابر نماز ادا کرے، اور تمام اہل آسمان و زمین کے برابر روزہ رکھے، فرشتوں کی طرح کھانا نہ کھائے اور (کوئی فاخرہ) لباس بدن پر نہ پہنے (اور انتہائی زہد اور پارسائی کی زندگی بسر کرے) لیکن اس کے دل میں ذرہ برابر بھی دنیا پرستی یا ریاست طلبی یا زینت دنیا کا عشق ہو۔ تو وہ میرے جاودانی گھر میں میرے جوار میں نہیں ہو گا۔ اور اپنی محبت کو اس کے دل سے نکال دوں گا ! میرا سلام و رحمت تجھ پر ہو، والحمد للہ رب العالمین"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۷، ص ۲۱ تا ۳۰ (تلخیص کے ساتھ)

یہ عرشی باتیں ـــــ جو انسانی روح کو آسمانوں کی طرف بلند کرتی ہیں، اور معراج الٰہی کی طرف سیر کراتی ہیں، اور آستانۂ عشق و شہود کی طرف کھینچتی ہیں ـــــ حدیث قدسی کا صرف ایک حصہ ہے۔

مزید براں ہمیں اطمینان ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنے ارشادات میں جو کچھ بیان فرمایا ہے ان کے علاوہ بھی، اس شب عشق و شوق اور جذبہ و وصال کی شب میں، ایسی باتیں، اسرار و رموز اور اشارے آپ کے اور آپ کے محبوب کے درمیان ہوئے ہیں جن کو نہ تو کان سننے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ ہی عام افکار میں ان کے درک کی طاقت ہے۔ اور اسی بنا پر وہ ہمیشہ پیغمبرؐ کے دل و جان کے اندر ہی مکتوم اور پوشیدہ رہے، اور آپ کے خواص کے علاوہ کوئی بھی اُن سے آگاہ نہیں ہوا۔

۱۹۔ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ

۲۰۔ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝

۲۱۔ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝

۲۲۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝

۲۳۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ؕ

ترجمہ

۱۹۔ مجھے بتاؤ کیا "لات" اور "عزیٰ" بت .....

۲۰۔ اور "منات" جو ان میں سے تیسرا ہے (خدا کی بیٹیاں ہیں) ؟

۲۱۔ کیا تمہارا حصہ تو بیٹا ہے اور اس کا حصہ بیٹی؟ (درحالیکہ تمہارے خیال میں لڑکیاں لڑکوں کی نسبت کم قدر و قیمت رکھتی ہیں)۔

۲۲۔ تو اس صورت میں یہ تقسیم غیر عادلانہ ہے۔

۲۳۔ یہ تو فقط وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کے رکھے ہیں، (ایسے نام جو بے معنی و مطلب اور اسمائے بے مسمّٰی ہیں) اور خدا نے ہرگز کوئی دلیل اور حجت اس پر نازل نہیں کی ہے۔ وہ صرف بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف

سے ان کے لیے ہدایت آچکی ہے۔

تفسیر

"توحید" و "وحی" و "معراج" اور آسمانوں میں خدائے یگانہ کی عظمت سے مربوط مباحث کے بیان کے بعد بتوں کے بارے میں مشرکین کے شرک اور بیہودہ عقائد کے بطلان کو پیش کرتا ہے۔

فرماتا ہے:

خدا کی عظمت اور اس کی عظیم آیات اور نشانیوں کو جان لینے کے بعد مجھے بتاؤ تو سہی کیا پھر بھی "لات" و "عزیٰ" بت ہی ....." (افرء یتم اللات والعزّٰی)۔

اور اسی طرح سے "منات" جو ان کا تیسرا بت ہے۔ جسے ان کے بعد ذکر کرتے ہو، کیا یہ مورتیاں خدا کی بیٹیاں ہیں، اور تمھیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں"؟ (ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ)[1]

"کیا تمھارا حصہ تو بیٹے ہیں اور اس کا حصہ بیٹیاں"؟ (الکم الذکر ولہ الانثیٰ)۔

حالانکہ تمھارے خیال میں بیٹیاں بیٹوں سے کم قدر و قیمت ہیں، یہاں تک کہ جب تم یہ سنتے ہو کہ تمھاری بیوی نے بیٹی جنی ہے تو تم غم واندوہ کی شدت اور غصہ سے سیاہ ہو جاتے ہو۔

اگر اسی طرح ہے تو پھر یہ تقسیم ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے۔ جو تم نے خود اپنے اور خدا کے درمیان روا رکھی ہے" (تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ)[2]

کیونکہ خدا کے حصہ کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہو۔

اس طرح قرآن ان کے گرے ہوئے اور بے ہودہ افکار کا مذاق اڑاتا ہے کہ تم ایک طرف تو بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے ہو، انہیں ننگ وعیب سمجھتے ہو۔ اور دوسری طرف فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے ہو، تم نہ صرف خود ان کی پرستش کرتے ہو،

---

[1] ان تینوں بتوں کے بارے میں ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، جو چیز یہاں قابل توجہ ہے وہ "ثالثۃ" "تیسرا" اور "اُخریٰ" (متأخر) کی تعبیر ہے، جو منات بت کے بارے میں آئی ہے۔ علماء نے ان دونوں تعبیروں کے لیے بہت زیادہ تفسیریں بیان کی ہیں۔ جن میں سے اکثر بے بنیاد تکلفات ہیں، جو کچھ زیادہ مناسب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین عرب کے نزدیک ان بتوں کی اہمیت اسی ترتیب کے ساتھ ہے جو آیت میں بتائی گئی ہے۔ تو اس بنا پر "منات" تیسرے مرتبہ میں قرار پاتا ہے۔ اور "اخریٰ" کے ساتھ اس کی توصیف اس کے رتبہ ومقام کے تاخر کی بنا پر ہے۔

[2] "ضیزیٰ" ناقص، ظالمانہ اور غیر معتدل کے معنی میں ہے۔

بلکہ ان کے بے روح مجسمے بھی بتوں کی صورت میں تمہاری نظر میں اتنے محترم ہیں کہ ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو، مشکلات میں ان سے پناہ مانگتے ہو، اور اپنی حاجتیں ان سے طلب کرتے ہو۔ حقیقتاً یہ ایک مذاق اور شرم والی بات ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم پتھر اور لکڑی کے بہت سے بت جن کی عرب پرستش کیا کرتے تھے، ان کے گمان میں فرشتوں کے مجسمے تھے، وہ فرشتے جنہیں وہ "رب النوع" اور عالم ہستی کا مدیر و مدبر سمجھتے تھے، اور خدا سے ان کی نسبت بیٹی اور باپ کی نسبت خیال کرتے تھے۔

جس وقت ان خرافات کا ایک دوسری بیہودگی کے ساتھ، جو وہ بیٹیوں کے بارے میں سمجھتے تھے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ان کا عجیب و غریب تضاد، خود ان کے عقائد و افکار کے بے بنیاد ہونے کا ایک بہترین گواہ بن جاتا ہے، اور کتنی عمدہ بات ہے کہ یہ چند مختصر سے جملوں کے ساتھ قرآن ان سب پر خط بطلان کھینچتے ہوئے ان کے مذاق اور مسخرہ پن کو آشکار کر دیتا ہے۔

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کا ہرگز منشا یہ نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے بیٹی اور بیٹے کے درمیان فرق کے بارے میں اعتقاد کو قبول کرلے، بلکہ وہ اس طریقہ سے مدمقابل کے مسلمات کو اس کے خلاف پیش کرنا چاہتا ہے جسے منطق کی اصطلاح میں "جدل" کہتے ہیں، ورنہ اسلام کی منطق میں، انسانی قدر و منزلت کے لحاظ سے، نہ تو بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق ہے، اور نہ ہی فرشتے بیٹی یا بیٹا ہیں اور نہ اصلاً وہ خدا کی اولاد ہیں، اور نہ ہی اصولاً خدا اولاد رکھتا ہے، یہ بے بنیاد مفروضے ہیں جن کی بنیاد دوسرے بے بنیاد مفروضوں پر ہے۔ لیکن یہ ان لغو بت پرستوں کے فکر و منطق کے ضعف و کمزوری کو ثابت کرنے کے لیے بہترین جواب ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں قرآن قاطعیت کے ساتھ کہتا ہے، یہ تو فقط نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کے رکھے ہوئے ہیں، (ایسے نام جو بے معنی اور اسمائے بے مسمی ہیں) اور خدا نے ہرگز کوئی دلیل اور حجت اس پر نازل نہیں کی ہے" (ان هی الا اسماء سمیتموها انتم و اٰباؤکم ما انزل الله بها من سلطان)[1]

نہ تو اس پر تم کوئی عقلی دلیل رکھتے ہو، اور نہ ہی وحی کے طریق سے کوئی دلیل تمہارے پاس ہے۔ اور یہ مٹھی بھر اوہام و خرافات اور کھوکھلے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں مزید کہتا ہے: وہ تو صرف بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں" اور یہ موہوم باتیں سب کی سب خیال اور ہوائے نفس کی پیداوار ہیں، (ان یتبعون الا الظن و ما تهوی الانفس)[2]

"حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے" (ولقد جاءهم من ربهم الهدی)۔

---

[1] "سلطان" تسلط اور غلبہ کے معنی میں ہے اور زندہ و یقینی دلائل کو "سلطان" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دشمن پر غلبہ کا سبب ہوتے ہیں۔

[2] "ما تهوی الانفس" میں "ما" "موصولہ" ہے، یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ مصدریہ ہو، البتہ نتیجہ کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں ہے۔

لیکن وہ آنکھیں بند کرکے اس سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور ان اوہام کی ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ عربوں کے تین مشہور بت

مشرکین عرب کے بہت سے بت تھے، لیکن بلاشک وشبہ ان میں سے تین بت "لات" و "عزیٰ" اور منات ایک خاص اہمیت اور شہرت رکھتے تھے۔

ان ناموں کے ساتھ ان تینوں کے نام رکھنے کے بارے میں، اور اسی طرح سب سے پہلے ان بتوں کے بنانے والے کے متعلق اور ان کے مقام اور پرستش کرنے والے قبیلہ کے سلسلہ میں بہت سی باتیں اور اختلافات ہیں۔ اور ہم یہاں صرف اسی بات پر ـــ جو کتاب "بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب" میں آیا ہے۔ اکتفا کرتے ہیں۔

"پہلا معروف بت، جسے عربوں نے انتخاب کیا، بت "منات" تھا، جو "عمرو بن لحی" کی طرف سے، بت پرستی کو شام سے حجاز کی طرف منتقل کرنے کے بعد، بنایا گیا تھا، یہ بت بحرۂ احمر کے پاس مدینہ اور مکہ کے درمیان کے علاقہ میں رکھا گیا تھا، اور تمام عرب اس کا احترام کیا کرتے تھے، اور وہ اس کے پاس قربانی کرتے تھے، لیکن سب سے زیادہ اسے دو قبیلے، "اوس" اور "خزرج" اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ آٹھویں ہجری میں، جو فتح مکہ کا سال تھا، جس وقت پیغمبرؐ مدینہ سے مکہ کی طرف جارہے تھے، آپؐ نے امیرالمومنین علیؑ کو بھیج کر اسے تڑوا دیا۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں نے بت "منات" بنانے کے ایک مدت بعد "لات" کو بنایا، جو ایک چار کونوں والے پتھر کی صورت میں تھا، اور سرزمین طائف میں رکھا گیا تھا، اس جگہ پر جہاں آج مسجد طائف کی بائیں طرف کا منارہ ہے اس بت کے خادم زیادہ تر قبیلۂ ثقیف میں سے تھے، جب وہ مسلمان ہوگئے، تو پیغمبرؐ نے مغیرہ کو بھیج کر اسے تڑوا دیا، اور اس نے اسے آگ میں پھینک کر جلا دیا۔

تیسرا بت جس کا زمانہ جاہلیت کے عربوں نے انتخاب کیا تھا، "عزّیٰ" تھا جو مکہ سے عراق کے راستے میں "ذات عرق" کے قریب رکھا ہوا تھا، اور قریش اس کا بہت ہی زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔

وہ ان تینوں بتوں کو اتنی اہمیت دیا کرتے تھے، کہ وہ خانۂ خدا کے گرد طواف کرتے وقت کہتے تھے: "واللات والعزّیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ، فانھن الغرانیق العلیٰ، وان شفاعتھن لترتجیٰ" لات وعزیٰ اور منات خوبصورت اور بلند مقام پرندے ہیں کہ جن سے شفاعت کی امید کی جاتی ہے"!!

اور وہ انہیں خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے (ظاہر یہ ہے کہ وہ انہیں فرشتوں کی مورتیاں خیال کرتے تھے جنہیں وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے[1]

---

[1] "بلوغ الارب فی معرفت احوال العرب" جلد ۲ ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا نام رکھنے میں بھی غالباً انہوں نے خدا کے ناموں سے استفادہ کیا ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ تانیث کی علامت کے ساتھ، تاکہ وہ اوپر والے عقیدہ کو ظاہر کرے، اس طرح سے کہ "اللّٰات" اصل میں "اللاھہ" تھا، اس کے بعد حرف "ھ" ساقط ہوگیا، اور اللّٰات ہوگیا[1] اور "العزّٰی" "اعز" کی مؤنث ہے اور "منات" "منی اللہ الشیء" کسی چیز کے خدا کی طرف سے مقدر ہونے سے لیا گیا ہے۔

بعض اسے "نوء" کے مادہ سے جانتے ہیں جو ان ستاروں میں سے تھا جن کے بارے میں عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب وہ طلوع کرتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی بارش ہوتی ہے، اور بعض اسے "منی" (بروزن سعی) کے مادہ سے خون بہانے کے معنی میں جانتے ہیں، کیونکہ وہ قربانی کے خون ان کے پاس بہایا کرتے تھے،[2]

بہرحال عرب ان بتوں کا اس قدر احترام کیا کرتے تھے، کہ بعض قبیلوں یا افراد کا نام "عبدالعزیٰ" اور "عبدمنات" کی طرح کے رکھا کرتے تھے[3]

۲- اسمہای بے مسمّٰی

شرک اور دو خداؤں یا کئی خداؤں کی پرستش کے قدیم ترین سرچشموں میں سے ایک، موجودات عالم کا تنوع ہے، کیونکہ کوتاہ فکر افراد یہ باور نہیں کر سکتے تھے، کہ یہ گوناں گوں اور متنوع موجودات، جو آسمان اور زمین میں ہیں، ایک ہی خدا کی مخلوق ہوں (کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر قیاس کر لیا تھا جو ہمیشہ ایک آدھ کام یا چند کاموں میں ہی مہارت رکھتے تھے) لہٰذا وہ موجودات کی ہر نوع کے لیے ایک علیحدہ خدا مانتے تھے۔ جسے وہ "رب النوع" سے تعبیر کرتے تھے مثلاً رب النوعِ دریا، رب النوعِ صحرا رب النوعِ باران، رب النوعِ آفتاب، رب النوعِ جنگ اور رب النوعِ صلح۔

یہ خیالی خدا جنہیں وہ بعض اوقات فرشتوں سے یاد کیا کرتے تھے، ان کے عقیدہ کے مطابق اس جہان کے حکمران تھے اور جس حصہ میں بھی کوئی مشکل پیدا ہوتی تو وہ اسی کے رب النوع سے پناہ مانگتے تھے، اس کے بعد چونکہ یہ سارے کے سارے موجودات کے رب النوع محسوس نہیں ہوتے تھے لہٰذا ان کی مورتیاں بنا کر ان کی عبادت کرنے لگے۔

یہ بیہودہ عقائد یونان سے دوسرے علاقوں کی طرف اور آخر کار حجاز کے علاقے کی طرف منتقل ہوئے۔ لیکن چونکہ عرب توحید ابراہیمی کی بنا پر، جو ان کے درمیان بطور یادگار رہ گئی تھی، اللہ کے وجود کے منکر نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے ان عقائد کو آپس میں ملا دیا، اور خداوند تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ برقرار رکھتے ہوئے، فرشتوں کا عقیدہ بھی اپنا لیا جن کا وہ خدا کے ساتھ باپ اور بیٹی کا رابطہ سمجھتے تھے، اور پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے مظہر اور ان کی مورتیاں سمجھتے تھے۔

---

[1] اس معنی کے مطابق اللات کو اللاۃ (گول تاء) کے ساتھ لکھا جانا چاہیے، لیکن چونکہ وقفی حالت میں (ھاء) کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے اور ممکن ہے کہ لفظ "اللہ" کے ساتھ اشتباہ ہو جائے لہٰذا اسے "اللّٰات" کی صورت میں لکھتے ہیں۔

[2] پہلا احتمال کشاف میں اور دوسرا بلوغ الارب میں آیا ہے۔

[3] بلوغ الارب جلد ۲ ص ۲۰۲ اور ۲۰۳۔

قرآن ایک مختصر لیکن جامع عبارت کے ساتھ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئی ہے، کہتا ہے، :"یہ سب بے معنی نام اور اسمائے بے مسمّٰی ہیں، جنہیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے بغیر کسی دلیل و مدرک کے انتخاب کر لیا ہے"!

نہ تو بارش کے خدا سے جس کا تم نے یہ نام رکھا ہے کوئی کام ہو سکتا ہے، اور نہ ہی سورج، دریا، جنگ اور صلح کے خیالی خداؤں سے کچھ ہو سکتا ہے۔

تمام چیزیں خدا ہی کی طرف سے ہیں، اور سب عالم ہستی اسی کا مطیع ہے۔ اور ان مختلف موجودات کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی ان کے خالق کی وحدت کی بہترین دلیل ہے، کیونکہ اگر کئی "الٰہ" اور بہت سے خدا ہوتے تو نہ صرف یہ کہ یہ ہم آہنگی موجود نہ ہوتی، بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا کہ سارا عالم تضاد اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے،: لوکان فیھما آلھۃ الّا اللہ لفسدتا۔

۲۔ بت پرستی کا نفسیاتی اور فکری سرچشمہ

بت پرستی کے سرچشمے تو ہمیں معلوم ہو گئے ہیں، لیکن بت پرستی کے کچھ اور نفسیاتی اور فکری سرچشمے بھی ہیں جن کی طرف اوپر والی آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور وہ بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی ہے۔

وہ ایک ایسا خیال اور تصور ہے جو نادان افراد میں پیدا ہو جاتا ہے، اور مقلدین آنکھیں اور کان بند کر کے ایک دوسرے سے لے لیتے ہیں اور پھر وہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے،

البتہ بت جیسا معبود، جو اپنے بندوں پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں رکھتا، اور نہ ہی کوئی معاد و قیامت اور حساب و کتاب رکھتا ہے، اور نہ ہی کوئی بہشت و دوزخ ہے۔ اور اس نے انہیں مکمل آزادی دے رکھی ہے، وہ صرف مشکلات میں اس کی طرف رخ کرتے ہیں اور اپنے خیال میں اس سے مدد طلب کرتے ہیں، یہ بات ان کی سرکش ہوا و ہوس کے ساتھ اچھی طرح سازگار ہے۔ اور ان کی خواہشات کے لیے میدان کو کھول دیتا ہے۔

اصولی طور پر، ہوائے نفس خود ایک عظیم ترین اور خطرناک ترین بت ہے۔ اور دوسرے بتوں کی پیدائش کا سرچشمہ ہے، اور بت پرستی کا بازار گرم ہونے کا سبب ہے۔

۴۔ پھر بھی "غرانیق" کا افسانہ

اس بحث کے دوران، جو ہم نے عربوں کے تین بتوں "لات و عزیٰ اور منات کے بارے میں تاریخی لحاظ سے بیان کی تھی، اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ وہ ان بتوں کو بلند پایہ "غرانیق" سمجھتے تھے، جن سے وہ شفاعت کی اُمید رکھتے تھے، (غرانیق "جمع" غرنوق" (بروزن مزدور) سفید یا سیاہ رنگ کے پانی کے ایک قسم کے پرندے کے معنی میں ہے) لہٰذا وہ بعض اوقات ان بتوں کے ناموں کے ذکر کے بعد "تلک الغرانیق العلیٰ و ان شفاعتھن لترتجی" کے جملوں کے ساتھ ان کی تعریف اور قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے۔

بعض کتابوں میں اس جگہ ایک بے ہودہ داستان بیان کی گئی ہے، کہ پیغمبر جب زیر بحث آیت "افرءیتم اللات والعزّٰی" پر پہنچے۔ تو (معاذ اللہ) آپ نے ان دو جملوں کا خود سے اضافہ کر دیا :"تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی" اور یہ چیز مشرکین کے خوش ہونے کا سبب بن گئی اور اس کو انہوں نے پیغمبرؐ کی طرف سے بت پرستی کے مسئلہ

کی طرف ایک قسم کا جھکاؤ سمجھا۔ اور اس سورہ کے آخر میں جب لوگوں کو سجدہ کی دعوت دی تو مشرک بھی مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ اور یہ خبر مشرکین کے اسلام لانے کے طور پر سب جگہ پھیل گئی، یہاں تک کہ حبشہ کے مہاجر مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ گئی اور ان میں سے بعض اتنے خوش ہوئے اور امن کا احساس کیا کہ اپنی ہجرت گاہ حبشہ سے مکہ کی طرف پلٹ آئے۔[1]

لیکن جیسا کہ ہم نے سورۂ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ ایک ایسی ناروا نسبت اور رسوا جھوٹ ہے۔ جس کے بطلان کو بہت سے دلائل اور قرائن واضح کرتے ہیں، جن لوگوں نے یہ جھوٹ گھڑا انھوں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ قرآن انہیں زیر بحث آیات میں صراحت کے ساتھ بت پرستی کی سرکوبی کر رہا ہے۔ اور اسے خیال خام اور ہوائے نفس کی پیروی شمار کرتا ہے۔ اور بعد والی آیات میں بھی صراحت اور پوری شدّت کے ساتھ بت پرستوں کے عقائد کی مذمت کر رہا ہے، اور اسے ان کی بے ایمانی بے علمی اور عدم آگاہی کی نشانی قرار دیتا ہے، اور صراحت کے ساتھ پیغمبرؐ کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنا معاملہ اُن سے الگ کرلے اور ان سے منہ پھیرلے۔

اس طرح یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ دو جملے پیغمبرؐ کی طرف سے ہوں، یا مشرکین اس قدر احمق ہوں کہ وہ یہ جملے تو سن لیں لیکن بعد والی آیات کو جو صراحت کے ساتھ بت پرستی کی سرکوبی کرتی ہیں نظر انداز کردیں۔ اور آخر میں خوش ہوجائیں اور سورہ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ سجدہ میں گر پڑیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اس افسانے کو گھڑنے والوں نے بہت ہی ناتجربہ کاری، اور کسی مطالعہ کے بغیر اسے گھڑا ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ پیغمبر کی طرف سے اس آیت افرءیتم اللّٰت والعزّٰی ..... کی قراءت کے وقت اچانک شیطان نے یا حاضر گروہ مشرکین میں سے کسی شیطان صفت انسان نے ان دو جملوں کا اضافہ کردیا ہو، (کیونکہ دونوں جملے ان کا شعار بن چکے تھے جن کے ذریعہ وہ ان تینوں بتوں کی تعریف کیا کرتے تھے) اور اس طرح سے ایک گروہ وقتی طور پر اشتباہ میں پڑگیا ہو۔

لیکن اس سورہ کے آخر پر نہ تو ان کا سجدہ کرنا کوئی مفہوم رکھتا ہے، اور نہ ہی پیغمبرؐ کا بت پرستی کے سلسلے میں جھکاؤ جیسا کہ تمام آیات قرآنی اور آپ کی تاریخ زندگی اس حقیقت اور واقعیت پر گواہ ہیں، کہ آپ نے کبھی بھی بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ مبارزہ کرنے میں، کسی بھی شکل وصورت میں، معمولی سے معمولی جھکاؤ نہیں دکھایا، اور اس سلسلہ میں آپ نے کسی بھی پیش نہاد کو قبول نہیں کیا، کیونکہ سارے اسلام کا خلاصہ توحید اور "لا الٰہ الّا اللّٰہ" ہے۔

لہٰذا پیغمبر اسلامؐ کسی طرح بھی اسلام کے اصلی مطلب اور مفہوم پر معاملہ نہیں کرسکتے؟

ہم اس سلسلے میں مزید دلائل اور استدلالات سورۂ حج کی آیت ۵۲ (جلد ۱۴ ص ۲۹ میں پیش کرچکے ہیں۔

---

[1] اس بیہودہ کہانی کو "طبری" نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد کے ص ۷۵ سے آگے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۲۴۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰیۖ
۲۵۔ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰیۖ
۲۶۔ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی○

ترجمہ

۲۴۔ کیا جو کچھ انسان آرزو رکھتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے ؟
۲۵۔ حالانکہ آخرت بھی اور دنیا بھی خدا ہی کے لیے ہے۔
۲۶۔ اور کتنے ہی زیادہ فرشتے آسمانوں میں ایسے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی، مگر اس کے بعد کہ خدا ــــ جس کے لیے چاہے اس سے راضی ہو کر (شفاعت کرنے کی) اجازت دے دے۔

تفسیر

شفاعت بھی اسی کے اذن سے ہوگی

یہ آیات اسی طرح سے بت پرستی کی بیہودگی کو بیان کرتے ہوئے اس کی مذمت کر رہی ہیں، اور گزشتہ آیات کے مضمون ہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پہلے بت پرستوں کی بے بنیاد آرزوؤں، اور ان توقعات کو جو وہ بتوں سے رکھتے تھے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا جو کچھ انسان آرزو رکھتا ہے وہ اُسے مل جاتا ہے"؟ (ام للانسان ما تمنّٰی)۔

کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بے روح اور بے قدر و قیمت اجسام اس کی شفاعت کے لیے بارگاہ خدا میں کھڑے ہو سکیں گے؟ یا اُسے دنیا و آخرت کی مشکلات میں پناہ دے سکیں گے؟

"حالانکہ دنیا و آخرت صرف خدا ہی کے لیے ہیں": (فللہ الاٰخرۃ والاولیٰ)۔

عالم اسباب اس کے ارادے کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ اور ہر موجود کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کے وجود کی برکت سے ہے شفاعت بھی اسی کی طرف سے ہے، اور مشکلات کا حل بھی اسی کے دست قدرت میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے آخرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا کے متعلق، کیونکہ وہ چیز جو سب سے زیادہ انسانی فکر کو اپنی طرف مشغول رکھے ہوئے ہے وہ آخرت کی نجات ہی ہے۔ اور خدا کی حاکمیت دوسرے گھر میں اس گھر سے زیادہ آشکار ہے۔

اس طرح سے قرآن مشرکین کو بتوں کی شفاعت، اور ان کے وسیلہ سے مشکلات کے حل سے، کلی طور پر مایوس، اور ناامید کر رہا ہے، اور یہ بہانہ ان سے چھین رہا ہے کہ ہم تو اس بنا پر ان کی پرستش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہ خدا میں ہماری شفاعت کریں: (و یقولون ھٰؤلآء شفعاؤنا عند اللہ)۔ (یونس، ۱۸)

اُوپر والی دو آیات میں ایک اور احتمال بھی ہے، اور وہ انسان کے، اپنی آرزوؤں اور خواہشات پر دسترس حاصل نہ کرنے کے طریق سے، پروردگار کے وجود کی طرف توجہ کرتا ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں ایک استفہام انکاری کی صورت میں کہتا ہے،: "کیا انسان اپنی تمام آرزوؤں کو پالیتا ہے"، اور چونکہ اس سوال کا جواب قطعاً نفی میں ہے۔ یعنی انسان ہرگز اپنی اکثر آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اصطلاح کے مطابق انہیں قبر میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے، یہی چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس عالم کی تدبیر کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اور صرف اس کا ارادہ اس جہان پر حاکم ہے، اس لیے دوسری آیت میں کہتا ہے، جب یہ بات ہے تو آخرت اور دنیا خدا ہی کے لیے ہیں۔

یہ معنی اسی چیز کے مشابہ ہے جو علیؑ کی مشہور گفتگو میں آئی ہے،:

عرفت اللہ سبحانہ بفسخ العزائم وحل العقود و نقض الھمم

"میں نے خدا کو پختہ ارادوں کے ٹوٹنے وعدوں کے ناتمام رہنے اور ہمتوں کے پست ہونے سے پہچانا ہے"۔[1]

اس تفسیر اور سابقہ تفسیر کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس مسئلہ پر اور زیادہ تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: "آسمانوں میں کتنے ہی زیادہ فرشتے ایسے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دے گی، مگر جس کسی کے لیے خدا چاہے اور اس سے راضی ہو کر اس کی شفاعت کی اجازت دے دے" (و کم من ملک فی السماوات لا تغنی شفاعتھم شیئاً الا من بعد ان یأذن اللہ لمن یشاء و یرضیٰ)۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۲۵۰۔

جہاں آسمان کے فرشتے اپنی ساری عظمت کے باوجود اجتماعی صورت میں بھی شفاعت پر قدرت نہیں رکھتے، جب تک کہ پروردگار کا اذن اور رضا نہ ہو، تو پھر ان بے شعور اور بے قدر و قیمت بتوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ جہاں تیز پرواز عقابوں کے پر و بال گر جاتے ہوں وہاں ناتواں مچھروں سے کیا ہوسکتا ہے، کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ ہم تو ان بتوں کی اس لیے پرستش کرتے ہیں تاکہ وہ بارگاہ خدا میں ہمارے شفیع ہوں؟

"کم" (کتنے بہت سے) کی تعبیر یہاں عموم کے معنی میں ہے۔ یعنی کوئی فرشتہ بھی اس کے اذن و رضا کے بغیر شفاعت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ تعبیر بعض اوقات لغت عرب میں ایک جمعیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیت ۷۰ میں لفظِ کثیر عموم کے معنی میں ہے: "وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا" "ہم نے بنی آدم کو اپنی ساری مخلوقات پر فضیلت اور برتری بخشی ہے" اس کے علاوہ سورۂ شعراء کی آیت ۲۲۳ میں شیاطین کے بارے میں یہ آیا ہے کہ: "واکثرھم کاذبون" "ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سب کے سب جھوٹے ہیں"[1]

باقی رہا "اذن" اور "رضا" میں فرق تو وہ اس لحاظ سے ہے، کہ "اذن" اس مقام پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی اپنی باطنی رضا کو ظاہر و آشکار کرے، لیکن رضا اس سے عام ہے، اور کسی چیز یا کام کو انجام دینے کے لیے ملائمت طبع کے معنی میں بھی ہے۔ اور چونکہ بعض اوقات کوئی شخص اذن تو دیتا ہے جب کہ وہ دل سے راضی نہیں ہوتا لہٰذا اوپر والی آیت میں تاکید کے لیے اذن کے بعد "رضا" کا مسئلہ بھی آیا ہے، اگرچہ خداوند تعالیٰ کے بارے میں اذن، رضا سے جدا نہیں ہے، اور اس کے بارے میں تقیہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

چند نکات

۱۔ آرزوؤں کے دامن کا پھیلاؤ

تمنا اور آرزو کا سرچشمہ انسان کی قدرت کا محدود ہونا اور اس کی ناتوانی ہے، کیونکہ جب کبھی اسے کسی چیز سے لگاؤ پیدا ہوا اور وہ اُسے حاصل نہ کرسکا، تو وہ آرزو اور تمنا کی صورت اختیار کرلیتی ہے، اور اگر ہمیشہ کسی چیز کی خواہش کرتے ہی وہ چیز حاصل ہوگئی ہوتی، اور جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اسے فوراً مل گیا ہوتا تو پھر آرزو کوئی معنی نہ رکھتی۔

البتہ بعض اوقات انسان کی تمنائیں سچی بھی ہوتی ہیں، اور وہ اس کی بلند روح سے سرچشمہ حاصل کرتی ہیں، اور وہ اس کی حرکت وسعی اور کوشش و جہاد اور سیر تکامل کے لیے ایک عامل بن جاتی ہیں، مثلاً انسان اس بات کی آرزو کرے کہ وہ علم و دانش اور تقویٰ و شخصیت میں تمام دنیا جہاں کے لوگوں سے بڑھ جائے۔

لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی یہ آرزوئیں جھوٹی ہوتی ہیں، اور ٹھیک سچی آرزوؤں کے برعکس غفلت، بے خبری، اور پس ماندگی کا سبب ہوتی ہیں، مثلاً عمر جاوداں تک پہنچنے کی آرزو۔ اور زمین پر ہمیشہ رہنے کی تمنا، اور تمام اموال اور ثروتوں پر قبضہ جمانا،

---

[1] "شفاعتھم" میں جمع کی ضمیر باوجود اس کے "ملک" مفرد ہے، مفہوم کلام کی رعایت کی بنا پر ہے، جو جمع کا معنی رکھتا ہے۔

اور تمام انسانوں پر حکومت کرنا اور اسی طرح کے دوسرے موہومات۔

اسی بنا پر اسلامی روایات میں اس بات کا شوق دلایا گیا ہے کہ لوگ اچھی آرزوئیں کریں، ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ:

من تمنی شیئاً وھو للہ عز وجل رضی لم یخرج من الدنیا حتی یعطاہ

"جو شخص کسی ایسی چیز کی تمنا کرے جو رضائے خدا کا موجب ہے، تو وہ دنیا سے اس وقت تک نہیں جاتا جب تک وہ پوری نہ ہو جائے۔"[1]

اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ دنیا میں اُسے حاصل نہ ہو تو اُسے اس کا اجر و ثواب ملے گا۔[2]

۲۔ شفاعت کے بارے میں گفتگو

آخری آیت ان آیات میں سے ہے، جو فرشتوں کے ذریعہ امکان شفاعت کی وضاحت کے ساتھ خبر دیتی ہے، جہاں وہ اذن و رضائے خدا سے شفاعت کا حق رکھتے ہیں، انبیاء اور اولیائے معصوم بطریق اولیٰ اس قسم کے حق کے حق دار ہیں۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اوپر والی آیت صراحت کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ: یہ شفاعت بے قید و شرط کے نہیں ہوگی، بلکہ یہ اذن و رضائے خدا کے ساتھ مشروط ہے۔ اور چونکہ اس کا اذن و رضا حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے لہٰذا انسان اور اس کے درمیان ایسا رابطہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ اس کے لیے، اپنے مقربان درگاہ کو، شفاعت کی اجازت دے دے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں امید شفاعت، انسان کے لیے ایک تربیتی مکتب کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور خدا سے اس کے تمام رشتوں کے ٹوٹنے سے مانع ہو جاتی ہے۔[3]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۱، ص ۲۶۱ (باب ثواب تمنی الخیرات)۔

[2] گذشتہ مآخذ۔

[3] "من یشاء" کی تعبیر جو اوپر والی آیت میں آئی ہے ممکن ہے ایسے انسانوں کی طرف اشارہ ہو جن کی شفاعت کی خدا اجازت دیتا ہے، یا اُن فرشتوں کی طرف اشارہ ہو جنہیں وہ شفاعت کی اجازت دیتا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

۲۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی ○

۲۸۔ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ۚ ○

۲۹۔ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۙ عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ ○

۳۰۔ ذٰلِکَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی ○

ترجمہ

۲۷۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو (خدا) کی بیٹی کا نام دیتے ہیں۔

۲۸۔ انہیں ہرگز اس بات کا یقین نہیں ہے، وہ تو صرف بے بنیاد گمان کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ گمان ہرگز بھی انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا۔

۲۹۔ اب جبکہ ایسا ہے، تو تم بھی ان لوگوں سے، جو ہمارے ذکر سے منہ موڑتے ہیں، اور مادی دنیا کے سوا کسی چیز کو طلب نہیں کرتے، منہ موڑ لو۔

۳۰۔ یہ ان کی آگاہی کی آخری حد ہے، تیرا پروردگار ان لوگوں کو جو اس کی راہ سے گمراہ ہو گئے ہیں اچھی طرح پہچانتا ہے، اور ہدایت یافتہ لوگوں کو سب سے بہتر طور پر جانتا ہے۔

تفسیر

ظن وگمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے

یہ آیات مشرکین کے عقیدہ کی نفی کے سلسلہ میں اسی طرح گزشتہ آیات کے موضوع کو بیان کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹیاں کہتے ہیں" (ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ لیسمون الملائکۃ تسمیۃ الانثیٰ)۔

ہاں! یہ قبیح اور بے غیرتی کی گفتگو صرف انہیں لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو حساب وکتاب اور جزائے اعمال کا عقیدہ نہیں رکھتے کیونکہ اگر وہ آخرت کا عقیدہ رکھتے تو اس طرح دیدہ دلیری کے ساتھ گفتگو نہ کرتے، ایسی گفتگو جس کے لیے کوئی معمولی سی دلیل بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ عقلی دلائل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ نہ تو خدا کے کوئی اولاد ہے اور نہ ہی فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں۔

"تسمیۃ الانثیٰ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، جو گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے۔ کہ یہ باتیں بے معنی نام اور اسمائے بے مسمّٰی ہیں دوسرے لفظوں میں وہ برائے نام کی حد سے آگے کی کوئی بات نہیں یعنی ان میں کوئی واقعیت اور حقیقت نہیں ہے۔

اس کے بعد اس نام رکھنے کے بطلان کی ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے: "وہ اس بات کے بارے میں علم ویقین نہیں رکھتے، بلکہ وہ بے بنیاد ظن کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ گمان ہرگز انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا اور کسی کو حق تک نہیں پہنچاتا" (وما لھم بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً)۔

ہدایت یافتہ اور صاحبِ عقیدہ انسان کوئی بات علم وآگاہی کے بغیر نہیں کہتا، اور کسی کی طرف کوئی نسبت بغیر دلیل کے نہیں دیتا، ظن وگمان اور خیال پر تکیہ کرنا شیطان یا شیطان صفت انسانوں کا کام ہے۔ اور خرافات اور موہومات کو قبول کرنا انحراف اور بے عقلی کی دلیل ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ "ظن" (گمان) کے دو مختلف معانی ہیں کبھی تو یہ بے بنیاد گمانوں کے معنی میں آتا ہے جو گزشتہ آیات کی تعبیروں کے مطابق "ہوائے نفس اور اوہام وخرافات" کے ہم پلہ وہم وزن ہے، زیر بحث آیات میں اس لفظ سے مراد یہی معنی ہے۔

دوسرا معنی وہ گمان ہیں جو معقول اور پسندیدہ ہیں اور اکثر اوقات واقع کے مطابق اور روزمرہ کی زندگی میں عقلاء کے کاموں کی بنیاد ہوتے ہیں، مثلاً محکمہ عدالت میں گواہوں کی گواہی، یا اہلِ خبرہ کا قول، یا "ظاہری الفاظ" اور اسی قسم کی دوسری باتیں کہ

اگر اس قسم کے گمانوں کو نوع بشر کی زندگی سے نکال لیں، اور صرف قطعی یقین پر ہی تکیہ کریں تو نظام زندگی کلی طور پر بکھر جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا ظن وگمان ان آیات میں مراد نہیں ہے۔ اور خود انہیں آیات میں اس معنی پر بہت سے شواہد موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دوسری قسم حقیقت میں ایک قسم کا عرفی علم ہے نہ کہ گمان وظن، تو اس بنا پر جو لوگ اس آیت (ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً) سے اور اسی قسم کی دوسری آیات سے "حجیتِ ظن" کی کلی طور پر نفی کے لیے استدلال کرتے ہیں، وہ قابل قبول نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فقہاء اور اصولیین کی اصطلاح میں "ظن" اعتقاد راجح کے معنی میں ہے، (وہ اعتقاد جس میں احتمال کا ایک پہلو انسان کی نظر میں ترجیح رکھتا ہو) لیکن لغت میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ یہ "وہم" اور ضعیف احتمالات پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور بت پرستوں کا ظن اسی طرح کا تھا، کوئی سی بیہودہ بات ایک ضعیف احتمال کی صورت میں ان کے دماغ میں ظاہر ہوتی تھی، اس کے بعد ہوائے نفس اس پر عمل کرنے کے لیے کھڑی ہو جاتی تھی، اور اس کو زینت دیتی تھی، اور دوسرا احتمال جو اس کے مقابل میں ہوتا تھا وہ زیادہ قوی ہوتا تھا، اس کو بھلا دیتے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ ایک راسخ عقیدہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا حالانکہ اس کی کچھ بھی بنیاد نہیں ہوتی تھی۔

اس کے بعد یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ گروہ اہل استدلال ومنطق نہیں ہے۔ اور حبِ دنیا اور خدا کی یاد کو بھلا دینے نے انہیں ان موہومات اور خرافات کی گندگی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے، مزید کہتا ہے، : جب ایسا ہے تو تم بھی ان لوگوں سے — جنہوں نے ہماری یاد سے پہلو تہی کی ہے اور وہ دنیا کی مادی زندگی کے سوا اور کسی چیز کے طالب نہیں ہیں — منہ پھیر لو اور ان کی بالکل پروا نہ کرو کیونکہ وہ گفتگو کرنے کے لائق ہی نہیں ہیں، (فاعرض عمن تولّی عن ذکرنا ولم یرد الّا الحیاۃ الدنیا)۔

بعض مفسرین کے عقیدہ کے مطابق "ذکر خدا" سے مراد قرآن ہے، اور کبھی یہ احتمال دیا گیا ہے کہ اس سے مراد منطقی اور عقلی دلائل ہیں، جو انسان کو خدا تک پہنچاتے ہیں، یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد وہی یاد خدا ہے جو غفلت کا نقطۂ مقابل ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جس میں خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ شامل ہے — چاہے وہ توجہ قرآن کے ذریعہ ہو، یا دلیل عقل سے ہو، چاہے سنّت کے طریق سے ہو، یا قیامت کی یاد کے ذریعہ ہو۔

ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یاد خدا سے غفلت اور مادیات اور زرق وبرق دنیا کی طرف متوجہ رہنے کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے مقابل تاثیر ہے خدا کی یاد سے غفلت انسان کو دنیا پرستی کی طرف ہانک کر لے جاتی ہے، جیسا کہ دنیا پرستی انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اور یہ دونوں ہوا پرستی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور طبعی طور سے وہ خرافات جو ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں وہ انسان کی نظر میں جلوہ دکھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ایک عقیدہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ اس گروہ سے منہ پھیر لینے کا حکم تبلیغ رسالت کے ساتھ جو پیغمبرؐ کا وظیفہ اصلی ہے ہرگز اختلاف نہیں رکھتا، چونکہ انذار وتبلیغ وبشارت ایسے موقعوں کے ساتھ مخصوص ہیں جہاں اثر کرنے کا کچھ نہ کچھ

احتمال ہو، جہاں اثر کے نہ ہونے کا یقین ہو وہاں اپنی توانائیوں کو فضول صرف نہیں کرنا چاہیے۔ اور اتمام حجت کے بعد اعراض کر لینا چاہیے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ حکم پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ راہ حق کے تمام ندا دینے والوں کو شامل ہے تاکہ وہ اپنی قیمتی تبلیغی توانائیوں کو صرف ایسے مقام پر صرف کریں جہاں اثر کی اُمید ہو۔ لیکن مغرور و سیاہ دل دنیا پرست جن کی ہدایت کی کوئی امید نہ ہو ان کو اتمام حجت کے بعد ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ خدا ان کے بارے میں فیصلہ کرے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے فکری انحطاط کو ثابت کرنے کے لیے مزید کہتا ہے،: "یہ ہے ان کی معلومات کی آخری حد" (ذالك مبلغهم من العلم)۔

ہاں! ان کے افکار کی بلندی یہاں پر آکر ختم ہو جاتی ہے کہ ملائکہ کے بارے میں خدا کی بیٹیاں ہونے کا افسانہ گھڑیں، اور اوہام و خرافات کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارتے پھریں، اور یہ ہے ان کی ہمت کا آخری نقطہ کہ خدا کو بھلا کر دنیا کی طرف رخ کر لیں۔ اور اپنے تمام انسانی شرف اور حیثیت کو درہم و دینار کے بدلے میں فروخت کر ڈالیں۔

آخر میں کہتا ہے: "تیرا پروردگار ان لوگوں کو جو اس کے راستے سے گمراہ ہو گئے ہیں اچھی طرح سے پہچانتا ہے، اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے" (ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بمن اهتدٰى)۔

"ذالك مبلغهم من العلم" کا جملہ ہو سکتا ہے کہ بت پرستی اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھنے جیسی خرافات کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی اس گروہ کی آخری آگاہی اور علم یہی موہومات ہیں۔

یا دنیا پرستی اور ان کے مادیات کے چنگل میں اسیر ہونے کی طرف اشارہ ہو، یعنی ان کا انتہائی فہم اور شعور یہ ہے کہ انھوں نے خواب و خور، عیش و نوش، اور فانی و زود گذر متاع اور زرق و برق دنیا پر قناعت کر لی ہے۔

ایک مشہور دعا میں جو ماہ شعبان کے اعمال میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے یہ آیا ہے کہ:

ولا تجعل الدنيا اكبر همنا ولا مبلغ علمنا

"خداوندا! دنیا کو ہمارے لیے سب سے بڑی فکری مشغولیت، اور ہمارے علم و آگاہی کی انتہا قرار نہ دے"[1]

آیت کا اختتام اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کہ خدا گمراہوں کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی ایک کو اپنے غضب کا مشمول بناتا ہے اور دوسرے کو اپنے لطف کا مشمول قرار دیتا ہے۔ اور قیامت میں ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا دے گا۔

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] یہ دعا اس اشارہ کے بغیر کہ یہ ماہ شعبان کے اعمال سے مربوط ہے۔ مجمع البیان اور بعض دوسری تفسیروں میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں آئی ہے۔

ایک نکتہ

دنیا پرستوں کا سرمایہ

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات میں، دنیا پرستوں کے لیے علم و آگاہی کے قائل ہونے کے باوجود، انہیں گمراہ شمار کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کی نگاہ میں وہ علوم جن کا آخری اور اصلی مقصد صرف مادیات کا حصول ہو اور اس کے سوا کوئی اور بلند تر مقصد نہ ہو، وہ علم نہیں ہے، بلکہ وہ ضلالت و گمراہی ہے، اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ تمام بدبختیاں جو موجودہ دنیا میں پائی جاتی ہیں ـــــ تمام جنگیں، خونریزیاں، ظلم و ستم، تجاوزات، فسادات اور آلودگیاں ـــــ انہیں ضلالت آفرین علوم سے پیدا ہوتی ہیں، ان کے علم کی انتہا وہی حیات دنیا ہے، اور ان کی نگاہ کا افق ان کی حیوانی احتیاجات و ضروریات سے آگے نہیں جاتا۔

ہاں! جب تک علم بلند تر مقاصد کے لیے آلہ نہ بنے جہالت ہے۔ اور جب تک وہ نورِ ایمان کے لیے ایک سرچشمہ اور اس کی راہ کا ایک ذریعہ نہ ہو، وہ ضلالت و گمراہی ہے۔

۳۱- وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ

۳۲- اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۧ

ترجمہ

۳۱- جو کچھ آسمانوں میں ہے وہ بھی اور جو کچھ زمین میں ہے وہ خدا ہی کے لیے ہے، تاکہ بدکاروں کو ان کے بُرے اعمال کی بنا پر سزا دے، اور نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال کے لیے اجر و پاداش عطا کرے۔

۳۲- وہی لوگ جو گناہانِ کبیرہ اور بُرے اعمال سے، سوائے صغیرہ کے، دوری اختیار کرتے ہیں، تیرے پروردگار کی بخشش وسیع ہے۔ وہ تمھاری نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہے، اس وقت سے جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا، اور جس وقت کہ تم جنینوں کی صورت میں اپنی ماؤں کے شکم میں تھے، پس تم خودستائی نہ کرو کیونکہ وہ پرہیزگاروں کو بہتر طور سے جانتا ہے۔

تفسیر

خودستائی نہ کرو وہ تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے،

چونکہ گزشتہ آیات میں گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کی نسبت علم خدا کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے، "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب خدا کے لیے ہی ہے" (و للہ ما فی السماوات و ما فی الارض)۔

عالم ہستی میں مالکیت مطلقہ اسی کے لیے ہے، اور حاکمیت مطلقہ بھی اسی کے لیے ہے، اسی بنا پر عالم ہستی کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور جب یہ بات ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی عبودیت و شفاعت کے لائق نہیں ہے۔

اس وسیع مخلوق کی خلقت سے اس کا سب سے بڑا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ انسان یعنی عالم ہستی کے گل سرسبد کو تکوینی اور تشریعی پروگراموں اور انبیاء کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ تکامل و ارتقاء کی راہ میں آگے لے جائے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں اس مالکیت کے نتیجہ کے عنوان سے فرماتا ہے: "غرض و مقصد یہ ہے کہ بدکاروں کو ان کے بُرے اعمال کی بنا پر سزا اور عذاب دے اور نیکوکاروں کو ان کے اچھے اعمال کے لیے اجر و پاداش عطا کرے" (لیجزی الذین اساؤا بما عملوا و یجزی الذین احسنوا بالحسنی)۔[1]

اس کے بعد نیکوکاروں کے اس گروہ کی توصیف و تعریف کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "وہ وہی لوگ ہیں جو گناہانِ کبیرہ اور برے اعمال سے دوری اختیار کرتے ہیں، اور اگر ان سے کوئی گناہ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف صغیرہ ہوتا ہے" (الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم)۔

"کبائر" جمع ہے کبیرہ کی اور "اثم" اصل میں اس عمل کو کہتے ہیں جو انسان کو خیر و ثواب سے دور کر دیتا ہے، لہٰذا عام طور پر گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

"لمم" (بروزن قلم) "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق، گناہ سے قریب ہونے کے معنی میں ہے، اور گناہانِ صغیرہ کو بھی لمم کہا جاتا ہے، اصل میں یہ لفظ "المام" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو کسی چیز کو انجام دیئے بغیر اس کے قریب ہونے کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات "قلیل اور کم اشیاء" پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے، (گناہ صغیرہ پر اطلاق بھی اسی بنا پر ہے)۔

---

[1] "لیجزی" میں "لام" "لام غایت" ہے، تو اس بنا پر جزا و سزا خلقت کی غایت و مقصد ہے اگرچہ بعض نے اسے گزشتہ آیت کے لفظ "اعلم" کے متعلق سمجھا ہے، اور (للہ ما فی السماوات و ما فی الارض) کے جملہ کو جملہ معترضہ جانتے ہیں، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

مفسرین نے بھی "لمم" کے لیے تقریباً اسی قسم کی تفسیریں بیان کی ہیں، بعض نے اس کی "گناہ صغیرہ" کے ساتھ، اور بعض نے اسے معصیب کی نیت اسے انجام دیئے بغیر، اور بعض نے "کم اہمیت معاصی" کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے۔

بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ "لمم" ہر قسم کے گناہ کو شامل ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، لیکن اس کی عادت نہ پڑ گئی ہو، اور وہ کبھی کبھار سرزد ہو جاتا ہو۔ اور انسان متذکر ہو کر اس سے توبہ کرلے۔

اسلامی روایات میں بھی اس لفظ کے لیے گوناں گوں تفسیریں آئی ہیں، ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہوا ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هوالذنب يلم به الرجل فيمكث ما شاء الله، ثم يلم به بعد

"اس سے مراد وہ گناہ ہے جسے انسان کر بیٹھتا ہے پھر ایک مدت تک اس سے رکا رہتا ہے، اور پھر دوبارہ اس سے آلودہ ہو جاتا ہے، (لیکن یہ اس کا ہمیشہ کا عمل ہرگز نہیں ہے)[1]

ایک اور دوسری حدیث میں اسی امامؑ سے یہ منقول ہوا ہے کہ:

اللمم الرجل يلم به الذنب فيستغفر الله منه

"لمم یہ ہے کہ انسان کوئی گناہ کر بیٹھے اور پھر اس سے استغفار کرے"[2]

اور دوسری روایات بھی اسی مفہوم کی نقل ہوئی ہیں۔

آیت میں موجود قرائن بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ "لمم" ان گناہوں کے معنی میں ہے جو کبھی کبھار انسان سے سرزد ہو جاتے ہوں، پھر وہ متوجہ ہو کر انہیں چھوڑ دیتا ہے،

کیونکہ "کبائر" سے "لمم" کا استثناء (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے استثناء کا ظاہر، استثناء متصل ہے) اس معنی پر ایک گواہ ہے۔

علاوہ ازیں قرآن بعد والے جملہ میں کہتا ہے، "تیرے پروردگار کی بخشش بہت وسیع ہے" (ان ربك واسع المغفرة)۔

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کے لیے پروردگار کے غفران کی ضرورت ہے، نہ کہ صرف قصد و نیت، اور گناہ سے اس کا مرتکب ہوئے بغیر قریب ہونا۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ ممکن ہے نیکوکاروں سے کوئی لغزش ہو گئی ہو، لیکن گناہ ان کی طبیعت اور عادت کے برخلاف ہے، ان کی روح اور قلب ہمیشہ پاک رہتے ہیں، اور آلودگیاں عارضی قسم کی ہوتی ہیں، لہٰذا گناہ کرتے ہی پشیمان ہو جاتے ہیں، اور خدا سے بخشش کی التجا کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۲۰۱ میں آیا ہے،: ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون "پرہیزگار جس وقت ان شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے وجود کے گرد گردش کر رہے ہیں، تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور بینا ہو جاتے ہیں (اور توبہ کر لیتے ہیں)۔

---

[1] "کافی" جلد ۲ کتاب الایمان والکفر باب اللمم (ص ۲۲۰)۔

[2] "کافی جلد ۲ کتاب الایمان والکفر باب اللمم (ص ۲۲۰)۔

اسی معنی کی نظیر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ میں بھی آئی ہے، جہاں وہ "متقین اور محسنین" کی تعریف وتوصیف میں فرماتا ہے:

والذین اذا فعلوا فاحشة اوظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم: "وہ وہی لوگ ہیں کہ جس وقت وہ کسی برے کام کا ارتکاب کر لیتے ہیں، یا اپنے آپ پر کوئی ظلم کر لیتے ہیں، تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں"

یہ سب باتیں اس تفسیر پر گواہ ہیں جو "لمم" کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

یہاں ہم امام صادقؑ کی ایک دوسری حدیث کے ساتھ اس بحث کو ختم کرتے ہیں، جو آپ نے زیر بحث آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمائی۔

اللمام العبد الذی یلم بالذنب بعد الذنب لیس من سلیقته، ای من طبیعته

"لمم" کو انجام دینے والا وہ بندہ ہے جس سے کبھی کبھار گناہ سرزد ہو جاتا ہے لیکن اس کی طبیعت اور عادت ایسی نہیں ہوتی"[1]

آیت کے آخر میں اجر وثواب اور سزا وعذاب کے مسئلہ میں عدالتِ پروردگار کی تاکید کے لیے، اس کے علم بے پایاں کے بارے میں، جو تمام بندوں اور ان کے اعمال کو محیط ہے گفتگو کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "وہ تمہاری نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہے، اسی وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور جس وقت کہ تم جنینوں کی صورت میں اپنی ماؤں کے شکم میں تھے" (هو اعلم بکم اذ انشأکم من الارض واذ انتم اجنة فی بطون امهاتکم)[2]

انسان کی زمین سے خلقت یا تو اس کی پہلی خلقت کے اعتبار سے ہے، جو حضرت آدم کے طریقہ سے ہوئی کہ وہ مٹی سے پیدا ہوئے تھے، یا اس اعتبار سے ہے کہ انسانی وجود کی تشکیل دینے والے تمام مادے زمین سے لئے گئے ہیں، جو تغذیہ کے طریق سے نطفہ کی ترکیب بندی میں، اور اس کے بعد جنین کی پرورش کے مراحل میں بھی اثر رکھتے ہیں، اور بہرحال مقصد یہ ہے کہ خدا اسی وقت سے، جب تمہارے وجود کے ذرات زمین کی مٹی کے درمیان تھے، اور اسی دن سے، جب کہ تم رحم مادر میں، رحم کے تاریک ظلمانی پردوں کے اندر، ایک ناچیز نطفہ تھے، تمہارے وجود کے تمام جزئیات سے آگاہ تھا، تو ان حالات میں کس طرح ممکن ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہو؟

یہ تعبیر ضمنی طور سے بعد والی گفتگو کے لیے ایک مقدمہ ہے جس میں وہ فرماتا ہے: "پس تم خودستائی نہ کرو اور اپنے پاک اور ظاہر ہونے کے بارے میں باتیں نہ بناؤ، کیونکہ وہ پرہیزگاروں کو سب سے بہتر طور سے جانتا ہے" (فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی)۔

نہ تو اسے تمہارے تعارف کی ضرورت ہے، اور نہ ہی تمہارے نیک اعمال کی تشریح وتفصیل کی، وہ تمہارے اعمال

---

[1] "کافی" جلد ۲ باب لمم ص ۳۲۱۔

[2] "اجنة" جمع جنین، اس بچے کے معنی میں ہے جو شکم مادر میں ہو۔

سے بھی آگاہ ہے، اور تمہاری نیت کے خلوص کی میزان سے بھی، یہاں تک کہ وہ تمہیں خود تم سے بہتر طور پر پہچانتا ہے، اور تمہارے اندرونی صفات اور بیرونی اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ایسے گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو نماز و روزہ کو انجام دینے کے بعد اپنی تعریف کرنے لگتے تھے اور کہا کرتے تھے، : ہماری نماز اس طرح کی تھی، اور ہمارا روزہ ایسا تھا! تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے منع کیا[1]

چند نکات

۱۔ خدا کا علم بے پایاں

ان آیات میں علم خدا اور اس کی بے انتہا وسعت کی طرف پھر اشارہ ہوا ہے، لیکن یہ تعبیر ایک نئی تعبیر ہے، کیونکہ اس میں دو نکتوں پر تکیہ کیا گیا ہے جو انسان کے خفی ترین اور پیچیدہ ترین حالات میں سے ہے: مٹی سے انسان کی خلقت کی حالت، جس میں ابھی تک ماہر علماء کی عقلیں حیران ہیں، کہ ایک زندہ موجود کا بے جان موجود سے وجود میں آنا کس طرح ممکن ہے؟ اس قسم کا کوئی امر گزشتہ زمانہ میں قطعی اور یقینی طور پر واقع ہوا ہے۔ خواہ انسان کے بارے میں ہوا ہو یا دوسرے جانداروں کے بارے میں، لیکن کن حالات میں ایسا ہوا یہ معلوم نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور پراسرار ہے، کہ ابھی تک اس کے اسرار نوع بشر کے علم و دانش سے پوشیدہ چلے آرہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جنینی دور میں وجود انسانی کی اسرار آمیز تبدیلیوں کا ہے، کہ وہ بھی انسان کی خلقت کی کیفیات میں سے پراسرار ترین حالت ہے، اگرچہ انسان کے علم و دانش کے لیے اس کا ایک ہیولا سا کشف ہو چکا ہے، لیکن جنین کے بارے میں اسرار آمیز مسائل، اور جواب کے بغیر رہے ہوئے سوالات تامل بھی کم نہیں ہیں۔

وہ ہستی جو انسان کے وجود کی ان دونوں حالتوں کے تمام اسرار، اور اس کی تبدیلیوں اور تغیرات سے آگاہ ہے، اور اس کی ہدایت و رہبری اور تربیت کرتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے اعمال و افعال سے باخبر نہ ہو اور ہر کسی کو اتنی جزا نہ دے جو اُس کے لیے لازم ہے؟

پس یہ علم بے پایاں اس کی عدالت مطلقہ کا سہارا ہے۔

۲۔ کبائر الاثم کیا ہے؟

گناہانِ کبیرہ کے بارے میں جن کی طرف چند آیاتِ قرآن میں اشارہ ہوا ہے،[2] ایک طرف تو مفسرین نے اور دوسری طرف فقہا اور محدثین نے بہت اختلاف کیا ہے۔

---

[1] "روح المعانی" جلد ۷، ص ۵۵۔

[2] نساء، آیت ۳۱ شوریٰ آیت ۳۷ اور زیر بحث آیات۔

بعض تو سب گناہوں کو ہی کبیرہ کہتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ہر گناہ بڑا ہے۔

جب کہ بعض دوسروں نے "کبیرہ" اور "صغیرہ" کو ایک امر نسبتی گردانا ہے، اور وہ ہر گناہ کو زیادہ اہم گناہ کے مقابلہ میں صغیر سمجھتے ہیں، اور چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ جانتے ہیں۔

بعض نے کبیرہ ہونے کا معیار، اس کے لیے تمن قرآن میں عذاب الٰہی کو سمجھا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر وہ گناہ "گناہ کبیرہ" ہے، جس کے لیے شرعی حد جاری ہوتی ہے۔

لیکن سب سے بہتر بات یہ ہے، کہ یہ کہا جائے، کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ "کبیرہ" کی تعبیر عظمت گناہ کی دلیل ہے، لہٰذا ہر وہ گناہ جس میں ذیل کی شرائط پائی جاتی ہوں، گناہ کبیرہ شمار ہوگا:

الف: وہ گناہ جن پر خدا نے عذاب کی دھمکی دی ہے۔

ب: وہ گناہ جو اہل شرع کی نظر میں اور روایات کی زبان میں کبیرہ کہے گئے ہیں۔

ج: وہ گناہ جو منابع شرعی میں ان گناہوں سے بڑے شمار ہوئے ہیں جو کبائر کا حصہ ہیں۔

د: اور آخر میں وہ گناہ جن کے کبیرہ ہونے کی معتبر روایات میں تصریح ہوئی ہے۔

اسلامی روایات میں کبائر کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے، بعض میں ان کی تعداد سات گناہ ہیں، (قتل نفس، عقوق والدین، سود خوری، ہجرت کے بعد دار الکفر کی طرف پلٹ جانا، پاک دامن عورتوں کی طرف زنا کی نسبت دینا، یتیم کا مال کھانا، اور جہاد سے فرار کرنا)[1]

اور بعض دوسری روایات میں اس کی تعداد، اس فرق کے ساتھ، سات گناہ شمار ہوئی ہے، کہ عقوق والدین کی جگہ "کلما اوجب اللہ علیہ النار" (ہر وہ گناہ جس پر خدا نے جہنم واجب کی ہے) ذکر ہوا ہے۔

بعض دوسری روایات میں اس کی تعداد دس شمار ہوئی ہے، اور بعض میں اٹھیس، اور بعض میں بہت زیادہ تعداد نظر آتی ہے[2]

کبائر کی تعداد کے شمار کرنے میں یہ فرق اس بنا پر ہے، کہ تمام گناہانِ کبیرہ بھی یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے بعض زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ اکبر الکبائر ہیں، اس بنا پر ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

۲۔ خودستائی اور تزکیۂ نفس

اس کام کی برائی اس حد تک ہے کہ یہ مطلب ایک ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ: تزکیۃ المرء نفسہ قبیحہ "خودستائی قبیح اور ناپسندیدہ کام ہے"۔

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۱۱ "ابواب جہاد النفس" باب ۴۶ حدیث ۱۔

[2] مزید توضیح کے لیے اوپر والے مدرک (باب ۴۶ از ابواب جہاد النفس) کی طرف رجوع کریں وہاں کبائر کے تعین کے بارے میں ۳۷ احادیث ذکر ہوئی ہیں۔

اس ناپسند عمل کا اصلی سرچشمہ اپنے آپ کو نا پہچاننا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو اچھی طرح پہچان لے، پروردگار کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے پن کو، اور اپنے ذمہ سنگین ذمہ داریوں کے مقابلہ میں اپنے اعمال کے ناچیز ہونے کو، اور ان عظیم نعمتوں کو جو خدا نے اُسے بخشی ہیں جان لے، تو پھر وہ ہرگز خودستائی کی راہ میں قدم نہیں رکھے گا۔

غرور و غفلت، اور خود کو بڑا سمجھنا، اور زمانہ جاہلیت کے افکار بھی اس قبیح کام کے لیے دوسرے اسباب و محرکات ہیں۔

خودستائی چونکہ اپنے کامل ہونے کے عقیدہ کو بیان کرتی ہے، لہٰذا پیچھے رہ جانے اور پسماندگی کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ تکامل وارتقاء کا رمز اپنی تقصیر و کوتاہی کا اعتراف، اور نقائص اور کمزوریوں کے وجود کو قبول کرنا ہے۔

اسی بنا پر اولیائے خدا ہمیشہ خدائی وظائف اور ذمہ داریوں کے مقابلہ میں اپنی تقصیر و کوتاہی کے معترف رہتے تھے اور لوگوں کو خودستائی اور اپنے اعمال کو بڑا سمجھنے سے منع کیا کرتے تھے۔

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے زیر بحث آیت (فلا تزکوا انفسکم) کی تفسیر میں آیا ہے:

لا یفتخر احدکم بکثرة صلاته و صیامه و زکوته و نسکه لان الله عز وجل اعلم بمن اتقی:

"تم میں سے کوئی بھی شخص اپنی نماز و روزہ و زکوٰۃ اور مناسک حج و عمرہ کے زیادہ ہونے پر فخر نہ کرے کیونکہ خدا تم میں سے پرہیزگاروں کو سب سے بہتر جانتا ہے۔"[1]

امیرالمؤمنین علیہ السلام، معاویہ کے نام اپنے ایک خط میں، جس میں بہت ہی اہم مسائل تحریر کئے تھے، فرماتے ہیں:

ولولا ما نهی الله عنه من تزکیة المرء نفسه لذکر ذاکر فضائل جمة، تعرفها قلوب المؤمنین، ولا تمجها آذان السامعین

"اگر یہ بات نہ ہوتی کہ خدا نے خودستائی سے منع کیا ہے، تو بیان کرنے والا اپنے بہت سے ایسے فضائل کو شمار کرتا جن سے آگاہ مؤمنین کے دل آشنا ہیں اور سننے والوں کے کانوں کو ان کے سننے سے انکار نہیں ہے۔ (بیان کرنے والے سے مراد خود امام علیہ السلام ہیں)[2]

اس سلسلہ کی ایک تفصیلی بحث جلد ۳ سورۂ نساء کی آیت ۴۹ کے ذیل میں بھی آچکی ہے (ص ۲۹۷ کے بعد)۔

یہاں یہ بات واضح کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ بعض اوقات ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنے تمام امتیازات و خصوصیات کے ساتھ جو اس میں پائی جاتی ہیں اپنا تعارف کرائے کیونکہ اس کے بغیر مقدس اہداف و مقاصد پامال ہو جاتے ہیں اس قسم کی باتوں اور خودستائی اور تزکیہ نفس کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔

اس بات کا نمونہ امام سجادؑ کا مسجد شام (دمشق) کا وہ خطبہ ہے۔ جبکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ اپنا اور اپنے خاندان و اہل بیت

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۶۵۔

[2] نہج البلاغہ خط ۲۸۔

کا شام کے لوگوں سے تعارف کرائیں تاکہ شہدائے کربلا کے خارجی ہونے کے سلسلہ میں بنی امیہ کا سازشی منصوبہ ناکام، اور ان کے شیطانی منصوبے نقش برآب ہو جائیں۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے بھی منقول ہوا ہے کہ جب لوگوں نے آپ سے خودستائی اور اپنی تعریف آپ کرنے کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"بعض اوقات کچھ ضرورتوں کی وجہ سے لازمی ہو جاتی ہے۔"

اور اس کے بعد آپؑ نے انبیاء کے کلام سے دو مواقع جو قرآن میں آئے ہیں، استدلال میں پیش کئے۔

پہلے یوسفؑ جنہوں نے عزیز مصر کو یہ تجویز پیش کی، کہ وہ انہیں ملک مصر کا خزانہ دار بنائے، تو انہوں نے کہا:

انی حفیظ علیم (یوسف - ۵۵)

"میں ایک آگاہ اور صاحب علم نگہبان ہوں۔"

اور دوسرا خدا کے عظیم پیغمبر "ھود" کے بارے میں جنہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

انا لکم ناصح امین۔ (اعراف - ۶۸)

"میں تمہارے لیے امین خیر خواہ ہوں۔"

۳۳- اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ۙ
۳۴- وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝
۳۵- اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝
۳۶- اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ۙ
۳۷- وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ۙ
۳۸- اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ
۳۹- وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ
۴۰- وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۖ
۴۱- ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ

ترجمہ

۳۳- کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اسلام (یا انفاق) سے روگردانی کی؟
۳۴- اور تھوڑا سا دیا اور زیادہ کو روک لیا۔
۳۵- کیا اس کے پاس علم غیب ہے اور اس نے دیکھ لیا ہے (کہ دوسرے اس کے گناہوں کو اپنے کندھے پر لے سکتے ہیں)
۳۶- کیا وہ اس سے باخبر نہیں ہوا ہے کہ جو موسیٰ کی کتابوں میں نازل ہوا ہے؟
۳۷- اور اسی ابراہیم کی کتابوں میں جس نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سے ادا کیا تھا۔

۳۸۔ کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں لے گا۔

۳۹۔ اور یہ کہ انسان کے لیے اس کی اپنی سعی وکوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے۔

۴۰۔ اور یہ کہ اس کی سعی وکوشش عنقریب دیکھی جائے گی (اور وہ اس کا نتیجہ پالے گا)۔

۴۱۔ اس کے بعد اسے پوری پوری جزا دی جائے گی۔

شانِ نزول

اکثر مفسرین نے اوپر والی آیات کے لیے علیحدہ علیحدہ شان نزول نقل کئے ہیں، لیکن یہ شان نزول آپس میں ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مشہور ہیں وہ ذیل کی دو شان نزول ہیں :

۱۔ ان آیات میں عثمان کا واقعہ بیان ہوا ہے، اس کے پاس بہت زیادہ مال و دولت تھی، اور وہ اپنے مال میں سے خرچ کیا کرتا تھا، اس کے رشتہ داروں میں سے ایک "عبداللہ بن سعد" نامی شخص نے کہا، اگر تیری یہی حالت رہی، تو ایک دن تیرے پاس کچھ بھی باقی نہ بچے گا، عثمان نے کہا، میں نے بہت گناہ کئے ہیں، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس ذریعہ سے خدا کی رضا اور عفو وبخشش حاصل کروں عبداللہ نے کہا، اگر تو اپنی سواری کا اونٹ اس کے ساز وسامان سمیت مجھے دے دے تو میں تیرے سارے گناہ اپنی گردن پر لے لیتا ہوں، عثمان نے ایسا ہی کیا، اور اس قرارداد پر گواہ لئے، اور اس کے بعد اس نے انفاق کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا، (تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کام کی شدت سے مذمت کی اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ کوئی شخص دوسرے کے بارگناہ کو اپنے کندھے پر نہیں لے سکتا، اور ہر شخص کی سعی وکوشش کا نتیجہ خود اسی کو ملے گا۔[1]

۲۔ یہ آیت "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں ہے، وہ پیغمبرؐ کے پاس آیا، اور دین اسلام سے قربت حاصل کی تو بعض مشرکین نے اسے سرزنش کی اور کہا کہ تو نے ہمارے بزرگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور انہیں گمراہ شمار کرتا ہے، اور تو نے یہ گمان کیا کہ وہ جہنم کی آگ میں ہیں۔ اس نے کہا کہ واقعاً میں خدا کے عذاب سے ڈر گیا ہوں، تو سرزنش کرنے والے نے کہا اگر تو اپنے مال کا کچھ حصہ مجھے دے دے اور شرک کی طرف پلٹ آئے تو میں تیرا عذاب اپنی گردن پر لے لیتا ہوں ولید بن مغیرہ نے ایسا ہی کیا، لیکن جو مال دینا تھا اس میں سے تھوڑے سے حصہ کے سوا ادا نہ کیا، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور ولید کے

---

[1] اس شان نزول کو طبرسی نے "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے، اور دوسرے مفسرین مثلاً "زمخشری" نے "کشاف" میں "فخر رازی" نے "تفسیر کبیر" میں بھی نقل کیا ہے "طبرسی" نے اسے نقل کے بعد مزید کہا ہے، کہ یہ شانِ نزول ابن عباس، کلبی اور مفسرین کی ایک جماعت سے نقل ہوئی ہے۔

ایمان سے منہ پھیرنے پر مذمت کی [1]

تفسیر

ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

گزشتہ آیات میں اس سلسلہ میں گفتگو تھی کہ خدا بدکاروں کو ان کے برے کاموں کے بدلے میں سزا اور عذاب کرے گا اور نیکوکاروں کو اجر دے گا، چونکہ ممکن ہے بعض یہ تصور کرلیں کہ کسی کو کسی دوسرے کے بدلے میں بھی سزا ہو جاتی ہے۔ یا کوئی دوسرے کے گناہ اپنی گردن پر لے لیتا ہو، تو یہ آیات اس توہم کی نفی میں آئی ہیں، اور اس اہم اسلامی اصل کی کہ ہر شخص کے اعمال کا نتیجہ صرف اسی کی طرف لوٹتا ہے تشریح کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اسلام (یا انفاق) سے منہ پھیر لیا ہے" (افرءیت الذی تولی)۔

"اور تھوڑا سا مال دیا اور انفاق (یا مزید مال دینے سے) ہاتھ روک لیا" (اس گمان سے کہ دوسرا اس کے گناہ کے بوجھ کو اپنے کندھے پر اٹھا سکتا ہے) (واعطی قلیلاً واکدی) [2]

"کیا وہ علم غیب رکھتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ دوسرے اس کے گناہوں کو اپنے کندھے پر لے سکتے ہیں": (أعندہ علم الغیب فھو یری)۔

قیامت کے دن سے پلٹ کر کون آیا ہے اور ان کے لیے یہ خبر لایا ہے کہ لوگ رشوت لے کر دوسروں کے گناہ اپنی گردن پر لے سکتے ہیں؟ یا کون شخص خدا کی طرف سے آیا ہے اور انہیں یہ خبر دی ہے کہ خدا اس معاملہ پر راضی ہے؟ کیا اس کے سوا بھی کوئی اور بات ہے کہ انہوں نے کچھ اوہام دل سے گھڑ لیے ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کرنے کے لیے انہوں نے خود کو ان اوہام کے تانے بانے میں پھنسا دیا ہے؟

اس شدید اعتراض کے بعد، قرآن ایک اصل کلی کو جو باقی آسمانی دینوں میں بھی آئی ہے پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے "کیا وہ شخص جس نے ان خیالی وعدوں پر" انفاق (یا ایمان) سے ہاتھ اٹھا لیا ہے، اور وہ یہ چاہتا ہے کہ مختصر سا مال ادا کر کے خود کو خدائی عذاب سے رہائی دلا لے: "کیا وہ اس سے جو موسیٰ کی کتابوں میں نازل ہوا ہے باخبر نہیں ہوا ہے"؟

---

[1] اس شان نزول کو بھی "مجمع البیان" "قرطبی" "روح البیان" "روح المعانی" اور بعض دوسری تفاسیر میں نقل کیا گیا ہے۔

[2] "اکدی" اصل میں "کدیہ" (بروزن حجرہ) زمین کی سختی اور صلابت کے معنی میں ہے اس کے بعد ممسک اور بخیل لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔

(ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ)۔

اور اسی طرح جو کچھ ابراہیم کی کتاب میں نازل ہوا ہے۔ "وہی ابراہیم جس نے اپنی ذمہ داری کو مکمل طور پر پورا کیا ہے" (و ابراھیم الذی وفّیٰ)۔[1]

وہی عظیم پیغمبر جس نے خدا کے تمام عہد اور پیمانوں کو پورا کیا، اس کے حق رسالت کو ادا کیا، اور اس کے دین کی تبلیغ کے سلسلہ میں کسی مشکل، تہدید اور آزار سے ہراساں نہیں ہوا، وہی شخص جو کئی امتحانات سے گزرا، یہاں تک کہ اپنے بیٹے کو خدا کے حکم سے قربانگاہ میں لے گیا اور اس کے گلے پر چھری رکھ دی۔ اور ان تمام امتحانوں سے سربلند اور سرفراز ہو کر باہر آیا، اور خدا نے اُسے مخلوق کی رہبری و امامت کا بلند مقام عطا فرمایا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں آیا ہے: واذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماماً، اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے ابراہیم کو چند احکام کے ذریعہ آزمایا، اور وہ ان تمام امتحانات سے عہدہ برآ ہوئے اور انہیں مکمل کر دیا تو خدا نے اُن سے فرمایا کہ میں نے تجھے لوگوں کا امام و پیشوا قرار دیا۔"

بعض مفسرین نے اس آیت کی وضاحت میں یہ کہا ہے: بذل نفسہ للنیران، وقلبہ للرحمٰن، وولدہ للقربان ومالہ للاخوان: "ابراہیم نے راہ خدا میں اپنا نفس آگ کے حوالے کر دیا اور اپنا دل خدائے رحمٰن کے لیے اور اپنا بیٹا قربانی کے لیے اور اپنا مال بھائیوں اور دوستوں کے لیے خرچ کیا"[2]

"کیا اسے یہ خبر نہیں دی گئی کہ ان تمام کتب آسمانی میں یہ حکم نازل ہوا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے دوش پر نہیں لیتا"؟ (الّا تزر وازرۃ وزر اخریٰ)۔

"وزر" اصل میں "وزر" (بروزن خطر) سے لیا گیا ہے، جو پہاڑی پناہ گاہوں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد لفظ "وزر" بھاری بوجھ کے لیے استعمال ہونے لگا، اس شباہت کی وجہ سے جو وہ پہاڑ کے بڑے بڑے پتھروں سے رکھتا ہے۔ اس کے بعد گناہ پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے کیونکہ وہ ایک بھاری بوجھ انسان کے کندھے پر ڈال دیتا ہے۔

"وازرۃ" سے مراد وہ انسان ہے جو گناہ کے بوجھ کو اٹھاتا ہے"[3]

اس کے بعد مزید توضیح کے لیے کہتا ہے: "کیا اسے اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ان آسمانی کتابوں میں یہ آیا ہے کہ انسان کے لیے اس کی سعی اور کوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے" وان لیس للانسان الّا ما سعیٰ)[4]

"سعیٰ" اصل میں تیزی کے ساتھ راستہ چلنے کے معنی میں ہے۔ جو دوڑنے کے مرحلہ تک نہ پہنچا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ

---

[1] "وفّیٰ" "توفیہ" کے مادہ سے، بذل اور مکمل ادائیگی کے معنی میں ہے۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۲۴۶۔

[3] "وازرۃ" کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ یہ نفس کی صفت ہے جو محذوف ہوا ہے، اور اسی طرح اخریٰ کا مؤنث ہونا بھی۔

[4] "ما سعیٰ" میں "ما" مصدریہ ہے۔

سعی وکوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ کاموں میں سعی وکوشش کے وقت انسان تیز حرکات انجام دیتا ہے، چاہے وہ نیک کام ہو یا بُرا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ نہیں فرماتا، کہ انسان کے حصہ میں وہ کام ہے جو اس نے انجام دیا ہے، بلکہ فرماتا ہے کہ وہ سعی وکوشش جو اس نے کی ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہم چیز سعی وکوشش ہے، چاہے انسان وقتی طور سے اپنے مقصد اور مقصود تک نہ پہنچے، کیونکہ اگر اس کی نیت نیک ہے تو خدا اس کو اچھا اجر دے گا، کیونکہ وہ تو نیتوں اور ارادوں کا خریدار ہے، نہ کہ صرف انجام شدہ کاموں کا۔

"اور کیا اسے اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس کی سعی وکوشش عنقریب دیکھی جائے گی"؟ (وانّ سعیہ سوف یرٰی)۔

نہ صرف اس سعی وکوشش کے نتائج، چاہے وہ خیر کی راہ میں ہوں یا شر کی راہ میں، بلکہ خود اس کے اعمال اس دن اس کے سامنے آشکار ہوں گے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے، : یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرًا، "وہ دن جس میں ہر شخص ان نیک اعمال کو جنہیں اس نے انجام دیا ہے حاضر پائے گا" (آل عمران۔ ۳۰)

اور قیامت میں نیک وبد اعمال کے مشاہدہ کے بارے میں بھی سورۂ زلزال کی آیت ۷، ۸ میں آیا ہے، (فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرًّا یرہ) ——— "جس شخص نے ذرہ برابر بھی خیر ونیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا، اور جس نے ذرہ برابر بُرا کام کیا تو وہ اسے بھی دیکھے گا"۔

"اس کے بعد اس کے عمل کے لیے اسے پوری پوری جزا دی جائے گی" (ثم یجزاہ الجزاء الاوفٰی)[1]

"جزاء اوفٰی" سے مراد وہ جزا ہے جو ٹھیک ٹھیک عمل کے عین مطابق ہو، البتہ یہ بات نیک اعمال کے سلسلہ میں تفضل الٰہی کے ساتھ دس گنا یا کئی سو گنا یا کئی ہزار گنا سے اختلاف نہیں رکھتی، اور یہ جو بعض مفسرین نے "جزاء اوفٰی" کو حسنات کے بارے میں زیادہ اجر کے معنی میں لیا ہے، صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ یہ آیت گناہوں کو بھی شامل ہے، بلکہ آیت کی اصلی گفتگو ہی وزر اور گناہ کے بارے میں ہے (غور کیجئے)

⁘ ⁘ ⁘

---

[1] "یجزی" کا نائب فاعل ایک ضمیر ہے جو "انسان" کی طرف لوٹتی ہے اور اس سے متصل ضمیر "عمل" کی طرف لوٹتی ہے حرف جر کے حذف کے ساتھ اور تقدیر میں اس طرح تھا، : ثم یجزی الانسان بعملہ (او علی عملہ) الجزاء الاوفی "زمخشری" "کشاف" میں کہتا ہے، ممکن ہے کہ تقدیر میں حرف جر نہ ہو۔ کیونکہ "یجزی العبد سعیہ" کہا جاتا ہے (لیکن توجہ رکھنی چاہیے کہ عام طور پر "جزاہ اللہ علی عملہ" کہا جاتا ہے "جزاہ اللہ عملہ" صحیح نہیں ہے) اور "الجزاء الاوفی" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ "یجزی" کا ایک اور دوسرا مفعول ہو یا مفعول مطلق ہو۔

چند نکات

۱۔ تین اہم اسلامی اصول

اوپر والی آیات میں اسلام کے تین مسلم اصولوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی مسلم اصول کے عنوان سے پہچانے گئے ہیں۔

الف : ہر شخص اپنے گناہوں کا مسئول اور جوابدہ ہے۔

ب : آخرت میں ہر شخص کا حصہ اس کی سعی و کوشش ہی ہے۔

ج : خدا ہر شخص کو اس کے عمل کے مقابلہ میں پوری پوری جزا دے گا۔

اور اس طرح قرآن بہت سے اوہام اور خرافات پر جو عام لوگوں میں پائے جاتے ہیں یا بعض مذاہب میں وقتی طور پر ایک عقیدہ کی صورت میں آگئے ہیں، خطِ بطلان کھینچ رہا ہے۔

قرآن اس طریقہ سے نہ صرف مشرکین عرب کے عقیدہ کی ـــــ جو زمانہ جاہلیت میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک انسان دوسرے کے گناہوں کو اپنے ذمہ لے سکتا ہے ـــــ نفی کر رہا ہے، بلکہ اس مشہور اعتقاد پر بھی ـــــ جو عیسائیوں کے درمیان رائج تھا اور اب بھی ہے، کہ خدا نے اپنے بیٹے مسیح کو دنیا میں اس لیے بھیجا ہے تاکہ وہ سولی پر چڑھ جائے اور آزاد و تکلیف اٹھائے اور گنہگاروں کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر لے ـــــ خطِ تنسیخ کھینچ رہا ہے۔

اسی طرح پادریوں کے ایک گروہ کے برے اعمال کی ـــــ جو قرون وسطیٰ میں مغفرت نامے اور استحقاق بہشت کے پروانے بیچا کرتے تھے اور موجودہ زمانہ میں بھی گناہ بخشی کے مسئلہ کو جاری رکھے ہوئے ہے ـــــ مذمت کرتا ہے۔

عقل کی منطق بھی اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ "ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اور اپنے ہی اعمال سے نفع پائے گا۔

یہ اسلامی عقیدہ اس بات کا سبب بنتا ہے، کہ انسان خرافات کی طرف پناہ لینے، یا اپنا گناہ کسی اور کی گردن میں ڈالنے کے بجائے، اعمال خیر کے لیے سعی و کوشش اور جد و جہد کرے، اور گناہ سے پرہیز کرے، اور جب کبھی اس سے کوئی لغزش ہو جائے اور اس سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو واپس لوٹے اور توبہ کرے اور تلافی مافات کرے۔

انسانوں میں اس تربیتی عقیدہ کی تاثیر مکمل طور پر واضح اور ناقابل انکار ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے ان مخرب عقائد کا اثر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیات آخرت کے لیے سعی و کوشش اور دوسرے گھر میں اس کا اجر و پاداش مشاہدہ کرنے کو بیان کر رہی ہیں، لیکن اس کا مدرک اور اصلی معیار دنیا کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے، اس معنی میں کہ اہل ایمان کو دوسروں کے انتظار میں نہیں بیٹھنا چاہیے کہ وہ ان کے لیے کام کریں، اور ان کے معاشرے کی مشکلات کو حل کریں، بلکہ خود کمر ہمت کس کر کھڑے ہو جائیں اور سعی و کوشش کریں۔

ان آیات سے مسائل جزائی و قضاوت کی ایک حقوقی اصل کا بھی استفادہ ہوتا ہے، کہ سزائیں ہمیشہ واقعی اور اصلی گنہگاروں

اور مجرموں کو ہی دی جائیں گی، اور کوئی شخص کسی دوسرے کی سزا کو اپنے ذمہ نہیں لے سکتا۔

۲۔ آیت کے مفاد سے سوء استفادہ

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ آیات گزشتہ اور بعد میں آنے والی آیات کے قرینہ سے، آخرت کے لیے انسان کی سعی و کوشش کو بیان کر رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ چیز ایک مسلم عقلی حکم کی بنیاد پر ہے، لہٰذا اس کے نتیجہ کو عمومیت دی جا سکتی ہے، اور دنیا کی کوششوں کو بھی اس میں شامل سمجھا جا سکتا ہے، اور اسی طرح دنیوی اجر و صلہ اور سزاؤں کو بھی۔

لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے، جو سوشلسٹ مکتب کے زیر اثر بعض لوگ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے، کہ مالکیت صرف کام کے طریقہ سے حاصل ہوتی ہے، اور اس طرح وہ قانون میراث، مضاربہ اور اجارہ و کرایہ وغیرہ پر خط بطلان کھینچ دیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، اور قرآنی آیات سے استدلال بھی کرتے ہیں، حالانکہ مسئلہ میراث اسلام کے قطعی اصولوں میں سے ہے۔ اور اسی طرح زکوٰۃ و خمس ہیں، حالانکہ نہ تو وارث نے ہی اپنے مورث کے مال کے لیے کوئی سعی و کوشش کی ہے، اور نہ ہی خمس و زکوٰۃ کے مستحقین نے، اور نہ ہی وصیتوں اور نذر وغیرہ کے موارد میں، حالانکہ یہ تمام امور قرآن مجید میں آئے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ ایک اصل ہے، لیکن عام طور پر ہر اصل کے مقابلہ میں ایک استثناء ہوتا ہے، مثلاً "بیٹے" کا "باپ" سے میراث لینا ایک اصل ہے۔ لیکن اگر بیٹا باپ کا قاتل ہو یا اسلام سے خارج ہو جائے تو اسے میراث نہیں ملے گی۔

اسی طرح ہر شخص کی کوشش کے نتیجہ کا اس تک پہنچنا ایک اصل ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اجارہ کی قرار داد کے مطابق جو ایک قرآنی اصول ہے،[1] اسے اس چیز کے مقابلہ میں، جس پر طرفین رضامند ہیں، واگزار کر دے، یا وصیت و نذر کے طریق سے کہ یہ دونوں بھی قرآن میں ہیں دوسرے کو منتقل کر دے۔

۳۔ چند سوالات کا جواب

یہاں چند سوال سامنے آتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے:

پہلا یہ کہ اگر ہر انسان کا حصہ قیامت میں صرف اس کی سعی و کوشش کا ماحصل ہے۔ تو پھر "شفاعت" کیا معنی رکھتی ہے؟

دوسرا یہ کہ سورۂ طور کی آیت ۲۱ میں اہلِ بہشت کے بارے میں آیا ہے: الحقنا بهم ذريتهم: ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے، حالانکہ "ذریۃ" نے تو اس راہ میں کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے علاوہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ جس وقت کوئی شخص اعمال خیر انجام دے تو اس کا نتیجہ اس کی اولاد کو پہنچے گا۔

---

[1] یہ اصل موسیٰ اور شعیب کی داستان میں سورہ قصص آیہ ۲۷ میں آئی ہے۔

ان سب سوالات کا جواب صرف ایک جملہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ: قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان اپنی سعی و کوشش سے زیادہ کا حق نہیں رکھتا، لیکن یہ چیز اس بات میں مانع نہیں ہوگی کہ پروردگار کے لطف اور فضل کے طریق سے لائق افراد کو نعمتیں دی جائیں۔ "استحقاق" ایک مفہوم ہے اور "تفضل" ایک الگ مفہوم ہے جیسا کہ وہ نیکیوں کی دس گنا، کبھی سو گنا، یا ہزاروں گنا جزا دیتا ہے۔

اس کے علاوہ "شفاعت" ــــ جیسا کہ ہم اس کے اپنے مقام پر بیان کر چکے ہیں۔ بے حساب نہیں ہوگی، بلکہ وہ بھی ایک قسم کی سعی و کوشش اور شفاعت کرنے والے کے ساتھ معنوی رابطہ پیدا کرنے کی محتاج ہے۔ اسی طرح اہلِ جنت کی اولاد کے ان سے ملحق ہونے کے بارے میں بھی قرآن اسی آیت میں کہتا ہے،: واتبعتهم ذريتهم بايمان: "یہ اس صورت میں ہے جب کہ ان کی اولاد ایمان میں ان کی پیروی کرے۔

۴۔ صحف ابراہیم و موسیٰ

"صحف" جمع ہے "صحیفہ" کی جو اصل میں ہر وسیع چیز کے معنی میں ہے، اس لیے صورت کو "صحیفۃ الوجہ" کہتے ہیں اس کے بعد کتاب کے صفحات پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

"صحف موسیٰ" سے مراد اوپر والی آیت میں وہی تورات ہے، اور "صحف ابراہیم" بھی ان کی آسمانی کتاب کی طرف اشارہ ہے۔

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں سورۂ اعلیٰ کی تفسیر میں ایک حدیث پیغمبر گرامی اسلام سے نقل کی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

ابوذر سوال کرتے ہیں: خدا کے پیغمبر کتنے ہوئے ہیں؟

آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار

پھر سوال کیا: ان میں سے رسول کتنے ہیں؟

آپ نے فرمایا: تین سو تیرہ ہیں اور باقی نبی ہیں (رسول وہ ہوتا ہے جو ابلاغ و انذار پر مأمور ہو جب کہ نبی کا مفہوم عام ہے)

پھر سوال کیا: کیا آدم پیغمبر تھے؟

آپ نے فرمایا: ہاں! خدا نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا۔

پھر پوچھا: خدا نے کتنی کتابیں نازل کیں؟

آپ نے فرمایا: ایک سو چار کتابیں: دس صحیفے آدم پر، پچاس صحیفے شیث پر، تیس صحیفے ادریس پر، دس صحیفے ابراہیم پر (جو مجموعی طور پر ایک سو صحیفے بنتے ہیں) اور تورات و انجیل و زبور و قرآن"[1]

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۷۶ اس حدیث کو "روح البیان" نے بھی جلد ۹ ص ۲۴۶ پر نقل کیا ہے۔

۵۔ گزشتہ کتب میں اعمال کے مقابلہ میں اصل مسئولیت

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ تورات میں کتاب "حزقیل" میں بھی زیر بحث آیت کا کچھ مضمون آیا ہے، کیونکہ وہ اس طرح ہے:

"وہی جان جو گناہ کرے گی وہی مرے گی، بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور باپ بیٹے کے گناہ کا بار نہیں اٹھائے گا"[1]

یہی مفہوم خصوصیت کے ساتھ قتل کے بارے میں "تورات" کے سفر تثنیہ میں بھی آیا ہے: "باپ اولاد کے بدلے میں قتل نہیں کئے جائیں گے، اور اولاد بھی باپوں کے بدلے میں قتل نہیں کی جائیں گی، ہر شخص اپنے گناہ کے سبب ہلاک ہوگا"[2]

البتہ گزشتہ انبیاء کی کتابیں مکمل طور پر اس وقت ہمارے پاس نہیں ہیں، ورنہ اس اصل کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں مل جاتیں۔

---

[1] کتاب "حزقیل" فصل ۱۸ ص ۲۰

[2] "تورات" "سفر تثنیہ" باب ۲۴ شمارہ ۱۶۔

۴۲۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ۙ
۴۳۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی ۙ
۴۴۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَا ۙ
۴۵۔ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ۙ
۴۶۔ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی ۙ
۴۷۔ وَاَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی ۙ
۴۸۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ۙ
۴۹۔ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ۙ

ترجمہ

۴۲۔ (اور کیا گزشتہ انبیاء کی کتابوں سے اسے پتہ نہیں چلا) کہ تمام امور تیرے پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں۔
۴۳۔ اور وہی ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی۔
۴۴۔ اور وہی ہے جو مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔
۴۵۔ اور وہی ہے جو دو دو جوڑے مذکر اور مؤنث کے پیدا کرتا ہے۔
۴۶۔ اس نطفہ سے جو نکلتا ہے (اور رحم میں گرتا ہے)۔
۴۷۔ اور یہ کہ خدا ہی پر ہے دوسرے عالم کا ایجاد کرنا (تاکہ عدالت کا اجراء ہو)۔

۴۸۔ اور یہ کہ وہی ہے جو بے نیاز کرتا ہے، اور باقی رہنے والا سرمایہ عطا کرتا ہے۔

۴۹۔ اور یہ کہ وہی ہے "ستارۂ شعریٰ" کا پروردگار۔

تفسیر

تمام خطوط اسی تک پہنچتے ہیں

یہ آیات خدا کی ان صفات کی تجلی گاہ ہیں جو مسئلہ توحید کو بھی واضح کرتی ہیں اور مسئلہ معاد کو بھی۔

ان آیات میں گزشتہ مباحث کو جاری رکھتے ہوئے جزائے اعمال کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "کیا انسان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ صحف موسیٰ و ابراہیم میں یہ آیا ہے کہ تمام امور تیرے پروردگار پر منتہی ہوتے ہیں" (و ان الیٰ ربك المنتهیٰ)۔

نہ صرف حساب و کتاب، ثواب و عقاب اور جزا و سزا آخرت میں اس کے دست قدرت میں ہے، بلکہ اس جہان میں بھی اسباب و علل کا سلسلہ اس کی پاک ذات تک جا کر منتہی ہوتا ہے، اس جہان کی تمام تدبیریں اس کی تدبیر سے پیدا ہوتی ہیں اور بالآخر عالم ہستی کی تکیہ گاہ اور اس کی ابتدا و انتہا خدا ہی کی پاک ذات ہے۔

بعض روایات میں اس آیت کی تفسیر میں امام صادقؑ سے اس طرح آیا ہے:

اذا انتهی الکلام الی الله فامسکوا[1]

"جس وقت گفتگو خدا کی ذات تک پہنچ جائے تو چپ ہو جاؤ۔"

یعنی اس کی ذات کے بارے میں گفتگو نہ کرو، کیونکہ عقلیں اس میں حیران ہیں۔ اور کہیں پہنچ نہیں پاتیں، اور ایک غیر محدود ذات کے بارے میں سوچ بچار کرنا محدود عقلوں کے لیے ناممکن ہے۔ کیونکہ جو کچھ تمہاری فکر میں آئے گا وہ بھی محدود ہی ہوگا، اور خدا کے لیے محال ہے کہ وہ محدود ہو جائے۔

البتہ یہ تفسیر اس آیت کے لیے ایک دوسرا بیان ہے جو اس بات سے جو ہم نے بیان کی ہے اختلاف نہیں رکھتی، اور دونوں آیت کے معنی جمع ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد امر ربوبیت میں اس کی حاکمیت، اور اس جہان کے تمام امور کے اس کی ذات پاک تک منتہی ہونے کو واضح کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: وہی ہے کہ جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی" (وانه هو اضحك و ابكیٰ)[2]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۷۰۔

[2] یہ افعال اگرچہ ماضی کی صورت میں ہیں لیکن مستقبل کا معنی دیتے ہیں۔

"اور وہی ہے جو مارتا بھی ہے اور زندہ بھی کرتا ہے" (وانه هو امات واحیا)۔
"اور وہی ہے جو دو دو جوڑے مذکر اور مونث کے پیدا کرتا ہے" (وانه خلق الزوجین الذکر والانثیٰ)۔
"اس نطفہ سے جو خارج ہوتا ہے اور قرار گاہ رحم میں گرتا ہے" (من نطفة اذا تمنیٰ)۔

یہ چند آیات، تمام امور کے پروردگار کی ربوبیت اور تدبیر کی طرف منتہی ہونے والے مسئلہ کے لیے، حقیقتاً ایک جامع بیان اور عمدہ وضاحت ہیں، کیونکہ کہتا ہے، : تمہاری موت اور زندگی اسی کے ہاتھ میں ہے، زوجین کی خلقت کے طریقہ سے نسل کا جاری رہنا بھی اسی کی تدبیر سے ہے، اسی طرح وہ تمام حوادث جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، اس کی طرف سے ہیں۔ وہی رلاتا اور ہنساتا ہے، وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ اور اس طرح سے سررشتہ زندگی آغاز سے لے کر انجام تک اس کی پاک ذات پر جاکر ختم ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں اس آیت کے ہنسنے اور رونے کے مفہوم کو وسعت دی گئی ہے، اور اس کی تفسیر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ابکی السماء بالمطر، واضحك الارض بالنبات

"خدا آسمان کو بارش کے ساتھ رلاتا ہے اور زمین کو نباتات کے ساتھ ہنساتا ہے" [1]

بعض شعرا نے اس مضمون کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے،

ان فصل الربیع فصل جمیل
تضحك الارض من بكاء السماء

"فصل بہار ایک خوبصورت فصل ہے" "کیونکہ زمین آسمان کے رونے سے ہنسنے لگتی ہے"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال میں سے ہنسنے اور رونے کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے، کیونکہ یہ دونوں اوصاف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور دوسرے جانداروں میں اصلاً اس کا وجود نہیں ہے۔ یا بہت ہی شاذ و نادر ہے۔

انسانی جسم میں ہنسنے یا رونے کے وقت جو فعل و انفعال اور دگرگونی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ان کا روحانی تغیرات کے ساتھ ارتباط بہت ہی پیچیدہ اور تعجب خیز ہے۔ اور مجموعی طور سے یہ حق تعالیٰ کی مدبریت کی ایک واضح نشانی ہو سکتی ہے، یہ بات اس مناسبت کے علاوہ ہے جو یہ دونوں افعال (ہنسنا اور رونا) موت و حیات کے مسئلہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔

بہر حال خدا کی تدبیر اور ربوبیت پر تمام امور کی انتہا، انسان کے اختیار اور آزادیِ ارادہ کے ساتھ کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ اختیار و آزادی بھی اسی کی طرف سے ہے اور اس تک ہی منتہی ہوتی ہے۔

ان امور کے ذکر کے بعد، جو پروردگار کی ربوبیت اور تدبیر سے مربوط ہیں، امر معاد و قیامت کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے، "کیا انسان کو یہ خبر نہیں ہے کہ گزشتہ کتب میں یہ آیا ہے کہ دوسرے عالم کو ایجاد کرنا خدا پر لازم ہے" (وان علیه

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۷۲۔

النشأة الاخرٰی)۔

"نشأة" آفرینش اور کسی چیز کی تربیت کے معنی میں ہے، "نشأة اخرٰی" قیامت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، "علیہ" (خدا پر لازم ہے) کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ جب خدائے حکیم نے انسانوں کو پیدا کیا، اور ان کے کندھے پر کچھ ذمہ داریاں ڈال دیں، اور سب کو آزادی دے دی، اس عرصہ میں مطیع وغیر مطیع اور ظالم و مظلوم افراد وجود میں آئے، اور کوئی بھی اس جہان میں اپنی اصلی پاداش اور سزا کو نہیں پہنچا، لہٰذا اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک "نشأة ثانیہ" ہو تاکہ عدالت کی جاسکے۔

علاوہ ازیں ایک حکیم ذات اس وسیع و عریض جہان کو، ان تمام ناملائم اور نامناسب امور کے ساتھ، چند روزہ زندگی کے لیے خلق نہیں کرسکتا، لہٰذا حتمی اور یقینی طور سے یہ ایک وسیع زندگی کے لیے — جو اس وسیع پروگرام کی قیمت ہے — ایک مقدمہ ہوگی، یا دوسرے لفظوں میں اگر دوسری زندگی نہ ہو تو اس جہان کی خلقت اپنے اصلی ہدف اور مقصد تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خدا نے یہ وعدہ اپنے بندوں کو ایک حتمی وعدہ کے عنوان سے دیا ہے۔ اور اس کے کلام کی صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے وعدے پورے ہوں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور وہی تو ہے جو بندوں کو بے نیاز بھی کرتا ہے اور باقی رہنے والے سرمائے ان کے اختیار میں دیتا ہے" (وانہ ھو اغنٰی واقنٰی)۔

خدا نے نہ صرف مادی پہلوؤں میں انسان کی ضروریات اور حاجتوں کو اپنے لطف و کرم سے برطرف کیا ہے، بلکہ ہمیشہ رہنے والے سرمائے بھی اسے عطا کئے ہیں، کیونکہ معنوی زندگی میں بھی انسانوں کی احتیاجات — تعلیم و تربیت اور تکامل وارتقاء کے سلسلہ میں — انبیاء و رسل کے بھیجنے اور آسمانی کتب کے نازل کرنے اور معنوی مواہب و نعمات عطا کرنے کے ذریعہ برطرف کی ہیں۔

"اغنٰی" "غنی" کے مادہ سے بے نیازی کے معنی میں ہے، اور "اقنٰی" "قنیہ" کے مادہ سے (جزیہ کے وزن پر) ان سرمایوں اور اموال کے معنی میں ہے جنہیں انسان ذخیرہ کرتا ہے،[1]

اس بنا پر "اغنی" تو موجودہ حاجات و ضروریات کو پورا کرتا ہے، اور "اقنی" ذخیرہ نعمتوں کی عطائیگی ہے، جو مادی امور میں تو باغ و املاک وغیرہ کے مانند ہے اور معنوی امور میں خدا کی رضا و خوشنودی جیسی باتیں ہیں، جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا عظیم ترین سرمایہ شمار ہوتا ہے۔

یہاں ایک اور تفسیر بھی ہے جو "اغنی" کو "اقنی" کے مدِ مقابل قرار دیتی ہے، یعنی غنی و فقیر اسی کے دستِ قدرت میں ہیں، اس کی نظیر سورۂ رعد کی آیت ۲۶ میں آئی ہے: اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر: خدا جس

---

[1] مفردات "راغب" مادہ "قنی"۔

کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے محدود و تنگ کر دیتا ہے۔

لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جو منابع لغت میں آئی ہے سازگار نہیں ہے اور اوپر والی آیت اس معنی کی شاہد نہیں بن سکتی۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت میں فرماتا ہے، :"کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ گزشتہ کتب میں یہ آچکا ہے کہ ستارۂ شعری کا پروردگار وہی ہے"؟ (وانہ ھو رب الشعری)۔

"ستارۂ شعری" کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ـــــ اس کے علاوہ، کہ یہ ستارہ آسمان کے ستاروں میں سب سے زیادہ چمکنے والا ہے۔ جو عام طور پر سحر کے وقت صورت فلکی "جوزا" کے پاس آسمان میں ظاہر ہوتا ہے، توجہ کو مکمل طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے ـــــ اس سبب سے ہے کہ مشرکین عرب کا ایک گروہ اس کی پرستش کرتا تھا، قرآن کہتا ہے: تم شعری کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ اس کے پیدا کرنے والے پروردگار کی پرستش کرو۔

ضمنی طور پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ آسمان میں دو ستارے ہیں جو شعری کے نام سے موسوم ہیں، جن میں سے ایک تو "جنوب" کی سمت میں ظاہر ہوتا ہے، اور اسی بنا پر اس کو "شعرای یمانی" کہتے ہیں (کیونکہ یمن جزیرہ عربستان کے جنوب میں ہے) اور دوسرا "شعرای شامی" جو شمال کی طرف نکلتا ہے، لیکن مشہور وہی "شعرای یمانی" ہے

اس ستارہ کی عمدہ خصوصیات کے بارے میں دوسرے مباحث بھی ہیں جو نکات کی بحث میں آئیں گے۔

چند نکات

۱۔ یہ سب سرو صدا اسی کی طرف سے ہے

ان آیات کے مباحث حقیقت میں اس معنی کی طرف ایک اشارہ ہیں کہ اس عالم میں ہر قسم کی تدبیر اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ موت و حیات کے مسئلہ سے لے کر، بے مقدار نطفہ سے انسان کی پیچیدہ خلقت تک اور اسی طرح سے وہ گوناں گوں حادثات جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، جو اُسے کسی نہ کسی طرح سے رلاتے ہے یا ہنساتے ہیں، یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہیں۔

آسمان میں درخشندہ ترین ستارے اسی کے فرمان اور اسی کی ربوبیت کے ماتحت ہیں، اور زمین میں انسانوں کی غنا اور بے نیازی بھی اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے، اور طبعاً "نشاۂ آخرت" بھی اسی کے فرمان سے ہے، کیونکہ وہ بھی اس جہان کی زندگی کو جاری رکھنے کے سلسلہ میں ایک جدید زندگی ہے۔

یہ بیان ایک طرف توحیدِ توحید کو واضح کرتا ہے اور دوسری طرف سے خطِ معاد و قیامت کو، کیونکہ رحم کے اندر ایک بے مقدار نطفہ سے انسان کو خلق کرنے والا، اس کو نئے سرے سے زندگی عطا کرنے پر بھی قادر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ سب چیزیں خدا کی، "توحید افعالی" اور "توحید ربوبیت" کو بیان کرتی ہیں، ہاں! یہ سب سرو صدا اور آوازے اسی کی طرف سے ہیں۔

۲۔ ستارۂ شعری کے عجائبات

یہ ستارہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے آسمان کے ستاروں میں سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ ہے۔ اور "شعرای یمانی" کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ یہ جنوب کی سمت ظاہر ہوتا ہے۔ اور یمن جزیرۂ عرب کے جنوب میں واقع ہے لہٰذا انہوں نے اس کو یہ نام دیا ہے۔

عربوں کا ایک گروہ جیسے قبیلہ "خزاعہ" اس کو مقدس جانتا تھا اور اس کی پرستش کیا کرتا تھا، اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ روئے زمین کے سارے موجودات کا مبدء ہے، اس مسئلہ پر قرآن کی تاکید کہ خدا شعری کا پروردگار ہے اس گروہ اور ان جیسے لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ہے، کہ انہوں نے مخلوق پر خالق ہونے کا اشتباہ کیا اور مربوب کو رب کی جگہ قرار دے لیا ہے۔

یہ عجیب الخلقت ستارہ جو اپنی حد سے زیادہ درخشندگی کی وجہ سے ستاروں کا بادشاہ کہلاتا تھا، بہت سی عجائبات کا حامل ہے۔ جن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس زمانہ میں ستارۂ شعری کے بارے میں یہ حقائق دریافت نہیں ہوئے تھے، قرآن کا اس موضوع کو سامنے لانا پُرمعنی ہے۔

الف۔ ان تحقیقات کے مطابق، جو دنیا کے مشہور رصدگاہوں میں عمل میں آئی ہیں، وہ عظیم حرارت جو شعری کی سطح پر پائی جاتی ہے، ۱۲۰ ہزار درجہ سینٹی گراڈ تک معلوم کی گئی ہے۔

جب کہ ہمارے سورج کے کرّہ کی سطح کی حرارت کو صرف ۶۵۰۰ درجہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ چیز ستارۂ شعری کی، سورج کی نسبت عظیم گرمی کے فرق کا پتہ دیتی ہے۔

ب۔ اس ستارہ کا مخصوص جرم پانی سے تقریباً ۵۰ ہزار گنا زیادہ وزنی ہے۔ یعنی وہاں کے ایک لیٹر پانی کا وزن کرہ زمین کے ۵۰ ٹن کے برابر ہوگا۔ حالانکہ ہمارے نظام شمسی کے سیاروں میں سے، جو سب سے زیادہ وزنی ہے۔ اس کا مخصوص وزن پانی کے وزن سے ۶ گنا سے زیادہ نہیں ہے۔

اس تعریف کے باوجود دیکھنا چاہیے کہ یہ عجیب وغریب ستارہ کس عنصر سے بنا ہے جو اس قدر وزنی ہے؟

ج۔ ستارۂ شعری جو ہمارے زمانہ میں سردیوں میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن مصر کے قدیم منجمین کے زمانہ میں اس ستارہ کا ظہور گرمیوں کے آغاز کے قریب ہوا کرتا تھا، یہ ایک بہت ہی عظیم کرّہ ہے جس کا حجم کرۂ آفتاب سے ۲۰ گنا ہے، اور اس کا ہم سے فاصلہ زمین سے سورج کے فاصلے کی نسبت انتہائی حد تک زیادہ ہے۔ اس طرح سے کہ اس فاصلہ کو سورج کے فاصلہ سے دس لاکھ گنا حساب کیا گیا۔

ہم جانتے ہیں کہ نور اور روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں ۳۰۰ ہزار کلومیٹر ہے، اور سورج کی روشنی ۸ منٹ اور ۱۳ سیکنڈ میں ہم تک پہنچتی ہے جب کہ اس کا چاند سے فاصلہ ۱۵ ملین کلومیٹر ہے۔ لیکن اگر آپ تعجب نہ کریں تو کرۂ شعری کی پہلی شعاع ہم تک تقریباً دس (۱۰) سال بعد پہنچتی ہے، تو اب آپ خود حساب کرلیں کہ اس کا فاصلہ کتنا ہے۔

د۔ شعرای یمانی کے ساتھ ایک اور ستارہ ہے، جو آسمان کے مرموز و پراسرار ستاروں میں سے ہے، سب سے

پہلے "بسل" نامی ماہر دانش مند نے اسے دریافت کیا، اور یہ ۱۸۴۴ عیسوی کی بات ہے، لیکن ۱۸۶۲ میں دوربین کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس ستارہ کی گردش کا دور اصلی ستارے کے گرد ۵۰ سال ہے۔[1]

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن کی تعبیریں کس حد تک پُرمعنی ہیں۔ اور اس کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں میں کیسے کیسے حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ جو اگر اس کے نزول کے دن پورے طور پر مشخص نہیں تھے تو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ واضح ہو گئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۳۔ پیغمبرؐ کی ایک پُرمعنی حدیث

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ایک گروہ کے قریب سے گزرے جو ہنسنے میں مشغول تھا: آپؐ نے فرمایا:

لو تعلمون ما اعلم لبکیتم کثیرًا و لضحکتم قلیلًا

"اگر تم اس چیز کو جانتے جسے میں جانتا ہوں تو تم رونے زیادہ اور ہنستے کم۔"

جس وقت پیغمبرؐ وہاں سے گذر گئے تو جبرئیل ان پر نازل ہوئے اور عرض کیا۔

ان اللہ ھو اضحک و ابکیٰ

"ہنسنا اور رونا دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔"

پیغمبرؐ ان کے پاس پلٹ آئے اور فرمایا کہ میں چالیس قدم نہیں چلا تھا کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا: تم ان کے پاس لوٹ کر جاؤ اور ان سے یہ کہو: ان اللہ اضحک و ابکیٰ[2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک صاحب ایمان شخص ہمیشہ روتا ہی رہے۔ خوفِ خدا سے اور گناہوں کے ڈر سے رونا بھی اپنی جگہ ضروری ہے اور نشاط اور خوشی کے وقت ہنسنا بھی۔ کیونکہ یہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔

بہرحال یہ تعبیرات انسان کے اصل اختیار اور آزادی ارادہ کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتیں، کیونکہ اس بیان کا مقصد علت العلل اور ان غرائز و احساسات کے خالق کا بیان ہے۔

اور اگر دوسری جگہ (سورہ توبہ کی آیت ۸۲ میں) یہ فرمایا ہے کہ: فلیضحکوا قلیلًا و لیبکوا کثیرًا جزاءً بما کانوا یکسبون: انہیں چاہیے کہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں ان کاموں کی سزا کی بنا پر جو وہ انجام دیا کرتے تھے" تو یہ منافقین کے ساتھ مربوط ہے، جیسا کہ اس کے قبل اور بعد کی آیات گواہی دے رہی ہیں۔

---

[1] "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" مادہ شعری اور "فرہنگ نامہ" مادہ ستارہ اور "دائرۃ المعارف فارسی مصاحب" مادہ شعری۔

[2] تفسیر درالمنثور، جلد ۶ صفحہ ۱۳۰۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سورہ کی ابتداء میں تو ستارہ کی قسم کھا رہا ہے اس وقت کہ جب وہ غروب کرتا ہے ، والنجم اذا ھوٰی اور یہاں شعری کے پروردگار کی قسم ہے جس وقت ہم ان دونوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ شعری کیوں معبود نہیں ہو سکتا ، کیونکہ وہ بھی افول و غروب رکھتا ہے اور قوانین خلقت کے پنجہ میں اسیر ہے ۔

۵۰۔ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨلْاُوْلٰى ۙ

۵۱۔ وَثَمُوْدَا فَمَاۤ اَبْقٰى ۙ

۵۲۔ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۫

۵۳۔ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۙ

۵۴۔ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۚ

۵۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى

ترجمہ

۵۰۔ (اور کیا انسان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ گزشتہ انبیاء کی کتب میں آیا ہے) کہ خدا نے "پہلی قوم عاد کو ہلاک کر دیا؟

۵۱۔ اور اسی طرح "قوم ثمود" کو اور ان میں سے کسی کو باقی نہیں چھوڑا۔

۵۲۔ اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی، کیونکہ وہ سب سے زیادہ ظالم اور سب سے زیادہ طوفان اٹھانے والے تھے۔

۵۳۔ اور (قوم لوط) کے زیر و زبر شدہ شہروں کو زمین پر دے مارا۔

۵۴۔ اس کے بعد انہیں سنگین عذاب کے ساتھ ڈھانپ لیا۔

۵۵۔ (کہہ دے) تو اپنے پروردگار کی کونسی نعمت میں شک رکھتا ہے۔

تفسیر

کیا یہ سب درسِ عبرت کافی نہیں ہیں؟

یہ آیات اسی طرح انہیں مطالب کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو گزشتہ کتب صحف ابراہیم و موسیٰ سے نقل ہوئی ہیں، گزشتہ آیات میں دس مطالب دو حصوں میں بیان کیے گئے ہیں، پہلا حصہ ہر شخص کے اپنے اعمال کے لیے مسئولیت اور ذمہ داری کے بارے میں ہے، اور دوسرا حصہ تمام خطوط کے پروردگار تک منتہی ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور زیر بحث آیات میں، جو صرف ایک ہی مطلب کو بیان کر رہی ہے وہ گزشتہ چار اقوام میں سے چار قوموں کے عذاب اور دردناک ہلاکت کی بات کرتی ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے جو گذشتہ احکام سے روگردانی کرتے ہیں اور مبدء و معاد پر ایمان نہیں رکھتے[1]

پہلے فرماتا ہے، "کیا انسان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ گزشتہ کتب میں یہ آیا ہے، کہ خدا نے پہلی قوم عاد کو ہلاک کر دیا" (وانہ اھلک عادا الاولیٰ)۔

قوم "عاد" کی توصیف "الاولیٰ" (پہلی) کے ساتھ یا تو اس قوم کی قدامت کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کے درمیان معمول ہے۔ کہ ہر قدیم چیز کو "عادی" کہتے ہیں۔ اور یا اس بنا پر ہے کہ تاریخ میں "عاد" نامی دو قومیں ہوئی ہیں، اور مشہور قوم جن کے پیغمبر "ہودؑ" تھے وہی پہلی عاد ہے[2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اسی طرح خدا نے قوم ثمود کو ان کی سرکشی کی بنا پر ہلاک کیا اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا" (وثمود فما ابقیٰ)۔

اس کے بعد قوم نوح کے بارے میں فرماتا ہے: اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی ہم نے ہلاک کیا" (وقوم نوح من قبل)۔

"کیونکہ وہ سب سے زیادہ ظالم، اور سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے تھے[3] (انھم کانوا ھم اظلم واطغیٰ)۔

کیونکہ ان کے پیغمبر نوحؑ نے تمام انبیاء کی نسبت، بہت طویل مدت تک انہیں تبلیغ کی تھی، لیکن اس کے باوجود تھوڑی سی تعداد کے سوا ان کی دعوت کو کسی نے قبول نہ کیا، اور شرک و بت پرستی اور نوح کی تکذیب اور آزار پہنچانے میں حد سے زیادہ سختی کی، جیسا کہ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی۔

---

[1] اس بات پر توجہ رکھیئے کہ یہ گیارہ مطالب سب کے سب "ان" کے ساتھ شروع ہوتے ہیں جن میں سے پہلا آیت ۳۸ "الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" اور آخری "وانہ اھلک عادا الاولیٰ" ہے۔

[2] "مجمع البیان" "روح المعانی" و "تفسیر فخر رازی"۔

قوم لوط چوتھی قوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "خدا نے قوم لوط کے زیروزبر شدہ شہروں کو زمین پر دے مارا" (والمؤتفکة اهوٰی)۔

ظاہر میں ایک شدید زلزلہ نے ان آبادیوں کو آسمان کی طرف پھینک دیا اور پھر سرنگوں کر کے زمین پر پٹخ دیا۔ اور روایات کے مطابق جبرئیل نے انہیں خداداد قوت کے ساتھ زمین سے اکھاڑ کر اوندھے منہ زمین پر دے مارا۔

"اس کے بعد انہیں ایک سنگین عذاب کے ساتھ ڈھانپ لیا" (فغشّٰهما ما غشّٰی)۔[1]

ہاں! آسمانی پتھروں کی ایک بارش ان پر برسی اور ان سارے ڈولتے ہوئے شہروں کو پتھروں کے ایک ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت اور اس سے قبل کی آیات میں قوم لوط کے نام کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن عام طور پر مفسرین نے یہاں بھی اور سورۂ توبہ کی آیت ۷۰ اور سورۂ حاقہ کی آیت ۹ میں بھی جہاں "مؤتفکات" کی تعبیر ہوئی ہے، یہی معنی سمجھے ہیں۔ اگرچہ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ تمام بلاد دیدہ اور مصیبت زدہ درہم برہم شہروں کو اپنے اندر لے لیتی ہے، لیکن قرآن کی دوسری آیات اس چیز کی جو مشہور مفسرین سمجھے ہیں تائید کرتی ہیں۔

سورۂ ہود کی آیت ۸۲ میں آیا ہے: فلما جاء امرنا جعلنا عالیها سافلها و امطرنا علیها حجارة من سجیل منضود: جس وقت ہمارا فرمان آپہنچا تو اس شہر و دیار کو زیروزبر کر دیا، اور پتھروں اور تپھری مٹی کی ـــ جو تہ بہ تہ جمی ہوئی تھی ان پر بارش کر دی۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ "مؤتفکه" (زیروزبر شدہ شہر) بصرہ کا شہر ہے، کیونکہ ایک روایت میں آیا ہے کہ امیرالمؤمنین علیؑ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا اهل البصرة و یا اهل المؤتفکة و یا جند المرأة و اتباع البهیمة:

"اے اہل بصرہ، اے زیروزبر شدہ زمین کے رہنے والو! اے عورت کے لشکر، اے اونٹ کی پیروی کرنے والو! (جنگ جمل کی طرف اشارہ ہے جس کی کماندار بی بی عائشہ تھیں اور بصرہ کے لوگ ان کے اونٹ کے پیچھے چل پڑے تھے)[2]

لیکن یہ بات معلوم ہے کہ امیرالمؤمنین علیؑ کے کلام میں یہ تعبیر ایک قسم کی تطبیق کے عنوان سے ہے نہ کہ تفسیر کے طور پر، شاید اس زمانے میں اس شہر کے لوگ اخلاق یا خدائی عذاب کے لحاظ سے قوم لوط کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔

---

[1] "ما غشّٰی" میں "ما" ممکن ہے مفعول ہو یا فاعل جیسے والسماء و ما بناها لیکن پہلا احتمال آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے پہلی صورت میں اس جملہ کا معنی وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا اور دوسری صورت میں معنی اس طرح ہے "وہ خدا جس نے عذاب کا پردہ ان پر بھیجا جس نے انہیں ڈھانپ لیا بہرحال یہ تعبیر کسی چیز کی عظمت و شدت کے بیان کے سلسلہ میں ذکر ہوتی ہے۔

[2] "تفسیر صافی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

اس بحث کے آخر میں ان نعمتوں کے بارے میں جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئی تھیں اشارہ کرتے ہوئے ایک استفہام انکاری کی صورت میں فرماتا ہے: "تجھے اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کونسی نعمت میں شک ہے" (فبای آلاء ربک تتماری)۔

کیا نعمت حیات میں، یا اصل نعمت خلقت میں، یا اس نعمت میں کہ خدا کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دیتا، خلاصہ یہ کہ جو کچھ گزشتہ صحیفوں میں آیا ہے، اور قرآن میں بھی اس پر تاکید ہوئی ہے ان میں سے کسی میں تجھے شک ہے؟

کیا تم اس نعمت میں، کہ خدا نے تمھیں گزشتہ اقوام کے عذابوں سے بچائے رکھا ہے، اور اپنی عفو و درگذر اور رحمت کو تمھارے شامل حال کیا ہے، شک کرتے ہو؟

یا نزول قرآن کی نعمت اور رسالت و ایمان اور ہدایت کے مسئلہ میں تمھیں شک ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت میں مخاطب پیغمبرؐ کی ذات ہے لیکن اس کا مفہوم سب کو شامل ہے، بلکہ ہدف اصلی زیادہ تر دوسرے افراد ہی ہیں۔

"تتماری" "تماری" کے مادہ سے (مجادلہ جو شک و تردید سے توأم ہو) کے معنی میں ہے[1]۔

"آلاء" جمع "ألا" یا إلی (بروزن فعل) نعمت کے معنی میں ہے۔ اگرچہ بعض ایسے مطالب، جو گذشتہ آیات میں آئے ہیں — جیسے کہ دوسری قوموں کے عذاب اور ہلاکت — نعمت کے مصداق نہیں ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ خدا نے مسلمانوں کو، بلکہ پیغمبرؐ کے زمانے کے کفار تک کو بھی، ان امور سے محفوظ رکھا ہے، ایک عظیم نعمت ہوگی۔

---

[1] اگرچہ باب "تفاعل" عام طور پر ایسے موقعوں میں استعمال ہوتا ہے، جب کوئی فعل دو افراد سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں صادر ہو لیکن یہاں صرف ایک ہی شخص کے فعل کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو یا تو تاکید کی بنا پر ہے یا نعمتوں کے موارد کے تعدد کی بنا پر (غور کیجئے۔)

۵۶۔ هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ ○
۵۷۔ أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ○
۵۸۔ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ○
۵۹۔ أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ○
۶۰۔ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ○
۶۱۔ وَأَنتُمْ سَامِدُونَ ○
۶۲۔ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ○ السجدة

ترجمہ

۵۶۔ یہ (پیغمبر) پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے۔
۵۷۔ جسے نزدیک ہونا چاہیے وہ نزدیک ہوگئی ہے، (اور قیامت آنے ہی والی ہے)
۵۸۔ اور خدا کے سوا کوئی شخص اس کے شدائد کو برطرف نہیں کرسکتا۔
۵۹۔ کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو؟
۶۰۔ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں؟
۶۱۔ اور تم ہمیشہ غفلت اور ہوس رانی میں زندگی بسر کرتے ہو؟
۶۲۔ اب جب کہ ایسا ہے تو تم سب اللہ کے لیے سجدہ کرو اور عبادت کرو۔

تفسیر

سب اس کے لیے سجدہ کرو

گزشتہ آیات کے بعد ــــ جو گزشتہ اقوام کی سرکشی اور طغیان کی وجہ سے ان کی ہلاکت کی بات کرتی تھی زیر بحث آیات اپنا روئے سخن مشرکین، کفار اور پیغمبرؐ کی دعوت کے منکرین کی طرف کرتے ہوئے کہتی ہیں: "یہ پیغمبر (یا یہ قرآن) گزشتہ ڈرانے والوں کی طرح ہی ایک ڈرانے والا ہے" (ھٰذا نذیر من النذر الاولیٰ)۔

یہ جو کہتا ہے کہ: پیغمبر (یا قرآن) پہلے انذار کرنے والوں اور ڈرانے والوں کی نوع میں سے ہے اس کا مفہوم یہ ہے، کہ محمدؐ کی رسالت، اور ان کی آسمانی کتاب قرآن کوئی نیا موضوع نہیں ہے، گزشتہ زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں پس یہ تمہارے لیے باعث تعجب کیوں ہے؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "ھٰذا" ان اخبار کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں پہلی اقوام کی سرگزشت کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ یہ بھی اپنی نوبت پر ڈرانے والی ہیں، لیکن پہلے والی دونوں تفاسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

اس غرض سے، کہ مشرکین اور کفار اس خطرے پر، جو انہیں درپیش ہے، زیادہ توجہ دیں، مزید کہتا ہے: "جسے نزدیک ہونا چاہیئے وہ نزدیک ہوگئی ہے" (ازفت الآزفۃ)۔

ہاں! قیامت نزدیک ہے، اپنے آپ کو سوال وحساب اور جزا کے لیے تیار کرو۔

"آزفۃ" کی تعبیر قیامت کے متعلق اس کے نزدیک ہونے اور وقت کی تنگی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ یہ لفظ کلمہ "ازف" (بروزن نجف) سے۔ "تنگی وقت کے معنی میں"۔ لیا گیا ہے۔ اور طبعاً نزدیک ہونے کے معنی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

اس نام کے ساتھ قیامت کا نام، زیر بحث آیت کے علاوہ سورۂ مؤمن کی آیت ۱۸ میں بھی آیا ہے، اور یہ ایک گویا اور بیدار کرنے والی تعبیر ہے۔ یہی مفہوم ایک دوسری صورت میں سورۂ قمر کی آیت ۱ میں بھی بیان ہوا ہے، : اقترب الساعۃ: "قیامت نزدیک ہوگئی ہے" بہرحال دنیا کی عمر کی کوتاہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے قیامت کی نزدیکی قابل ادراک ہے۔ خصوصاً اس چیز کو دیکھتے ہوئے کہ جو شخص مرتا ہے اس کی تو قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، : اہم بات یہ ہے کہ "اس دن خدا کے علاوہ کوئی شخص ان کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا" اور نہ ہی اس کے شدائد کو برطرف کرسکتا ہے" (لیس لھا من دون اللہ کاشفۃ)[1]

---

[1] "لھا" کی ضمیر "ازفۃ" کی طرف لوٹتی ہے۔ اور "کاشفۃ" کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ صفت ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"کاشفۃ" یہاں شدائد کو برطرف کرنے والے کے معنی میں ہے۔

لیکن بعض نے "کاشفۃ" کو تاخیر قیامت کے عامل کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ اور بعض نے "وقوع قیامت کی تاریخ کو کشف کرنے" کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال حاکم و مالک اور صاحب قدرت اس دن بھی اور (ہمیشہ) خدا ہی ہے، اگر نجات چاہتے ہو تو اس کے لطف کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھاؤ اور اگر آرام و سکون کے طالب ہو تو اس پر ایمان لے آؤ۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو" (افمن ھٰذا الحدیث تعجبون)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ قیامت اور قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کی طرف اشارہ ہو، جو گذشتہ آیات میں آیا ہے، یا قرآن کی طرف اشارہ ہو۔ (کیونکہ دوسری آیات میں اس کی "حدیث" کے لفظ سے تعبیر ہوئی ہے [1]) یا وہ باتیں جو گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ یا ان سب کی طرف۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو" (وتضحکون ولا تبکون)۔

"اور ہمیشہ غفلت، بے خبری، لہو و لعب اور گناہ آلود سرگرمیوں میں زندگی بسر کرتے ہو" (وانتم سامدون)۔

حالانکہ یہاں نہ تو ہنسنے کی جگہ ہے اور نہ ہی غفلت اور بے خبر رہنے کی جگہ ہے۔ بلکہ یہ تو ہاتھ سے نکلی ہوئی فرصتوں، ترک شدہ اطاعتوں، اور ان گناہوں پر جو تم سے سرزد ہوئے ہیں، رونے کی جگہ ہے۔ بیداری اور ان امور کی تلافی کی جگہ ہے جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کی اور لطف خدا کے سائے کی طرف پلٹنے کی جگہ ہے۔

"سامدون" "سمود" کے مادہ سے (بروزن جمود) لہو و لعب، جوش اور کبر و غرور سے سر اونچا کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اصل میں اونٹ جب چل رہا ہو اور اپنا سر بے اعتنائی سے فضا میں بلند کرے تو اس فعل کو سمود کہا جاتا ہے۔

یہ مغرور تکبر کرنے والے جانوروں کی طرح خواب و خور میں مشغول ہیں، اور عیش و نوش میں غرق ہیں، اور دردناک حوادث اور ان شدید عذابوں سے۔ جو انہیں درپیش ہیں اور ان سے دامنگیر ہونے ہی والے ہیں —— بے خبر ہیں۔

* * *

اس سورہ کی آخری آیت میں، ان بہت سے مباحث کے بعد جو اثبات توحید اور نفی شرک کے سلسلہ میں بیان ہوئے ہیں، کہتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو خدا کے لیے سجدہ کرو اور اس کی پرستش کرو" (فاسجدوا للہ واعبدوا)۔

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ حق کی صراط مستقیم پر چلو تو صرف اسی کی ذات کو سجدہ کرو، جس کی پاک ذات تک تمام عالم ہستی کے خطوط منتہی ہوتے ہیں، اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ گزشتہ اقوام کی دردناک سرنوشت میں —— جو شرک و کفر و ظلم و ستم کی بنا پر عذاب الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوئی ہیں —— گرفتار نہ ہوں، تو صرف اسی کی عبادت کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) "نفس" کی جو محذوف ہے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "کاشفۃ" کی "تا" مبالغہ کے لیے ہے "علامۃ" کی طرح۔

[1] سورۂ طور آیت ۳۴۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ اس سورہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے تو تمام مومنین وکفار جو اسے سن رہے تھے سجدہ میں گر پڑے، ایک روایت کے مطابق جس نے سجدہ نہیں کیا وہ صرف "ولید بن مغیرہ" تھا (جو شاید سجدہ کرنے کے لیے جھک نہیں سکتا تھا) اس نے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اس پر پیشانی رکھ دی اور اس طرح سے سجدہ کیا۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بت پرست تک بھی سجدے میں گر پڑے۔ کیونکہ اس سورہ کے لب ولہجہ کی اثر پذیری ایک طرف سے، اور اس سورہ کا ہیجان انگیز مضمون دوسری طرف سے، اور مشرکین کے لیے وحشتناک تہدیدیں تیسری طرف سے، اور پیغمبر گرامی اسلامؐ کے منہ سے نزول وحی کے پہلے مرحلہ میں ان مبارک آیات کا نکلنا چوتھی طرف سے، اس قدر گہرائی کے ہوں مؤثر اور پُر نفوذ تھا کہ جس نے ہر دل پر بے اختیار اثر کیا، اور عناد، ہٹ دھرمی، تعصب اور خود خواہی کے پردوں کو — چاہے وقتی طور پر ہی سہی — آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا، اور نور توحید کا دلوں پر سایہ ڈال دیا۔

اگر ہم بھی اس سورہ کو دقت وتأمل اور حضور قلب وتوجہ سے تلاوت کریں، اور خود کو پیغمبر گرامی اسلامؐ کے سامنے نزول قرآن کی فضا میں رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ — اسلام کے مخصوص عقائد سے قطع نظر — ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ جس وقت آخری آیت پر پہنچیں تو سجدہ میں گر پڑیں۔ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سر تعظیم جھکا دیں۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ قرآن نے منکرین کے دلوں میں بھی اثر ڈالا، اور انہیں بے اختیار اپنی طرف جذب کر لیا جیسا کہ "ولید بن مغیرہ" کی داستان میں آیا ہے کہ جس وقت اس نے سورۂ حٰم سجدہ (فصلت) کی آیات کو سنا اور جب پیغمبرؐ نے اس آیت کی تلاوت کی فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود - تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور لرزنے لگا۔ اور بال اس کے بدن پر سیدھے کھڑے ہو گئے گھر میں آیا تو اس حالت میں کہ مشرکین نے خیال کیا کہ وہ پورے طور پر محمدؐ کے دین میں جذب ہو گیا ہے۔

اس بنا پر یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چونکہ بعض شیطانوں، یا شیطان صفت انسانوں نے افرأیتم اللات والعزیٰ۔ ..... کی تلاوت کے وقت — جو عربوں کے مشہور بتوں کی بات کرتی ہے — ان بتوں کی تعریف وتوصیف میں زبان کھولی تھی۔ اور "تلک الغرانیق العلیٰ" کہہ دیا تھا، اس وجہ سے مشرکین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ لہٰذا وہ بھی اس بنا پر سجدہ میں گر پڑے۔

کیونکہ — جیسا کہ ہم نے ان آیات کی تفسیر میں پہلے بیان کیا ہے — ان آیات میں جو ان بتوں کے نام لینے کے بعد آئی ہیں ان میں ان کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اور اس نے کسی قسم کے شک اور تردید اور خطا واشتباہ کی گنجائش کسی کے لیے بھی باقی نہیں چھوڑی (مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیت ۱۹ و ۲۰ کی طرف رجوع کریں)

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ "اوپر والی آیت" ان آیات میں سے ہے جس کی تلاوت کے وقت سب پر سجدہ واجب ہے: آیت کا لب ولہجہ بھی جو اس کے صیغہ امر سے ظاہر ہے، اور امر وجوب کی دلیل ہے، اس معنی کی گواہی دیتا ہے، اور اس طرح سے سورہ "الم سجدہ" اور "حٰم سجدہ" کے بعد یہ تیسرا سورہ ہے، جس میں سجدہ واجب آیا ہے۔ اگرچہ

بعض روایات کے مطابق، تاریخ نزول کے لحاظ سے وہ پہلا سورہ، جس میں سجدہ واجب کی آیت نازل ہوئی ہے، یہی سورہ ہے۔

خداوندا! ہمیشہ معرفت کے انوار کو ہمارے دلوں پر سایہ فگن کر، تاکہ ہم تیرے غیر کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر کے سامنے سجدہ نہ کریں۔

بارالٰہا! تمام خیرات کی کلید تیرے ہی دست قدرت میں ہے، ہمیں اپنے بہترین مواہب وعطایا سے یعنی اپنی خوشنودی اور رضا سے بہرہ مند کردے۔

پروردگارا! ہمیں عبرت بین نگاہ عطا فرما، تاکہ ہم گذشتہ ظالم وستمگر اقوام کے حالات سے عبرت سیکھیں اور ان کے راستے پر قدم رکھنے سے بچے رہیں۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ نجم اور تفسیر نمونہ کی جلد ۲۲ کا اختتام

۱۵/ ربیع الاول ۱۴۰۶

۳ / ۹ / ۱۳۶۴

اختتام ترجمہ

بتاریخ ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعرات بوقت پونے آٹھ بجے صبح بر مکان حقیر قم المقدسہ جمہوری اسلامی ایران، محل سلطان محمد شریف کوی جمشیدی بلاک ۱۱ خیابان انقلاب ـــــ الحمد للہ اولاً وآخراً وصلی اللہ علیٰ محمد وآلہ ابداً دائماً۔

احقر صفدر حسین عفی عنہ

اصول و عقائد

اسماء باری تعالیٰ

اللہ ۳۳، ۴۰، ۴۵، ۵۰، ۶۵، ۷۳، ۸۰، ۹۷، ۱۰۴، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۲۷، ۱۵۲، ۶۲، ۱۷۱، ۱۸۶، ۱۹۶، ۲۰۰، ۲۰۹، ۲۷۳، ۳۵۳، ۳۸۳، ۴۰۳، ۴۳۶

بصیر ۲۰۰

توّاب ۱۷۱

حکیم ۴۵، ۵۰، ۸۰، ۱۵۳، ۲۰۰

خبیر ۶۵، ۱۸۶

رب ۲۹۱، ۳۰۰، ۳۶۳، ۳۷۶، ۳۹۱، ۴۱۶، ۴۲۹، ۴۴۰، ۴۶۲

رحمٰن ۳۳، ۲۰۹، ۲۷۳، ۳۵۳، ۴۰۳

رحیم ۳۳، ۶۵، ۱۲۷، ۱۷۱، ۱۹۶، ۲۰۹، ۲۷۳، ۳۵۳، ۳۷۱، ۴۰۳

سمیع ۱۳۷

عزیز ۵۰، ۸۰

علیم ۴۵، ۱۰۴، ۱۳۷، ۱۵۲، ۱۸۶، ۲۰۰، ۳۰۰

غفور ۶۵، ۱۲۷، ۱۹۶

توحید

ہم نے تمہارے لیے واضح کامیابی فراہم کردی ۳۳

شکست ناپذیر کامیابی عطا کی ۴۰

ہم نے تمہارے لیے واضح کامیابی فراہم کردی ۳۳

شکست ناپذیر کامیابی عطا کی ۴۰

وہی تو ہے جس نے مومنوں کو قلب کو سکون عطا کیا۔ زمین و آسمان کے لشکر خدا کیلئے ہیں۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے ۴۵

زمین و آسمان کے لشکر صرف خدا کیلئے اور خدا شکست ناپذیر و دانا ہے۔ ۵۱

ہم نے تمہیں بشارت و انذار کے لیے بھیجا ہے۔ ۵۸

خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، جو تم انجام دیتے ہو اس سے بھی باخبر ہے، ۲۰۰

ہم نے آسمان کو ستاروں سے سجایا اور اسمیں کوئی شگاف نہیں ۲۱۴

زمین کو پھیلایا، پہاڑ قائم کیئے گھاس اُگائی، آسمان سے پُر برکت پانی نازل کیا۔ مُردہ زمین کو زندہ کر دیا ۲۱۵-۲۱۸

ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ ہم اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں ۲۲۳

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُنکے درمیان ہے چھ ادوار میں پیدا کیا ۲۵

طلوع و غروب سے پہلے اور رات کے ایک حصہ میں اور سجدوں کے بعد اُس کی تسبیح کر ۲۶۱

ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ۲۶۳

ہاں (ہواؤں، بادلوں، کشتیوں، فرشتوں کی قسم) جو کچھ تجھے وعدہ دیا گیا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ ۲۷۴

ہم نے آسمان بنائے وسعت دیتے رہتے ہیں، زمین کو پھیلایا ۳۲۲-۳۲۹

ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے، پس تم خدا کی طرف دوڑو۔

میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ عبادت کریں ۳۲۴-۳۴۴

اور خدا ہی روزی دینے والا ہے۔

خدا شرک سے پاک و منزہ ہے۔ ۳۸۳

اسے اُس ہستی نے تعلیم دی ہے جو عظیم قدرت رکھتی ہے، ۴۰۸

جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے۔

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کیلئے ہے، تاکہ بدوں کو سزا اور نیکوں کو جزا دے۔ گناہوں سے بچنے والوں کو جانتا ہے۔ زمین سے پیدا کیا۔ خود ستائی نہ کرو۔ ۴۴۵

خدا کا علم بے پایاں اور بے انتہا وسعتِ علمی ۴۴۹

تمام امور تیرے رب کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہی ہنساتا، رُلاتا

مارتا، زندہ کرتا، جوڑے پیدا کرتا، عالم ایجاد کرتا، ستارۂ شعری کا رب ہے۔ ۴۶۲-۴۶۹

عدل

مَیں کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کروں گا ۲۹۳
بلاشک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی ۲۷۴
ہم نے قوم لوط کے شہروں سے مومنین کو پہلے ہی نکال لیا۔
مومن کو کافر کی سزا میں کیوں گرفتار کریں۔ ۳۱۳
اُس کا علمِ بے پایاں اُسکی عدالتِ مطلقہ کا سہارا ہے۔ ۴۴۹
خدا ہی پر ہے دوسرے عالم کا ایجاد کرنا (تاکہ عدالت کا اجرا ہو) ۴۶۲

نبوت

ہم نے تمہیں بشارت و انذار کیلئے بھیجا ہے ۵۸
انہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ اُن ہی میں سے ڈرانے والا پیغمبر آیا ۲۰۹
جب حق آیا تو تکذیب کی لہٰذا وہ اپنے پراگندہ کام میں متحیر ہیں ۲۱۰
صرف تمہارا ہی دشمن سے مقابلہ نہیں ہے (عاد و ثمود، اصحاب الرس
و ایکہ) قوم نوح و فرعون نے بھی اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ۲۱۹-۲۲۹
تم قرآن کے ذریعے ڈرنے والوں کو نصیحت کرتے رہو۔ ۲۶۴
جس پیغمبر کو بھیجا۔ اسے قوم نے جھٹلایا جادوگر کہا۔ تو ان سے منہ پھیر لے۔
نصیحت کر نصیحت میں مومن کو فائدہ ہے۔ ۳۳۰-۳۳۲
وہ اُفقِ اعلیٰ میں تھا پھر نزدیک ہوا۔ فاصلہ دو کمان سے کم ہو گیا
خدا نے بندہ کو وحی کی۔ جو دیکھا ہرگز جھوٹ نہیں کہا۔ تم مجادلہ کرتے ہو ۴۰۹-۴۱۵
اس نے اپنے پروردگار کی چند عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ ۴۱۶-۴۲۸
یہ (پیغمبر) پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے ۴۷۴

امامت

ابراہیمؑ تمام امتحانوں سے گزرا تو اُسے امامت عطا کی۔ ۴۵۶

قیامت

جب ہم مر جائیں گے خاک ہو جائیں گے، تو پھر زندہ کیے جائیں گے ۔ ۲۰۹
ہم نے بارش کے ذریعے مُردہ زمین کو زندہ کیا۔ مُردوں کا زندہ کرنا
بھی اسی طرح ہے ۔ ۲۱۵
انجام کار سکراتِ موت پہنچ جائیگی، جس سے انسان بھاگتا تھا۔
صور پھونکا جائیگا۔ وحشت ناک دن غفلت کا پردہ ہٹا دیا جائے گا ۲۲۰-۲۲۱
جس نے دوسرے کو خدا کا شریک بنایا، اُسے شدید عذاب میں ڈال دو ۲۴۲
قریب کے مکان سے ندا۔ سب صیحہ کو حق کے ساتھ سُنیں گے زمین اُن کے
اُوپر سے پھٹ جائیگی، وہ قبروں سے تیزی کے ساتھ نکلیں گے ۔ ۲۶۳
بلا شک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی۔ ۲۷۴
روزِ قیامت کے منحرف جزا کا دن کب ہوگا؟ وہی دن ہے جس میں
انہیں آگ میں جلائیں گے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی جلدی کیا کرتے تھے ۲۷۶ تا ۲۸۲
تمہیں صرف تمہارے اعمال ہی کی جزا ملے گی ۳۵۹
جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں ۴۴۰
خدا ہی پر دوسرے عالم کا ایجاد کرنا واجب ہے ۔ ۴۶۲
وہ (قیامت) نزدیک ہو گئی۔ اسکی شدت کو خدا کے سوا کوئی برطرف
نہیں کر سکتا۔ تعجب کرتے ہو۔ ہنستے ہو روتے نہیں ۴۷۴

جنت

بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک ہو جائیگی۔ اسکا تم سے وعدہ کیا تھا۔
سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ ۲۵۰
بہشت کہاں ہے۔ جنت الماویٰ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے ۲۹۷
مومن پرہیزگار جنت کے باغوں میں ہوں گے نعمات سے بہرہ مند اور
خوش ہونگے انکی اولاد کو جنت میں اُن سے ملحق کر دیں گے ۳۶۲-۳۶۹

جہنم

جہنم میں ایک شہر "حصینہ" ہے جسمیں بیمان شکنوں کے باقی ہیں (علیؑ)
جب جہنم سے پوچھیں گے کہ کیا پر ہوگئی؟ کہے گی کہ اس کے
سوا اور کچھ بھی ہے۔ ۲۴۳

فرشتے

رقیب و عتید (متلقیان) دو فرشتے دائیں طرف رقیب،
بائیں طرف عتید۔ اعمال لکھتے ہیں ۲۲۸
اس کا ہم نشین فرشتہ کہتا ہے، اس کا نامۂ اعمال میرے
پاس حاضر و تیار ہے۔ ۲۴۲
جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو خدا
کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ ۴۴۰

احکام

عمرۃ القضاء: عمرۂ حدیبیہ میں ملتوی ہو کر اگلے سال
کیا گیا۔ اس وجہ سے قضا شمار کیا گیا ۱۱۵، ۱۱۶

تسبیح

طلوع و غروب سے پہلے، رات کے ایک حصہ میں اور سجدوں
کے بعد اُس کی تسبیح کرو۔ ۲۶۱

سجدہ

سب اُس کے لیے سجدہ کرو ۴۷۵، ۴۷۸

نماز

اس سے مُراد رات کو نماز پڑھنے کے لیے بیدار رہنا ہے ۱۲۲
ادبار السجود سے مُراد دو رکعت نافلہ ہے جو مغرب کے بعد
پڑھتے ہو (علیؑ) ۲۶۱
بہت کم راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بیدار نہ ہوں اور عبادت کریں ۲۸۹
نمازِ تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا (علیؑ) ۲۸۹
عبادت کے لیے قیامِ شب کو فراموش نہ کرو۔ ۲۹۰
جن و انس کو عبادت کے لیے پیدا کیا۔ ۳۴۴

ذکر

ہر صبح و شام بطور ذکر کہو "لا الہ الا اللہ" ۲۶۰

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ: مومنین میں قرار و اطمینان جو خدا پر ایمان و اعتقاد اور
اسکے لطف سے پیدا ہوا تھا، انہیں ضبط اور نفس پر تسلط کی
دعوت دی اور غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ ۱۰۶
وہ لوگ جو اپنی آواز کو پیغمبرؐ کے سامنے دھیمی رکھتے ہیں اُنکے
دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے کشادہ کر دیا ہے ۱۴۳
ادب افضل ترین سرمایہ ہے۔ رسولِ پاک کے سامنے مؤدب
رہنا بدرجہ اولیٰ ۱۴۵-۱۵۱
کسی فاسق کی جھوٹی خبر پر بلا تحقیق عمل نہ کرنا۔ واقعہ بنی مصطلق ۱۵۵-۱۶۰
دو فریقین میں نزاع ہو جائے تو صلح کرا دو۔ ۱۶۲-۱۶۵
ایک دوسرے کا مذاق نہ اُڑائیں۔ عورتیں ایک دوسری کو
طعن و تشنیع نہ کریں۔ بُرے القاب سے یاد نہ کریں۔ اسلام
کے بعد کفر اختیار نہ کریں۔ ۱۷۳

اخلاقِ رذیلہ

کافر اپنے دلوں میں غصہ اور نخوت رکھتے تھے۔ یہی بات ایمان قبول کرنے میں
مانع تھی بلکہ مومنوں کو تکلیف پہنچانے کا سبب تھی ۱۰۵

بنی تمیم کے کچھ افراد کے حجروں کے عقب سے رسول پاک کو اونچی آواز سے بلایا اس پر سورہ حجرات کی آیتیں انکی مذمت میں نازل ہوئیں ۱۳۹
پیغمبر کی محفل میں بلند آواز سے بولنا بے ادبی ہے ۱۴۲
ظالم کیخلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خدا کی طرف پلٹ آئے ۱۶۴
استہزاء، بدگمانی، غیبت، تجسس اور برے القاب بدخلقی ہے ۱۷۳
اپنی زبان سے مومن کے دل (جو عشق خدا کا مرکز ہے) کو آزار پہنچانا، بہت بڑا ظلم ہے ۱۷۵
غیبت مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے ۱۷۸

اقوامِ گزشتہ

اصحاب الایکہ
قوم شعیب کا ایک گروہ جو مدین کے علاوہ کہیں اور رہتا تھا۔ ۲۲۱
اصحاب الرس: یہ قوم یمامہ میں رہتی تھی اُن کی طرف حنظلہ پیغمبر مبعوث ہوئے۔ ۲۲۰
قوم تبع
یمن کے لوگوں کا ایک گروہ ۲۱۰
قوم ثمود: صالح نبی کی قوم حجر کی زمین میں رہتی تھی ۲۲۰، ۲۵۵
اور قوم ثمود کو بھی ہلاک کیا۔ اُن میں سے کسی کو نہیں چھوڑا ۴۷۰
قوم عاد، عاد کی سرگزشت میں بھی ایک نشانی ہے ۳۱۶
کیا پتہ نہیں کہ اللہ نے قوم عاد کو ہلاک کر دیا؟ ۴۷۰
قوم فرعون: موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا ۲۱۵
قوم لوط: عذاب کا ذکر ۳۱۰، ۳۱۴
قوم لوط کے زیر زبر شدہ شہروں کو زمین پر دے مارا ۴۷۰
قوم نوح، حضرت نوحؑ کی قوم کا ذکر ۲۲۰
ہم نے قوم نوحؑ کو ہلاک کیا، کیونکہ وہ سب ظالم تھے ۴۷۰

شخصیات

ابراہیمؑ (نبی)
فرزند کو قربان کرنے کے لیے "سچا خواب" ۱۱۴
آپ کے پاس فرشتے مہمان ہوئے ۳۰۰-۳۰۱
کیا ابراہیم کی کتابوں سے باخبر نہیں ہوا جس نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔ ۴۵۳
ابن الکوا۔
نام عبداللہ۔ جناب امیرؑ کا دشمن بظاہر دوست۔ جناب امیرؑ سے ذاریات کے معنیٰ دریافت کیے ۴۱۳
ابوبکرؓ (صحابی)
رسول پاکؐ سر میں درد کی وجہ سے صرف ایک روز خیبر سے باہر نہیں آئے
اس دوران ابوبکرؓ نے علم سنبھالا اور قلعہ (خیبر) کی طرف آئے ۹۵
اسامہ بن زیدؓ
پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آخری وقت اسامہؓ بن زید کی قیادت میں اسلامی لشکر کو جمع ہونے اور جنگ پر جانے کا حکم دیا، جس پر عمل نہ کیا گیا ۱۵۰
اسعد ابوکرب۔
یمن کا ایک خاص بادشاہ ۲۲۱
اسمٰعیلؑ (نبی)
ابراہیمؑ نے خواب میں اپنے فرزند (اسماعیلؑ) کو قربان کرتے ہوئے دیکھا ۱۱۴
اقرع
اشراف بنی تمیم کا ایک شخص جس نے اسلام کی برتری کا اعتراف کیا۔ ۱۳۹
اُم سلمہؓ (زوجۂ رسولؐ)
بعض ازواج رسولؐ نے مخصوص لباس کی وجہ سے ان مخدومہ کا مذاق اُڑایا ۱۷۲

ثابتؓ بن قیس (صحابی وخطیب)
آپ نے رسولِ پاک کے حکم سے بنی تمیم افتخارات کا جواب دیا ۱۳۹
وُہ میں تھا جو پیغمبرؐ کے سامنے بلند آواز میں بات کرتا تھا۔ پس
میرے اعمال حبط ہوگئے۔ رسولِ پاکؐ نے فرمایا نہیں۔ وُہ
اہلِ جنت سے ہے اس کا یہ عمل خدمتِ اسلام کیلئے ہوتا تھا۔ ۱۴۳
ثقلِ سماعت کی وجہ سے رسولِ پاکؐ کے قریب بیٹھتے تھے جگہ نہ ملی
تو ایک شخص کو ناپسندیدہ طور پر ماں کے نام سے پکارا ۱۷۲
جعفر بن محمد صادقؑ
اپنے اموال، ازواج و اولاد کو سورہ فتح تلاوت کرکے محفوظ کرلو
جنت کے باغوں کی بشارت ہو ۳۱، ۳۲
ایمان کے (سیڑھی کی طرح) دس درجہ ہیں جس سے درجہ بدرجہ اوپر جاتے ہیں ۴۹
خُدا نے ایمان کو سات حصوں نیکی، صدق، یقین، رضا، وفا، علم و حلم
میں تقسیم کر دیا ہے ۴۹
اللہ مومن صادق دُعا کرنے والے کی نیت جان لینے کے
بعد دُعا قبول کر لیتا ہے۔ ۸۲
خُدا کی کچھ ایمان والی امانتیں کفار و منافقین کے صلبوں میں تھیں
اُن کے جُدا ہو جانے تک اُنہیں عذاب نہیں کیا ۱۰۳
ہم تقویٰ کا کلمہ اور راہِ ہدایت ہیں۔ ۱۰۷
اس سے مُراد رات کو نماز پڑھنے کیلئے بیدار رہنا ہے جس کے
آثار دن کے وقت ان کے چہروں سے ظاہر ہوتے ہیں ۱۲۲
مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہیں کرتا، تنہا نہیں چھوڑتا ۱۲۸
دین، عقل، حیا، حسنِ خلق، حسنِ ادب، انسان کی پانچ امتیازی صفات ہیں
تکبر کرنے والوں سے ذکرِ خیر کی توقع ہرگز نہ رکھنی چاہیئے۔ ۱۴۶
کیا تمہیں یہ علم نہیں کہ انبیاء کے گھروں میں بحالت جنابت داخل
نہیں ہوتے مومن، مومن کا بھائی، ایک جسم کے اعضاء کے مانند ہے
ایک عضو کی تکلیف ہو تو دُوسرے کو قرار نہیں آتا ۱۶۸
مومن، مومن کا بھائی ہے وہ اسکی آنکھ کے مانند ہے کبھی خیانت
نہیں کرتا۔ ۱۶۹
جو مومن کی عیب جوئی کرے خُدا اُسے اپنی ولایت سے ولایتِ شیطان میں
منتقل کر دیتا ہے۔ ۱۸۳
غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کے بارے میں وہ بات کرے جسے
خُدا نے پوشیدہ رکھا ہے ۱۸۴
اسلام کے ساتھ انسان کا خُون محفوظ ہے۔ شادی بیاہ حلال ہوتا ہے
لیکن ثواب اعمال پر ملتا ہے۔ ۱۹۸
اِسلام ایمان کے ساتھ شریک ہے لیکن ایمان اسلام کے ساتھ شریک نہیں ۱۹۸
جب دو مومن آپس میں باتیں کرتے ہیں تو محافظِ اعمال فرشتے الگ ہو
جاتے ہیں مبادا کوئی ایسی گفتگو یا راز ہو جسے خدا نے مستور رکھا ہو ۲۸۸
ہر صبح و شام بطور ذکر دس مرتبہ کہو لا الہ الا اللہ ۲۶۰
صبر و شکیبائی پر آپ کی طویل حدیث ۲۶۱
بہشتی و نیکوکار سحر کے وقت نمازِ وتر میں ستر مرتبہ خدا سے
مغفرت طلب کرتے ہیں ۲۸۶
خُدا نے دولت مندوں کے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق قرار دیئے ہیں ۲۸۷
بہت کم راتیں ایسی گزرتی ہیں کہ وُہ بیدار نہ ہوں اور عبادت نہ کریں ۲۸۹
عبادت کے لیے قیامِ شب کو فراموش نہ کرو ۲۹۰
جب رزق تقسیم شدہ ہے تو پھر حرص و لالچ کس بنا پر..... ۲۹۹
خداوند تعالیٰ انسان کو اُس کی مروت و شخصیت کے مطابق
رزق دیتا ہے۔ ۲۹۹
لوگوں کو آزار نہ پہنچانے اور جھگڑوں کو ختم کرنے سے روزی میں اضافہ
ہوتا ہے۔ ۲۹۹
جن و انس کو عبادت کے لیے پیدا کیا۔" پوچھا خاص گروہ "فرمایا سب کو" ۲۲۴

رسول پاکؐ نے فرمایا کہ معراج میں سدرہ کے ہر پتے کے
سایہ میں ایک اُمت قرار پائی ہے۔ ۴۱۸
"وہ گناہ جو انسان کر بیٹھتا ہے، پھر ایک مدت رُکا رہتا ہے"
پھر آلودہ ہوتا ہے۔ مگر یہ اُس کا معمول نہیں ہے ۴۴۷
لم یہ ہے کہ انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر اس سے
استغفار کرے۔ ۴۴۷
لم کو انجام دینے والا وہ بندہ ہے جس سے کبھی کبھار گناہ سرزد
ہو جاتا ہے لیکن یہ اُس کی عادت نہیں ہے ۴۴۸
بعض اوقات کچھ ضرورتوں کے پیشِ نظر اپنے فضائل بیان کرنا
ضروری ہو جاتے ہیں۔ ۴۵۲
جس وقت گفتگو خُدا تک پہنچ جائے تو چُپ ہو جاؤ ۴۶۳

حسان بن ثابت (شاعر)

بنی تمیم کے شاعر کے بیان کردہ افتخارات کا جواب دیا ۱۳۹

حسنؑ ابن علیؑ

آپکے تابوت کو بغرضِ دفن روضۂ رسولؐ پر لے جانا اور عائشہ کا انکار ۱۴۹

حسینؑ ابن علیؑ

جناب حسنؑ کی میت جوارِ رسولؐ میں دفن کرنے کا عائشہ کا بلند
آواز میں انکار، شور و غوغا اور آپ کا آیت لاترفعوا اصواتکم...
تلاوت فرمانا ۱۴۹
اے کریم اور بزرگوار لوگوں کے بیٹو! صبر کرو موت صرف ایک پُل ہے
جو تمہیں مقامِ رنج سے مقامِ راحت کی طرف منتقل کر دیتا ہے ۲۳۸-۲۳۹
خُدا نے بندوں کو اس لیے پیدا کیا کہ خالق کو پہچانیں، پہچان لیں تو
پھر عبادت کریں اور غیر کی عبادت سے بے نیاز ہو جائیں (صادقؑ) ۲۴۳

حیّ بن اخطب

ایک یہودی سردار (صفیہؓ زوجۂ رسولؐ کے والد) ۱۷۵

خالد بن ولید

رسولِ پاکؐ نے ولید بن عقبہ کے بیان کی تحقیق کے لیے بھیجا
تو اس نے بنی مصطلق کا صاحبِ ایمان ہونا بیان کیا ۱۵۲

زعلب یمانی

جس نے آیت "قاب قوسین" کا جنابِ امیرؑ سے معنیٰ دریافت کیے ۴۱۳

زہری

ایک مشہور تابعی کا قول کوئی بھی فتح "حدیبیہ" سے بڑھ کر نہیں تھی ۳۸

سہیل بن عمرو

مشرکینِ مکہ کا نمائندہ جو حدیبیہ میں رسولِ پاکؐ سے گفتگو کے لیے آیا ۲۵، ۱۰

شیطان

اس کا ہم نشین کہے گا۔ میں نے اسے سرکشی کے لیے نہیں اُبھارا تھا
وہ خود ہی دُور دراز کی گمراہی میں تھا۔ ۲۴۳

صالحؑ نبی

اپنی قوم سے کہا بس تین دن کی مہلت ہے، عذاب کے منتظر رہو ۳۱۹

صفیہؓ (زوجۂ رسولؐ)

جنابِ صفیہؓ نے رسولِ پاکؐ سے شکایت کی کہ عائشہؓ
مجھے یہودی کی لڑکی کہتی ہے۔ ۱۷۵

عائشہؓ (زوجۂ رسولؐ)

جوارِ رسولؐ میں امام حسنؑ کو دفنانے سے انکار ۱۴۹
جنابِ صفیہؓ پر طعن ۱۷۵

عباسؓ بن عبدالمطلبؑ

بحکم رسولؐ جنگِ حنین میں بھاگنے والوں کو بلند آواز
سے پکارا۔ ۱۴۳

عبدالرحمٰن ابن ملجم

حضرت علی علیہ السلام کا قاتل ۵۲

عبداللہ بن سعد
عثمانؓ کا ایک رشتہ دار جس نے عثمانؓ سے اُونٹ لے کر اُسکے گناہ اپنے ذمہ لینے کا اقرار کیا اور اُس پر گواہی کرائی ۴۵۴
عبداللہ بن عباس
اللہ نیک اولاد کو جنت میں اُنکے مومن والدین سے ملحق کریگا (رسولِ پاکؐ) ۳۶۷
عثمانؓ بن عفان
مشرکینِ مکہ سے بات کرنے گئے قتل کی شہرت ہوئی۔ پھر زندہ واپس ہوئے۔ ۱۲۰،۳۵
اس کے پاس بہت دولت تھی۔ انفاق کرتا تھا عبداللہ بن سعد نے کہا دولت ختم ہو جائے گی۔ سواری کا اُونٹ معہ سامان مجھے دیدے۔ میں گناہ اپنے ذمے لیتا ہوں۔ ۴۵۴
عروہ بن مسعود ثقفی
مشرکینِ مکہ کا نمائندہ جو حدیبیہ میں رسولِ پاکؐ سے گفتگو کرنے آیا ۳۴
علی ابن ابی طالب علیہما السلام
آپ نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ تحریر فرمایا ۳۶
وہ اپنے آپکو متہم کرتے ہیں اپنے اعمال سے ڈرتے ہیں جس وقت ان میں سے کسی ایک کا تزکیہ و تعریف کی جائے (خطبہ ہمام) ۵۵
ہر آنے والا دن کہتا ہے اے انسان نیک کام کرتا کہ میں تیرے کام کی قیامت میں گواہی دوں۔ ۶۰
جہنم میں ایک شہر "حصینہ" ہے جس میں پیمان شکنوں کے ہاتھ ہیں ۶۳،۶۴
بخل، بزدلی اور حرص ایسی صفات جو خدا کے بارے میں سوءظن میں جمع ہیں ۶۹
خدا نے ہمارا صدق و خلوص دیکھا تو ذلت و خواری دشمن پر اور کامیابی و نصرت کو ہم پر نازل فرمایا ۸۳
میں ایسے لوگوں میں پھنس گیا ہوں کہ حکم کی اطاعت نہیں کرتے، دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ ۱۰۸
ادب کی رعایت، زینت کے لیے فاخرہ لباس کی طرح ہے
ادب انسان کو اپنے بزرگوں پر فخر کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے ۱۴۵
جو شخص بُرا گمان رکھتا ہو وہ ہر شخص سے ڈرتا ہے۔ اور وحشت رکھتا ہے۔ ۱۷۹
گناہ سرکش سواریوں کے مانند ہیں۔ لیکن تقویٰ آرام دہ اور سبک رفتار سواری ہے۔ ۱۹۳
تقویٰ ایک مستحکم اور شکست ناپذیر قلعہ ہے۔ انسان صرف تقویٰ کے ذریعے گناہ سے بچ سکتا ہے۔ ۱۹۴
وہ تمام موجودات کے ساتھ ہے لیکن اسطرح نہیں کہ انکے قرین ہو تمام موجودات سے جدا ہے مگر اس طرح نہیں کہ اُن سے الگ ہو:۔ ۲۲۹
سکراتِ موت اپنے پاس کی ہر چیز کو کھو دینے کی حسرت کے ساتھ ہجوم کرتی ہے ۲۲۲،۲۲۳
علم و دانش نے حقیقت بصیرت کے ساتھ اُن کا رُخ کیا ہے ۲۳۶
ادبار السجود سے مُراد دو رکعت نماز نافلہ ہے جو تم مغرب کے بعد پڑھتے ہو۔ ۲۶۱
نمازِ تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا ۲۸۹
(عقیلؑ سے) مجھے اُس آگ کی طرف کھینچتے ہو جسے خدا نے اپنے غضب سے بھڑکایا ۳۵۶
ہوائے نفس کی پیروی انسان کو راہِ حق سے روک دیتی ہے ۴۰۵،۴۰۶
میں نے خدا کو مصمم ارادوں کے ناکام رہنے اور ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ ۴۳۷
خدا نے خودستائی سے منع کیا ہے ورنہ وہ فضائل بیان کرتا جن سے مومنین کے دل آشنا ہیں ۴۵۱

اے اہلِ بصرہ، زیر و زبر شدہ زمین کے رہنے والو۔ اے عورت کے لشکر، اے اونٹ کی پیروی کرنے والو۔ ۴۷۲

علی ابن الحسین علیہما السلام

اپنی قوم کے بُرے آدمیوں کو دوسری قوم کے نیک افراد سے اچھا سمجھنا ایسا تعصب ہے۔ جو گناہ کا سبب ہے، ۱۰۹
جو تجھے تعلیم دیتا اور تربیت کرتا ہے، اُسکا احترام کرے تو ایسا ہے کہ تو علم خدا کیلئے حاصل کیا (اُستاد کے احترام میں ایک طویل حدیث) ۱۴۸
موت۔ مومن کا غلیظ و کثیف لباس اُتار کر پاکیزہ و معطر لباس پہن لینا ہے اور کافر کا عمدہ لباس اُتار کر گندہ و آلودہ لباس پہننا ہے۔ ۲۲۷، ۲۳۸

علی بن موسیٰ رضا علیہم السلام

خدا کے بارے میں اپنے ظن و گمان کو اچھا رکھو تا کہ خدا تم سے اچھا سلوک کرے ۵۷
ہم کلمۂ تقویٰ اور خدا کی مضبوط رسی ہیں ۱۰۷
ایمان اسلام سے ایک درجہ بلند ہے اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ اُونچا ہے ۱۹۴
اُس نے دُنیا جہان کی چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد پیدا کیا ہے۔ (ایک طویل حدیث) ۳۲۸

عمرؓ بن خطاب

حدیبیہ میں مشرکینِ مکہ سے بات کرنے میں عُذر کیا ۳۵
جنگِ خیبر کے دوران ایک روز علم سنبھالا قلعہ کی طرف گئے، کامیابی نہ ہوئی ۹۵
قلم دوات کاغذ لانے سے منع کیا (واقعہ قرطاس) ۱۵۱

فرعون

کہا یہ تو جادوگر ہے ۲۱۷

فضیل بن یسار

امام صادقؑ کا ایک صحابی جس نے امام کے اکثر اقوال بیان کیے ۱۹۸

لوطؑ (نبی)

فرشتوں کا قوم لوط کی طرف جانا۔ ۲۰۹

ماریہؑ (زوجۂ پیغمبر)

ماریہ (والدہ ابراہیمؑ) کے پاس اُنکے چچازاد کا آنا۔ علیؑ کا تعاقب کرنا پھر رسولؐ سے صحیح حال عرض کرنا۔ ۱۵۴

محمد مصطفیٰ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جو شخص سُورہ فتح پڑھے ایسا ہے کہ حدیبیہ میں درخت کے نیچے میری بیعت کی اور فتح مکہ میں میرے ساتھ رہا ۳۱
خُدا کے ساتھ حُسنِ ظن رکھنا جنت کی قیمت ہے ۵۷
تین شخص ایسے ہیں جن سے خُدا بات تک نہ کرے گا۔ ۸۷
مَیں تجھ سے اس آبادی اور اسکے اہل میں جو خیر ہے، اُس کا طلبگار ہوں ۹۴
خدا کی قسم یہ علم ایسے مرد کو دوں گا، جو خدا اور اُس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔ ۹۵
دُنیا بھر میں کوئی مٹی، پتھر کا گھر یا خیمہ ایسا نہ ہوگا، جس میں خدا نے اسلام نہ داخل کر دیا ہو۔ ۱۱۹
تم تو میرے اصحاب ہو۔ میرے بھائی تو وہ ہیں جو بعد میں آئیں گے ۱۲۶
حُسنِ ادب پر آپؐ کی طویل حدیث ۱۴۶-۱۴۷
تاخیر و تحقیق کرنا خدا کی طرف سے ہے۔ جلد بازی شیطان کی طرف سے ۱۵۲
مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے وہ ہرگز اس پر ظلم نہیں کرتا۔ اور حوادث کے مقابلہ میں تنہا نہیں چھوڑتا۔ ۱۶۸
دینی بھائی دونوں ہاتھوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کو دھوتے ہیں ۱۶۸

مومن اپنے مومن بھائی پر تیس حق رکھتا ہے۔ (طویل حدیث) ۱۶۹-۱۷۰
تین چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود مومن میں پسندیدہ نہیں جبکہ
اُن سے راہِ فرار موجود ہے۔ ۱۷۶
خُدا نے مُسلمانوں کا خُون، مال اور عزت و آبرو دُوسروں پر حرام کردی
اور بدگمانی بھی۔ ۱۷۹
سُود کا درہم چھتیس زناؤں سے بڑھ کر ہے۔ اور مسلمان کی
آبرو سُود سے بڑھ کر ہے۔ ۱۸۱
جو مُسلمانوں کے پوشیدہ امور کو افشا کرے خُدا اُسکے راز فاش
کر دیتا ہے۔ ۱۸۲
جس نے غیبت سے توبہ کر لی وُہ آخری شخص ہے جو جنت میں
داخل ہوگا۔ ۱۸۲
غیبت کی تاثیر جذام کے اثر سے بڑھ کر ہے ۱۸۲
خدا نے جاہلیت کے ننگ و عیب اور بزرگوں پر فخر کرنے کو ختم کر دیا ۱۸۹
صرف دو گروہ صاحبانِ تقویٰ اور بدکار ۱۸۹
لوگو! تمہارا خدا ایک ہے، باپ بھی ایک ہے، عرب کو عجم پر کوئی
فضیلت نہیں ۱۹۰
خُدا تمہارے گھرانے، نسب اور جسموں کو نہیں دیکھتا۔ دلوں
کو دیکھتا ہے۔ ۱۹۰
تم سب اولادِ آدم ہو جو مٹی سے پیدا ہوئے۔ آباء و اجداد
کے ذریعے فخر کرنے سے گریز کرو۔ ۱۹۱
اسلام ایک ظاہری چیز ہے، لیکن ایمان کی جگہ دل ہے ۱۹۷
جو سُورہ ق کی تلاوت کرے گا، اللہ اُس پر مشکلات و
سکراتِ موت آسان کرے گا۔ ۲۰۸
جب انسان بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو خدا وہی نیک اعمال جو
وہ حالت صحت و قیام میں انجام دیا کرتا تھا۔ اُس کے لیے لکھتا ہے ۲۲۷
ان للموت سکرات: موت کے لیے سکرات ہے ۲۳۲
پیغمبر علیہ السلام کو صبر کی تلقین اور نزولِ آیت "لقد خلقنا السموات" ۲۶۲
آخرِ شب مجھے تہجد کیلئے زیادہ محبوب ہے ۲۸۶
تین چیزیں گناہوں کا کفارہ ہیں جن میں سے ایک تہجد پڑھنا ہے ۲۸۹
جو دو رکعت رات کی تاریکی میں پڑھی جائے۔ دُنیا کی ہر چیز
سے بہتر ہے۔ ۲۸۹
جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے گا وہ اپنے خُدا کو پہچان لے گا ۲۹۴
توحید نصف دین ہے اور روزی کے نزول کا سبب راہِ خدا میں
خرچ کرنا ہے۔ ۲۹۹
جو سُورہ طور تلاوت کرے خُدا اُسے عذاب سے مامون رکھے گا ۳۵۱-۳۵۲
مومن جنت میں اولاد کیلئے خدا سے سوال کریگا۔ نیک اولاد
اُس سے ملحق کر دی جائے گی۔ ۳۶۷، ۳۶۸
جنت میں مخدوم کی خادم پر برتری ایسی ہوگی جیسے بدر کامل کو
ستاروں پر ۳۷۲
یہ وہ کلمات ہیں جن کی خُدا نے مجھے تعلیم دی ہے یہ اُس چیز
کا کفارہ ہے جو مجلس میں واقع ہوتی ہے ۳۹۵
ہوائے نفس کی پیروی انسان کی راہِ حق سے روک دیتی ہے ۴۰۵، ۴۰۶
مَیں نے دروازہ کھولا نہ بند کیا۔ یہ عمل مطابق وحیٔ الٰہی تھا ۴۰۷
مَیں جب معراج پر گیا تو پروردگار کی ساحتِ قدس سے
بقدر دو کمان یا اس سے بھی کم پر پہنچ گیا۔ ۴۱۲
مَیں نے سدرہ کے ہر پتہ پر ایک فرشتہ کو کھڑا دیکھا جو خدا کی
تسبیح و عبادت میں مصروف تھا ۴۱۸
حضور پاکؐ کا خدا سے سوال و جواب (حدیث قدسی کے اقتباسات)
۴۲۴ تا ۴۲۸
جس کی تمنا رضائے خدا کا موجب ہو وہ نہ مرے گا جب تک
تمنا پوری نہ ہو جائے۔ ۴۳۹

خداوند دُنیا کو ہمارے لیے سب سے بڑی فکری مشغولیت
اور ہمارے علم و آگاہی کی انتہا قرار نہ دے۔ ۴۴۳
خدا آسمان کو بارش کے ذریعے رُلاتا اور زمین کو نباتات
کے ذریعے ہنساتا ہے۔ ۴۶۳
ابُوذر کا سوال مولا کتنے پیغمبر آئے رسولِ پاکؐ کے جوابات ۴۶۰
اگر تم اس چیز کو جانتے جسے میں جانتا ہوں تو تم روتے
زیادہ اور ہنستے کم۔ ۴۶۸

محمد بن علی باقر علیہما السلام

جو ہمیشہ واجب اور مستحب نمازوں میں سورۂ قٓ تلاوت کریگا
اللہ اسکی روزی وسیع اور قیامت کا حساب آسان کردے گا ۲۰۸
جو سُورۂ "طور" تلاوت کرے گا اللہ دُنیا اور آخرت کی بھلائی
اُس کے لیے جمع کردے گا۔ ۳۵۲
تم میں سے کوئی بھی اپنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے زیادہ ہونے پر فخر
نہ کرے خدا پرہیزگاروں کو خُوب جانتا ہے۔ ۴۵۱

محمد بن علیؑ تقی الجواد علیہما السلام

موت وہی نیند ہے جو ہر رات تمہیں آتی ہے، مگر یہ کہ
اسکی مدت طولانی ہے بیداری قیامت میں ہوگی۔ ۲۳۸

موسیٰ بن جعفر کاظم علیہما السلام

بابا جان میں جس کی نماز پڑھ رہا تھا وہ ان گزرنے والوں کی
نسبت مجھ سے زیادہ قریب تھا۔ ۲۲۵
موت تصفیہ کا ایک ذریعہ ہے۔ ۲۳۹
خداوند تعالیٰ نے جن و انس کو عبادت کیلئے پیدا کیا۔
نافرمانی نہ کریں ۳۴۲
معراج میں رسولِ پاکؐ اور پروردگار کی ساحتِ قدس کے
درمیان دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ تھا۔ ایک حجاب آنکھوں سے ہٹا دیا تھا ۴۱۲

موسیٰ نبیؑ

ہم نے موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیجا ۳۱۵
کیا وہ اس سے باخبر نہیں ہوا جو موسیٰ کی کتابوں میں نازل ہوا ۴۵۲

ولید بن عقبہ

رسُولِ پاکؐ نے بنی مصطلق سے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا
واپسی پر بتایا کہ وہ زکوٰۃ دینے سے انکاری ہیں۔ ۱۵۳

ولید بن مغیرہ

اپنے بھتیجوں سے کہا تم میں سے جو اسلام قبول کرے گا
میں اُسکی مدد نہیں کروں گا۔ ۲۴۵
دینِ اسلام سے قربت حاصل کی۔ مشرکین کی سرزنش۔ ایک نے
مال کے بدلے گناہ اُٹھانے کا اقرار کیا طے شدہ مال سے کم دیا۔
اِسلام سے پھرنا۔ مذمت ۴۵۵
آیتِ سجدہ کی تلاوت پر مومن کافر سب سجدہ میں گرے۔ اس نے
ایک مُٹھی مٹی سے اُٹھا کر اُسے پیشانی سے لگا لیا۔
جُھک نہیں سکتا تھا۔ ۴۷۷

علماء و دانشور

بیضاوی ۴۱۱
جان الدر ایک محقق ۳۲۵
جلال الدین سیوطی، مفسر درالمنثور ۴۰۶
راغب: صاحب مفردات ۵۳، ۲۲۴، ۲۵۵، ۲۷۹
۳۰۲، ۳۵۶، ۳۶۵، ۳۷۲
۳۷۴، ۳۷۸، ۳۷۹، ۴۰۴
۴۰۵، ۴۶۵
زمخشری (مفسر) ۲۹۶، ۳۰۲، ۴۱۱، ۴۵۴، ۴۵۷

ژرژ گامو ف : دانشور ۳۲۵
سید قطب : مفسر فی ظلال القرآن ۴۱۱
طباطبائی : (المیزان) ۴۱۱
طبرسی : (مفسر) ۳۵۶، ۴۱۱، ۴۵۴
طوسی : (امالی) ۴۱۲
فاضل مقداد ۲۸۶
فخرالدین رازی (مفسر) ۴۱۱، ۴۵۴
فردھویل (مولف مرزہائے نجوم) ۳۲۵
قرطبی (رُوح البیان) ۴۱۱
کرسی مورلیسین (دانش ور ماہر طبیعیات) ۲۹۲
مراغی (مفسر) ۴۱۱
ہشام بن حکم ۴۱۲

کُتبِ آسمانی

توراۃ

اس کی گواہی توراۃ میں بھی ہے (مثلہم فی التوراۃ) ۱۱۷
اصحابِ رسولؐ کی صفات جو توراۃ میں بیان ہوئیں ۱۲۲، ۱۲۳
کتاب حزقیل : وہی جان جو گناہ کرے گی وہی مرے گی بیٹا، باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا ۴۶۱
توراۃ سفر تثنیہ : باپ اولاد کے بدلے قتل نہیں کیے جائیں گے اولاد بھی باپ کے بدلے میں قتل نہیں کی جائے گی۔ ہر شخص اپنے گناہ کے سبب ہلاک ہوگا ۴۶۱

انجیل

اور یہ گواہی انجیل میں بھی ہے (مثلہم فی الانجیل) ۱۱۷
اصحابِ رسولؐ کی صفات جو انجیل میں بیان ہوئیں ۱۲۲-۱۲۳

قرآنِ پاک

سُورۂ فتح کے مضامین

حدیبیہ سے واپسی پر رسولِ اکرمؐ کا چہرہ بشاش ہوا۔ سُورۂ فتح کا نزول ہوا جسے آپؐ نے بیان فرمایا سات حصّے بشارت فتح، صلح حدیبیہ، نزولِ سکینہ، پیغمبرؐ کا مرتبہ، منافقین کی رُسوائی، منافقین کے نامناسب تقاضے معذورین جہاد اور مومنین کی خصوصیات و صفات ۲۹-۳۰

تلاوت کی فضیلت

جس نے سُورہ فتح تلاوت کی، ایسا ہے کہ وہ اس سفر میں رسول کے ساتھ رہا۔ صلح حدیبیہ کے وقت بیعتِ رسول کی (عبداللہ ابنِ مسعود حدیث) ۳۱
تلاوت کرنے والے کے اموال، اولاد، ازواج محفوظ جنّت میں دخول (امام صادقؑ) ۳۱-۳۲

سُورۂ حجرات کے مطالب

اس سُورہ میں بیشتر اخلاقی مضامین بیان ہوئے ہیں ۱۳۳

تلاوت کی فضیلت

تلاوت کرنے والے کو اُن افراد کی تعداد سے جنہوں نے خُدا کی اطاعت یا نافرمانی کی دس گنا نیکیاں دی جائیں گی (رسولِ پاکؐ) ۱۳۴
ہر دن یا رات میں تلاوت کرنے والا زائرینِ رسولؐ میں شمار ہوگا۔ (صادقؑ) ۱۳۵

سُورۂ قٓ کے مطالب

اس سُورہ میں معاد کے مطالب بیان ہوئے ہیں۔ عاد و ثمود قومِ فرعون و لوط و شعیب اور تبع کے حالات کا بیان ہے ۲۰۷

تلاوت کی فضیلت
جو سُورۂ ق کی تلاوت کریگا، اللہ اس پر مشکلاتِ موت و سکرات کو آسان کردے گا۔ (رسولِ پاکؐ) ۲۰۸
جو ہمیشہ واجب و مستحب نمازوں میں ق کو تلاوت کرے اللہ اُسکی روزی وسیع کرے گا۔ (امام باقرؑ) ۲۰۸
ہمارے پاس وُہ کتاب ہے جسمیں ہر چیز محفوظ ہے ۲۰۹، ۲۱۰
سُورہ ذاریات کے مضامین
قیامت اور مومنین و کفار کی جزاء و سزا سے مربوط مسائل ۲۷۱
تلاوت کے فضائل
جو شخص دن یا رات کو سُورہ ذاریات کی تلاوت کرے اللہ اُسکی روزی کو وسیع اور قبر کو روشن کرے گا (صادقؑ) ۲۷۱، ۲۷۲
سُورہ طور کے مطالب
معاد۔ نیک اور پاک لوگوں کی تقدیر
مُجرموں اور بدی کرنے والوں سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے ۲۵۱
سُورۂ طور کی تلاوت کی فضیلت
جو شخص سُورۂ طور کی تلاوت کریگا، خدا اُسے اپنے عذاب سے مامون قرار دے گا۔ (رسولِ پاکؐ) ۳۵۱-۳۵۲
جو سُورہ طور کی تلاوت کرے گا خدا دنیا و آخرت کی بھلائی اُسکے لیے جمع کردے گا۔ (امام باقرؑ) ۳۵۲
سُورۂ نجم کے مطالب
سجدۂ واجب کی ایک آیت کا نزول۔ نبوت و معاد کے مسائل کی بحث اور معراج کے ذکر پر مشتمل ہے ۳۹۹، ۴۰۰
سُورۂ نجم کی تلاوت کے فضائل
پیغمبرؐ پر ایمان لانے اور اُن کا انکار کرنے والوں کی تعداد کے مطابق تلاوت کرنے والے کو اللہ دس نیکیاں عطا کرے گا (رسولِ پاکؐ) ۴۰۰
جو شب و روز تلاوت کرے، شائستہ سمجھا جائے گا۔ اللہ اُسے بخش دے گا۔ (صادقؑ) ۴۰۰، ۴۰۱

کُتب تاریخ و تفسیر و سیرۃ

آغاز و انجامِ جہاں۔ ۳۲۵، ۳۲۶
آفرینشِ جہاں۔ ۳۲۶
اصولِ کافی۔ ۴۹، ۱۰۶، ۱۲۸، ۱۴۹، ۱۶۱
〃 ۱۶۸، ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۹۸، ۲۲۸
〃 ۲۵۶، ۲۶۲، ۴۲۷، ۴۴۸
المراجعات۔ ۱۵۰، ۱۷۹
المُنجد۔ ۳۱۴، ۳۷۸
امالی۔ ۴۱۲
بحارالانوار۔ ۳۶، ۴۹، ۵۶، ۵۷، ۸۲
〃 ۸۸، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۵۰
〃 ۱۷۰، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۲۶، ۲۲۷
〃 ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۴۴
〃 ۲۵۵، ۴۲۷، ۴۳۹ - -
تاریخِ طبری۔ ۳۶، ۱۱۶، ۴۳۵
تفسیر المیزان۔ ۳۴، ۶۱، ۱۶۴، ۱۹۷، ۲۰۱
〃 ۲۴۵، ۳۱۵، ۴۱۱، ۴۱۹، ۴۲۳
〃 انوارالتنزیل۔ ۴۱۱
〃 برہان۔ ۴۷
〃 تبیان (طوسی)۔ ۳۴، ۵۲، ۶۱، ۱۰۰
〃 تفسیر جوامع الجوامع۔ ۳۸

تفسیر درالمنثور ۳۸، ۱۰۶، ۲۵۸، ۲۸۶
〃 〃 ۳۹۵، ۴۰۷، ۴۱۳، ۴۶۸
〃 رُوح البیان ۱۲۶، ۱۸۹، ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۳۲
〃 〃 ۲۴۱، ۳۰۳، ۳۷۲، ۳۹۹، ۴۱۰
〃 〃 ۴۱۱، ۴۱۳، ۴۵۵، ۴۶۰، ۴۷۱
رُوح الجنان (رازی) ۳۴، ۵۲، ۱۰۰، ۳۷۲
〃 رُوح المعانی ۳۴، ۵۲، ۶۱، ۱۰۰
〃 〃 ۱۴۸، ۲۲۷، ۲۴۵، ۴۵۵
〃 صافی ۳۴، ۶۱، ۴۷۲
〃 علی بن ابراہیم ۱۱۴، ۴۱۲، ۴۶۳
〃 فی ظلال القرآن ۳۰، ۳۴، ۳۶، ۱۱۶، ۱۴۳
〃 〃 ۱۵۳، ۱۹۱، ۱۹۷، ۳۸۲، ۴۱۱
〃 قرطبی ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۱۹، ۱۵۴، ۱۶۳
〃 〃 ۱۷۳، ۱۸۹، ۲۰۱، ۲۶۶، ۳۷۲
〃 〃 ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۹۵، ۴۵۵
〃 قُمّی ۳۰
〃 کشاف ۳۴، ۶۱، ۲۹۷، ۳۰۲
〃 〃 ۳۷۲، ۴۱۱، ۴۵۴، ۴۵۷
〃 مجمع البیان ۳۰، ۳۱، ۳۴، ۳۶، ۵۲
〃 〃 ۶۱، ۸۱، ۱۰۰، ۱۱۶، ۱۱۹
〃 〃 ۱۴۲، ۱۴۷، ۱۵۲، ۱۷۳، ۱۷۵
〃 〃 ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۸۶
۳۵۶، ۳۷۲، ۳۹۵، ۴۱۱، ۴۱۸
〃 〃 ۴۴۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۶۰، ۴۷۱
〃 مراغی ۵۲، ۱۰۰، ۱۴۳، ۳۶۸، ۳۷۷، ۳۹۹
〃 مفاتیح الغیب (فخررازی) ۳۴، ۱۴۷، ۴۱۱، ۴۵۴، ۴۷۱
تفسیر نورالثقلین ۳۱، ۳۸، ۳۹، ۱۰۳، ۱۰۶
〃 〃 ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۲۲، ۱۴۳
〃 〃 ۱۵۳، ۱۶۱، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۹۹
〃 〃 ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۵۶، ۴۱۲، ۴۱۳
〃 〃 ۴۱۸، ۴۵۱، ۴۶۳
توحید (صدوق) ۳۲۸، ۳۴۳
ثوابُ الاعمال ۳۱
خصال (صدوق) ۸۷، ۱۰۷، ۲۶۶
دائرۃ المعارف دہ خدا ۳۱۴
دائرۃ المعارف فارسی مصاحب ۴۶۸
روضۃ الواعظین ۱۲۲
سفری بہ اعماق وجودِ انسانی ۲۹۴
سفینۃ البحار ۲۹۴
سیرۃ ابن ہشام ۳۶، ۷۲
صحاح اللغت ۵۳
صحیح بخاری ۱۴۳، ۱۵۱
صحیح مُسلم ۱۲۶، ۱۵۱، ۱۹۱
علل الشرائع ۳۴۳، ۴۱۲
غررالحکم ۱۷۹
قاموس مقدس ۳۱۴
کامل ابنِ اثیر ۲۶، ۸۵
کنزالعرفان ۱۶۶، ۲۸۶
لسان العرب ۲۵۵، ۲۷۹، ۳۶۹، ۳۷۸
مجمع البحرین ۳۶۹، ۳۷۲
محجۃ البیضا ۱۴۸، ۱۶۸، ۱۸۱

مرزبانے نجوم ۳۲۵
معانی الاخبار ۲۳۹
مفردات ۵۲، ۲۲۴، ۲۵۵، ۲۷۹، ۳۰۲
〃 ۳۵۶، ۳۶۵، ۳۷۲، ۳۷۴، ۳۷۸
〃 ۳۷۹، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۶۵
مقدمہ ابن خلدون ۸۴
من لایحضرہ الفقیہ ۱۲۲
نہج البلاغہ ۶۹، ۸۲، ۸۸، ۸۹، ۱۰۸، ۱۰۹
〃 ۱۴۵، ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۵۶
〃 ۳۹۶، ۴۰۶، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۳۷، ۴۵۱
وسائل الشیعہ ۱۸۳، ۲۸۷، ۲۸۹، ۴۵۰

لغاتِ قرآن

الف۔ احلام۔ جمع حلم (بروزن نہم) کی عقل ۳۸۰
أزر۔ مادہ "موازرہ" معاونت ۱۲۳
ازفۃ: ازف (بروزن نجف) تنگیٔ وقت (بہت قریب) ۴۷۵
ازلفت: مادہ "زلفیٰ" (بروزن کبریٰ) قرب، نزدیکی ۲۵۲
استغلظ: مادہ "غلظت" سخت، مستحکم ۱۲۳
اسحار: سحر (بروزن بشر) کی جمع، پوشیدہ، نہاں ۲۸۵
اغنیٰ: مادہ "غنی" بے نیازی ۴۶۵
اقنیٰ: مادہ "قنیہ" (بروزن جزیہ) مال و دولت ۴۶۵
التناھم: مادہ "الت" (بروزن شرط) کم کرنا ۳۶۸
القی السمع: کان میں ڈالے۔ توجہ اور انہماک سے سنے ۲۵۶
امتحن: مادہ "امتحان" سونے کو پگھلا کر خالص کرنا۔ آزمائش ۱۴۳
امددناھم: مادہ "امداد" اضافہ و افزائش اور عطا ۲۷۱
اوّاب: مادہ "اوب" (بروزن ذوب) بازگشت، واپسی ۲۵۲
ایجاس: مادہ "وجس" (بروزن مکث) مخفی آواز، پنہانی اور اندرونی احساس ۳۰۴
أید: (بروزن صید) قدرت و قوت ۳۲۴
ایکہ: بہت زیادہ اور گھنے درخت، جنگل کے مشابہ ۲۲۰

ب

باسقات: جمع باسقہ کی مرتفع و بلند ۲۱۷
بطش: کسی چیز کو قوت و قدرت کے ساتھ پکڑنا۔ جنگ و جدال ۲۵۴
بیت المعمور: وہ مکان جو آسمانوں میں خانہ کعبہ کے عین اوپر واقع ہے۔ فرشتوں کی عبادت کے ساتھ معمور ہے۔ ۳۵۵

ت

تُبّع: یمن کے بادشاہوں کا لقب ۲۱۰
تتماریٰ: مادہ "تماری" معاجہ جو شک و تردید سے توام ہو ۴۷۳
تحید: مادہ "حید" (بروزن صید) ناپسند کرنا، بھاگنا ۲۲۳
تدلّٰی: مادہ "تدلّی" (بروزن تجلّی) نزدیک ہونا ۴۱۰
ترتیلوا: مادہ "زول" زوال اور متفرق ہونا ۱۰۳
تعزروہ: مادہ "تعزیر" منع کرنا ۶۱
تقول: ایسی گفتگو جو اپنی طرف سے گھڑ لی گئی ہو ۳۸۰
تلقّی: دریافت، اخذ، ضبط ۲۲۶
توسوس: مادہ "وسوسہ" غیر مطلوب افکار جو انسان کے دل میں گزرتے ہیں ۲۶۴
توقروہ: مادہ "توقیر" سنگینی۔ یہاں تعظیم کے معنی میں ہے ۶۱

ج

جاریات: جاریہ کی جمع۔ جاری پانی کی لہریں۔ کشتی، سورج نوجوان لڑکی ۲۷۵
جزاء الاوفیٰ: وہ جزا جو عمل کے ٹھیک مطابق ہو ۴۵۷
جنّت الماویٰ: یہ جنت اُس آسمانی بہشت جاودانی کے

علاوہ ہے، جس کی وسعت تمام زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے۔ یہ مخصوص مقربین کی جگہ ہے ۴۱۹

ح

حبک : (بروزن کُتب) رستے، بل، شکن، باندھنا، محکم کرنا ۲۷۸

حجرات : مادہ "حجر" (بروزن اجر) حجرہ کی جمع۔ منع کرنا۔ حجرہ دوسرے لوگوں کو انسان کی زندگی کے حریم میں داخل ہونے سے مانع ہے۔ ۱۴۴

حشر : جمع کرنا، ہر طرف سے اکٹھا کرنا ۲۶۶

حفیظ : محافظ، نگران، عہد و پیمان کی حفاظت ۲۵۳

حمیّت : مادہ "حمی" (بروزن حمد) آگ، حرارت، خشم آلود تعصب ۱۰۵

حور : جمع ہے (حوراء احور) کی، جس کی آنکھ کی سیاہی کامل طور پر مشکی اور سفیدی پورے طور پر شفاف ہو ۳۶۶

خ

خراص : مادہ "خرص" وہ بات جو گمان، تخمینہ اور اندازے کی بنا پر کہی جائے۔ ۲۸۰

خطب : اہم کام ۳۱۰

خوض : (بروزن حوض) باطل اور غلط عادات میں غرق رہنا ۳۶۰

د

دائرہ : حوادث یا روئیداد، جو انسان کو اچھی یا بُری پیش آتی ہیں ۵۲

داع : (بروزن جد) شدت سے دھکیلنا، خشونت سے ہانکنا ۲۶۱

دنی : قریب ہونا۔ ۴۱۰

دین : قیامت کا ایک نام۔ جیسے یوم الدین جزاء اور روز جزا ۲۷۶

ذ

ذاریات : جمع ذاریہ کی، چیزوں کو اڑانے والی اور تیز ہوائیں ۲۷۴

ذنب : بُرے کام کے آثار و نتائج ۴۲

ذنوب : (بروزن قبول) وہ گھوڑا جس کی دُم لمبی ہو، حصہ ۳۴۶

ر

راغ : "روغ" (بروزن شوق) پوشیدہ منصوبے کے ساتھ چلنا ۲۰۲

رس : کنواں، مختصر اثر جو باقی رہ جائے ۲۲۰

رق : مادہ "رقت" نازک، لطیف، کاغذ، باریک چمڑا ۳۵۵

رقیب : مراقب، نگران، محافظ ۲۲۸

رکن : ستون، پایہ اصلی۔ ہر چیز کا اہم حصہ ۳۱۷

رمیم : مادہ "رمّة" (بروزن منہ) بوسیدہ ہڈیاں ۳۱۸

ز

زاغ : مادہ "زیغ" دائیں بائیں طرف لڑھنا، انحراف ۴۱۹

س

سامدون : مادہ "سمود" (بروزن جمود) لہو و لعب، غرور سے سر اونچا کرنا ۴۷۶

ساهون : مادہ "سہو" ہر طرح کی غفلت ۲۸۱

سدرہ : (بروزن حرفہ) بیری کا درخت ۳۷۴

سُلطان : وُہ چیز جو تسلط کا سبب بنے، معجزہ۔ قوی عقلی دلیل و منطق یا دونوں ۳۱۶

سلطان : زندہ اور یقینی دلائل جو دشمن پر غلبہ کا سبب ہوتے ہیں ۴۳۱

سعی : تیزی کے ساتھ چلنا۔ تیزی سے راستہ طے کرنا ۴۵۶-۴۵۷

سقف مرفوع : آسمان ۳۵۵

سکر : (بروزن مکر) پانی کی راہ کو مسدود کرنا ۲۳۲

سکرۃ الموت : مستی سے مشابہ ایک حالت، شدید اضطراب و بے چینی کی کیفیت جو موت کے وقت لاحق ہوتی ہے ۲۳۲

سکینہ : مادہ "سکون" دلی آرام و اطمینان ۴۶

سموم : وہ گرم ہوا جو مسامات میں داخل ہو کر جھلسا دیتی ہے ۲۷۶

سمین : موٹا تازہ ۲۰۳
سوء : (بروزن توع) نامطلوب ۵۳
سوق : ساق کی جمع ، پنڈلی ، ٹانگ ، قدم ۱۲۳

ش

شطا : چوڑہ ، ٹہنی ، ایسی ٹہنیاں جو تنے میں سے پھوٹتی ہیں ۱۲۳
شعوب : شعب (بروزن صعب) کی جمع ایک عظیم گروہ ۱۸۷
شہید : وہ شخص جو حضور قلب رکھتا ہو ۲۵۶

ص

صاعقہ اور صاقعہ : دونوں کے معنی شدید آواز کے ساتھ نیچے گرنا ۲۱۹
صرّہ : مادہ "صر" (بروزن شر) باندھنا ، وابستگی ، شدت سے چیخنا ۲۰۴
صکت : مادہ "صک" (بروزن شک) شدت سے مارنا چہرہ پر مارنا ۲۰۴

ط

طغیٰ : مادہ "طغیان" حد سے تجاوز کرنا ۴۱۹
طلع : کھجور کا پھل جب وہ ظاہر ہونے لگے ۲۱۷
طور : پہاڑ، الطور سے وہی پہاڑ مراد ہے جہاں موسیٰ کو وحی کی گئی۔ ۲۵۴

ظ

ظلام : صیغہ بالغہ۔ نہایت ظلم کرنے والا ۲۴۷

ع

عبد : ایسا انسان جو اپنے مالک سے تعلق رکھتا ہو ۳۲۶
عتوا : مادہ "عتو" (بروزن غلو) اطاعت سے روگردانی ۲۱۹
عتید : مادہ "عتاد" (بروزن جہاد) ذخیرہ کرنا ۲۲۸
عجل : (بروزن طفل) بچھڑا ۲۰۲
عنید : مادہ "عناد" تکبر، خود پسندی، حق کا انکار ۲۴۴

غ

غمرہ : زیادہ پانی جو کسی جگہ کو ڈھانپ لے، جہالت و نادانی جو کسی کو ڈھانپ لے۔ ۲۸۱
غوی : غی، ایسی حالت جو اعتقادِ فاسد کے ساتھ ہو ۴۰۵

ف

فاسق : وہ شخص جو خدا کے فرمان کی حدود سے باہر قدم نکالے ۳۲۰
فاکہین : مادہ "فکہ" (بروزن نظر) پھل ، ہنسی خوشی ۳۶۴
فتنہ : سونے کی کٹھالی میں رکھنا تاکہ صاف ہو کر خالص ہو جائے ۲۸۲
فوز : کامیابی اور خیرات کا سلامتی کے ساتھ حصول ۵۲

ق

قاب : اندازہ، کمان کو درمیان سے پکڑنے کی جگہ سے مڑی ہوئی نوک تک کا فاصلہ ۴۰
قرن : دو یا کئی چیزوں کا ایک دوسرے کے قریب ہونا۔ ایسی دو جماعتیں جو ایک زمانہ میں بسر کرتی ہیں عرصہ ۳۰ سال یا سو سال۔ ۲۵۴
قعید : مادہ "قعود" بیٹھنا ، مامور ، نگران ۲۲۶
قلب : عقل، علم، فہم کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۲۵۵
قوس : کمان بعض نے قیاس کے مادے سے مقیاس معنی لیے ہیں۔ ۴۱

ک

کاس : شراب سے بھرا ہوا پیالہ ۲۷۲
کاہن : اسرار غیبی کی خبر دینے والا ۲۷۸
کِسف : (بروزن فسق) کسی چیز کا ٹکڑا۔ جزو ۳۹۲
کید : (بروزن صید) چارہ جوئی۔ ۳۸۹

ل

لاتلمزوا: مادہ لمز (بروزن طنز) عیب نکالنا، طنز کرنا ۱۷۴

لَعَنِتَّم: مادہ "عنت" ایسے کام میں پڑنا، جس کے عواقب سے انسان ڈرتا ہو۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی پر دباؤ پڑنا۔ مشقت ۱۵۷

لغوب: تعب، خستگی، تکان ۲۸۵

لمم: (بروزن قلم) مادہ "المام": گناہ سے قریب ہونا (بلا ارتکاب) ۴۴۶

م

ماویٰ: ملنے کی جگہ، مقام ملاقات ۴۱۸

ماھد: مادہ "مہد" گہوارہ، آرام و راحت کی جگہ ۳۲۶

مثقلہ: مادہ "اثقال" تحمیل مشقت ۳۸۸

مجید: مادہ "مجد" وسیع شرافت ۲۱۱

محیص: مادہ "حیص" (بروزن حیف) انحراف، عدول، فرار، شکست کھانا ۲۵۵

مرہ: لپٹے ہوئے، رسّی کے بل، قدرت، توانائی، مادی و معنوی استحکام ۴۰۹

مریب: مادہ "ریب" شک میں پڑا ہوا ۲۴۵

مریج: مادہ "مرج" (بروزن حرج) مختلط، مشوش، مشتبہ (چراگاہ) ۲۱۳

مھور: بھڑکنے والا، پُر، کناروں تک بھرا ہوا ۳۵۶

مسومہ: ایسی چیز جس پر نشان لگا ہوا ہو، مہر، چھاپ ۲۱۱

مشفقین: مادہ شفق، خوف سے ملی ہوئی توجہ ۲۷۴

مصفوفہ: مادہ "صف" ساتھ ساتھ قطاروں میں بچھے ہوئے تخت ۳۶۶

مصیرا: مختلف حالات ۵۴

مصیطرون: مادہ "سطر" مسیطر وہ شخص جو کسی کام پر غلبہ رکھتا ہو ۲۸۶، ۲۸۷

معتد: متجاوز، دوسروں کے حقوق میں متجاوز ہو۔ یا احکام الٰہی کی حدود سے تجاوز کرے۔ ۲۴۵

معرہ: مادہ "عر" (بروزن شر) کھجلی اور خارش کی بیماری ضرر و زیان ۱۰۲

منکوفا: مادہ "عکوف" نہ چلنا، ساکن رہنا۔ ۱۰۱

مقسطین: مادہ "قسط" عادلانہ حصہ ۱۶۵

مناع: صیغہ مبالغہ بہت زیادہ منع کرنے والا ۲۴۴

منشور: پھیلا ہوا، درخشندہ ۳۵۵

منون: مادہ "من" نقصان، قطع و برید کرنا ۳۷۸

موتفکہ: زیر و زبر شدہ شہر مراد "بصرہ شہر" ۴۷۲

مور: (بروزن قول) تیزی کے ساتھ رواں دواں ۳۵۹

ن

نبذناھم: ہم نے اُن کو پھینک دیا ۳۱۷

نشاۃ الاخریٰ: نشاۃ آفرینی اور تربیت، قیامت مراد ہے ۴۶۵

نضید: تراکم، تہ بہ تہ، ایک دوسرے کے اوپر ۲۱۷

نفخ: پھونکنا، نفخہ ایک بار پھونکنا ۲۲۴

نقبوا: مادہ "نقب" دیوار یا چمڑے میں سوراخ کرنا ۲۵۵

نقیب: وہ شخص جو جمعیت کے بارے میں بحث و تحقیق کرتا ہے۔ ۲۵۵

و

وازرہ: مادہ "وزر" (بروزن قطر) پہاڑی پناہ گاہ، بھاری پتھر، گناہ ۴۶۵

وارید: مادہ "ورود" پانی کی تلاش میں جانا۔ ۲۲۵

وقر: (بروزن فکر) بھاری بوجھ کانوں کا بھاری پن، ثقل سماعت ۲۷۴

ویل: اُن پر بولا جاتا ہے جہاں ایک یا کئی فرد ہلاکت میں جا پڑیں افسوس۔ ۳۴۷

ی
یتنازعون : مادہ " تنازعہ " کھینچا تانی ۔ ایک دوسرے سے لینا ۲۷۱
یصعقون : مادہ " صعق و اصعاق " صاعقہ ۔ مار ڈالنا ۳۹۳
یغضون : مادہ " غض " (بروزن خط) نگاہ یا آواز کو کم کرنا
نیچی کرنا ، کوتاہ کرنا ۔ ۱۴۳
یم : سمندر ۔ اور نیل جیسے بڑے دریا پر بھی اطلاق ہوا ہے ۳۱۷
یھجعون : مادہ " ھجوع " رات کو سونا ۲۸۴

الف ۔ متفرق موضوعات

آپ ہماری مکمل حفاظت میں ہیں :
اگر یہ عذاب کا کوئی پتھر آسمان سے گرتا دیکھیں تو یقین نہ کریں
ان کے حال پر چھوڑ دیجئے ، انہیں یہاں بھی عذاب ہوگا ،
صبر سے کام لیجئے ، حمد و تسبیح کیجئے ۔ ۳۹۱-۳۹۶
آسمانوں اور زمین کا خالق مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے
ہم نے آسمان اور زمین کو چھ دن (ادوار) میں بنایا طلوع و غروب سے
پہلے اور رات کے ایک حصہ میں اور سجدوں کے بعد اسکی تسبیح کرو ۲۵۷-۲۶۱
ابراہیم کے مہمان :
ابراہیم کے مہمانوں کی خبر پہنچی ؟ بھنا ہوا گوشت لائے مگر نہ کھایا ،
بیٹے کی بشارت ، بڑھیا بانجھ بیوی کا اظہار تعجب ، تیرے رب
نے اسی طرح کہا ہے ۳۰۱-۳۰۵
ادب افضل ترین سرمایہ
رسول ، خدا کا سفیر ہے ۔ اس کا ادب خدا کا ادب ہے ، اونچی
آواز سے بولنا بے ادبی ہے گزشتہ سے توبہ کرو ۔ اللہ غفور و رحیم ہے
استہزاء ، بدگمانی ، غیبت وغیرہ ممنوع ہے : ۱۴۵-۱۵۱
مذاق اڑانے اور استہزاء کے واقعات ، غیبت کی مثال اور ممانعت
۱۶۸-۱۷۳
اس کے مانند کلام لے آئیں
اے رسول نصیحت کرتے رہو کہو انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں
ان کی عقلیں ان کاموں کا حکم دیتی ہیں یا سچے ہیں تو
ایسا کلام لے آئیں ۔ ۳۷۶-۳۸۲
اسلام اور ایمان کا فرق :
زبان پر شہادتین جاری کرنے والا داخل اسلام ہے ۔ ایمان
باطنی امر ہے ۔ اس کی جگہ انسان کا دل ہے ۔ ۱۹۷-۱۹۹
اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ :
مسلمان ہو کر تم نے خدا پر احسان کیا نہ رسول پر بلکہ تم پر اللہ کا احسان ہے ۲۰۱-۲۰۳
اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی :
اگر مشرکین مکہ حدیبیہ میں تمہارے ساتھ جنگ کرتے تو بھاگ
کھڑے ہوتے اور کوئی ولی و یاور نہ پاتے ۹۸-۱۰۲
انسان کی بہترین صفت تقویٰ ہے :
تمہارے کنبے قبیلے تو تعارف و پہچان کے لیے بنائے ہیں ۔
البتہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو متقی و پرہیزگار ہے ۔ ۱۸۶-۱۸۷
انسان کے ہم نشین فرشتے و شیاطین
ہم نشین فرشتہ کے پاس اعمال نامہ موجود ہے ، ہر کافر و متکبر کو
جہنم میں ڈال دو ۔ میں نے سرکشی کے لیے نہیں ابھارا وہ
خود گمراہی میں پڑا ہوا تھا (قول شیطان) ۲۴۲-۲۴۹
ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو :
ہم نے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا ، اس میں کوئی شگاف نہیں ۔
پُر برکت بارش سے مُردہ زمین کو زندہ کیا ۔ مُردوں کو زندہ
کرنا بھی اسی طرح ہے ۲۱۵-۲۱۸

ب ۔ باغیوں سے جنگ کی شرائط

باغیوں کی جنگ اور دو مومنوں کے درمیان نزاع ۔ دو مختلف

موارد ہیں۔ زیر بحث آیت دو مومن مردوں
کے درمیان نزع کو بیان کرتی ہے ۱۶۵-۱۶۷
بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم عذاب واقع ہو کر رہے گا:
طور کی قسم، کتاب، بیت المعمور، بلند چھت اور بھڑکتے
سمندر کی قسم۔ عذاب واقع ہو گا۔ جسمیں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی ۳۵۴-۳۵۷
بیعتِ رضوان والوں سے خدا کی خوشنودی:
رسولِ پاکؐ نے ایک درخت کے نیچے اصحاب سے دوبارہ
بیعت لی کہ اب ان لوگوں سے جنگ ناگزیر ہے ۸۰-۸۳
بیعت و بیعت کی خصوصیات:
بیعت کے معنی و تشریح اور بیعت پر احادیثِ رسولِ پاکؐ
اور ارشادات جناب امیر ۸۳-۹۰
پ
پیچھے رہ جانے والوں کا عذر:
پیچھے رہ جانے والوں کی سرزنش اور قلبی کیفیت کا
اظہار ہوا۔ پھر وہ توبہ میں بھی مخلص نہیں ہیں ۶۵-۷۰
پیچھے رہ جانے والوں کا اب ساتھ چلنے پر اصرار:
جو لوگ حدیبیہ میں رسول کے ساتھ نہیں تھے، وہ خیبر میں
ساتھ چلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ۷۵-۷۹
پیغمبرؐ کا سچا خواب:
حدیبیہ سے پہلے کا خواب لوگوں کا عمرہ کیے بغیر واپس آنا اور شک
میں پڑنا۔ جبکہ خواب ایک سال بعد پورا ہونا تھا (نکات) ۱۱۲-۱۱۴
پیغمبرؐ کی بارگاہ کے آداب:
پسِ حجرہ سے آواز دو، شور اور آواز بلند نہ کرو۔ اعمال حبط
ہو جائیں گے۔ ۱۴۰-۱۴۵
پیغمبر کی بیعت خدا کی بیعت ہے
تم عمل کرو۔ خدا اور اس کا رسول اور مومنین (ائمہ) تمہارے
اعمال کو دیکھتے ہیں۔ ۵۹-۶۴
پیغمبروں کی سخاوت
کھلے دل سے مہمان کی پذیرائی کرنا ۲۰۵، ۲۰۶
ت
تجسس نہ کرو
کسی کی داخلی زندگی کے راز معلوم کرنا منع ہے۔ لیکن
حکومت کو معاشرہ کی حفاظت کیلئے جاسوسی کا حق ہے ۱۸۰-۱۸۱
تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں
آسمان کا شدت سے ہلنا، پہاڑ متحرک ہونگے، تکذیب کرنے والوں
پر وائے جو باطل میں مشغول ہیں انہیں جہنم میں دھکیلا جائیگا۔
اعمال کی سزا ملے گی۔ ۳۵۸-۳۶۲
تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی فرشتے لکھتے ہیں
انسان کے دائیں بائیں ساتھ رہنے والے دونوں فرشتے اعمال
لکھتے ہیں۔ زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالتا کہ فرشتے لکھنے
کو آمادہ ہوتے ہیں۔ ۲۲۳-۲۲۸
ح
حقیقتِ تقویٰ
قرآنی آیتوں سے تقویٰ کی وضاحت، انسان کا عظیم ترین امتیاز ۱۹۲
حمیتِ جاہلیت کیا ہے؟
حمیت اگر جاہلیت کے ساتھ نہ ہو تو ممدوح معنی میں استعمال ہوتا ہے ۱۰۸-۱۱۰
خ
خدا اور خلق خدا کی طرف توجہ
متقین و محسنین رات کے آخری حصوں میں خدا کی طرف متوجہ
ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ سے مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں ۲۸۸-۲۹۰
خدا غنی مطلق ہے
خدا ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ دعوت عمومیت میں

اُس کا کوئی مفاد نہیں ۳۳۷

خُدا کے بارے میں سوءظن رکھنے والے :
خُدا کے وعدوں اور بے پایاں رحمت کے بارے میں
سوءظن رکھنے والے ناقص الایمان، بلکہ بے ایمان ہیں ۵۵-۵۷

خُدا کے حصّے کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہو :
لات وعزیٰ اور منات کیا خدا کی بیٹیاں ہیں؟ تم نے اپنے
لیے بیٹے پسند کیے تمہاری یہ تقسیم غلط ہے۔ تم تو بیٹیوں
کو زندہ درگور کرتے ہو۔ ۴۳۰-۴۳۱

خُدا کی نشانیاں تمہارے وجود میں ہیں :
انسانی وجود اعضاء و جوارح، آنکھ، ناک، کان یہ سب
خدا کی نشانیاں ہیں۔ ۲۹۱-۲۹۶

خُدا کی نشانیوں سے معاد کیلئے آمادگی :
توجہ، تعقل، غور و فکر، صبر، ایمان، ہوش و حواس کی
آمادگی کے بغیر استفادہ ممکن نہیں ۲۹۸-۲۹۹

خُدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی :
تمام انسانوں میں ایمان کے ساتھ عشق اور کفر سے نفرت
بلا استثنا موجود ہے ۱۶۰-۱۶۱

خُودستائی نہ کرو خدا تمہیں خُوب پہچانتا ہے :
جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کیلئے ہے تاکہ بدوں کو
سزا، نیکوں کو جزا دے جو کبائر سے بچتے ہیں، اللہ
جانتا ہے۔ خودستائی نہ کرو اللہ علیم ہے۔ ۴۴۵-۴۴۹

د

داستانِ اصمعی
ایک عرب کی فرمائش پر "ذاریات" کی آیات پڑھنا۔ عرب کا
اونٹ کو نحر کرکے تقسیم کر دینا۔ پھر کعبہ میں ملاقات انجام ۲۹۶-۲۹۷

داستانِ صلح حدیبیہ اور اُس کے نتائج :
سہیل بن عمر اور رسولؐ کے درمیان معاہدہ، فتح کا دروازہ کھل گیا
اور دو سال بعد مکہ کسی عظیم خُوں ریزی کے بغیر فتح ہو گیا۔ ۳۴-۳۹

دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے :
خدا کا شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہونا ہماری اُس شدید
وابستگی کا سرچشمہ ہے۔ ۲۲۹-۲۳۰

دوسرا دیدار :
دوبارہ مشاہدہ کیا۔ سدرۃ المنتہیٰ نزدیک جنت الماویٰ وہاں
نور ہی نور تھا۔ اُس نے اپنے رب کی چند نشانیاں دیکھیں ۴۱۷-۴۲۰

دشمنوں پر سخت، دوستوں پر مہربان :
اصحاب پیغمبرؐ کی خصوصیات جو توراۃ و انجیل میں بھی بیان ہوئیں ۱۱۸-۱۲۹

س

سب سُرود صدا اُسی کی طرف سے ہے :
آسمان کے درخشندہ ستارے اُسی کے فرمان اور ربوبیت سے
چمکتے ہیں۔ ستارۂ شعریٰ کے عجائبات وغیرہ ۴۶۶-۴۶۸

سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کونسی ہے؟
کیا وہ خُود بخود پیدا ہو گئے۔ کیا غلبہ و تسلط رکھتے ہیں۔
کیا اسرار وحی کو سُنتے ہیں۔ خدا کی لڑکیاں اور تمہارے
لڑکے خدا شرک سے منزہ ہے۔ ۳۸۴-۳۹۰

سچّی اور جھُوٹی قدریں :
مال و دولت، قوم و قبیلہ کے افتخارات کو ختم کرتے ہوئے خدا
نے سچّی قدر یعنی قلب کی پاکیزگی اور تقویٰ کو انتخاب کیا ۱۸۸-۱۹۱

ش

شفاعت بھی اُسی کے اذن سے ہوگی
عالمِ اسباب اُس کے ارادہ کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ ہر موجود

کے پاس جو کچھ ہے اُسی کی برکت سے ہے
شفاعت بھی اُسی کی طرف سے ۴۳۶-۴۳۹

ص

صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے :
تم بھی عجلت نہ کرو۔ ان کی باتوں کے سامنے صبر کرو ۲۶۱-۲۶۲

صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن سے مقابلہ ہے :
تم سے پہلے قوم نوح و فرعون، عاد و ثمود وغیرہم نے
پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ۲۲۰-۲۲۲

صلح حدیبیہ
۶ھ میں مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان ایک
معاہدہ طے ہوا۔ رسول پاکؐ کے حکم سے مسلمانوں نے سر منڈوائے
اسی جگہ قربانی کے جانور ذبح کیے اور احرام کھول دیے ۲۶-۲۹

صلح حدیبیہ کی مزید برکات
فتح خیبر اور وہاں سے ملنے والے غنائم کی طرف اشارہ ۔ ۹۱-۹۶

ع

عمرۃ القضاء
عمرہ جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتوی کرنا پڑا اور اگلے سال
ادا کیا گیا ۱۱۵-۱۱۶

غ

غیبت بہت بڑا گناہ
شخصیت کو قتل کرنا، شخص کو قتل کرنے سے بھی بڑا
گناہ ہے ۱۸۱-۱۸۲
غیبت کا مفہوم، کسی کی پیٹھ پیچھے خلاف بات کرنا ۱۸۳
غیبت کا علاج۔ جس کی غیبت کی اُس سے معافی چاہنا۔
اُس کے لیے استغفار ۱۸۴
استثنائی مواقع۔ شادی بیاہ کے موقع پر بطور مشورہ کسی
کے عیوب بیان کرنا غیبت نہیں ہے۔ ۱۸۵

ط

طوفان اور بارش لانے والے بادلوں کی قسم
ہواؤں کی، بادلوں کی، کشتی جو پانی پر چلتی ہے، فرشتوں
کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں قسم جو تجھ کو وعدہ
دیا ہے وہ سچ ہے۔ بلاشبہ اعمال کی جزاء واقع ہو کر
رہے گی۔ ۲۷۳-۲۷۶

ظ

ظن و گمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے
گمان کی پیروی ہمارے ذکر سے انحراف۔ تم بھی اُن سے
منہ موڑ لو جو راہِ خدا سے بھٹک گئے۔ اللہ انہیں
اچھی طرح جانتا ہے۔ ۴۴۰-۴۴۴

ف

فاسقوں کی خبروں پر اعتبار نہ کرو :
ولید بن عقبہ کی دی ہوئی خبر، خالد بن ولید کی تحقیق،
بنی مصطلق کا واقعہ ۱۵۵-۱۶۰

فتح مُبین :
ہم نے تمہارے لیے واضح کامیابی فراہم کر دی ۳۳-۳۴

فتح مُبین کے عظیم نتائج :
مشرکین مکہ نے رسولؐ پر تہمتیں لگائیں، انہیں گناہ قرار دیا۔ حدیبیہ
سے اُنکا دروازہ بند ہو گیا۔ آئندہ کے لیے بھی تہمت
لگانے کی جرأت نہ رہی ۴۰-۴۴

فتح مُبین کے مزید نتائج
مومنین و مومنات کا پُربہار جنت میں نوید داخلہ اور منافقین

کے لیے انذارِ عذاب ۵۱ تا ۵۵
فرار کی کوئی راہ نہیں :
کتنی بہت سی قومیں ایسی ہیں جنہیں ان سے پہلے ہلاک کیا۔ کیا ان افراد کیلئے موت اور عذابِ الٰہی سے فرار کی کوئی راہ ہے ؟ ۲۵۱ - ۲۵۶

ق

قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت کا مقصد :
جن و انس کی عبادت کیلئے پیدا کیا۔ نہ کہ مجھے کھانا کھلائیں روزی میں دیتا ہوں رحمتِ الٰہی انسان کی خلقت کا ہدف ہے۔ عبودیت سے اس ہدف کو پورا کیا جا سکتا ہے ۳۲۴ - ۳۲۷
قسم ہے آسمان اور اُسکی زیبا شکنوں کی :
یقیناً تم مختلف باتوں میں لگے ہوئے ہو جزا کا دن کب ہوگا ؟ ۲۷۷ - ۲۸۲
قومِ لوط کے بے دیکھے شہر نشانِ عبرت ہیں
فرشتو تمہیں کس لیے بھیجا؟ مجرم قوم پر عذاب کے لیے۔ ہم نے مومنوں کو نکال لیا تھا۔ ایک گھر کے سوا کوئی مومن نہ تھا۔ ان بے دیکھے شہروں کو نشانِ عبرت بنایا۔ ۳۰۹ - ۳۱۴
قیامت کی چیخ سے سب لوگ زندہ ہو جائیں گے
وُہ دن جب زمین اُن کے اُوپر سے پھٹ جائے گی، وُہ قبروں سے نکلیں گے یہ جمع کرنا ہمارے لیے آسان ہے ۲۶۳ - ۲۶۹

ک

کبائر الاثم کیا ہے ؟
کبیرہ گناہوں کی تعریف، اقسام، اسلام کی روایات میں کبائر کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے۔ ۴۵۰
گ ، گزشتہ لوگوں کی تاریخ اور درسِ عبرت
موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا اُس نے کہا جادوگر ہے۔ ہم نے لشکر سمیت پکڑ لیا۔ عاد کا انجام، ثمود کی سرگزشت بھی نشانی، قوم کو بھی ہلاک کیا ۳۱۵ - ۳۲۲
گناہ کی توجیہہ کرنا ایک عام بیماری ہے
گناہ کی توجیہہ آدمی کو گناہ پر اصرار کرنا سکھاتی ہے۔ بہت بُری بیماری ہے۔ ۷۰ - ۷۲

م

مُجرموں کو دوزخ میں کسطرح لے جائیں گے
طوق و زنجیر میں جکڑ کر حقارت و ذلالت کے ساتھ ہانکے جائیں گے۔ ۳۶۱ - ۳۶۲
معاشرے میں کامل امن و امان
تمسخر، غیبت، عیب جوئی، بُرے القاب، بدگمانی اور تجسس سے اجتناب معاشرہ میں امن و امان کا سبب بنے گا۔ ۱۷۸ - ۱۸۰
معراج ایک مسلمہ حقیقت ہے
واقعہ معراج کو تمام علمائے نے قبول کیا ہے۔ البتہ کچھ نے اسے صرف رُوحانی اور خواب کی کیفیت سمجھا ہے ۴۲۰ - ۴۲۲
موت کی حقیقت
ایک طویل نیند، ایک پُل رسولِ پاکؐ اور آئمہؑ کے ارشادات ۲۳۷ - ۲۳۹
موت حق ہے ، متعدد حوالے ۲۴۰ - ۲۴۱
مومنوں کے دلوں پر نزولِ سکینہ
زمین و آسمان کے لشکر خدا کے لیے ہیں اللہ حکیم و دانا ہے اُس نے مومنوں کے دلوں کو آرام بخشا ۴۵ ، ۴۹
مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں
اگر دو مسلمان فریقوں میں نزاع ہو جائے تو صلح کرا دو۔ ظالم

کے خلاف مظلوم کا ساتھ دو، یہاں تک کہ صلح ہو جائے۔ ۱۶۲-۱۶۵

ن

نیکو کار سحر خیزوں کا اجر

پرہیزگار جنّت کے باغوں میں جو انہیں مرحمت فرمایا اُسے حاصل کریں گے۔ رات کو کم سوتے ہیں، استغفار کرتے ہیں۔ اُن کے اموال میں سائلوں اور محروموں کا حق ہے۔ ۲۸۳ - ۲۸۸

ہ

ہٹ دھرم منکرین اپنے کام میں سرگرداں ہیں

اس بات پر تعجب کیا کہ ڈرانے والا اُن میں ہی سے آیا۔ کیا ہم مٹی میں مل جانے کے بعد پھر زندہ کیے جائینگے ۲۱۰-۲۱۳

ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار

وہ شخص جس نے اسلام (اتفاق) سے منہ پھیر لیا، یہ جان کر کہ کوئی دوسرا کسی کے گناہوں کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے اور دیگر نکات کی بحث ۴۵۳، ۴۶۱

ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے رہتے ہیں

ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا اور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ ہم کیا ہی اچھا پھیلانے والے ہیں۔ ۲۲۳، ۳۲۹

ی

یہ بھی عذابِ الٰہی میں حصّہ دار ہیں

جنہوں نے ظلم کیا، اُن کے لیے بھی، ان کے ساتھیوں جیسا عذاب ہے۔ اس بنا پر جلدی نہ کریں۔ وائے ہے اُن لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے ۳۴۵ - ۳۴۸

یہ درس عبرت کیلئے کافی نہیں ہے

عاد، ثمود اور قوم لوط کی سنگین عذاب کے ساتھ تباہی اور قوم نوح کی تباہی، وہ سب سے زیادہ ظالم تھے۔ تو اپنے پروردگار کی کونسی نعمت میں شکست رکھتا ہے ۴۷۰-۴۷۳

مقامات

بابل : حضرت ابراہیمؑ کا پہلا وطن ۳۱۴

حبرون : سدوم کے قریب حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ کا مرکز ۳۱۴

حدیبیہ : مکّہ سے بیس کلومیٹر فاصلہ پر ایک بستی کا نام ۲۹

دارالندوہ : سردارِ قریش قصی بن کلاب کا گھر جہاں مشورہ کے لیے عرب اکٹھے ہوتے تھے۔ ۲۷۷

ذی الحلیفہ : مدینہ کے قریب ایک مقام جہاں ۶ھ میں مسلمانوں نے رسولؐ کی معیت میں عمرہ کا احرام باندھا ۲۹

سدوم : قوم لوط کا ایک شہر، ایک آبادی ۳۱۲

عراق : موجودہ ایک مسلم ملک۔ حضرت ابراہیمؑ کا پہلا وطن ۳۱۴

عسقلان : مکّہ کے قریب ایک مقام ۳۴

مسجد الحرام : خانہ کعبہ کا ایک نام (مقام محترم) ۲۹

موتہ : ایک مقام جہاں ایک مشہور جنگ لڑی گئی۔ حضرت جعفر طیّار کی شہادت گاہ ۷۷

یمامہ : ایک جنگی مقام ۷۸

بحمداللہ اشاریہ جلد ۲۲ بہ توفیقِ ربانی اختتام پذیر ہوا۔

سید شکیل حُسین موسوی
B-۴۶ - جعفریہ کالونی۔ لاہور
۱۸ نومبر ۱۹۹۱ء ۹ جمادی الاول ۱۴۱۲ھ